الحمدللہ حکومت پاکستان کی جانب سے اوّل انعام یا
اللہ
رسول
محمد
3
سید الوری صلی اللہ علیہ وسلم
اضافہ شدہ نیا ایڈیشن
قاضی عبدالدائم دائم
www.maktabah.org

حضرت العلام مولانا قاضی عبدالدائم دائم
مدظلہ العالی زیب سجادہ آستانہ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ ہری پور
ہزارہ اس دور کے وہ صاحب عرفان و ایقان، پیر ارشاد و
احسان، دریائے فیض فراواں اور مصنف ذیشان ہیں جن کے
افکار عالیہ، تحقیق انیق، تدقیق عجیب، تفحص نادر، بحوث دلآرا
اور نصوص حقائق افشاں پہچی محسوس ہیں۔

آپ کی تصنیف "سید الوریٰ" کا مطالعہ
شبستان محبت و مودت کے ہمراہیوں کے لئے باعث
طمانیت، وجہ فرحت جان، سبب ازدیاد ایمان، ذریعہ حصول
رضائے رحمن اور ضامن خوشنودی سید انس و جان ہے۔ اس
تصنیف منیف میں قاضی صاحب نے صدیوں سے اذہان
میں گھر کئے ہوئے اشکالات کا ازالہ کر کے اصح ترین
روایات و مراجع سے تاریخ سیرت سید الوریٰ کی تزئین و
آرائش کی ہے اور اسی ایک مہتم بالشان بات کے باعث
سید الوریٰ نے گزشتہ ڈیڑھ سو سال سے سیرت طیبہ پر لکھی
جانے والی کتب پر فوقیت حاصل کر لی ہے۔ کتاب سید الوریٰ
سے قاضی صاحب کی لوذعیت و جامعیت کا اظہار ہوتا ہے اور
قاری کتاب ایک ایک سطر کی خواندگی سے آپ کے علم و فضل کا
دل و جان سے اقرار کر لیتا ہے اور دوران مطالعہ میں کہتا جاتا
ہے۔ این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔

بحمد اللہ! سید الوریٰ کی جلد اول و دوم کو دربار
مصطفوی علی صاحبہا الصلوٰۃ سے ایسی سند قبولیت و طغرائے
پذیرائی ملا کہ ہر عارف و عامی نے اس کے مافیہات کو سامان
نور جان اور سرمایہ ایمان سمجھ کر تعریف و تحسین کی۔ اب اسی
کتاب کی جلد سوم آپ کے سامنے ہے جس میں حسب سابق
قاضی صاحب نے توفیق ربانی سے تحقیق لاثانی کا حق ادا کر دیا
ہے۔ شمائل نبویہ اور معجزات پر یوں تو ہر سیرت نگار نے لکھا ہے
مگر قاضی صاحب جیسا زندہ و تابندہ اسلوب بیان کس کو نصیب
ہے! حقیقت یا فسانہ، نکاح سیدہ زینب اور تحقیق عمر سیدہ عائشہ
جلد سوم کے وہ روشن، تاباں اور درخشاں ابواب ہیں جن
میں مصنف مبجل نے جدید تحقیق اور عمیق تحرّی و تتبع سے صدیوں
کے متنازعہ مسائل کو اصح ترین اسانید و مراجع سے استفادہ
کرتے ہوئے حل کر دیا ہے اور ہر قاری کے دل میں عظمت و
تقدیس شان رسالت کا نقش بٹھا دیا ہے۔ کتاب آپ کے
ہاتھ میں ہے۔ اسے شوق فراواں اور ذوق مودت سے
پڑھئے!

مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید

عبد سامی و دائم۔ بشیر حسین ناظم تمغہ حسن کارکردگی
سابق مشیر وزارت مذہبی امور، حکومت پاکستان۔ اسلام آباد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَللّٰھُمَّ !

اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَ سَلِّمْ وَ بَارِکْ عَلیٰ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلیٰ اٰلِ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ وَ سَلَّمْتَ وَ بَارَکْتَ عَلیٰ سَیِّدِنَا اِبْرَاھِیْمَ وَ عَلیٰ اٰلِ سَیِّدِنَا اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ.

تو مہرِ لا زوال سرِ مطلعِ ازل
تو طاقِ جاں میں شمع ابد سیّدالوریٰ

حفیظ تائبؔ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حکومتِ پاکستان
وزارتِ مذہبی امور
اسلام آباد

سندِ امتیاز

نہایت مسرت سے تصدیق کی جاتی ہے کہ محترم قاضی عبدالدائم دائم
کی تالیف کردہ کتاب سیدالوریٰ بزبان اردو مقابلہ کتب سیرت
برائے سال ۱۹۹۸ء میں اول انعام کی مستحق قرار پائی اور مؤلف موصوف کو
حکومتِ پاکستان کی طرف سے مبلغ تیس ہزار روپے بطور انعام دیئے گئے۔

نمبر ۱۲(۲)ا/ے ڈی آر/۰۰/۹۸

تاریخ ۱۲ ربیع الاول ۱۴۱۹ھ
۷/جولائی ۱۹۹۸ء

سیکرٹری
وزارتِ مذہبی امور حکومتِ پاکستان
اسلام آباد

سَیِّدُ الوَریٰ

(اوّل انعام یافتہ)

(جلد سوم)

جانِ دو عالم

صلی اللہ علیہ وسلم

کی سیرت مطہرہ

قاضی عبدالدائم دائمؔ

علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40- اُردو بازار، لاہور۔

فون :7352332، 7232336 فیکس: 7223584

www.ilmoirfanpublishers.com

E-mail: ilmoirfanpublishers@hotmail.com

نام کتاب	....	سیّد الورٰی ﷺ
مصنف	....	قاضی عبدالدائم دائم
کمپوزنگ	....	محمد بشیر، محمد شبیر، صدریہ کمپیوٹرز، ہری پور
پروف ریڈنگ	....	قاری جاوید اختر، شیخ توحید احمد
نظرِ ثانی	....	قاضی عابد الدائم عابد
عکاسی	....	قاضی واجد الدائم (بھائی)، اختر، امجد
پبلشر	....	گلفراز احمد، علم و عرفان پبلشرز، لاہور
اہتمام اشاعت	....	محمد طاہر اکرم، گوجرانوالہ
مطبع	....	زاہدہ نوید پرنٹرز، لاہور
اشاعت اوّل	....	1996ء
اشاعت ششم	....	2012ء
ہدیہ فی جلد	....	-/700 رُوپے
مکمل سیٹ	....	-/2100 رُوپے

......ملنے کے پتے......

علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40۔ اُردو بازار، لاہور

اشرف بک ایجنسی

اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی

کتاب گھر

اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی

خزینہ علم و ادب

الکریم مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور

ویلکم بک پورٹ

اُردو بازار، کراچی

جہانگیر بکس

بوہڑ گیٹ، ملتان

رشید نیوز ایجنسی

اخبار مارکیٹ، اُردو بازار، کراچی

کشمیر بک ڈپو

تلہ گنگ روڈ، چکوال

شمع بک ایجنسی

بھوانہ بازار، فیصل آباد

رائل بک کمپنی

فضل داد پلازہ، اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی

سعید بک بنک

انتساب

والدِ مکرم ، حضرتِ معظم

قاضی محمد صدرالدین رحمۃ اللہ علیہ

کے نام!

جن کے فیضانِ نظر نے میرے دل کو درد آشنا کیا اور عشقِ مصطفیٰ سے سرشار کیا

اسی دردِ پنہاں کی تفسیر ہے---اسی عشقِ سوزاں کی تعبیر ہے

سرمایۂ جاں ہیں شہِ ابرار کی باتیں
کس درجہ سکوں دیتی ہیں سرکار کی باتیں
جی چاہے کہ ہر آن کروں ذکرِ پیمبر
ہوتی رہیں کونین کے سردار کی باتیں

صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمْ

فہرست

فہرست حواشی

باب ۱۰

محبوبِ رب ﷺ کے

حسنِ لازوال کا، جمالِ بے مثال کا اور عادات و خصال

کا دلکش و دلنشین تذکرہ

شمائل نبویہ

علی صاحبها الصلوۃ والتحیہ

وَ اَحْسَنُ مِنکَ لَمْ تَرَقَطُّ عَیْنِیْ وَ اَجْمَلُ مِنکَ لَمْ تَلِدِ النِّسَآء،
خُلِقْتَ مُبَرَّأً مِّنْ کُلِّ عَیْبٍ کَاَنَّکَ قَدْ خُلِقْتَ کَمَا تَشَآء،

(حضرت حسّان بن ثابت رضی اللہ عنہ)

ہے کلامِ الٰہی میں شمس و ضحیٰ، ترے چہرۂ نور فزا کی قسم
قسمِ شبِ تار میں راز یہ تھا کہ حبیب کی زُلفِ دوتا کی قسم
ترے خُلق کو حق نے عظیم کہا، تری خلق کو حق نے جمیل کیا
کوئی تجھ سا ہوا ہے، نہ ہوگا شہا! ترے خالقِ حُسن و ادا کی قسم

(اعلیٰ حضرت بریلویؒ)

(شمائل نبویہ کے مطالعہ سے پہلے جام عرفاں کی ایک رونمائی پڑھ لیجئے جس کے مطالعہ سے شمائل نبویہ کا لطف دوبالا ہو جائے گا۔)

سِرَاجًا مُّنِيرًا

قرآن کریم میں رب العالمین نے اپنے محبوب کو سراجًا مُّنِيرًا قرار دیا ہے۔ سِرَاج چراغ کو کہتے ہیں اور مُنِیر کے معنی ہیں نور دینے والا، روشنی پھیلانے والا۔ اس لحاظ سے سِرَاجًا مُّنِيرًا کا معنی ہوا چراغِ نور افشاں۔

بجلی کی ایجاد سے پہلے روشنی کے معروف ذرائع تین تھے---سورج، چاند اور چراغ---ان تینوں میں روشنی کا سب سے بڑا منبع سورج ہے۔ چاند کی روشنی اس سے بدرجہا کم ہے اور چراغ کی روشنی تو بہت مدھم اور محدود ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ کو چراغ کیوں کہا ہے---؟ اوّلاً تو آفتاب کہنا چاہئے تھا کہ نور وضیاء کی فراوانی جس طرح اس میں پائی جاتی ہے، کسی اور چیز میں نہیں پائی جاتی، نیز محبوب کے لئے خورشید کا استعارہ عربی ادب میں مروّج بھی ہے۔ ابن العمید نے ایک حیران کن منظر یوں بیان کیا ہے

قَامَتْ تُظَلِّلُنِیْ مِنَ الشَّمْسِ　　نَفْسٌ اَعَزُّ عَلَیَّ مِنْ نَفْسِیْ

قَامَتْ تُظَلِّلُنِیْ وَ مِنْ عَجَبٍ　　شَمْسٌ تُظَلِّلُنِیْ مِنَ الشَّمْسِ

(ایک ایسی ہستی جو مجھے اپنی جان سے بھی پیاری ہے، اس انداز سے کھڑی ہوئی کہ اس کا سایہ مجھ پر پڑنے لگا۔ یہ کیسا تعجب انگیز منظر ہے کہ سورج ہی مجھ پر سورج سے سایہ کر رہا ہے۔)

اگر کسی وجہ سے آفتاب نہیں کہا تو پھر چاند کہنا چاہئے تھا کیونکہ روئے محبوب کے لئے چودھویں کے چاند کا استعارہ تقریبًا ہر زبان میں رائج ہے۔ اہلِ مدینہ کا استقبالیہ نغمہ معروف ہے

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا　　مِنْ ثَنِيَّاتِ الْوَدَاعِ

آخر اس میں کیا راز ہے کہ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ نے اپنے محبوب کی مدح و ستائش کے لئے سورج چاند جیسے منابع نور کو چھوڑ کر چراغ کو پسند فرمایا اور سِرَاجاً مُنِیْرًا کے لقب سے نوازا---سورج اور چاند کی ضیاباریوں کے مقابلے میں چراغ کی ٹمٹماتی لَو کی حقیقت ہی کیا ہے؟

آیئے! آج اس سوال کا جواب تلاش کریں۔

ہر آدمی کا اپنا اپنا خیال ہوتا ہے، میرے خیال کے مطابق اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ چاند سے تشبیہ مناسب نہ تھی کیونکہ وہ بذات خود ایک غیر منوّر کرّہ ہے، اس کی تابانی سورج کی ضیاء پاشی کی مرہونِ منّت ہے، اگر سورج کی روشنی منقطع ہو جائے تو چاند کی درخشانی از خود ختم ہو جائے گی، جب کہ سرورِ دوعالم ﷺ کی نورانیت ذاتی ہے، کہ آپ ﷺ کی اوّلین تخلیق ہی نورانی ہے۔ جیسا کہ حدیث پاک میں آتا ہے ''اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِیْ'' (سب سے پہلے اللہ نے میرا نور پیدا فرمایا۔)

غرضیکہ آپ ﷺ کی نورانیت ذاتی ہے اور چاند کی عرضی۔ آپ ﷺ اپنے نور میں کسی اور مخلوق کے محتاج نہیں ہیں؛ جبکہ چاند، سورج کا محتاج ہے۔ اس بنا پر آپ ﷺ کو چاند کہنا مناسب نہ تھا۔

رہا سورج تو وہ اگرچہ بذاتِ خود منوّر ہے مگر اس کی روشنی میں اتنی تیزی اور حدّت ہے کہ آنکھیں اسے دیکھنے کی تاب نہیں لاسکتیں اور کوئی اسے دیکھنے کی کوشش کرے تو اس کی بینائی زائل ہو جانے کا خدشہ ہے؛ جبکہ سرکار ﷺ کے روئے ضیابار کے دیدار سے آنکھوں کو ٹھنڈک ملتی ہے، دل کو فرحت و انبساط حاصل ہوتا ہے اور دیکھنے والے کی روح خوشیوں اور مسرتوں کی ایسی رنگین وادیوں میں پہنچ جاتی ہے، جہاں ہر پریشانی ختم ہو جاتی ہے اور ہر غم معدوم ہو جاتا ہے۔ جس خاتون کا خاوند اور بیٹے جنگ میں شہید ہو گئے تھے، اس نے جانِ دوعالم ﷺ کے روئے منوّر کو دیکھ کر جو جملہ کہا تھا، وہ اسی کیفیت کا غماز ہے۔ اس نے کہا تھا

''کُلُّ مُصِیْبَۃٍ بَعْدَکَ جَلَلٌ، یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ!''

(آپ کا دیدار کر لینے کے بعد ہر مصیبت میرے لئے ہیچ ہے یا رسول اللہ!)

غرضیکہ خورشید کی روشنی کی حدت اور تیزی اس سے مانع ہے کہ آپ ﷺ کو اس سے تشبیہ دی جائے۔

علاوہ ازیں شمس وقمر کے ساتھ تشبیہ میں یہ خامی بھی ہے کہ یہ دونوں اپنے عشاق کی رسائی سے ماوراہیں، ان کا کوئی عاشق ان کے وصل کی لذتوں سے بہرہ یاب ہوسکتا ہے، نہ ان پر پروانہ وار نثار ہوسکتا ہے، جب کہ محبوبِ خدا ﷺ کے عُشاق اِن کے وصل سے شادکام بھی ہوتے تھے اور ان کے قدموں پر اس طرح فدا بھی ہوتے تھے، جس طرح چراغ پر پروانے۔

اس لحاظ سے چراغ کی تشبیہ نہایت موزوں ہے کہ وہ بذاتِ خود منوّر بھی ہے اور اس کے گرد پروانوں کا ہجوم بھی رہتا ہے، مگر اس تشبیہ میں بھی ایک کمی رہ جاتی ہے کہ چراغ کی روشنی انتہائی محدود اور کمزور سی ہوتی ہے، جب کہ آقائے عالم ﷺ کی ضوفشانی لامحدود اور بے انتہا ہے۔

تشبیہ کی اس کمی کو دور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ تدبیر فرمائی کہ اپنے کلام میں تین جگہ --- سورہ فرقان، سورہ نوح سورہ نبأ میں --- سورج کے لئے سراج کا لفظ استعمال فرمایا ہے --- وَجَعَلَ فِيهَا سِرَاجًا --- وَجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا --- سِرَاجًا وَّهَّاجًا --- تاکہ جب میرے محبوب کے لئے سراج کا لفظ بولا جائے تو سامع کا ذہن اس چراغ کی طرف منتقل نہ ہو، جس کی معمولی سی روشنی دس گز سے آگے نہیں بڑھ پاتی؛ بلکہ اس کے ذہن میں آفتاب عالمتاب کا تصور اُبھرے، لیکن آفتاب کے تصور کے ساتھ ہی اس کی حدت اور تیزی کا تصور بھی اُبھرتا ہے، اس کے دفعیہّ کے لئے اللہ تعالیٰ نے مُنِيرًا کا اضافہ فرما دیا۔ دوسری جگہ قمر (چاند) کی صفت بیان کی گئی ہے --- وَقَمَرًا مُّنِيرًا --- جب کہ سورج کے لئے یہ صفت کہیں نہیں بیان کی گئی، بالفاظ دیگر سورج کو سِرَاج کہا ہے، مُنِیر نہیں کہا اور چاند کو مُنِیر کہا ہے، سِرَاج نہیں کہا، مگر اپنے محبوب کے لئے دونوں کو جمع کر کے سِرَاجًا مُّنِيرًا فرمایا۔

یعنی میرا محبوب چراغ کی طرح بذاتِ خود منوّر تو ہے، مگر اس کی روشنی چراغ کی

طرح محدود نہیں ؛ بلکہ سورج کی طرح لامحدود ہے--- لامحدود تو ہے، مگر اس کی ضیاء سورج کی طرح ناگوار نہیں گزرتی ؛ بلکہ چاند کی چاندنی جیسی ٹھنڈک پہنچاتی ہے---ٹھنڈک تو پہنچاتی ہے مگر اس کی روشنی چاند کی طرح کسی اور سے مستفاد نہیں ہے ؛ بلکہ وہ چراغ کی طرح بذاتِ خود منور ہے--- چراغ کی طرح بذاتِ خود منور تو ہے .... الخ

سُبحان اللہ! کیا نورانی دائرہ ہے اور کیا لطیف پیرایۂ اظہار ہے۔!!

یوں اللہ تعالیٰ نے نور و ضیا کے تینوں ذرائع اپنے پیارے حبیب ﷺ کے لئے ثابت فرما کر ہمہ اقسام کے انوار اس مقدس سراپا میں ضم فرما دیئے۔

اور اس پر مستزاد یہ کہ محبوبِ خدا ﷺ شمس و قمر کی طرح عُشاق کی رسائی سے باہر نہیں ہے ؛ بلکہ چراغ کی طرح پروانوں کے ہجوم میں گھرا رہتا ہے--- ایسے پروانے کہ اس کے ایک اشارۂ ابرو پر اپنا سب کچھ لُٹا دینے کے لئے ہر دم تیار رہتے ہیں

جاں نثارانِ بدر و احد پر درود
حق گزارانِ بیعت پہ لاکھوں سلام

(رونمائی ختم ہوئی)

شمائل نبویہ

جانِ دو عالم ﷺ کے جمالِ بے مثال اور پیاری پیاری عادات و خصال کے تذکرے کو محدثین و سیرت نگار حضرات ''شمائل نبویہ'' کے عنوان سے تعبیر کرتے ہیں۔ بعض علماء نے اس دلآویز موضوع پر مستقل کتابیں تصنیف فرمائی ہیں اور بعض سیرت نگاروں نے اپنی مفصل و مبسوط کتب کا ایک قابلِ ذکر حصہ اس مقصد کے لئے مختص کیا ہے۔ ہم نے اس موضوع پر قلم اُٹھاتے وقت یوں تو متعدد کتب سے استفادہ کیا ہے لیکن تین کتابیں خصوصی طور پر پیشِ نظر رہیں۔

(۱) شفاء قاضی عیاضؒ مع شروح۔ (۲) شمائلِ ترمذیؒ مع شروح۔ (۳) مواہبِ لدنیہ کی کتاب اَلشمائل النبویہ مع شرح زرقانی، ج ۴۔ علاوہ ازیں علامہ شبلی کی سیرۃ النبی اور دورِ حاضر کے ایک محقق قلمکار مفتی محمد خان قادری کی تصنیف شہکار ربوبیت سے بھی فائدہ

حاصل کیا ہے۔

وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ، عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَ اِلَیْہِ اُنِیْبُ ؕ

''حُسن'' کیا ھے؟

قارئینِ کرام! حُسنِ مصطفیٰ ﷺ کا تذکرہ کرنے سے پہلے آیئے دیکھتے ہیں کہ جسے حُسن کہا جاتا ہے، وہ ہے کیا چیز؟

حیرت کی بات ہے کہ مفکرین آج تک حُسن کی کوئی تعریف متعین نہیں کرسکے۔ کوئی کہتا ہے کہ حُسن دیکھنے والے کی آنکھ میں ہوتا ہے۔ یعنی کسی آنکھ کو کوئی صورت اتنی بھا جاتی ہے کہ دیکھنے والا اس پر فریفتہ وشیدا ہو جاتا ہے؛ جبکہ وہی صورت کسی دوسری آنکھ کو سرے سے متاثر ہی نہیں کرتی۔

کوئی کہتا ہے کہ حُسن علاقائی شئے ہے اور ہر علاقے کا معیارِ حُسن مختلف ہوتا ہے۔ افریقہ کے علاقے میں زیادہ سے زیادہ کالا ہونا حُسن ہے؛ جبکہ باقی علاقوں میں سیاہ رنگ بدصورتی میں شمار کیا جاتا ہے۔

کوئی کہتا ہے کہ حُسن کا رنگ سے کوئی تعلق ہی نہیں؛ بلکہ اعضاء کی موزونیت اور تناسب کا نام حُسن ہے اور جس طرح وہائٹ بیوٹی WHITE BEAUTY ہوتی ہے، اسی طرح BLACK BEAUTY بھی ہوتی ہے۔

حُسنِ مصطفوی

غرضیکہ جتنے منہ اتنی باتیں، لیکن یہ اختلاف رائے عام انسانوں کے حُسن کے بارے میں تو ہوسکتا ہے، جہاں تک جانِ دوعالم ﷺ کا تعلق ہے تو ان کا حُسن اس بحث سے بالاتر اور ماوراء ہے کیونکہ آپ خالقِ حُسن و جمال کا اپنا انتخاب ہیں اور ظاہر ہے کہ جس خلاقِ اکبر کے علم میں دنیا و آخرت کے سارے حُسن متحضر ہوں اور وہ ان میں سے کسی ایک کو منتخب کرے تو وہ ''ایک'' بلاشبہ ساری مخلوقات میں یکتا و منفرد ہوگا اور حسن وخوبصورتی کی آخری انتہاء پر فائز ہوگا۔ اس کا کوئی ثانی ہوگا، نہ شریک۔ اس کی کوئی مثال ہوگی، نہ نظیر--- اور وُہی بے مثال و ممتنع النظیر ہستی اس یکتا اعزاز کی مستحق ہوگی کہ وحدہٗ لاشریک رب کی محبوب

قرار پائے اور بصد شانِ دلربائی اعلان فرمائے کہ---''اَلاَ، وَاَنَا حَبِیْبُ اللّٰہِ'' (آگاہ رہو کہ میں اللہ کا محبوب ہوں۔)

علامہ بوصیریؒ قصیدہ بُردہ میں اس حقیقت کو یوں بیان فرماتے ہیں:

مُنَزَّہٌ عَنْ شَرِیْکٍ فِیْ مَحَاسِنِہٖ

فَجَوْھَرُالْحُسْنِ فِیْہِ غَیْرُ مُنْقَسِمٖ

فَھُوَ الَّذِیْ تَمَّ مَعْنَاہُ وَصُوْرَتُہٗ

ثُمَّ اصْطَفَاہُ حَبِیْبًا بَارِئُ النَّسَمٖ

(یعنی رسول اللہ ﷺ اپنے حُسن میں شریک سے پاک ہیں اور آپ کا حُسن وہ جوہرِ فرد ہے جو ناقابل تقسیم ہے۔ آپ ہی وہ ہستی ہیں جو معنوی لحاظ سے بھی اور صوری لحاظ سے بھی تام اور مکمل ہیں، جبھی تو انسانوں کے خالق نے آپ کو اپنا محبوب منتخب کیا ہے۔)

علامہ زرقانیؒ نے پہلے مصرع کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے---اَیْ لَاشَرِیْکَ لَہٗ فِیْ حُسْنِہٖ. (یعنی تمام مخلوقات میں حُسن کے اعتبار سے آپ لاشریک ہیں۔)

مشہور مفسّر علامہ قرطبیؒ بعض علماء کے حوالے سے نقل کرتے ہیں کہ:

''لَمْ یَظْھَرْ لَنَا تَمَامُ حُسْنِہٖ ﷺ لِاَنَّہٗ لَوْظَھَرَ لَنَا تَمَامُ حُسْنِہٖ لَمَا اَطَاقَتْ اَعْیُنُنَا رُؤْیَتَہٗ.''

(یعنی ہمارے لئے آپ ﷺ کا مکمل حسن ظاہر ہی نہیں ہوا کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو ہماری آنکھیں آپ کے دیدار کی تاب نہ لاسکتیں۔)

واقعی، جو ذات والا صفات مظہرِ تجلیات الٰہیہ ہو اور بقول عارف گولڑوی جس صورت سے بے صورت ظاہر ہوا ہو، اس کی حقیقی تجلی کون برداشت کرسکتا ہے اور کس کا یارا ہے کہ اس کے دیدار کی تاب لاسکے---!!

تاہم جس قدر آپ ﷺ کا حسن دنیا پر ظاہر ہوا، اس کو بھی دیکھ کر ایک عالم محوِ حیرت رہ گیا اور آپ کے دیدار سے شادکام ہونے والا ایک عاشق بے ساختہ پکار اٹھا۔

وَاَحۡسَنُ مِنۡکَ لَمۡ تَرَقَطُّ عَیۡنِیۡ
وَاَجۡمَلُ مِنۡکَ لَمۡ تَلِدِ النِّسَآءُ

(آپ سے زیادہ حسین میری آنکھ نے کبھی نہیں دیکھا (بلکہ) آپ سے زیادہ حسین کسی ماں نے جنا ہی نہیں۔)

اس تخیل میں حسان الہند نے مزید رنگ بھرا اور یوں گویا ہوئے۔

لَمۡ یَأۡتِ نَظِیۡرُکَ فِیۡ نَظَرٍ، مثل تو نہ شُد پیدا جانا

(آپ کی نظیر کسی آنکھ نے دیکھی ہی نہیں، کیونکہ آپ کی مثال پیدا ہی نہیں ہوئی۔)

عنقریب ہم آپ کو محبوب رب العالمین کے جمالِ دلنشین کی چند دل افروز جھلکیوں کا نظارا کرائیں گے لیکن پہلے ایک اہم نکتہ ذہن نشین کر لیجئے!

حسن کے دو پہلو ہیں---صباحت اور ملاحت۔صباحت ''صُبۡحٌ'' سے مشتق ہے، یعنی صبح کی طرح روشن و تابناک ہونا۔ملاحت ''مِلۡحٌ'' (نمک) سے ماخوذ ہے، یعنی نمک جیسا نمکین اور سلونا ہونا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا حُسن ''حُسنِ صبیح'' تھا اور روشنی اور تابانی میں اپنی مثال آپ تھا مگر اس میں جاذبیت اور دلکشی نسبتاً کم تھی۔اسی لئے ان کے حُسن سے غیر معمولی طور پر متأثر صرف خواتین ہوئیں، کسی مرد پر اتنا شدید اثر نہیں ہوا؛ جبکہ جانِ دو عالم ﷺ کا حُسن ''حُسنِ ملیح'' تھا اور اس کے جذب و کشش کا یہ عالم تھا کہ کیا مرد، کیا عورتیں، کیا جوان، کیا بوڑھے، کیا بچے، کیا بچیاں، کیا حبشی، کیا رومی، کیا عربی، کیا عجمی---غرضیکہ ہر صنف آپ کے حُسن سے مسحور نظر آتی ہے اور ہر نوع آپ کے عشق میں مخمور دکھائی دیتی ہے۔

سچ کہا ہے اعلیٰ حضرت نے

حُسن کھاتا ہے جس کے نمک کی قسم وہ ملیحِ دِل آرا ہمارا نبی

اسی حقیقت کو جانِ دو عالم ﷺ نے یوں واضح فرمایا

''اَخِیۡ یُوۡسُفُ اَصۡبَحُ وَاَنَا اَمۡلَحُ'' (میرے بھائی یوسف صبیح زیادہ ہیں اور میں ملیح زیادہ ہوں۔)

یعنی یہ نہیں کہ یوسف صرف صبیح تھے اور ملاحت نام کو نہ تھی۔ اسی طرح میں بھی ملیح محض نہیں کہ صباحت بالکل نہ پائی جائے؛ بلکہ ہم دونوں صبیح بھی ہیں اور ملیح بھی؛ البتہ میرے بھائی یوسف کی صباحت نمایاں تھی اور میری ملاحت زیادہ ہے۔

اس فرمانِ نبوی کی ترجمانی کا حق ادا کر دیا اعلیٰ حضرت بریلویؒ نے، جب ان کی زبان پر یہ بلاغت پارہ رواں ہوا۔

حسنِ یوسف پہ کٹیں مصر میں انگشتِ زناں
سر کٹاتے ہیں ترے نام پہ مردانِ عرب (۱)

صباحت و ملاحت کا فرق واضح ہو جانے کے بعد یہ بھی جان لیجئے کہ ان دونوں کی

---

(۱) اس شعر میں ''صنعتِ تضاد'' نے جو غیر معمولی حُسن اور بانکپن پیدا کر رکھا ہے، اسے سمجھنے کے لئے جناب غلام مصطفیٰ مجددی کی درج ذیل تشریح پڑھئے اور لطف اٹھایئے!

''صنعتِ تضاد

کسی شاعر کا اپنے کلام میں ایسے الفاظ لانا جو آپس میں ایک دوسرے کی ضد ہوں 'صنعتِ تضاد کہلاتا ہے۔ مثلاً زمین و آسماں، آگ اور پانی، صبح و شام، دن اور رات وغیرہ۔

درج ذیل دو اشعار پر غور کیجئے، ان میں صنعتِ تضاد نے شعری فکر کو کتنا رسا اور پر اثر بنا دیا ہے۔

وہ اٹھے ، درد اٹھا ، حشر اٹھا
مگر دل ہے کہ بیٹھا جا رہا ہے

اس شعر میں ''اُٹھا'' اور ''بیٹھا'' کے الفاظ تضاد کی مثال ہیں۔

جو آکے نہ جائے ، وہ بڑھاپا دیکھا
جو جاکے نہ آئے وہ جوانی دیکھی

اس شعر میں صنعتِ تضاد کی تین وجوہات ہیں۔ ''آکے'' کا ''جاکے'' ''جائے'' کا ''آئے'' اور ''بڑھاپا'' کا ''جوانی'' الٹ ہے۔ ایک شعر میں سہل ممتنع کے ساتھ تضاد کی تین وجوہات کو بیان کرنا واقعی مہارت شعری کی دلیل ہے۔

اثر انگیزی کی نوعیت بھی مختلف ہے۔ صباحت، انتہائی شدت اور زور سے یکبارگی اثر انداز ہوتی ہے مگر اس میں گہرائی کی کمی ہوتی ہے؛ جبکہ ملاحت نہایت ہی شیریں اور دھیمے دھیمے انداز میں اثر کرتی ہے اور دل کی گہرائیوں میں اترتی چلی جاتی ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا حسن صبیح سارے عالم میں ضرب المثل ہے۔ یہ بھی طے شدہ بات ہے کہ ان کے حسن سے بہت زیادہ متاثر اِمْرَأَةُ الْعَزِيْز (عزیز مصر کی بیوی) ہوئی تھی مگر ---''یوسف زلیخا'' کے عنوان سے عجمی زبانوں میں چھپنے والی عشقیہ داستانوں

''صنعتِ تضاد'' کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینے کے بعد آیئے، اب اعلیٰ حضرت بریلوی کے مندرجہ بالا شعر پہ بحث کرتے ہیں۔ الحمد للہ! راقم الحروف کو شعر وسخن سے خصوصی لگاؤ ہے۔ میرؔ، دردؔ، غالبؔ، ذوقؔ، آتشؔ، داغؔ، جگرؔ، سیمابؔ، حسنؔ، اخترؔ، جوشؔ، ندیمؔ، ناصرؔ اور ساغرؔ جیسے شعراء کا کلام پڑھا ہے، میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ کسی استاد نے بھی اپنے کسی شعر میں صنعتِ تضاد کی اتنی وجوہات پیش نہیں کیں، جتنی اعلیٰ حضرت بریلوی نے اپنے اس شعر میں کی ہیں۔

''حسن یوسف پہ کٹیں مصر میں انگشتِ زناں
سر کٹاتے ہیں ترے نام پہ مردانِ عرب''

اس عظیم شعر میں تضاد کی پانچ وجوہات تو ظاہر ہیں اور ایک پوشیدہ۔ کل چھ وجوہات ہوئیں۔ آیئے، اب ان وجوہات کا فرداً فرداً جائزہ لیتے ہیں۔

(۱) ---اِدھر ''حسن'' ہے اور اُدھر ''نام''۔ یعنی اِدھر یوسف کو دیکھا تو بے خودی و وارفتگی، ہوش پہ غالب ہوئی، اُدھر حسنِ مصطفیٰ کا دیدار تو بہت ہی بڑی نعمت وسعادت ہے، آپ کا نامِ پاک بھی آ جائے تو شمع رسالت کے پروانے سر کٹانے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔

(۲) ''کٹیں'' اور ''کٹانے'' میں تضاد کے دو پہلو ہیں

[الف] ---''کٹیں'' کا لفظ ظاہر کرتا ہے کہ عہد رفتہ میں بس ایک بار ایسا ہوا تھا کہ مصر کی عورتوں نے اپنی انگلیاں کاٹ لی تھیں، پھر کبھی ایسا واقعہ رونما نہیں ہوا۔ اگر ہوتا تو قرآن وحدیث یا تاریخ و آثار اس پر گواہی دیتے۔ مگر ''سر کٹاتے ہیں'' کا جملہ فعل مضارع ہے اور مضارع میں دوام واستمرار پایا جاتا ہے۔ یعنی نامِ مصطفیٰ پہ مشتاقانِ مصطفیٰ ہر دور میں اپنا سر کٹاتے رہے ہیں اور قیامت تک کٹاتے رہیں گے۔

سے قطع نظر---انتہائی افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے جب اس کی خواہشات کے آگے سر نہ جھکایا تو اس نے بالائی طبقے کی نمائندہ خواتین کے اجتماع میں سرِ عام یہ اعلان کر دیا کہ:

﴿لَئِنۡ لَّمۡ يَفۡعَلۡ مَاۤ اٰمُرُهٗ لَيُسۡجَنَنَّ وَلَيَكُوۡنًا مِّنَ الصّٰغِرِيۡنَ۝﴾

[ب]---''کٹیں'' سے عیاں ہے کہ زنانِ مصر کی انگلیاں بے اختیار کٹ گئیں، کاٹنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا؛ جبکہ ''سر کٹاتے ہیں'' سے اہلِ محبت کا عزم وارادہ پوری طرح آشکارا ہے۔یعنی بے اختیار نہیں؛ بلکہ وہ جان بوجھ کر سر کٹاتے آرہے ہیں۔

(۳)---اِدھر ''مصر'' ہے کہ جس کے لوگ حسن آشنا، نازک خیال اور خوبی جاناں پہ جان چھڑکنے والے تھے۔اُدھر ''عرب'' ہے۔ایک خشک صحرا، جس کے لوگ وحشت وبربریت اور سرکشی وترش روئی میں مشہور ہیں۔مصر کے نرم مزاج لوگ حسن کو دیکھ کر پگھل جائیں تو کمال ضرور ہے مگر اس سے بڑا کمال یہ ہے کہ عرب کے سنگدل لوگ محبوبِ خدا کا صرف نام سن کر ہی فدا ہونے کے لئے تیار ہو جائیں؛ بلکہ فدا ہو جائیں۔

(۴)---اِدھر صرف ''انگلیاں'' کٹیں، اُدھر ''سر'' کٹائے جارہے ہیں۔انگشت وسر میں جو فرق ہے وہ کسی سے چھپا ہوا نہیں ہے۔

(۵)---اِدھر ''عورتیں'' ہیں---وہ بھی علاقہ مصر کی، جو آدابِ عشق ومحبت سے پوری طرح واقف تھیں اور اس قسم کی مجالس حسن وعشق منعقد کرتی رہتی تھیں۔اُدھر ''مرد'' ہیں---وہ بھی خطۂ عرب کے، جو دردِ محبت سے قطعی بیگانہ تھے۔خون آشام تلواروں کے سائے میں پل کر جوان ہوتے تھے اور ساری عمر کشت وخون میں گزار دیتے تھے، مگر جب محبوب خدا ﷺ کے نام کا فیضان شامل حال ہوا تو سرفروشی کے طریقے سیکھ گئے۔

گویا اعلیٰ حضرت بریلوی نے ایک شعر میں صنعتِ تضاد کی پانچ وجوہات ظاہری اور ایک وجہ باطنی (کل چھ وجوہات) سمو کر نہ صرف نعت مصطفیٰ کو اچھوتے رنگ میں بیان کر دیا ہے؛ بلکہ اردو ادب پر بھی ایک احسان فرمایا ہے۔'' (بشکریہ مجلہ ''الحسن'' پشاور)

(اگر اس نے وہی کچھ نہ کیا جس کا میں اسے حکم دیتی ہوں تو اس کو لازماً قید کر دیا جائے گا اور وہ ذلیل وخوار ہوگا۔) اَسْتَغْفِرُ اللہ!

کیا آپ مدنی ملیح ﷺ کے شیدائی کسی مرد یا عورت سے تصور کر سکتے ہیں کہ اس کے دل میں اپنے محبوب آقا کے بارے میں ایسا کوئی خیال بھی گزرے؟ زبان سے کہنا ---اور بھرے مجمع میں کہنا تو بہت دور کی بات ہے۔

ایک دلخراش منظر یہ بھی دیکھتے جایئے۔

جب حضرت یوسف علیہ السلام دعوت گناہ سے بمشکل جان بچا کر دامانِ دریدہ کے ساتھ بند کمروں سے باہر نکلے تو امراۃ العزیز کا خاوند سامنے کھڑا تھا۔ یہ دیکھ کر امراۃ العزیز جھٹ الزام تراشی پر اتر آئی اور حضرت یوسف علیہ السلام جیسے معصوم اور بے گناہ نوجوان پر بے دھڑک تہمت جڑ دی کہ اس نے مجھ سے دست درازی کی کوشش کی ہے:

﴿قَالَتْ مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا اِلَّآ اَنْ يُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۝﴾

(کہنے لگی---"کیا سزا ہے اس شخص کی جس نے تیری بیوی کے ساتھ برائی کا ارادہ کیا، سوائے اس کے کہ اسے قید کر دیا جائے، یا کوئی دردناک عذاب دیا جائے۔)

اللہ اکبر---! ایک طرف عزیز مصر کی بیوی اپنے "محبوب" کو قید کرنے اور عذاب الیم میں مبتلا کرنے کی خواہش ظاہر کر رہی ہے اور دوسری طرف یہ ایمان افروز نظارا کیجئے کہ نمکین حسن والے عربی محبوب کے ایک عاشق کو صلیب پر چڑھا دیا گیا ہے اور اس کے جسم کو تیروں اور نیزوں سے چھلنی کیا جا رہا ہے۔ اس حالت میں ایک ستمگر اس سے پوچھتا ہے

"سچ بتا! اگر آج تو بچ جاتا اور تیری جگہ محمد کو قتل کر دیا جاتا تو کیا تیرے خیال میں بہتر نہ ہوتا؟!"

اگرچہ اس وقت اس کے جسم سے لہو کے فوارے ابل رہے تھے اور وہ ناقابل برداشت کرب واذیت سے دوچار تھا مگر فوراً جواب دیا---"وَاللہِ الْعَظِیْم! مجھے تو یہ بھی گوارا نہیں کہ میری جان کے بدلے محمد ﷺ کے پاؤں میں کوئی کانٹا بھی چبھے۔"(۱)

---

(۱) ملاحظہ ہو، حکایاتِ صحابہ، از مولانا محمد زکریا سہارنپوری۔ واقعہ شہادت حضرت خبیب رضی اللہ عنہ اور واقعہ شہادت حضرت زید رضی اللہ عنہ، ص ۷۱۔

یہ فرق ہے شیدائیانِ حسنِ صبیح اور فریفتگان حسنِ ملیح کا---! ﷺ

آیئے تاریخ وسیرت کے جھروکوں سے اس ملیح دلآرا کے جمال بے مثال کی ایک جھلک دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن واضح رہے کہ یہاں جو کچھ ذکر کیا جائے گا وہ زیادہ تر صباحت کے زمرے میں آتا ہے، کیونکہ ملاحت تو ایک کیفیت کا نام ہے، جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ پھول کی شکل وصورت اور اس کی کلیوں، پتیوں اور رنگ روپ کی تفصیلات تو بیان کی جاسکتی ہیں مگراس کی من بھاتی خوشبو کی نوعیت بیان کرنے کے لئے کوئی الفاظ کہاں سے لائے---!!

رُوئے ضیا بار و پُر انوار

حسین ترین تھا

جانِ دو عالم ﷺ کا دیدار کرنے والے اس پر متفق ہیں کہ آپ کا روئے انور سارے عالم سے زیادہ خوبصورت تھا۔

حضرت ام المؤمنین عائشہؓ اور حضرت علیؓ دونوں بیان کرتے ہیں کہ---"کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اَحْسَنَ النَّاسِ وَجْھًا." (رسول اللہ ﷺ کا چہرہ سارے لوگوں سے زیادہ حسین تھا۔)

سرخ و سفید تھا

ابو طالب نے جانِ دو عالم ﷺ کی مدح میں ایک طویل قصیدہ کہا تھا جس کا یہ مصرعہ مشہور عالم ہے۔

"وَاَبْیَضُ یُسْتَسْقَی الْغَمَامُ بِوَجْھِہٖ"

(وہ سفید رنگ والا، جس کے توسل سے بارش طلب کی جاتی ہے۔)

حضرت ابو الطفیلؓ کہتے ہیں "اَبْیَضُ، مَلِیْحُ الْوَجْہِ." (سفید رنگ والے، نمکیں چہرے والے۔)

صرف سفیدی ہی نہ تھی، اس میں سرخی کی بھی انتہائی متناسب آمیزش تھی۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں --- ''اَبْیَضُ، مُشْرَبٌ بِحَمْرَۃٍ'' (آپ کا رنگ سفید تھا، جس میں سرخی ملی ہوئی تھی۔)

بالفاظِ دیگر سرخی مائل سفید تھا۔

آئینے جیسا تھا

روئے دلآویز بے حد شفاف تھا؛ خصوصاً خوشی اور مسرت کے موقعہ پر یہ شفافیت اتنی بڑھ جاتی تھی کہ آس پاس کی چیزیں اس میں جھلکتی معلوم ہوتی تھیں۔

''کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اِذَا سُرَّفَکَاَنَّ وَجھَہٗ اَلْمِرْاٰۃُ وَکَاَنَّ الْجُدُرَ تُلَاحِکُ وَجْھَہٗ ﷺ.''

(رسول اللہ ﷺ جب مسرور ہوتے تھے تو آپ کا چہرہ آئینے کی طرح دمکتا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے اس میں اردگرد کی دیواروں کا عکس اتر آیا ہو۔)

روشن تھا

اُمِ معبد وہ خوش نصیب خاتون تھیں، جن کے خیمے میں جان دو عالم ﷺ تھوڑی دیر ٹھہرے تھے اور ان کی ایک لاغر اور سوکھی بکری کے تھنوں پر ہاتھ پھیرا تھا تو اتنا دودھ اتر آیا تھا کہ سب سیر ہوگئے تھے اور برتن بھر گئے تھے۔ بعد میں جب امِ معبد کا خاوند باہر سے واپس آیا تو اس کے سامنے اُمِ معبد نے جانِ دو عالم ﷺ کا جو حلیہ بیان کیا تھا، اس میں یہ الفاظ بھی ہیں:

''ظَاھِرُ الْوَضَاءَ ۃِ اَبْلَجُ الْوَجْہِ.''

(نمایاں حسن والے، روشن چہرے والے۔)

بہرحال آپ کے چہرے کا روشن و درخشاں ہونا تو مسلم ہے لیکن اس روشنی کی کیفیت اجاگر کرنے میں صحابہ کرام کا اندازِ بیاں مختلف ہے۔

چاند جیسا تھا

اکثر واصفانِ حسن مصطفوی نے آپ کے روئے منور کو چاند سے تشبیہہ دی ہے۔

حضرت ہند ابن ابی ہالہؓ کہتے ہیں --- ''یَتَلَألَؤُ وَجْھَہٗ تَلَألُؤَ الْقَمَرِ لَیْلَۃَ

الْبَدْرِ. ''(آپ کا چہرہ یوں چمکتا تھا جیسے چودھویں رات کا چاند۔)

ایک خاتون کو جانِ دو عالم ﷺ کی معیت میں حج کرنے کی سعادت حاصل ہوئی تھی۔ وہ ایک مرتبہ ان مبارک گھڑیوں کا تذکرہ کر رہی تھیں اور لوگوں کو جانِ دو عالم ﷺ کے طواف و استلام کے بارے میں بتا رہی تھیں کہ مشتاقانِ جمال نبوی میں سے کسی نے کہا ''ذرا تشبیہ دے کر واضح کیجئے کہ اس وقت رسول اللہ ﷺ کیسے لگ رہے تھے؟''

انہوں نے جواب دیا ---''كَالْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ، لَمْ اَرَ قَبْلَه' وَلَا بَعْدَه' مِثْلَه'. ''(چودھویں رات کے چاند کی طرح۔ میں نے ان جیسا پہلے کوئی دیکھا، نہ بعد میں۔)

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ:

''لَمْ يَصِفْهُ وَاصِفٌ قَطُّ اِلَّا شَبَّهَه' بِالْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ. ''

(جس کسی نے بھی آپ کا وصف بیان کیا، اس نے آپ کو چودھویں رات کے چاند سے تشبیہ دی۔)

چاند کا ٹکڑا تھا

فرحت و سرور کے وقت روئے انور کی تابانی میں اضافہ ہو جاتا تھا اور بالکل چاند کا ٹکڑا لگتا تھا۔

حضرت کعبؓ فرماتے ہیں ---كَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اِذَا سَرَّ اِسْتَنَارَ وَجْهُه' كَاَنَّه' قِطْعَةُ قَمَرٍ. ''(رسول اللہ ﷺ جب کسی بات پر خوش ہوتے تو آپ کا چہرہ یوں دمک اٹھتا تھا جیسے چاند کا ٹکڑا ہو۔)

ممکن ہے آپ سوچیں کہ چاند کا ٹکڑا تو چاند کا ایک حصہ ہوتا ہے اور اس سے بہت چھوٹا ہوتا ہے، پھر اس کے ساتھ تشبیہ دینے سے زیادہ تابانی و درخشانی کا مفہوم کیسے پیدا ہو جاتا ہے؟

عقلی طور پر تو یہ بات بالکل درست ہے لیکن ذوق و وجدان کے لحاظ سے ''چاند کا ٹکڑا'' میں زیادہ مبالغہ ہے۔ یہ ایک سر بسر ذوقی معاملہ ہے اس لئے میں اس کی وجہ بیان

کرنے سے قاصر ہوں؛ تاہم اتنا تو ہر اردو دان بھی سمجھ سکتا ہے کہ ''زید میرا جگر ہے'' میں وہ بات نہیں جو ''زید میرے جگر کا ٹکڑا ہے'' میں پائی جاتی ہے۔

غرضیکہ اکثر واصفانِ جمال نبوی نے جانِ دو عالم ﷺ کے ضیاء بار چہرے کو چاند سے تشبیہ دی ہے---کسی نے چاند جیسا کہا، کسی نے چودھویں رات کے چاند جیسا اور کسی نے چاند کا ٹکڑا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیائے محبت میں روئے محبوب کے حسن و جمال اور اس کی چمک دمک کو اجاگر کرنے کے لئے چاند سے بہتر تشبیہ کوئی نہیں، کیونکہ اس کی روشنی ٹھنڈک، فرحت اور سکون کا تأثر لئے ہوئے ہوتی ہے اور آنکھوں کو بہت بھلی معلوم ہوتی ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ چاند کا رنگ زرد ہوتا ہے اور اس کی روشنی میں بھی پیلاہٹ پائی جاتی ہے؛ جبکہ جانِ دو عالم ﷺ کا چہرہ سرخی مائل سفید تھا اور زردی اس میں نام کو نہ تھی۔

شاید اسی وجہ سے بعض صحابہؓ نے اس تشبیہ سے گریز کیا ہے اور سورج سے تشبیہ دی ہے۔

سورج جیسا تھا

حضرت ربیع بنتِ معوذؓ سے کسی نوجوان نے مطالبہ کیا کہ مجھے رسول ﷺ کے بارے میں کچھ بتایئے!

انہوں نے جواب دیا---''یَابُنَیَّ! لَوْرَأَیْتَه' رَأَیْتَ الشَّمْسَ طَالِعَةً.''

(بیٹے! اگر تو نے انہیں دیکھا ہوتا تو تجھے یوں دکھائی دیتا جیسے آفتاب طلوع ہو رہا ہو۔)

لیکن اس تشبیہ میں یہ الجھن ہے کہ سورج کی طرف دیکھنے سے آنکھوں کو تکلیف ہوتی ہے؛ جبکہ روئے مصطفیٰ ﷺ کے دیدار سے آنکھیں لطف اٹھاتی تھیں اور راحت پاتی تھیں۔

شاید اسی خامی کی وجہ سے حضرت ابو ہریرہؓ نے اس تشبیہ کا انداز بدل دیا اور بالکل اچھوتا تخیل پیش کیا۔

انہوں نے فرمایا---''کَاَنَّ الشَّمْسَ تَجْرِیْ فِیْ وَجْهِهٖ.'' (یوں لگتا تھا جیسے سورج آپ کے چہرے میں جاری و ساری ہو۔)

سورج چاند جیسا

حضرت جابر بن سمرہؓ نے آفتاب و مہتاب پر غور کیا تو انہوں نے محسوس کیا کہ نہ تنہا چاند آپ کے روئے منور کی صحیح ترجمانی کرتا ہے، نہ اکیلا سورج۔ اس لئے انہوں نے دونوں کو جمع کر دیا اور فرمایا---"مِثْلَ الشَّمْسِ وَالْقَمَرِ." (سورج چاند جیسا چہرہ تھا۔)

یعنی تابانی و درخشانی سورج جیسی تھی اور دلکشی و نظر نوازی چاند جیسی۔

اللہ اکبر---! کیسے سچے عاشق تھے وہ لوگ کہ خود بھی اپنے محبوب آقا ﷺ کے روئے دلآویز کے تصور میں کھوئے رہتے تھے اور دوسروں کو بھی اس کے بارے میں بتاتے رہتے تھے۔ انہیں یہ بھی احساس تھا کہ ہمیں تو اس روئے پرانوار کے دیدار کی سعادت حاصل ہے مگر بعد میں آنے والوں کو اس کے حسن وخوبصورتی سے کیسے آگاہ کیا جائے ---! اس مقصد کے لئے وہ آنکھوں سے دکھائی دینے والی چیزوں میں سے انتہائی روشن و تابناک اور حسین و جمیل اشیاء کا انتخاب کرتے ہیں اور پھر اپنے اپنے انداز میں روئے محبوب خدا کو ان سے تشبیہ دیتے ہیں تاکہ جن لوگوں نے وہ عالمتاب چہرہ نہیں دیکھا، انہیں پورے طور پر نہ سہی، کسی حد تک تو اندازہ ہو جائے کہ جس سوہنے مکھڑے پر ہم مرمٹے تھے، وہ کیسا تھا---!!

یہ مقصد نہیں تھا کہ روئے مصطفیٰ ﷺ کا شمس و قمر سے موازنہ کیا جائے --- موازنے کی گنجائش ہی کہاں تھی، کہ شمس و قمر تو خود نورِ مصطفیٰ ﷺ وسلم سے مستنیر ہیں --- اصل و فرع میں کیا مشابہت اور منیر و مستنیر میں کیا مماثلت---!!

یہ جو مہرومہ پہ ہے اطلاق آتا نور کا
بھیک تیرے نام کی ہے، استعارہ نور کا

ہاں، کبھی کبھی دوسروں کو سمجھانے کے لئے کم تر چیزوں سے بھی تشبیہ دینا پڑ جاتی ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے نور کی مثال روغنِ زیتون سے جلنے والے اس چراغ سے دی ہے جو طاق میں شیشے کے اندر رکھا ہو۔ ورنہ کہاں نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْض کا نور اور کہاں چراغ کی مدھم سی لَو---!

اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لئے حضرت جابر بن سمرہؓ اپنا ایک ایمان افروز مشاہدہ بیان کرتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ ایک رات چاند پوری طرح تاباں و درخشاں تھا۔ ہر طرف چاندنی چھٹکی ہوئی تھی اور تاریکی کا کہیں نام ونشان تک نہ تھا۔ اس منور فضا میں اچانک میری نظر رسول اللہ ﷺ پر پڑی۔ اس وقت آپ نے سرخ چادر اوڑھ رکھی تھی اور بہت ہی حسین لگ رہے تھے، ''فَجَعَلْتُ اَنْظُرُ اِلَيْهِ وَاِلَى الْقَمَرِ.'' میں کبھی رسول اللہ ﷺ کو دیکھتا تھا، کبھی چاند کو۔ ''فَلَهُوَ اَحْسَنُ عِنْدِیْ مِنَ الْقَمَرِ.'' رب کی قسم! میرے خیال میں وہ چاند سے بدرجہا حسین تھے۔

اعلیٰ حضرت بریلویؒ کی فصاحت و بلاغت سے کس کو انکار ہوسکتا ہے! دلچسپ بات یہ ہے کہ انہیں ایک طرف تو یہ اعتراف ہے کہ جانِ دو عالم ﷺ کے رخساروں کے سامنے چاند کی تابانی ماند پڑ جاتی تھی اور اس کا چراغ جھلملانے لگتا تھا۔

جن کے آگے چراغِ قمر جھلملائے
ان عذاروں کی طلعت پہ لاکھوں سلام

بلکہ ان کے نزدیک تو سورج بھی آپ کے روئے پرنور کے روبرو بے نور ہو جاتا تھا۔

خورشید تھا کس زور پر، کیا بڑھ کے چمکا تھا قمر
بے پردہ جب وہ رُخ ہوا، یہ بھی نہیں وہ بھی نہیں

مگر آپ حیران ہوں گے کہ اس کے باوجود وہ آپ کے چہرۂ انور کو چاند ہی سے تشبیہہ دیتے ہیں۔

چاند سے منہ پہ تاباں درخشاں درود
مِلح آ گیں صباحت پہ لاکھوں سلام

اس کی وجہ یہ ہے قارئینِ کرام! کہ انہوں نے دوسرے مصرعہ میں اس خامی کو رفع کر دیا ہے، جو چاند کے ساتھ تشبیہہ دینے کی صورت میں پیدا ہوتی ہے، یعنی زردی اور

پیلاہٹ کا تأثر۔ کیونکہ انہوں نے قافیے کے طور پر صباحت کا لفظ استعمال کیا ہے جس کا مفہوم صبح کی طرح روشن ہونا ہے۔ ظاہر ہے کہ صبح کی روشنی میں زردی کی کوئی جھلک نہیں ہوتی، مگر صباحت چونکہ عام طور پر ملاحت کے مقابلے میں ذکر کی جاتی ہے، اس لئے اس احتمال کے پیش نظر کہ کسی کا ذہن صباحت بے ملاحت کی طرف نہ چلا جائے، انہوں نے ایک نئی ترکیب ایجاد کی جس کا صوتی اور معنوی حسن اپنی مثال آپ ہے۔ یعنی ''مَلیح آ گیں صباحت'' ---ایسی صباحت جس میں نمک کی آمیزش ہو۔ دوسرے لفظوں میں نمکین اور سلونی صباحت۔

سبحان اللہ! کیا کیا لطافتیں پائی جاتی ہیں اس ایک شعر میں!

یہ ساری لطافتیں یکجا کردی جائیں تو پھر چاند سے تشبیہہ دینے میں کوئی حرج نہیں؛ بلکہ اس صورت میں چاند سے بہتر کوئی تشبیہہ ہے ہی نہیں---خصوصاً جب یہ لطافت بھی ملحوظ ہو کہ چاند کی تابانی و درخشانی کی مناسبت سے روئے تاباں و درخشاں پر درود بھی تاباں و درخشاں ہی بھیجا جارہا ہو۔

حقیقی روشنی

واضح رہے کہ جانِ دو عالم ﷺ کے روئے انور کی چمک دمک کو آفتاب و مہتاب سے تشبیہہ دینا تمثیلی نہیں؛ بلکہ حقیقی ہے۔ یعنی یہ اس طرح کی تشبیہہ نہیں جیسے عام طور پر محبوب کے چہرے کو چاند سورج سے تشبیہہ دی جاتی ہے اور اسے مخاطب کر کے کہا جاتا ہے--- چودھویں کا چاند ہو یا آفتاب ہو۔

کیونکہ عام محبوب کا چہرہ، خواہ کیسا ہی حسین کیوں نہ ہو، اس سے روشنی نہیں پھوٹتی، نہ اس سے اجالا پھیلتا ہے۔ جبکہ محبوبِ خدا ﷺ کا چہرہ حقیقۃً ضیا بار و نور افشاں تھا اور اس کی روشنی سے اندھیرے اجالوں میں بدل جاتے تھے۔

اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ایک دفعہ مجھ سے اندھیرے میں سوئی کھوگئی۔ میں اس کو ڈھونڈ رہی تھی، مگر تاریکی کی وجہ سے مل نہیں رہی تھی۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ منہ پر کپڑا ڈالے آرام فرما رہے تھے۔ چنانچہ میں نے آپ کے

رخ انور سے پردہ ذرا سا ہٹایا

فَتَبَيَّنَتِ الْاِبْرَةُ بِشُعَاعِ وَجْهِ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ. تو آپ کے نورانی چہرے سے پھوٹنے والی کرنوں کی وجہ سے سوئی نمایاں نظر آنے لگی۔

کبھی کبھی تو تجلیات الٰہیہ کے بکثرت ورود وظہور کی وجہ سے چہرہ مبارک اتنا نور افشاں ہو جاتا تھا کہ اس کی طرف دیکھنا مشکل ہو جاتا تھا۔

حضرت حسان بن ثابتؓ نے شاید کسی ایسے ہی موقعہ پر آپ ﷺ کا دیدار کیا تھا، کہ وہ فرماتے ہیں

''لَمَّا نَظَرْتُ اِلىٰ اَنْوَارِهٖ ﷺ وَضَعْتُ كَفِّىْ عَلىٰ عَيْنَىَّ خَوْفًا مِّنْ ذَهَابِ بَصَرِىْ.''

(جب میں نے رسول اللہ ﷺ کے انوار کو دیکھا تو اپنی آنکھوں پر ہتھیلی رکھ لی کہ کہیں میری بصارت ہی زائل نہ ہو جائے۔)

تاہم یہ کیفیت کبھی کبھار ہوتی تھی ورنہ عام طور پر لوگ بے تکلف آپ کے روئے دلآویز کا دیدار کرتے تھے اور محظوظ ہوتے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ جن صحابہ کرامؓ نے آپ کے روئے منور کو سورج سے تشبیہ دی ہے، انہوں نے ایسے ہی کسی موقع کی عکاسی کی ہو!

قارئینِ کرام! ابھی تک تو جانِ دو عالم ﷺ کے روئے ضیا بار کے مجموعی اور اجمالی حسن کا بیان ہوا ہے۔ اب ہم ان اجزاء پر گفتگو کرتے ہیں جن سے چہرہ بنتا ہے۔ یعنی پیشانی، آنکھیں، رخسار، ناک اور ہونٹ وغیرہ۔

جبینِ دلنشین

چہرے کا نمایاں حصہ انسان کی پیشانی ہے۔ کشادہ، ہموار اور چمکدار ماتھا خوبصورتی اور بلند اقبالی کی علامت ہے، جب کہ تنگ، پچکی ہوئی یا باہر کو ابھری ہوئی اور دھندلائی ہوئی پیشانی بدصورتی اور بدنصیبی کی نشانی ہے۔

جانِ دو عالم ﷺ کی جبینِ حسین کشادہ اور ہموار تھی۔ حضرت ہند ابن ابی ہالہؓ نے آپ کو ''وَاسِعُ الْجَبِيْن'' کہا ہے اور حضرت ابو ہریرہؓ نے ''مُفَاضُ الْجَبِيْن'' معنی

دونوں کا ایک ہی ہے۔یعنی کشادہ پیشانی والے۔

حضرت سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں

''كَانَ جَبِيْنُ رَسُوْلِ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم صَلْتًا'' (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی مبارک واضح اور ہموار تھی۔)

روشن اس قدر تھی کہ اندھیرے میں چراغ کی طرح چمکتی تھی۔شاعرِ دربارِ رسالت حضرت حسان ابنِ ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں

مَتٰى يَبْدُ فِیْ اللَّيْلِ الْبَهِيْمِ جَبِيْنُه‘

يَلُحْ مِثْلَ مِصْبَاحِ الدُّجىٰ الْمُتَوَقِّدِ

(انتہائی تاریک رات میں جب آپ کی پیشانی ظاہر ہوتی ہے تو یوں چمکتی ہے جیسے اندھیرے میں چراغ روشن ہو۔)

خوشی کے موقع پر پیشانیٔ اقدس کے خطوط مزید درخشاں ہو جاتے تھے---تَبْرُقُ اَسَارِيْرُ وَجْهِه‘.

دونوں بھنوؤں کے درمیان پیشانی میں ایک رگ تھی جو غصے کے عالم میں ابھر آتی تھی---بَيْنَهُمَا عِرْقٌ يُدِرُّهُ الْغَضَبُ.

حضرت رضا بریلویؒ نے جانِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے روئے منور کو ''چشمۂ مہر'' کہا ہے اور جبینِ انور میں ابھری ہوئی رگ کو ''نورِ جلال کی مَوج'' قرار دیا ہے۔فرماتے ہیں

چشمۂ مہر میں موجِ نُورِ جلال

اس رگ ہاشمیت پہ لاکھوں سلام[1]

جب جانِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ماتھے پر پسینہ آتا تھا تو ایسا دلآویز منظر پیدا ہوتا تھا کہ دیکھنے والا مبہوت ہو کر رہ جاتا تھا۔

ایک دفعہ گرمی کا موسم تھا اور جانِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ماتھے پر پسینہ آ رہا تھا۔یہ بہت ہی خوبصورت اور دلربا نظارہ تھا۔پیشانی سے پھوٹنے والی شعاعیں جب پسینے کے شفاف قطروں میں منعکس ہوتی تھیں تو یوں لگتا تھا جیسے ہفت رنگ روشنی نور کے موتیوں کی شکل میں

مجسم ہوگئی ہو۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں---''فَبَھَتُّ''میں یہ منظر دیکھ کر مبہوت ہوگئی۔ رسول اللہ ﷺ نے مجھے اس حالت میں دیکھا تو کہا---مَالَکِ؟ بَھَتِّ؟ تجھے کیا ہوا ہے؟ کیوں کھوگئی ہو؟ میں نے عرض کی

''یَارَسُوْلَ اللهِ! جَعَلَ جَبِیْنُکَ یَعْرَقُ وَجَعَلَ عِرْقُکَ یَتَوَلَّدُ نُوْرًا.''

(یارسول اللہ! آپ کے ماتھے پر پسینہ آ رہا ہے اور پسینے سے نور کے موتی بن رہے ہیں)

حضرت عائشہؓ نے مزید عرض کی---اگر ابوکبیر ہذلی (عرب کا مشہور شاعر) آپ کو اس حال میں دیکھ لیتا تو پکار اٹھتا کہ اس کے اس شعر کے حقیقی مصداق آپ ﷺ ہیں

وَاِذَا نَظَرْتَ اِلٰی اَسِرَّةِ وَجْهِهٖ
بَرَقَتْ کَبَرْقِ الْعَارِضِ الْمُتَهَلِّلِ

(اگر تم میرے ممدوح کی پیشانی کے خطوط کو دیکھو تو وہ یوں چمکتے نظر آئیں گے، جیسے بادل میں بجلی لہرا رہی ہو۔)

غور کیجئے کہ حضرت عائشہؓ، جانِ دو عالم ﷺ کی زوجۂ محترمہ ہیں اور دن رات میں کئی کئی مرتبہ آپ کی زیارت سے فیضیاب ہوتی ہیں، مگر اس کے باوجود حسنِ مصطفوی کی تجلیاں اتنی گوناگوں اور نوع بنوع ہیں کہ ہر وقت کی رفیقۂ حیات بھی مبہوت ہو جاتی ہے اور نظارۂ جمال میں کھو جاتی ہے۔!!

سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللهِ الْعَظِیْمِ.

شبنمِ باغِ حق ، یعنی رخ کا عرق
اس کی سچی براقت پہ لاکھوں سلام

''باغِ حق''میں جانِ دو عالم ﷺ کے اس فرمان کی جانب تلمیح ہے:

''مَنْ رَاٰنِیْ فَقَدْ رَاَی الْحَقَّ''(۱) (جس نے مجھے دیکھا، اس نے حق دیکھا۔)

(۱) اس حدیث کو شاعرانہ انداز میں جس طرح اعلیٰ حضرت نے نظم کیا ہے، وہ صرف انہی کا حصہ ہے۔ فرماتے ہیں۔

کھلے کیا رازِ محبوب و مُحِب مستانِ غفلت پر
شرابِ''قَدْ رَاَی الْحَقّ''زیبِ جامِ''مَنْ رَاٰنِیْ''ہے

''براقت'' سے پہلے ''سچی'' کا اضافہ اس لئے کیا ہے تا کہ واضح ہو کہ یہ براقت اور چمک حقیقی تھی، نہ کہ مجازی اور تمثیلی۔

اعلیٰ حضرتؒ نے جانِ دو عالم ﷺ کی جبینِ انور پر بھی سلام پیش کیا ہے اور ساتھ ایک محاورے کو نظم کر کے عجیب لطف پیدا کیا ہے۔

جس کے ماتھے شفاعت کا سہرا رہا
اس جبینِ سعادت پہ لاکھوں سلام

''دو ابرو قوس مثال دسن''

حسن و جمال کے اعتبار سے وہ ابرو مثالی ہوتے ہیں جو محرابی شکل رکھتے ہوں، پتلے اور لمبے ہوں اور ان کے بال بھرپور اور پورے ہوں۔ جانِ دو عالم ﷺ کے ابروؤں میں یہ تمام صفات بدرجہ اتم پائی جاتی تھیں۔ حضرت ہند ابن ابی ہالہؓ نے آپ کو ''اَزَجُّ الْحَوَاجِبُ'' کہا ہے۔ حَوَاجب تو ابروؤں کو کہتے ہیں؛ البتہ اَزَجّ کے مفہوم میں خاصی وسعت ہے۔ قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں کہ جن ابروؤں میں یہ تین صفات پائی جائیں وہ اَزَجّ ہوتے ہیں۔

۱ ---کمان کی طرح گولائی کا پایا جانا۔

۲ ---لمبا ہونا۔

۳ ---بھرپور بالوں والا ہونا۔

علامہ زرقانیؒ نے کہا ہے کہ ایک اور وصف بھی اَزَجّ کے مفہوم میں شامل ہے، یعنی باریک ہونا۔

اس طرح اَزَجُّ الْحَوَاجِبُ کا پورا مفہوم یہ بنے گا کہ جانِ دو عالم ﷺ کے ابرو لمبے تھے، باریک تھے، بھرپور بالوں والے تھے اور کمان یا محراب کی مانند گولائی رکھتے تھے۔

یہ صفات تو متفقہ ہیں؛ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ دونوں ابرو آپس میں ملے

ہوئے تھے یا جدا جدا تھے۔

حضرت علیؓ اور چند دیگر صحابہ کرامؓ نے آپ کو ''مَقْرُوْنُ الْحَاجِبَیْنِ'' کہا ہے۔ یعنی دونوں ابرو باہم ملے ہوئے تھے؛ جبکہ حضرت ہند ابن ابی ہالہؓ نے آپ کے ابروؤں کو ''سَوَابِغُ مِنْ غَیْرِ قَرْنٍ'' قرار دیا ہے۔ یعنی تام اور مکمل تھے، لیکن ایک دوسرے سے جدا تھے۔

شارحین حدیث نے ان دو متضاد روایتوں میں تین طرح سے تطبیق کی ہے۔

ایک یہ کہ اوائل عمر میں آپ کے ابرو جدا جدا تھے۔ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ بالوں میں بھی اضافہ ہوتا رہا اور آخر میں دونوں باہم مل گئے۔ چنانچہ جنہوں نے آپ کو ''مَقْرُوْنُ الْحَاجِبَیْنِ'' کہا ہے، انہوں نے عمر کے آخری حصے کی کیفیت بیان کی ہے اور جنہوں نے ''مِنْ غَیْرِ قَرْنٍ'' کہا ہے، انہوں نے آپ کی جوانی کے زمانے کی بات کی ہے۔

دوسری یہ کہ آپ کے ابرو درحقیقت متصل تھے مگر ان کو ملانے والے بال اتنے پتلے اور ملائم تھے کہ عام حالات میں نظر نہیں آتے تھے۔ ہاں، جب سفر وغیرہ کی وجہ سے ان پر گرد پڑ جاتی تھی تو نمایاں دکھائی دینے لگتے تھے۔ گویا سفر اور گرد والے کام مثلاً جہاد وغیرہ کے دوران آپ مَقْرُوْنُ الْحَاجِبَیْنِ ہوتے تھے اور عام حالات میں مِنْ غَیْرِ قَرْنٍ۔

تیسری یہ کہ درحقیقت آپ کے ابرو جدا جدا تھے، مگر دور سے ملے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ چنانچہ جنہوں نے ''مَقْرُوْنُ الْحَاجِبَیْنِ'' کہا ہے، انہوں نے دور سے دکھائی دینے والا منظر بیان کیا ہے اور جنہوں نے ''مِنْ غَیْرِ قَرْنٍ'' کہا ہے، انہوں نے نزدیک سے نظر آنے والے نظارے کے بارے میں بتایا ہے۔ زیادہ تر محدثین نے اسی توجیہ کو ترجیح دی ہے۔ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَاب.

مخمور اور مَد بھری آنکھیں

کہا جاتا ہے کہ آدھا حسن آنکھوں میں ہوتا ہے۔ بجھی بجھی اور چھوٹی بٹن نما آنکھیں اچھے بھلے چہرے کا ستیاناس کر دیتی ہیں؛ جبکہ چمکتی، دمکتی، بڑی اور لمبی بادامی آنکھیں عام چہرے کو بھی جاذبِ نظر بنا دیتی ہیں اور اگر چہرہ حسین ہو اور آنکھیں بھی ستم ڈھا

رہی ہوں تو جاذبیت و دلکشی مزید بڑھ جاتی ہے اور دیکھنے والا اس کی مقناطیسیت کے آگے بے بس ہو جاتا ہے۔

یہ تو عام آنکھوں کی بات ہے، پھر جانِ دو عالم ﷺ کی آنکھیں؟---!!

اللہ اکبر---! ان کی دلآویزی و خوشنمائی کا کیا کہنا---!!

اعلیٰ حضرتؒ نے ان کو باغ قدرت میں کھلے ہوئے نرگس کے پھول کہا ہے

نرگسِ باغِ قدرت پہ لاکھوں سلام

آیئے! جن نصیبہ وروں نے ان گلہائے نرگس کی زیارت کی تھی، ان سے معلوم کریں کہ ان پھولوں کا رنگ کیا تھا اور بناوٹ کیسی تھی۔

صحابہ کرامؓ نے آپ کو عَظِیْمُ الْعَیْنَیْنِ، اَنْجَلُ الْعَیْنَیْنِ اور اَدْعَجُ الْعَیْنَیْنِ کہا ہے۔ یعنی آپ کی آنکھیں بڑی تھیں، کشادہ تھیں اور ان کی سیاہی بہت گہری تھی۔

سیاہ حصے کے گرد جو سفیدی پائی جاتی ہے، وہ بھی نہایت واضح اور نمایاں تھی۔ یعنی نہ تو وہ ملگجی تھی نہ زردی مائل؛ البتہ اس میں سرخ رنگ کے انتہائی باریک ڈورے تیرتے رہتے تھے، جن کی وجہ سے آنکھیں بے پناہ حسین نظر آتی تھیں اور ہر دیکھنے والے کا دل موہ لیتی تھیں۔

حضرت جابر بن سمرہؓ نے آپ کو اَشْکَلُ الْعَیْنَیْن کہا ہے۔ اشکل شکلۃ سے مشتق ہے اور شکلہ کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ قسطلانی لکھتے ہیں کہ اَلْحُمْرَۃُ تَکُوْنُ فِیْ بَیَاضِ الْعَیْنِ. یعنی آنکھ کی سفیدی میں جو سرخی پائی جاتی ہے اس کو شکلہ کہا جاتا ہے۔

اسی کیفیت کو واضح الفاظ میں حضرت علیؓ نے یوں بیان کیا مُشْرَبُ الْعَیْنِ بِحُمْرَۃٍ (آپ کی آنکھوں میں سرخی کی آمیزش تھی۔)

جانِ دو عالم ﷺ کی آنکھوں میں گلابی ڈوروں کا پایا جانا ان خصوصیاتِ میں سے تھا جو سابقہ الہامی کتابوں میں آپ کی نبوت کی علامات کے طور پر مذکور تھیں۔ اسی لئے راہب حضرات اس نشانی کو بہت اہمیت دیتے تھے۔

حضرت علیؓ بیان کرتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے ایک دفعہ یمن بھیجا تو وہاں ایک راہب سے ملاقات ہوئی جس کے ہاتھوں میں کوئی قدیمی کتاب تھی۔ اس نے مجھ سے رسول اللہ ﷺ کا حلیہ پوچھا تو میں نے جس حد تک مستحضر تھا، بیان کر دیا مگر اس کی تشفی نہ ہوئی۔

کہنے لگا ---''وَمَاذَا---؟''---اور کچھ؟

میں نے کہا ---''هٰذَا مَا يَحْضُرُنِیْ.'' اس وقت تو اتنا ہی یاد ہے۔

اس نے کہا---''فِیْ عَيْنَيْهِ حُمْرَةٌ، حَسَنُ اللِّحْيَةِ؟'' کیا ان کی آنکھوں میں سرخی پائی جاتی ہے اور داڑھی بہت خوبصورت ہے؟

یہ سن کر مجھے حیرت ہوئی، میں نے کہا---''هٰذِهٖ وَاللّٰهِ صِفَتُه'' اللہ کی قسم! یہ صفات ان میں پائی جاتی ہیں۔

اس نے کہا---''آخری رسول کی یہ تمام نشانیاں میرے آباء و اجداد کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے نبی ہیں اور تمام لوگوں کی طرف بھیجے گئے ہیں۔''(۱)

چشمِ تاباں کے حُسن وضیاء پر درود ہلکی سی سرخیٔ خوشنما پر درود

جانِ دو عالم ﷺ کی آنکھوں کا ایک اور انوکھا وصف یہ تھا کہ وہ قدرتی طور پر سرمگیں تھیں۔ یعنی سرمہ لگائے بغیر یوں دکھائی دیتی تھیں جیسے سرمہ لگا ہو۔

حضرت جابر بن سمرہؓ فرماتے ہیں---''اِذَا نَظَرْتُ اِلیٰ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ قُلْتُ اَكْحَلُ وَلَيْسَ بِاَكْحَلَ.'' (میں جب بھی رسول اللہ ﷺ کو دیکھتا تھا، سمجھتا تھا کہ آپ نے سرمہ لگا رکھا ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہوتا تھا۔)

---

(۱) اس طرح کا ایک واقعہ اس وقت بھی پیش آیا تھا جب جانِ دو عالم ﷺ تجارت کے لئے شام گئے تھے اور نسطورا راہب سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے بھی آپ کے خادم میسرہ سے آپ کی آنکھوں کی سرخی کے بارے میں خاص طور پر پوچھا تھا اور اثبات میں جواب ملنے پر کہا تھا کہ بلاشبہ یہ وہی خاتم الانبیاء ہیں جن کا انتظار ہو رہا ہے۔ (تفصیل جلد اول، ص ۱۵۰ پر گزر چکی ہے۔)

یہ وصف پیدائشی تھا۔ سیرت نگار لکھتے ہیں---''وُلِدَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ مَخْتُوْنًا مَکْحُوْلًا۔'' (رسول اللہ ﷺ ولادت کے وقت ہی ختنہ شدہ اور سرمگیں آنکھوں والے تھے۔)

اعلیٰ حضرت قصیدہ نوریہ میں فرماتے ہیں

سرمگیں آنکھیں، حریم حق کے وہ مشکیں غزال
ہے فضائے لامکاں تک جن کا رمنا (۱) نور کا

مختصر یہ کہ جانِ دو عالم ﷺ کی آنکھیں بناوٹ کے اعتبار سے بڑی بڑی اور کشادہ تھیں۔ سیاہ حصہ مکمل طور پر سیاہ تھا اور سفید حصہ انتہائی سفید تھا؛ البتہ اس میں باریک گلابی ڈورے تیرتے رہتے تھے۔ گوشہ ہائے چشم اور زیریں و بالائی پپوٹوں کے وہ حصے جو آپس میں ملتے ہیں، مائل بہ سیاہی تھے جن کی وجہ سے سرمہ لگائے بغیر بھی آپ کی آنکھیں سرمے والی دکھائی دیتی تھیں۔

ایسی بے مثال آنکھیں بذاتِ خود ہی کچھ کم دیدہ زیب و دلفریب نہ تھیں کہ اوپر سے لمبی لمبی پلکوں کی خوبصورت جھالر نے ان کی دلربائی و جاں ستانی میں مزید اضافہ کر رکھا تھا۔ بقول صحابہ کرام آپ اَھْدَبُ الْاَشْفَارِ تھے۔ یعنی لمبی پلکوں والے۔

ان کی آنکھوں پہ وہ سایہ افگن، مِژہ
ظُلَّۃِ قصرِ رحمت پہ لاکھوں سلام (۲)

---

(۱) رمنا، یعنی گھومنا پھرنا اور سیر کرنا۔

(۲) اس بلیغ شعر سے آپ پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو پائیں گے جب تک اس کی تھوڑی سی تشریح نہ کر دی جائے۔

مِژہ، فارسی میں پلک کو کہتے ہیں۔ اردو میں بھی یہ لفظ بکثرت مستعمل ہے؛ بلکہ حضرت گولڑوی نے تو مقامی پنجابی میں بھی استعمال کیا ہے۔

دو ابرو قوس مثال دِسن
جَیں توں نوکِ مِژہ دے تیر چھُٹن ☜

یہ تو آنکھوں کی ساخت، بناوٹ اور رنگت کی چند جھلکیاں تھیں۔ جہاں تک ان کی بصارت کا تعلق ہے تو اس کی وسعت وہمہ گیری عقل وفہم سے ماوراء ہے۔ بقولِ اعلیٰ حضرت --- ہے فضائے لامکاں تک جن کا رمنا نور کا۔

جانِ دو عالم ﷺ فرماتے ہیں --- ''اِنِّیْ اَرٰی مَالَا تَرَوْنَ'' (میں وہ کچھ دیکھتا ہوں، جو تم نہیں دیکھتے)

ہم کیا اور ہمارا دیکھنا کیا---!

ہماری آنکھ صرف سامنے کی چیز دیکھ سکتی ہے؛ جبکہ جانِ دو عالم ﷺ کی آنکھیں پس پشت بھی دیکھتی تھیں۔ چنانچہ صحابہ کرامؓ کو امام سے پہلے رکوع وسجود میں جانے سے منع کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں

ظُلَّہ، اس سائبان کو کہا جاتا ہے جو باہر کو نکلا ہوا ہو۔ جیسے چٹان میں آگے کو نکلا ہوا پتھر۔ قرآن کریم میں ہے ﴿وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ﴾ (اور جب ہم نے پہاڑ کو اٹھا کر بنی اسرائیل کے اوپر یوں لا کھڑا کیا جیسے سائبان ہو۔) روشندانوں اور کھڑکیوں وغیرہ پر جو شیڈ بنائے جاتے ہیں انہیں بھی ظُلَّہ کہا جاتا ہے۔

قَصر، عربی میں محل کو کہتے ہیں۔ اس کی جمع قُصُوْر آتی ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ جنت میں اہل ایمان کو حور وقصور ملیں گے۔

اعلیٰ حضرت نے جانِ دو عالم ﷺ کے سراپا کو شان وشوکت اور جاہ وعظمت میں قصر سے تشبیہ دی ہے لیکن عام قصر سے نہیں؛ بلکہ قصرِ رحمت سے۔ مژہ کو ظلہ سے تشبیہ دی ہے، کیونکہ پلک بھی سائبان کی طرح باہر کو نکلی ہوتی ہے۔ گویا جانِ دو عالم ﷺ کا جسم اطہر رحمت الٰہیہ کا عالیشان محل ہے اور آپ کی آنکھوں پر سایہ کناں پلکیں اس محل کے سائبان ہیں۔

اس شعر میں قصرِ رحمت کے انہی سائبانوں پر سلام پیش کیا ہے ؎

ان کی آنکھوں پہ وہ سایہ افگن مژہ
ظلۂ قصرِ رحمت پہ لاکھوں سلام

''لوگو! میں تمہارا امام ہوں اس لئے مجھ سے پہلے رکوع اور سجدے میں نہ چلے جایا کرو۔ میں تمہیں دیکھتا رہتا ہوں، خواہ تم میرے آگے ہو، یا پیچھے (مسلم) کیا تم سمجھتے ہو کہ میں صرف اپنے روبرو دیکھتا ہوں---!؟ اللہ کی قسم، مجھ پر تمہارا رکوع؛ بلکہ خشوع بھی مخفی نہیں رہتا، کیونکہ میں پس پشت بھی دیکھتا ہوں ---''اِنِّی لَاَرٰکُمْ مِنْ وَّرَاءِ ظَھْرِیْ.''

(بخاری)

ہماری آنکھ صرف روشنی میں دیکھتی ہے؛ جبکہ جانِ دو عالم ﷺ کی چشمانِ نور افشاں روشنی اور تاریکی میں یکساں دیکھتی تھیں۔ حضرت ابن عباسؓ اور حضرت عائشہؓ دونوں کا بیان ہے کہ---''کَانَ رَسُوْلُ اللہِ ﷺ یَرٰی فِی اللَّیْلِ بِالظُّلْمَۃِ کَمَا یَرٰی فِی النَّھَارِ بِالضَّوْءِ.'' (رسول اللہ ﷺ رات کی تاریکی میں اسی طرح دیکھتے تھے جیسے دن کی روشنی میں۔)

ہماری آنکھوں کی بینائی تھوڑی دور تک کام کرتی ہے؛ جبکہ جانِ دو عالم ﷺ کی چشمِ اقدس کی بینائی مشرق و مغرب کو محیط ہے۔

فرماتے ہیں---''اِنَّ اللہَ زَوٰی لِیَ الْاَرْضَ فَرَأَیْتُ مَشَارِقَھَا وَمَغَارِبَھَا'' (اللہ تعالیٰ نے میرے لئے زمین کو سمیٹ دیا تو میں نے اس کے مشرق و مغرب کو دیکھ لیا۔)

ہمارا مشاہدہ صرف دنیاوی اشیاء تک محدود ہے؛ جبکہ جانِ دو عالم ﷺ کی آنکھوں کی رسائی جنت و دوزخ تک ہے۔

ایک موقع پر ارشاد فرمایا---''مَا مِنْ شَیْءٍ لَمْ اَکُنْ اُرِیْتُہٗ اِلَّا قَدْ رَأَیْتُہٗ فِیْ مَقَامِیْ ھٰذَا، حَتّٰی الْجَنَّۃِ وَالنَّارِ.'' (بخاری) (جو کچھ مجھے اب تک نہیں دکھایا گیا تھا، وہ سب میں نے اس مقام پر دیکھ لیا ہے، حتیٰ کہ جنت و دوزخ بھی۔)

ان سب عظمتوں سے ماورا عظمت و افتخار یہ ہے کہ جانِ دو عالم ﷺ کی آنکھوں نے شبِ معراج اللہ تعالیٰ کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔ لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّہِ الْکُبْرٰی اور جس ہمت اور حوصلے سے اس جہانِ حیرت کی آیات کو دیکھا، اس کی داد خود اس آنکھ کے خالق اکبر نے ان پر شکوہ الفاظ میں دی---مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی (نہ ان

کی نگاہ ہٹی، نہ بٹی۔)

انہی آیات کو مدنظر رکھتے ہوئے اعلیٰ حضرت نے اس آنکھ پر یوں سلام پیش کیا ہے۔

معنیٔ ''قَدۡرَأٰی'' مقصدِ ''مَاطَغٰی''

نرگسِ باغِ قدرت پہ لاکھوں سلام

اور اس سے بھی بلند و بالا مقام یہ ہے کہ ان آنکھوں نے ذاتِ باری تعالیٰ کو بے حجاب دیکھا---اس طرح نہیں جیسے اہلِ جنت اپنے رب کو دیکھیں گے، کیونکہ وہ تو دور سے دیکھیں گے، جیسے دنیا میں چودھویں کے چاند کو دیکھا کرتے تھے۔ جانِ دو عالم ﷺ نے اپنے رب کو قریب سے؛ بہت قریب سے؛ بہت ہی قریب سے دیکھا---یعنی دو کمانوں سے بھی کم فاصلے سے۔ فَکَانَ قَابَ قَوۡسَیۡنِ اَوۡ اَدۡنٰی.

گئے ملنے خدا سے خدا کے حبیب، ہوا ان کو جو قربِ الٰہی نصیب

کہا آ جا قریب، قریب، قریب، ذرا دیکھو تو شانِ لِقائے نبی

اللہ اکبر---! ایک طرف تو ان آنکھوں کی قوت و رسائی کا یہ عالم تھا کہ عین ذات کے جلوے برداشت کرنے کی طاقت رکھتی تھیں اور دوسری طرف ان کی شرم و حیا اور تواضع و انکساری کا یہ عالم تھا کہ اوپر کو اُٹھتی ہی نہیں تھیں---مگر شاذ و نادر۔

حضرت ہند ابن ابی ہالہ ؓ جانِ دو عالم ﷺ کے بارے میں بتاتے ہیں ''خَافِضُ الطَّرۡفِ، نَظَرُہٗ اِلَی الۡاَرۡضِ اَطۡوَلُ مِنۡ نَظَرِہٖ اِلَی السَّمَآءِ'' (آپ نگاہیں جھکائے رکھتے تھے، آسمان کی جانب کبھی کبھار ہی نگاہ اُٹھاتے تھے۔)

اسی فطری حیا و وضعداری کی وجہ سے آپ کسی کو نظر بھر کر دیکھتے بھی نہیں تھے؛ بلکہ ہمیشہ گوشۂ چشم سے التفات فرمایا کرتے تھے---کَانَ جُلُّ نَظَرِہٖ اَلۡمُلَاحَظَۃُ.

اللہ اللہ!! اس نگاہِ التفات و عنایت کی بندہ نوازیوں کا کیا کہنا---!

ایک دن فاقے کی وجہ سے حضرت ابو ہریرہؓ کی حالت غیر تھی۔ اچانک جانِ دو عالم ﷺ ان کے پاس سے گزرے اور ان کی خستہ حالی دیکھ کر انہیں اپنے ساتھ لے آئے۔ گھر پہنچے تو فرمایا---''جاؤ! اصحابِ صفہ کو بلا لاؤ۔''

اصحابِ صفہ آئے تو آپ نے دودھ سے بھرا کٹورا حضرت ابوہریرہؓ کو دیا کہ ان کو پلاؤ!
شانِ خداوندی اور اعجازِ مصطفوی ملاحظہ ہو کہ ستر [۷۰] اصحابِ صُفّہ سیر ہو گئے مگر کٹورا ہنوز لبالب تھا۔ حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں دوبارہ آپ کے پاس آیا تو آپ نے کٹورا مجھ سے لے کر اپنے دست مبارک پر رکھ لیا---''فَنَظَرَ اِلَیَّ وَ تَبَسَّمَ'' پھر مجھ پر نگاہِ عنایت ڈالی اور مسکرائے

جس کی تسکیں سے روتے ہوئے ہنس پڑیں
اس تبسم کی عادت پہ لاکھوں سلام

پھر فرمایا---''ابوہریرہ! اب میں اور تو رہ گئے ہیں؟''
میں نے عرض کی---''جی ہاں، یارسول اللہ!''
فرمایا---''بیٹھ اور پی!''
چنانچہ میں بیٹھ گیا اور پینے لگا۔ جب پیٹ بھر گیا اور میں پیالہ منہ سے ہٹانے لگا تو آپ نے فرمایا---''ابوہریرہ! اور پی۔''
دو تین دفعہ یونہی ہوتا رہا، آخر میں نے عرض کی---''اللہ کی قسم یارسول اللہ! اب تو بالکل ہی گنجائش نہیں رہی۔''
تب آپ نے مجھ سے کٹورا لے لیا اور خود نوش فرما کر ختم کر دیا۔
یوں حضرت ابوہریرہؓ کا ناقابلِ برداشت فاقہ دور ہو گیا اور ان کے دم میں دم آ گیا۔

جس طرف اُٹھ گئی دم میں دم آ گیا
اس نگاہِ عنایت پہ لاکھوں سلام

اشک باری

انہی مقدس آنکھوں سے جب ٹپاٹپ آنسو گرتے تھے تو شفاعت کے موتیوں کی مالا بن جاتی تھی اور مجھ جیسے سیاہ کاروں کی مغفرت کا سامان ہو جاتا تھا۔

اشکبارئ مژگاں پہ برسے درود
سلکِ دُرِّ شفاعت پہ لاکھوں سلام

احادیث کی کتابیں آپ کی اشکباری کے واقعات سے بھری پڑی ہیں۔ ایک واقعے پر میں نے ''جامِ عرفاں'' کے لئے ''رونمائی'' بھی لکھی تھی۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسے یہاں پیش کر دیا جائے۔

دعائے محمد ﷺ

وہ دعا جس کا جوبن بہارِ قبول
اس نسیمِ اجابت پہ لاکھوں سلام

''حضرت عبداللہ بن عمرو ابن عاصؓ راوی ہیں کہ نبی ﷺ نے قرآن کریم میں بیان کردہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا، رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِىْ فَاِنَّه مِنِّى اور حضرت عیسٰی علیہ السلام کی دعا، اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ تلاوت فرمائی۔ پھر اپنے ہاتھ اٹھائے اور کہا ''اَللّٰهُمَّ اُمَّتِىْ ، اُمَّتِىْ'' (اے اللہ! میری امت، میری امت) یہ کہتے ہوئے آپ کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ---''جبریل! محمد کے پاس جاؤ اور اس سے پوچھو کہ کیوں رو رہا ہے---؟'' جبریل امین نے حاضر ہو کر پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اپنی امت کے لئے روتا ہوں، حضرت جبریل نے جا کر یہ جواب بارگاہِ الٰہی میں پیش کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''جبریل! پھر جاؤ اور محمد سے کہو کہ ہم امت کے سلسلے میں اسے راضی کریں گے اور ہرگز آزردہ نہ ہونے دیں گے۔'' (مسلم ج ۱ ص ۱۱۳)

کتنی کشادہ دل اور وسیع الظرف ہستیاں ہوتی ہیں انبیاء کرام کی---!

ذرا حضرت ابراہیمؑ اور حضرت عیسٰیؑ کی دعاؤں کے بین السطور پر غور کیجئے! حضرت ابراہیم کہتے ہیں۔ ﴿فَمَنْ تَبِعَنِىْ فَاِنَّه مِنِّىْ وَمَنْ عَصَانِىْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ٥﴾

(جس نے میری پیروی کی وہ مجھ سے ہے اور جس نے میری نافرمانی کی تو بے شک تو غفور رحیم ہے۔)

یعنی جو میرا پیروکار بن گیا، وہ تو مجھ سے ہو گیا (اپنے پیروکاروں کے ساتھ ''مِنِّیْ'' میں جو یگانگت کا اظہار ہے اس پر غور کیجئے!) لیکن جو میرا نافرمان ہے، اس نے بے شک میرا اتباع نہیں کیا مگر تُو تو غفور رحیم ہے۔ یعنی اگر کسی نے میری بات نہیں مانی تو اس سے گلہ شکوہ مجھ کو ہونا چاہئے۔ تجھے بہر حال مغفرت اور رحمت ہی کا مظاہرہ کرنا چاہئے!

سرکشوں اور نافرمانوں کے لئے واضح طور پر مغفرت طلب نہیں کر سکتے تھے تو یہ درمیانی راہ نکال لی۔

ہے کوئی انتہا اس شفقت بے پایاں کی!

حضرت عیسٰیؑ نے بھی اسی سے ملتا جلتا انداز اختیار کیا اور جن لوگوں نے حضرت عیسٰیؑ اور ان کی والدہ ماجدہ کو خدا بنالیا تھا، ان کی سفارش کرتے ہوئے کہا

﴿اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْلَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ٥﴾

(اگر تو ان کو عذاب دے تو تیرے ہی بندے ہیں اور اگر بخش دے تو تُو غالب اور حکمت والا ہے۔)

یعنی اگر عذاب دو گے تو اپنے ہی بندوں کو عذاب دینا پڑے گا (اور یہ بات تمہاری رحمت بھلا کہاں گوارا کرے گی!) لیکن اگر معاف کر دو گے تو یہ تمہاری دو عظیم صفات کے تقاضوں کے عین مطابق ہوگا کیونکہ تم عزیز بھی ہو اور حکیم بھی --- جو چاہو کر سکتے ہو اور جو کرتے ہو صحیح کرتے ہو۔

کس خوبصورت انداز میں شہنشاہ جہاں پناہ کے برہم مزاج کو مائل بہ کرم کیا جارہا ہے اور کتنے لطیف طریقے سے عفو و درگزر پر ابھارا جارہا ہے!!

یہ دونوں دعائیں اپنی نوعیت کے اعتبار سے انتہائی جامع ہیں اور ہر لحاظ سے بے نظیر و بے مثال ہیں مگر سوال تو یہ ہے کہ یہ دعائیں قبول بھی ہوئیں کہ نہیں---؟ ہوسکتا ہے قبول ہوگئی ہوں، ہوسکتا ہے نہ ہوئی ہوں---کوئی سندیسا تو آیا نہیں، کوئی پیغام تو پہنچا نہیں، کوئی اطلاع تو ملی نہیں، کوئی خبر تو سنی نہیں، کوئی نامہ بر تو دیکھا نہیں--- جو یہ مژدہ لایا ہو کہ

تمہاری دعائیں منظور ہو گئی ہیں اس لئے بے فکر ہو جاؤ!

واقعی اس بے نیاز بادشاہ کو کیا پڑی ہے کہ دعا کرنے والوں کو اطلاع دیتا پھرے کہ تمہاری دعا قبول ہو گئی ہے---قبول ہوئی تو خود ہی اثر ظاہر ہو جائے گا، نہ ہوئی تو بھی پتہ چل جائے گا۔

یہی دستور ہے اور یہی اس شہنشاہ کی بارگاہ کا معمول ہے۔

مگر کائنات میں ایک البیلا ایسا بھی ہے جس کے لئے سارے دستور ترک کر دیئے جاتے ہیں، تمام قوانین ایک طرف رکھ دیئے جاتے ہیں اور صمدیت و شہنشاہیت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنے کے بجائے عشق و محبت کی دنیا آباد کر لی جاتی ہے۔

وہی بے تابیاں اور بے قراریاں---وہی دلجوئیاں اور دلداریاں

حضرت ابراہیم اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی دعاؤں کو مدنظر رکھیئے اور پھر دیکھئے کہ محبوبِ خدا نے کیا دعا کی تھی---!

اس نے حضرت ابراہیمؑ کی طرح ''جو میری پیروی کرے'' اور ''جو میری نافرمانی کرے'' کی دو قسمیں نہیں بنائی تھیں۔ حضرت عیسیٰؑ کی طرح ''اگر عذاب دے'' اور ''اگر بخش دے'' کی دو صورتیں نہیں بیان کی تھیں، نہ غَفُوْرٌ رَّحِيْم اور عَزِيْزٌ حَكِيْم کہہ کر اس کی مغفرت و رحمت اور اختیار و حکمت کو اپیل کی تھی---اس نے تو سیدھے سادے تین لفظ کہے تھے---اَللّٰھُمَّ! اُمَّتِیْ، اُمَّتِیْ---مگر اشکوں کی برسات میں نکلنے والے انہی تین لفظوں نے---سچ تو یہ ہے کہ---دل یزداں میں ہلچل مچا دی تھی۔

میں یہ لفظ استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا کہ کہیں بارگاہِ شہنشاہ عالی جاہ میں بے ادبی کا مرتکب نہ ہو جاؤں---اَعُوْذُ بِاللهِ مِنْ ذٰلِکَ---مگر حدیثِ پاک میں رب العٰلمین کی جو کیفیت مذکور ہے، اس کی صحیح ترجمانی کے لئے واللہ مجھے کوئی دوسرا لفظ نہیں مل سکا۔

ذرا دیکھئے تو---! وہی صمد و مستغنی بادشاہ جو کسی کو دعا کی مقبولیت یا عدم مقبولیت کی اطلاع تک دینا گوارا نہیں کرتا، اپنے محبوب کے منہ سے نکلے ہوئے تین لفظوں کو سن کر کیسا مضطرب ہو گیا ہے! کما یلیق بشانہ.

''جبریل! آج محبوب غمزدہ نظر آ رہا ہے--- جا کر پتہ تو کرو، پوچھو تو سہی، بات کیا ہے؟ کیوں پریشان ہے؟''

کیا خود اسے نہیں پتہ تھا؟ کیا وہ نہیں جانتا تھا کہ میرے محبوب کو کیا غم کھائے جا رہا ہے---؟ وہ جو عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْر ہے، وہ جو اَقْرَبُ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْد ہے---؟!!

اسے سو فیصد پتہ تھا، وہ بالیقین جانتا تھا، وہ اپنے محبوب کے دل کی ایک ایک کیفیت سے ہر دم باخبر تھا، مگر عشق و محبت کی دنیا میں نامہ و پیام کا جو دستور ہے، وہ اسے نباہ رہا تھا اور اپنے طرزِ عمل سے ملکوت و ملک کو بتا رہا تھا کہ میرا محبوب جب افسردہ ہو جاتا ہے تو میری کیا کیفیت ہوتی ہے---؟ میں جو ربّ العٰلمین ہوں، میں جو احکم الحاکمین ہوں، اپنے محبوب کو حزین و ملول دیکھ کر بے تاب ہو جاتا ہوں۔ اسی وقت اپنے راز دار پیامی کو خدمتِ محبوب میں بھیجتا ہوں۔ وہ جا کر پوچھتا ہے

''محبوب رب! کیا بات ہے---؟ کیوں دل غمناک ہے---؟ کیوں آنکھیں نمناک ہیں---؟

میرا محبوب جواب دیتا ہے---''امت کے سوا مجھے کیا غم ہو سکتا ہے! میرے دلدار آقا سے کہو کہ میری امت کو بخش دے، میری امت کو بخش دے۔''

پیامبر واپس آتا ہے، محبوب کا تقاضا بتاتا ہے۔ مجھے تو اپنے محبوب کو راضی رکھنے سے سروکار ہے۔ مجھے تو اس کی خوشی اور مسرت درکار ہے۔ میں قاصد کو پھر بھیجتا ہوں--- محبوب کو منانے کے لئے اور یہ نویدِ جانفزا سنانے کے لئے کہ

اِنَّا سَنُرْضِیْکَ فِیْ اُمَّتِکَ وَلَا نَسُوْئُکَ (حدیث مذکور)

(ہم تجھے، تیری امت کے سلسلے میں بہر صورت راضی کریں گے اور کبھی آزردہ نہ ہونے دیں گے)

سُبْحَانَ اللہِ وَبِحَمْدِہٖ، سُبْحَانَ اللہِ الْعَظِیْمِ.

خدا کی رضا چاہتے ہیں دوعالم خدا چاہتا ہے رضائے محمد
اِجابت نے جُھک کر گلے سے لگایا بڑھی ناز سے جب دعائے محمد

صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ.

اشکبارئ مژگان پہ برسے درود سِلکِ درِ شفاعت پہ لاکھوں سلام
ہم غریبوں کے آقا پہ بے حد درود ہم فقیروں کی ثروت پہ لاکھوں سلام

اگرچہ آپ کی آنکھیں زیادہ تر خشیتِ الٰہیہ اور مغفرت امت کے لئے اشکبار ہوا کرتی تھیں؛ تاہم اس کے علاوہ بھی بعض مواقع پر آپ اشک ریز ہو جایا کرتے تھے۔ مثلاً اعزہ و اقارب اور مخلص جاں نثاروں میں سے کسی کے وفات پا جانے پر، یا کوئی انتہائی المناک واقعہ سن لینے پر۔

''سیدالورٰی'' میں اس طرح کے متعدد واقعات گزر چکے ہیں، یہاں ہم ''شہکارِ ربوبیت'' کے حوالے سے تین واقعات پیش کر رہے ہیں، جن سے آپ کی رقتِ قلب اور شفقت و رأفت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

جناب مفتی محمد خان قادری لکھتے ہیں:

۞ ---''حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اکرم ﷺ کی معیت میں آپ کے صاحبزادے سیدنا ابراہیم کے پاس پہنچے۔ اس وقت ان پر نزع کی کیفیت طاری تھی اور وہ اپنے مولیٰ کی طرف رخصت ہو رہے تھے۔ آپ نے اپنے لختِ جگر اور نورِ نظر کی حالت دیکھی

فَجَعَلَتْ عَیْنَا رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ تَذْرِفَانِ، وَقَالَ: اِنَّ الْعَیْنَ تَدْمَعُ وَالْقَلْبَ یَحْزَنُ. (تو آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی اور فرمانے لگے ''آنکھیں آنسو برسا رہی ہیں اور دل غم و حزن میں مبتلا ہے۔'')

۞ ---اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ کے رضاعی بھائی حضرت عثمان بن مظعونؓ کا وصال ہوا تو آپ ان کا جنازہ پڑھانے کے لئے

تشریف لائے اور ان کے چہرے سے کپڑا ہٹا کر ---قَبَّلَ بَیْنَ عَیْنَیْهِ وَبَکَا، ثُمَّ بَکَا طَوِیْلاً حَتّٰی سَالَتْ دُمُوْعُهٗ عَلٰی وَجْهِ عُثْمَانَ (ان کی دونوں آنکھوں کے درمیان بوسہ دیا اور رو دیئے، پھر اتنا روئے کہ آپ کے آنسو عثمان کے چہرے پر ٹپک پڑے۔)

پھر جب ان کی چارپائی اٹھائی گئی تو آپ نے فرمایا

''اے عثمان! تجھے مبارک ہو، نہ تو نے دنیا کو استعمال کیا ہے اور نہ دنیا نے تجھے''

یعنی دنیا میں رہتے ہوئے اس سے الگ تھلگ رہے۔

۞---حضرت میسرہ بن معبدؓ سے مروی ہے کہ ایک آدمی رسالت مآب ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا اور عرض کی ---''یارسول اللہ، ہم اہل جاہلیت اور بت پرست تھے۔ اپنی اولاد کو اپنے ہاتھوں سے قتل کیا کرتے تھے۔ خود میری بڑی ہی خوبصورت بیٹی تھی۔ وہ مجھ سے بہت زیادہ پیار کیا کرتی۔ جب میں اسے بلاتا تو میرے بلانے پر بہت خوش ہوتی۔ ایک دن میں نے اسے بلایا تو وہ میرے پیچھے پیچھے چلی آئی۔ کچھ فاصلے پر ایک کنواں تھا۔ میں اس کی طرف چل دیا۔ جب وہاں پہنچا تو میری بیٹی بھی کھیلتی کودتی میرے پاس آ پہنچی۔ اچانک میں نے ہاتھ سے پکڑ کر اسے کنویں میں پھینک دیا اور اسے ہمیشہ کے لئے آنکھوں سے اوجھل کر دیا۔ میرے کانوں میں اس کے آخری یہ الفاظ سنائی دے رہے تھے کہ وہ درد بھرے انداز سے مجھے ''یَا اَبَتَاهُ! یَا اَبَتَاهُ.'' (او میرے ابا! او میرے ابا!) کہہ رہی تھی، مگر میرا دل پتھر سے بھی زیادہ سخت تھا، ذرہ بھر متاثر نہ ہوا۔

جب رحمتِ عالم ﷺ نے یہ واقعہ سنا---فَبَکٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ حَتّٰی وَکَفَ دَمْعُ عَیْنَیْهِ. (تو آپ رونے لگے یہاں تک کہ آپ کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔)

حاضرین میں سے ایک شخص نے اسے کہا کہ تو نے آپ ﷺ کو حزن وملال میں ڈال دیا ہے تو اس نے جواب دیا کہ کوئی ایسا معاملہ ہے تو حضور ضرور فرمادیں گے، تم خاموش رہو۔

حبیبِ اکرم ﷺ نے اس آدمی کو فرمایا کہ اپنی بات دوبارہ بیان کرو اور مجھے سناؤ۔ اس نے یہی واقعہ دوبارہ آپ کی خدمت میں عرض کیا---فَبَکٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ حَتّٰی وَکَفَ دَمْعُ عَیْنَیْهِ اِلٰی لِحْیَتِهٖ. (تو پھر رو دیئے یہاں تک کہ آنسوؤں سے آپ

کی داڑھی مبارک تر ہوگئی۔)

اس کے بعد فرمایا---''اللہ تعالیٰ نے زمانۂ جاہلیت کے اعمال سے درگزر فرما دیا ہے۔اب نیک اور صالح عمل کی کوشش کرو۔''

بینیٔ پُر نور

ناک کا بلند اور نمایاں ہونا ہمیشہ سے عزت و عظمت کی علامت رہا ہے۔اردو میں بھی کہا جاتا ہے کہ ناک اونچی رہے اور ناک نیچی نہ ہونے پائے۔ جانِ دو عالم ﷺ کی نورانی ناک بھی اونچی، پتلی اور لمبی تھی اور یہ تینوں صفات آپس میں انتہائی متوازن و متناسب انداز میں یکجا تھیں، جس کی وجہ سے بینیٔ پُر نور نہایت خوبصورت اور دلآویز دکھائی دیتی تھی۔ حسن میں مزید اضافہ اس نور سے ہو جاتا تھا جو آپ کی ناک پر ہر وقت چھایا رہتا تھا۔اسی نور کی وجہ سے آپ کی ناک مبارک نمایاں طور پر بلند اور طویل نظر آتی تھی۔

حضرت ہند ابن ابی ہالہؓ کہتے ہیں

''اَقْنَی الْعِرْنِیْنِ، لَہٗ نُوْرٌ یَّعْلُوْہُ، یَحْسَبُہٗ مَنْ لَّمْ یَتَاَمَّلْہُ اَشَمَّ وَلَیْسَ بِاَشَمَّ. ''(اونچی بینی والے، اس بینی پر نور چھایا رہتا تھا۔جس کی وجہ سے بظاہر آپ کی بینی خاصی اونچی اور لمبی دکھائی دیتی تھی مگر درحقیقت ایسا نہیں تھا۔(بلکہ رفعت و طوالت میں ایک خاص توازن و تناسب تھا۔)

اعلیٰ حضرت نے قصیدۂ نوریہ میں جانِ دو عالم ﷺ کی پُر نور بینی کو ظاہری صورت اور معنوی رفعت میں لِوَاءُ الْحَمْد (۱) سے تشبیہ دی ہے اور اس پر تاباں درخشاں نورانی

---

(۱) لِوَاءُ الْحَمْد اس جھنڈے کا نام ہے، جو روزِ محشر جانِ دو عالم ﷺ کے دستِ مبارک میں ہوگا اور حضرت آدم علیہ السلام سمیت تمام انبیاء و رسل اس کے نیچے سر چھپائیں گے۔

جس کے زیرِ لواء ، آدم و مَن سوا
اس سزائے سیادت پہ لاکھوں سلام

شعلے کو نور کا پھریرا قرار دیا ہے۔

بینیٔ پُر نور پَر رخشاں ہے بکا (۱) نور کا
ہے لواء الحمد پر اڑتا پھریرا نور کا

اور اپنے مشہور سلام میں ''نیچی نظروں'' اور ''اونچی بینی'' کا خوبصورت تقابل کرتے ہوئے یوں درود پیش کیا ہے۔

نیچی نظروں کی شرم و حیا پر درود
اونچی بینی کی رفعت پہ لاکھوں سلام

رخسارِ پُر انوار

اگرچہ حسن کا دار و مدار چہرے کے مجموعی توازن و اعتدال پر ہے؛ تاہم اس میں زیادہ حصہ رخساروں کا ہے۔ بہت ابھرے ہوئے یا اندر دھنسے ہوئے گال، ظاہر ہے کوئی اچھا تأثر پیدا نہیں کرتے۔ جانِ دو عالم ﷺ کے رخساروں کو اللہ تعالیٰ نے نہایت ہی متناسب و موزوں بنایا تھا۔

حضرت صدیق رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ آپ وَاضِحُ الْخَدَّیْن تھے۔

حضرت ہند ابن ابی ہالہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ سَھْلُ الْخَدَّیْن تھے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بتاتے ہیں کہ اَبْیَضُ الْخَدَّیْن تھے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی فرماتے ہیں کہ اَسِیْلُ الْخَدَّیْن تھے۔

مفہوم ان چاروں صفات کا یہ ہے کہ آپ کے رخسار پچکے ہوئے نہیں تھے؛ بلکہ نمایاں تھے۔ ابھرے ہوئے نہیں تھے؛ بلکہ ہموار تھے۔ رخساروں کا رنگ سفید تھا اور جلد انتہائی نرم اور ملائم۔

ان تمام صفات کو مد نظر رکھتے ہوئے ذرا حسن و جمال کے ان شہکار رخساروں کا

---

(۱) بُکّا یا بُکّہ کے متعدد معانی ہیں مگر جب نور کا بکا بولا جاتا ہے تو اس سے مراد وہ شعلہ ہوتا ہے جو غیر معمولی طور پر روشن ہو۔

تصور باندھیئے اور پھر پڑھیئے اعلیٰ حضرتؒ کا یہ شعر:-

جن کے آگے چراغِ قمر جھلملائے
ان عذاروں کی طلعت پہ لاکھوں سلام

واضح رہے کہ ''عذار'' رخسار کو کہتے ہیں اور ''طلعت'' حُسن و جمال کو۔

لبھائے نازک

جانِ دو عالم ﷺ کے ہونٹ انتہائی دلکش اور دیدہ زیب تھے۔ صحابہ کرام فرماتے ہیں کہ --- كَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اَلْطَفَ عِبَادِ اللهِ شَفَتَيْنِ. (رسول اللہ ﷺ کے ہونٹ اللہ کے سارے بندوں سے زیادہ لطیف اور نازک تھے۔)

اعلیٰ حضرتؒ نے ان لبوں کی نزاکت پر یوں سلام پیش کیا ہے۔

پتلی پتلی گُلِ قدس کی پتیاں
ان لبوں کی نزاکت پہ لاکھوں سلام

ایک اور نعت میں اعلیٰ حضرتؒ فرماتے ہیں کہ جانِ دو عالم ﷺ کے لبہائے نازک گلاب کے پھول جیسے ہیں، جن سے علم و عرفاں کے نوع بنوع پھول جھڑتے رہتے ہیں۔ پھر بلبل سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اے بلبل! تو نے گلشن میں گلاب تو دیکھے ہیں، مگر ذرا میرے آقا کے لبوں کو تو دیکھ، یہاں تجھے یہ انوکھا نظارا دکھائی دے گا کہ گلاب میں گلشن کھلا ہوا ہے---!!

وہ گُل ہیں لبہائے نازک ان کے، کہ جھڑتے ہیں پھول جن سے
گلاب گلشن میں دیکھے بلبل! یہ دیکھ گلشن گلاب میں ہے

بوسہ لینا

انہی لبہائے نازک کے ساتھ جانِ دو عالم ﷺ بعض خوش نصیبوں کا بوسہ لیا کرتے تھے۔ سیدہ فاطمہ زہراؓ اس شرف سے خاص طور پر بہرہ ور ہوئیں۔ ان کی آمد پر عموماً جانِ دو عالم ﷺ کھڑے ہو جایا کرتے تھے اور فرطِ محبت سے ان کی پیشانی چوم لیا کرتے تھے۔

حسنین کریمینؓ کو بھی اکثر گود میں بٹھا کر چوما کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ نے حضرت حسنؓ کو چوما تو اقرع ابن حابس تمیمی نے کہا کہ میرے دس بیٹے ہیں مگر میں نے ان کو کبھی نہیں چوما۔ یہ سن کر جانِ دوعالم ﷺ نے اس کی طرف دیکھا اور فرمایا

''مَنْ لَّایَرْحَمْ لَایُرْحَمْ.'' (جو رحم نہیں کرتا، خود اس پر بھی رحم نہیں کیا جاتا۔)

اسی طرح ایک اور موقع پر ایک شخص نے آپ سے کہا کہ آپ اپنے بچوں کو چومتے رہتے ہیں، حالانکہ ہم ایسا ہرگز نہیں کرتے۔ جانِ دوعالم ﷺ نے خشمگیں لہجے میں فرمایا

''اگر اللہ تعالیٰ نے تیرے دل سے رحم نکال دیا ہے تو میں کیا کرسکتا ہوں۔''

جانِ دوعالم ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم جب بیمار تھے اور زندگی کے آخری لمحوں میں تھے تو آپ انہیں اپنے ہاتھوں پر اٹھا کر چومتے رہے۔

اگر آپ کا کوئی محبوب شخص کافی مدت بعد باہر سے واپس آتا تو آپ اسے بھی پیار بھرے بوسے نوازتے تھے۔ آپ کے تایازاد بھائی حضرت جعفر طیارؓ جب طویل عرصے بعد حبشہ سے واپس آئے تو آپ بے حد مسرور ہوئے اور اٹھ کر ان کی پیشانی چوم لی۔

زندوں کے علاوہ وفات یافتہ پیاروں کو بھی آپ چوما کرتے تھے۔ آپ کے رضاعی بھائی حضرت عثمان ابن مظعونؓ فوت ہوگئے تو آپ نے ان کی پیشانی کا بوسہ لیا اور دیر تک روتے رہے۔

غرضیکہ آپ کی شفقت و رحمت کے ایسے بیسیوں واقعات احادیث وسیرت کی کتابوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں ازدواجی محبت کے تحت بھی آپ اپنی تمام ازواج مطہرات کو چوما کرتے تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں

''کَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ یُقَبِّلُ وَھُوَ صَائِمٌ.'' (رسول اللہ ﷺ روزے کی حالت میں بھی بوسہ لے لیا کرتے تھے۔)

بہرحال ان لبہائے لعلیں کے بوسے ایک شرف ہے، ایک اعزاز ہے، ایک وقار ہے، ایک افتخار ہے --- کتنے خوش قسمت تھے وہ لوگ، جو گلِ قدس کی ان پتلی پتلی پتیوں کے لمس سے فیضیاب ہوتے رہے اور پیار کے خزانے سمیٹتے رہے۔ رضی اللہ عنھم اجمعین.

مُسکرانا اور ہنسنا

انہی مبارک لبوں سے جانِ دو عالم ﷺ مسکرایا کرتے تھے تو دکھیوں کو قرار آ جایا کرتا تھا۔

جس کی تسکیں سے روتے ہوئے ہنس پڑیں
اس تبسم کی عادت پہ لاکھوں سلام

صحابہ کرامؓ فرماتے ہیں کہ آپ ہنستے کم تھے، زیادہ تر مسکرانے پر ہی اکتفا کیا کرتے تھے؛ بلکہ حضرت حیصؓ تو فرماتے ہیں

''مَا رَأَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ ضَاحِکًا قَطُّ، مَاکَانَ اِلَّا التَّبَسُّم.'' (میں نے رسول اللہ ﷺ کو کبھی ہنستے نہیں دیکھا، صرف تبسم فرمایا کرتے تھے۔)

یہی بات حضرت عائشہ صدیقہؓ اور چند دوسرے صحابہ کرامؓ سے بھی مروی ہے اور عام حالات میں ایسا ہی ہوتا تھا، لیکن کبھی کبھی آپ خوب کھل کر بھی ہنستے تھے۔ احادیث میں بعض مواقع پر یہ الفاظ مذکور ہیں

''فَضَحِکَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ حَتّٰی بَدَتْ نَوَاجِذُہ'.'' (رسول اللہ ﷺ اتنے ہنسے کہ آپ کی داڑھیں ظاہر ہوگئیں۔) تاہم اس میں شک نہیں کہ ایسا کبھی کبھار ہی ہوا کرتا تھا۔

جانِ دو عالم ﷺ کے ہنسنے میں بھی ایک انوکھا اور نرالا حسن پایا جاتا تھا اور اس حسن کی وجہ آپ کے دانتوں کا غیر معمولی طور پر سفید اور چمکدار و آبدار ہونا تھا۔ تو آیئے، آپ کے دندان مبارک کی چند جھلکیاں ملاحظہ فرمایئے۔

دندانِ نور افشاں

حضرت علیؓ فرماتے ہیں --- ''کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ بَرَّاقَ الثَّنَایَا.'' (رسول اللہ ﷺ چمکدار ثَنَایَا والے تھے۔) ثَنَایَا سامنے کے بالائی اور زیریں دانتوں کو کہا جاتا ہے۔

حضرت ہند ابن ابی ہالہؓ نے سفیدی اور آبداری واضح کرنے کے لئے بہت

خوبصورت تشبیہ دی ہے۔فرماتے ہیں

''مِثْلُ حَبِّ الْغَمَامِ'' (جیسے بادلوں سے برسنے والے اولے ہوتے ہیں۔)

سامنے کے درمیان والے دو دانتوں کے درمیان ذرا سا فاصلہ تھا جو بہت بھلا معلوم ہوتا تھا۔حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں

''کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم اَفْلَجَ الثَّنِیَّیْنِ.'' (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے والے دو دانت ملے ہوئے نہیں تھے؛ بلکہ ان میں معمولی سا فاصلہ تھا۔)

جب آپ گفتگو کرتے تھے تو دانتوں سے نور کی شعائیں پھوٹتی محسوس ہوتی تھیں۔ آپ کے جملہ وصّاف اس بات پر متفق ہیں کہ اِذَا تَکَلَّمَ رُؤِیَ کَالنُّوْرِ یَخْرُجُ مِنْ بَیْنِ ثَنَایَاہُ. (جب آپ گفتگو کرتے تھے تو ایسے لگتا تھا جیسے آپ کے مبارک دانتوں سے نور نکل رہا ہو۔)

ہنستے وقت اس نور باری میں اضافہ ہو جاتا تھا اور اردگرد کی دیواریں دمک اٹھتی تھیں۔حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں

''کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم اِذَا ضَحِکَ یَتَلَاْلَأُ فِیْ الْجُدُرِ.'' (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ہنستے تھے تو دیواریں چمک اٹھتی تھیں۔)

جانِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دندان مبارک کی یہ ضوفشانیاں ذہن میں رکھیئے اور پھر اعلیٰ حضرتؒ کے اس شعر سے لطف اُٹھایئے!

جن کے گچھے سے لچھے جھڑیں نور کے
ان ستاروں کی نزہت پہ لاکھوں سلام

دھانِ حق بیان

اہلِ عرب، مردوں کے لئے بڑا اور وسیع دہانہ پسند کرتے تھے۔ان کے خیال میں کشادہ دہن شخص خوش بیان وخوش آہنگ ہوتا تھا؛ جبکہ تنگ دہن آدمی کے اندر ان صفات کی کمی پائی جاتی تھی۔

جانِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ نے عربوں کے اس مرغوب وصف سے بھی نمایاں حصہ

عطا فرمایا تھا۔ حضرت جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ آپ ضَلِیْعُ الْفَمِ تھے۔ یعنی بڑے اور کشادہ منہ والے۔

دونوں اطراف میں جہاں منہ کا اختتام ہوتا ہے، وہ کنارے بہت پتلے اور لطیف تھے۔ ایک صحابی نے اس کی تعبیر یوں کی ہے ''اَلْطَفُهُمْ خَتْمَ فَمٍ'' یعنی آپ کے منہ کا اختتام سب سے لطیف تر تھا۔

یہ تو اس دہن کی ظاہری صورت اور ساخت کا بیان تھا، جہاں تک اس کے معنوی اوصاف کا تعلق ہے تو ان کی تفصیلات کی کوئی حد نہیں ہے۔ حق و صداقت کے سارے گلزار اسی دہن کے انفاسِ معطرہ سے مہکتے ہیں اور علم و حکمت کی تمام لہلہاتی کھیتیاں اسی چشمے کے آبشار سے سیراب و شاداب ہوتی ہیں۔

وہ دہن جس کی ہر بات وحیِ خدا
چشمۂ علم و حکمت پہ لاکھوں سلام

بلاشبہ اس منہ سے نکلنے والی ہر بات وحیِ رحمان ہے اور اس سے صادر ہونے والا ہر ارشاد حق کا ترجمان ہے۔ آیۂ ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى﴾ (۱) میں اسی حقیقت کا بیان ہے اور حدیث ''اِنِّیْ لَا اَقُوْلُ اِلَّا حَقًّا'' (۲) میں اسی صداقت کا اعلان ہے۔

لُعاب، رشکِ عرقِ گلاب

جانِ دوعالم ﷺ کے لعاب دہن میں چار نمایاں خصوصیات پائی جاتی تھیں۔

۱ ---خوشبودار تھا ؛ بلکہ دوسری چیزوں کو خوشبودار بنانے والا تھا۔

---

(۱) یہ آیت سورہ النجم کی ہے۔ اس کے بعد والی آیت یوں ہے۔ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی دونوں کا مجموعی مفہوم یہ ہے کہ رسول ﷺ اپنی خواہش سے کچھ نہیں بولتے، وہ تو وحی ہوتی ہے جو ان پر اتاری جاتی ہے۔

(۲) جانِ دوعالم ﷺ نے ایک بار حضرت عبداللہ ابن عمرو ابن عاص ؓ سے فرمایا تھا--- ''اُكْتُبْ! فَوَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِيَدِهٖ مَا خَرَجَ مِنِّیْ اِلَّا الْحَقُّ'' (میں جو کچھ بھی بیان کروں، لکھ لیا کرو! قسم ہے اس ذات کی، جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میرے منہ سے سوائے حق کے کچھ نہیں نکلتا۔)

۲---میٹھا تھا ؛ بلکہ دیگر اشیاء کو شیریں بنانے والا تھا۔

۳ ---بھوک پیاس مٹانے والا اور سیراب و شاداب کرنے والا تھا۔

۴ ---ظاہری و باطنی بیماریوں کو دور کر دینے والا اور شفا بخش تھا۔

ان چاروں خصوصیات کی جھلکیاں ترتیب وار ملاحظہ فرمایئے!

۱ ---حضرت وائل ابن حجرؓ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے ڈول سے پانی پیا، پھر قریب ہی ایک کنویں میں کلی کر دی۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ اس کنویں سے کستوری کی خوشبو آنے لگی۔

حضرت عتبہ ابن فرقدؓ کے پیٹ اور پیٹھ پر چھوٹے چھوٹے دانے نکل آئے جن میں سخت جلن ہوتی تھی۔ جانِ دو عالم ﷺ نے ان سے فرمایا ''قمیص اوپر اٹھاؤ!''

انہوں نے قمیص اٹھایا تو آپ نے اپنے دست مبارک پر تھوڑا سا لعاب لگایا اور حضرت عتبہؓ کے جسم کے متاثرہ حصے پر ہاتھ پھیر دیا۔ بیماری تو فی الفور زائل ہوگئی؛ البتہ یہ اضافی فائدہ بھی حاصل ہوگیا کہ حضرت عتبہؓ کا جسم خوشبودار ہوگیا۔ صحابہ کرامؓ فرماتے ہیں کہ پورے مدینہ میں عتبہ جیسی خوشبو والا کوئی نہیں تھا۔

۲ ---حضرت انسؓ کے گھر مین کنواں تھا۔ ایک دفعہ جانِ دو عالم ﷺ نے اس میں اپنا لعاب دہن ڈال دیا۔ اس کے بعد وہ کنواں اتنا میٹھا ہوگیا کہ پورے مدینہ میں اس سے بڑھ کر شیریں کنواں کوئی نہیں تھا۔

جس سے کھاری کنویں شیرۂ جاں بنے
اس زُلالِ حلاوت پہ لاکھوں سلام

۳ ---جب تک رمضان کے روزے فرض نہیں ہوئے تھے، جانِ دو عالم ﷺ دسویں محرم کے روزے کا بہت اہتمام فرمایا کرتے تھے؛ یہاں تک کہ چھوٹے بچوں کے منہ میں ذرا سا تھتکار دیتے تھے اور ان کی ماؤں سے کہہ دیتے تھے کہ انہیں شام تک کھانے پینے کے لئے کچھ نہ دینا۔ صحابہ کرامؓ بیان کرتے ہیں کہ آپ کے لعاب کی برکت سے وہ بچے سارا دن سیراب رہتے تھے اور انہیں کوئی چیز کھلانے پلانے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔

ایک دفعہ سفر میں ننھے حضرت حسنؓ بھی ساتھ تھے۔ اچانک ان کو شدید پیاس لگی اور رونے لگے۔ جانِ دو عالم ﷺ نے اپنی زبان مبارک ان کے منہ میں ڈال دی۔ حضرت حسنؓ نے اسے تھوڑا سا چوسا اور سیراب ہو گئے۔

جس کے پانی سے شاداب جان و جناں
اس دہن کی طراوت پہ لاکھوں سلام

۴---غزوۂ خیبر میں حضرت علیؓ کی آنکھیں بہت زیادہ دکھ رہی تھیں۔ جانِ دو عالم ﷺ نے ان پر اپنا لعاب لگایا تو اسی وقت ٹھیک ہوگئیں اور پھر ساری زندگی ان کی آنکھوں کو کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔

مدینہ کی ایک خاتون فحش گو اور بد زبان تھی۔ ایک دفعہ جانِ دو عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی تو آپ خشک گوشت تناول فرما رہے تھے۔ گوشت کا ایک ٹکڑا اٹھا کر آپ نے اس کو دینا چاہا تو اس نے عرض کی---''مجھے وہ گوشت دیجئے جو آپ کے منہ میں ہے۔'' جانِ دو عالم ﷺ نے اپنا چبایا ہوا گوشت نکال کر اسے دے دیا اور اس نے کھا لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی فحش گوئی اور بد زبانی یکسر ختم ہوگئی اور پھر عمر بھر کسی نے اس سے کوئی ناگوار بات نہیں سنی۔

زبان، دُرفشان

جانِ دو عالم ﷺ کی زبان گوہر فشاں کے بارے میں اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں

اس کی پیاری فصاحت پہ بے حد درود
اس کی دِلکش بلاغت پہ لاکھوں سلام

اللہ اکبر---! اس فصاحت و بلاغت کی کوئی حد نہیں تھی، کوئی انتہا نہیں تھی اور کوئی کنارا نہیں تھا۔ بڑے سے بڑا ادیب آپ کی فصاحتِ بے پایاں کے آگے دنگ اور حیران رہ جاتا تھا اور اعلیٰ سے اعلیٰ خطیب آپ کی بلاغتِ بے کراں کے سامنے گنگ اور بے زبان ہو جاتا تھا۔

علمائے معانی و بیان کہتے ہیں کہ جو کلام فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے اتنا بڑھ

جائے کہ انسانی طاقت سے باہر نکل جائے اس کو ''کَلَامِ مُعجِز'' کہا جاتا ہے۔ یعنی ایسا کلام جس کی مثال لانے سے دوسرا عاجز وقاصر ہو، خواہ کتنا ہی فصیح و بلیغ کیوں نہ ہو۔

قرآنِ کریم سارے کا سارا کلامِ معجز ہے۔ اسی لئے چیلنج کے باوجود نہ اُس دور میں کوئی اس کی نظیر لا سکا، نہ بعد میں۔ اسی طرح صاحبِ قرآن علیہ صلوات الرحمان کے کلام کا کچھ حصہ بھی معجزانہ شان کا حامل ہے، جسے سن کر اس زمانے کے وہ لوگ جو مختلف اسالیب کلام سے آگاہی رکھتے تھے، مسحور ہو جایا کرتے تھے اور بے دھڑک اس کے بے مثال ہونے کا اعتراف کر لیتے تھے۔

ضماد ابن ثعلبہ ازدی ایک دفعہ مکہ مکرمہ آیا۔ ان دنوں مکہ میں جانِ دو عالم ﷺ کی مخالفت عروج پر تھی اور کوئی آپ کو ساحر کہتا تھا، کوئی مجنون۔ ضماد نے بھی کچھ لوگوں سے سنا کہ یہاں ایک شخص کو، جس کا نام **مُحَمَّد** ہے، جنون کا عارضہ ہو گیا ہے۔ (مَعَاذَ اللّٰہ) ضماد ایسے مریضوں کا دم اور منتر وغیرہ کے ذریعے علاج کیا کرتا تھا۔ اس نے سوچا کہ **مُحَمَّدٌ** کو بھی دم کرنا چاہئے، ہو سکتا ہے کہ ٹھیک ہو جائے۔ چنانچہ وہ جانِ دو عالم ﷺ کے پاس آیا اور کہا --- ''**یَامُحَمَّدُ!** تمہیں جو بیماری ہے، میں اس کا علاج جانتا ہوں۔ اگر اجازت ہو تو تمہارا ابھی علاج کر دوں۔''

جانِ دو عالم ﷺ نے مناسب سمجھا، کہ جن باتوں کی وجہ سے اہل مکہ آپ کو مجنون سمجھتے تھے، ان کا کچھ حصہ ضماد کو بھی سنا دیا جائے۔ چنانچہ گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے آپ نے وہی معروف کلمات کسی قدر اختصار کے ساتھ پڑھے جو عموماً خطبے کی ابتداء میں پڑھا کرتے تھے

''اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰہ، نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ، وَ مَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ. وَاَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ، اَمَّا بَعْد .....''

(سب تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں۔ ہم اسی کی حمد بیان کرتے ہیں اور اسی سے مدد کے خواہاں ہیں۔ جسے اللہ ہدایت دے دے، اس کو کوئی گمراہ نہیں کر سکتا اور جسے وہ بھٹکا دے، اس کی کوئی رہنمائی نہیں کر سکتا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے،

وہ اکیلا ہے۔اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اس کا بندہ اور رسول ہے۔اما بعد.....)

''اَمَّا بَعْد'' کہہ کر آپ اصل موضوع کی طرف آنا چاہتے تھے مگر ضماد تو یہ تمہیدی کلمات سن کر ہی ششدر رہ گیا۔ کہنے لگا---''یہ کلمات مجھے دوبارہ سنا دیجئے!''

آپ نے دوبارہ سنائے تو ضماد کو مزید لطف آیا اور کہا کہ ایک بار اور سنا دیجئے!

جب آپ نے تیسری مرتبہ سنائے تو ضماد کے دل کی دنیا ہی بدل گئی اور پکار اٹھا کہ میں نے بڑے بڑے ساحروں، کاہنوں اور شاعروں کا کلام سنا ہے مگر ایسے کلمات آج تک نہیں سنے۔وَلَقَدْ بَلَغْنَ قَامُوْسَ الْبَحْرِ. بلاشبہ یہ کلمات فصاحت و بلاغت کے سمندر کی آخری گہرائی تک پہنچے ہوئے ہیں۔لایئے اپنا ہاتھ، میں اسلام پر بیعت کرنا چاہتا ہوں۔

جانِ دو عالم ﷺ نے اپنا دست مبارک آگے کیا اور اس کو بیعت سے مشرف کرلیا۔

ملا علی قاری شرح مشکوٰۃ میں ضماد کے قول کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں

''فَاَشَارَ بِقَوْلِهٖ هٰذَا اِلَی الْاِعْجَازِ، اَیْ جَاوَزَ کَلَامُکَ حَدَّ الْفَصَاحَةِ.'' (ضماد نے اپنے اس قول میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ آپ کا یہ کلام فصاحت و بلاغت کی تمام حدوں کو عبور کر کے اعجاز تک جا پہنچا ہے۔) یعنی کلامِ معجز بن گیا ہے۔

حضرت برّہ ایک تابعیہ خاتون تھیں۔انہوں نے ایک مرتبہ اپنے بھائیوں سے پوچھا کہ تم میں سے کسی نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہے؟

''ہاں، حج کے موقع پر ہم سب نے آپ کا دیدار کیا تھا۔'' بھائیوں نے جواب دیا

''آپ کی گفتگو بھی سنی تھی؟''

''ہاں، سنی تھی۔''

''کیسی گفتگو فرماتے تھے آپ؟''

بھائیوں نے جواب دیا ---''عربوں میں ایسا فصیح آج تک پیدا ہوا ہے، نہ آئندہ

ہوگا۔ جب آپ گفتگو فرماتے تھے تو ہر ادیب آپ کے کلام کے سامنے بے بس ہو جاتا تھا اور جب آپ خطاب فرماتے تھے تو ہر خطیب آپ کی خطابت کے آگے گونگا لگتا تھا۔''

ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے آپ کی خوش کلامی پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے عرض کی ---''یارسول اللہ! آپ زندگی بھر ہمارے پاس رہے ہیں مگر آپ کی فصاحت ہم سب سے بہت زیادہ ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟''

جانِ دوعالم ﷺ نے فرمایا---''اصل بات یہ ہے کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی زبان انتہائی فصیح و بلیغ تھی مگر امتدادِ زمانہ سے اپنی اصلی شکل میں باقی نہیں رہی تھی؛ بلکہ دیگر زبانوں کے ساتھ مخلوط اور گڈمڈ ہو گئی تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کو بھیجا اور انہوں نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اصلی عربی مجھے پوری طرح ازبر کرادی۔ اس وجہ سے میں تم سب سے زیادہ فصیح ہوں۔''

جس قطعۂ زمین کو عرب یا ملکِ عرب کہا جاتا تھا، وہ ایک وسیع و عریض خطہ تھا جس میں کئی طرح کی بولیاں بولی جاتی تھیں۔ ہوتی تو وہ سب عربی زبان کی شاخیں تھیں مگر تلفظ و لہجہ ہی نہیں، بعض مقامات پر الفاظ بھی اتنے مختلف ہوتے تھے کہ ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کی زبان کو پوری طرح نہیں سمجھ پاتا تھا۔

جانِ دوعالم ﷺ کی زندگی کا بیشتر حصہ مکہ مکرمہ میں گزرا تھا مگر انتہائی حیرت کی بات یہ ہے کہ آپ کو عرب کے ہر قبیلے کی زبان آتی تھی اور ہر علاقے کا لہجہ مستحضر رہتا تھا۔ دور و نزدیک سے آنے والے قبائل کے ساتھ آپ ہمیشہ ان کے ہاں مروج لب و لہجے میں گفتگو فرماتے تھے اور اتنی روانی و بے ساختگی سے کہ صدیقِ اکبرؓ جیسے جہاندیدہ انسان حیرت میں ڈوب جاتے تھے۔ حالانکہ صدیق اکبرؓ پہلے تاجر تھے اور تجارت کے سلسلے میں سارا عرب گھومے ہوئے تھے۔ اس وجہ سے ہر علاقے کی زبان اور لہجے سے آشنا تھے مگر اس کے باوجود جانِ دوعالم ﷺ کے بعض الفاظ ان کی سمجھ میں نہیں آتے تھے اور وہ آپ کی ہمہ گیر زباندانی پر دنگ رہ جاتے تھے۔

ایک شخص نے جانِ دوعالم ﷺ سے پوچھا

''یَارَسُوْلَ اللہِ! اَیُدَالِکُ الرَّجُلُ اِمْرَأَتَه''؟'' (یارسول اللہ! کیا آدمی اپنی بیوی سے ''مدالکت'' کرسکتا ہے؟)

آپ نے جواب دیا---''نَعَمْ، اِذَا کَانَ مُفْلِجًا.'' (ہاں، اگر ''مفلج'' ہو تو کرسکتا ہے۔)

صدیق اکبرؓ پاس بیٹھے تھے مگر ان کو نہ ''مدالکت'' کے معنی آتے تھے، نہ ''مفلج'' کے۔ اس لئے ازراہِ تعجب پوچھا

''یارسول اللہ! اس نے کیا کہا تھا اور آپ نے کیا جواب دیا ہے؟''

آپ نے فرمایا---''اس نے پوچھا تھا کہ آدمی اپنی بیوی کی فرمائشیں پوری کرنے میں ٹال مٹول کرسکتا ہے؟ اور میں نے جواب دیا تھا کہ ہاں، اگر گنجائش نہ رکھتا ہو تو کرسکتا ہے۔

یہ سن کر صدیق اکبرؓ نے عرض کی---''یارسول اللہ! میں پورے عرب میں گھوما پھرا ہوں اور ہر علاقے کے فصحاء کی گفتگو سنی ہے مگر آپ سے بڑھ کر فصیح میں نے کسی کو نہیں پایا۔ آخر آپ کو اتنی بولیاں کیسے آ گئی ہیں---!؟''

فی البدیہہ فرمایا---''میرے رب نے سکھا دی ہیں---اور میری پرورش بنی سعد میں ہوئی ہے۔''

یعنی بنی سعد کی بولی تو ان کے ہاں رہنے کی وجہ سے آ گئی ہے اور باقی تمام بولیاں اللہ تعالیٰ نے سکھا دی ہیں۔

ایک دفعہ یمن سے قبیلہ بنی نہد کے کچھ افراد حاضر خدمت ہوئے اور ان کے نمائندے حضرت طہفہؓ نے اپنی علاقائی زبان میں انتہائی مُسَجَّع و مُقَفّٰی گفتگو کی۔ جانِ دو عالم ﷺ نے بھی اسی لہجے میں، سجع کو پوری طرح ملحوظ رکھتے ہوئے، ان کو جواب دیا۔ اس دوطرفہ بات چیت میں ایسے ایسے الفاظ استعمال ہوئے تھے کہ جنہیں باب مدینۃ العلم اور انتہائی قادر الکلام شاعر و خطیب حضرت علیؓ بھی نہ سمجھ سکے اور نہایت تعجب سے عرض گذار ہوئے

''یارسول اللہ! ہم دونوں ایک ہی دادا کی اولاد ہیں اور ایک ہی شہر میں پلے

بڑھے ہیں مگر بعض دفعہ آپ ایسی گفتگو فرماتے ہیں کہ اس کے اکثر الفاظ میرے علم میں نہیں ہوتے---!''(۱)

---

(۱) حضرت طہفہؓ اور جانِ دو عالم ﷺ کی آپس میں کیا باتیں ہوئی تھیں اور ان میں کون سے ایسے الفاظ استعمال ہوئے تھے جن کا مفہوم سمجھنے سے مکہ کے فصحاء قاصر تھے، اس کی تفصیلات سے ایک عام قاری تو کوئی حظ نہیں اٹھا سکتا؛ البتہ لغات عرب سے آگاہی حاصل کرنے کے شائقین اس سے خوب لطف اندوز ہوسکتے ہیں۔اس لئے ذیل میں یہ مکالمہ مع اعراب و ترجمہ پیش کیا جارہا ہے۔

حضرت طہفہؓ کا علاقہ ان دنوں شدید قحط کی لپیٹ میں آیا ہوا تھا اس لئے اُنہوں نے اپنی پریشانیاں بیان کرتے ہوئے لغاتِ نادرہ پر مشتمل مسجع عرضداشت پیش کی

''یَارَسُوْلَ اللہِ---! اَتَیْنَاکَ مِنْ غَوْرٰی تِھَامَۃَ بِاَکْوَارِ الْمَیْس---تَرْتَمِیْ بِنَاالْعَیْس * نَسْتَحْلِبُ الصَّبِیْر---وَنَسْتَخْلِبُ الْخَبِیْر---وَنَسْتَعْضِدُ الْبَرِیْر * وَنَسْتَخِیْلُ الرِّھَام---وَنَسْتَحِیْلُ الْجَھَام * مِنْ اَرْضٍ غَائِلَۃِ الْغِطَآءِ---غَلِیْظَۃِ الْوَطَآء * قَدْ نَشَفَ الْمُدْھُنُ---وَیَبِسَ الْجِعْثِن * وَمَاتَ الْعُسْلُوْج---وَسَقَطَ الْاُمْلُوْج * وَھَلَکَ الْھَدِی---وَمَاتَ الْوَدِی * وَلَنَا نَعَمٌ ھَمَلٌ اَغْفَال---مَاتَبُلُّ بِبَلَال * وَوَقِیْرٌ کَثِیْرُ الرَّسْلِ---قَلِیْلُ الرِّسْل---اَصَابَتْھَا سُنَیَّۃٌ حَمْرَآءُ مُؤْزِلَۃٌ لَیْسَ لَھَا عَلَلٌ وَلَانَھَل * بِرِئْنَا اِلَیْکَ یَارَسُوْلَ اللہِ! مِنَ الْوَثَنِ وَالْعَنَنُ---وَمَا یُحْدِثُ الزَّمَنُ * لَنَا دَعْوَۃُ الْاِسْلَامُ---وَشَرَائِعُ الْاِسْلَامُ * مَاطَمَی الْبَحْر---وَقَامَ تِعَار. *''

رَواں ترجمہ

(یارسول اللہ! ہم آپ کے پاس تہامہ کے زیریں علاقے سے، مَیْس (سخت لکڑی والے ایک درخت کا نام) کے بنے ہوئے کجاووں پر زردی مائل سفید اونٹوں کے ذریعہ سفر کرتے ہوئے آئے ہیں۔ (قحط کی وجہ سے) ہم گھاس کاٹ کر کھاتے ہیں اور پیلو کے پھل پر گزارہ کرتے ہیں۔ (پیلو کے ساتھ جھاڑی کے بیروں جیسے چھوٹے چھوٹے پھل لگتے ہیں۔ظاہر ہے کہ ایسی چیزوں سے مستقل طور پر بھوک نہیں مٹائی جاسکتی۔) ہلکے سے بادل کو دیکھ کر ہم خیال کرتے ہیں کہ شاید برس جائے اور ابرِ بے آب سے بھی توقع ☜

جانِ دو عالم ﷺ نے فرمایا---''ہاں، مجھے میرے رب نے سکھایا ہے اور خوب سکھایا ہے۔''

اللہ غنی---! جس محیرالعقول فصاحت و بلاغت کے روبرو حضرت صدیقؓ، حضرت فاروقؓ، حضرت مرتضیٰؓ اور حضرت ضمادؓ جیسی ہستیاں دم بخود اور انگشت بدنداں ہوں، اس کی ہمہ گیری اور وسعت کا کون احاطہ کرسکتا ہے اور اس کی روانی و سلاست کا کون

رکھتے ہیں کہ شاید چند بوندیں گرا جائے۔ ہم ایسی زمین سے آئے ہیں، جس کی دوری ہلاکت خیز ہے اور جس پر چلنا انتہائی دشوار ہے۔ (قحط کا یہ عالم ہے) کہ پہاڑی گڑھوں میں بھی پانی ختم ہو چکا ہے اور پودوں کی جڑیں تک مردہ ہوگئی ہیں۔ درختوں کی ٹہنیاں خشک ہو چکی ہیں اور املوج (ایک سرونما درخت، نمی ختم ہو جانے کی وجہ سے) گر پڑے ہیں۔ اونٹ ہلاک ہو چکے ہیں اور نخلستان تباہ ہو گئے ہیں۔ (جو اونٹنیاں باقی بچی ہیں) وہ آزاد ہو چکی ہیں۔ (یعنی گھاس کی تلاش میں بے مہار بھاگتی پھرتی ہیں) ان کا دودھ بھی ختم ہو چکا ہے، اتنا بھی نہیں نکلتا جس سے کوئی چیز تر ہو سکے۔ بھیڑوں اور بکریوں کے ریوڑوں کا بھی یہی حال ہے۔ اِدھر اُدھر دوڑتی بہت ہیں (کہ کہیں سے کھانے کو کچھ مل جائے۔) مگر دودھ بہت تھوڑا دیتی ہیں، کیونکہ ان کو ایسی شدید خشک سالی نے گھیر رکھا ہے، جس کی وجہ سے فضا (گردوغبار سے) سرخ ہوگئی ہے اور تنگدستی چھا گئی ہے۔ ان جانوروں کو دوسری بار پانی پینا تو کجا، پہلی بار پینا بھی نصیب نہیں ہوتا۔

یارسول اللہ! ہم آپ کے روبرو برأت کا اعلان کرتے ہیں---بتوں سے، غلط کاموں سے اور زمانے کے پیدا کردہ اختلافات سے۔ ہم اسلام کی دعوت قبول کرتے ہیں اور اسلامی طریقوں پر چلنے کا عہد کرتے ہیں---جب تک سمندر میں موجیں اٹھتی رہیں اور کوہِ تعار اپنی جگہ جما رہے۔)

حضرت طہفہ نے تو ممکن ہے اس کے لئے پہلے سے تیاری کی ہو مگر جانِ دو عالم ﷺ نے اس کے جواب میں حضرت طہفہ اور بنی نہد کو دعائیں دیتے ہوئے فی البدیہہ ارشاد فرمایا

''اَللّٰھُمَّ! بَارِکْ لَھُمْ فِیْ مَحْضِھَا---وَمَخْضِھَا وَمَذْقِھَا ٭ وَ ابْعَثْ رَاعِیَھَا فِیْ الدَّثْرِ---بِیَانِعِ الثَّمَرِ ٭ وَافْجُرْلَهُ الثَّمَدَ---وَبَارِکْ لَهٗ فِیْ الْمَالِ وَالْوَلَدِ ٭ مَنْ اَقَامَ الصَّلٰوةَ کَانَ مُسْلِمًا---وَمَنْ اٰتَی الزَّکٰوةَ کَانَ مُحْسِنًا---وَمَنْ شَھِدَ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، کَانَ مُخْلِصًا ٭ لَکُمْ یَابَنِیْ نَھْدٍ وَدَائِعُ الشِّرْکِ---وَوَضَائِعُ الْمُلْکِ ٭ لَاتُلْطِطْ فِیْ الزَّکٰوةِ---وَلَا تُلْحِدْفِیْ الْحَیٰوةِ---وَلَا تَتَثَاقَلْ عَنِ الصَّلٰوةِ. ٭''

اندازہ کرسکتا ہے---!!!

سچ فرمایا اعلیٰ حضرت نے

ترے آگے یوں ہیں دبے لچے، فصحا عرب کے بڑے بڑے

کوئی جانے منہ میں زباں نہیں، نہیں ؛ بلکہ جسم میں جاں نہیں

جانِ دوعالم ﷺ کی گفتگو کی ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ آپ بہت ٹھہر کر اور تھم کر بات کرتے تھے تاکہ سننے والے کو سمجھنے میں کوئی دِقت نہ ہو۔

ایک دفعہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے لوگوں سے فرمایا

''رسول اللہ ﷺ تمہاری طرح تیز تیز باتیں نہیں کیا کرتے تھے۔ وہ تو اتنی صاف گفتگو فرماتے تھے کہ اگر کوئی آپ کے الفاظ گننا چاہے تو گن سکتا تھا۔''

حضرت عائشہ صدیقہؓ کے مخاطب فصیح اللسان اہل زبان ہی تھے مگر جس کے کانوں نے جانِ دوعالم ﷺ کا صاف، واضح اور نکھرا ہوا تکلم سن رکھا ہو، اسے ہر آدمی کج مج زبان

(اَللّٰھُمَّ! ان کے جانوروں کے خالص دودھ میں، لسّی میں اور کچی لسّی میں برکت ڈال۔ ان جانوروں کو چرواہے جہاں بھی لے جائیں، وہاں بہت سی گھاس ہو اور تازہ پھل ہوں، ان کے لئے چشمے پھوٹ نکلیں اور انہیں مال و اولاد کی فراوانی حاصل ہو۔ جس نے نماز قائم کی وہ مسلم ہوگا، جس نے زکوٰۃ ادا کی وہ محسن ہوگا اور جس نے شہادت دی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے وہ مخلص ہوگا۔

اے بنی نہد! زمانۂ شرک میں دیگر قبائل سے تم لوگوں نے جو معاہدے کئے تھے، وہ برقرار رہیں گے اور مملکت اسلامیہ کی طرف سے تم پر جو فرائض عائد کئے جائیں گے، انہیں پورا کرنا ہوگا۔

زکوٰۃ کو مت روکنا، زندگی میں بے راہروی سے بچنا اور نمازوں میں سستی نہ کرنا۔)

اس مختصر گفتگو کے بعد جانِ دوعالم ﷺ نے ان کے لئے ایک تحریر املا کرائی جو نہایت ہی عجیب اور خوبصورت الفاظ پر مشتمل ہے۔ جس کو شوق ہو وہ زرقانی علی المواہب کی جلد چہارم از ص ١٩٣ تا ص ٢١٢ کا مطالعہ کرے۔ وہاں اس تحریر کے علاوہ بھی جانِ دوعالم ﷺ کی فصاحت و بلاغت کے متعدد شہپارے مذکور ہیں۔ اہل علم سے التماس ہے کہ اس جہانِ حیرت کی ضرور سیر کریں۔

ہی لگتا تھا۔

حُسنِ صَوت

کلام فصیح ہو، کلمات واضح ہوں، مگر آواز کرخت ہو تو الفاظ کی فصاحت اور وضاحت بے اثر ہو جاتی ہے۔ انبیاء کرام چونکہ داعی و مبلغ ہوتے ہیں اور تبلیغ مؤثر تب ہی ہوسکتی ہے، جب الفاظ وحروف کے ساتھ ساتھ لہجہ وآواز بھی دلکش ہو، اس لئے اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کرام کو عمدہ گلا اور خوبصورت آواز عطا فرمائی تھی۔ پھر جانِ دو عالم ﷺ تو داعی اعظم ہیں، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ کی آواز کو بھی دیگر انبیاء کی آوازوں سے بدرجہا زیادہ حسین وشیریں بنایا تھا۔

یہ بات ہمیں حضرت انسؓ نے بتائی ہے۔ فرماتے ہیں

''مَابَعَثَ اللّٰہُ نَبِیًّا اِلَّاحَسَنَ الْوَجْہِ، حَسَنَ الصَّوْتِ، وَکَانَ نَبِیُّکُمْ اَحْسَنَھُمْ وَجْھًا وَاَحْسَنَھُمْ صَوْتًا.''

(اللہ تعالیٰ نے جو نبی بھی بھیجا، اس کو خوبصورت چہرے اور عمدہ آواز سے نوازا، مگر تمہارے نبی ﷺ کا چہرہ سب سے زیادہ حسین تھا اور آواز سب سے بڑھ کر دلنواز تھی۔)

مردانہ آواز میں کشش و جاذبیت تین چیزوں سے پیدا ہوتی ہے۔

آواز کا بھاری اور بلند ہونا، میٹھا اور شیریں ہونا اور اس میں نغمگی اور ترنم کا پایا جانا۔ یہ تینوں صفات جانِ دو عالم ﷺ کی آواز میں بدرجۂ اتم پائی جاتی تھیں۔

(الف) ام معبد کہتی ہیں ''فِیْ صَوْتِہٖ صَحَلٌ'' (آپ کی آواز میں بھاری پن تھا۔)

آواز کی بلندی کا یہ عالم تھا کہ آپ مسجد نبوی میں اونچی آواز سے خطبہ دیا کرتے تھے تو مدینہ کے تمام گھروں میں آپ کی آواز سنائی دیتی تھی۔ حضرت براء بن عازبؓ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں خطبہ دیا، جسے گھروں میں پردوں کے اندر بیٹھی ہوئی عورتوں نے بھی سن لیا۔

ایک دفعہ جانِ دو عالم ﷺ خطاب کے لئے منبر پر چڑھے تو حاضرین سے

فرمایا---''اِجْلِسُوْا!'' (بیٹھ جاؤ!) حضرت عبداللہ بن رواحہؓ نے یہ فرمان محلہ بنی غنم میں سن لیا، حالانکہ وہ جگہ مسجد سے ہٹی ہوئی تھی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جانِ دو عالم ﷺ نے تو صرف حاضرین کو بیٹھنے کے لئے کہا تھا مگر حضرت عبداللہ بن رواحہؓ، آپ کا فرمان سن کر جہاں تھے وہیں بیٹھ گئے۔

حجۃ الوداع کے موقع پر جانِ دو عالم ﷺ کے ساتھ ایک لاکھ سے زیادہ صحابہ کرامؓ تھے، جن کے خیمے منیٰ میں دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ حضرت عبدالرحمٰن ابن معاذؓ کہتے ہیں کہ منیٰ میں رسول اللہ ﷺ نے ہم سے خطاب فرمایا۔ آپ کی آواز اتنی بلند تھی کہ ہم نے اپنے اپنے خیموں میں آپ کا خطاب پوری طرح سن لیا۔

(ب) آواز میں شیرینی اور مٹھاس اس قدر تھی کہ سننے والا اس کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ ام معبد کہتی ہیں

''اِذَا تَکَلَّمَ سَمَا وَعَلَاہُ الْبَھَآءُ، حُلُوَّ الْمَنْطِقِ'' (جب آپ بولتے تھے تو سامعین پر چھا جاتے تھے اور چہرے پر رونق آ جاتی تھی، میٹھی میٹھی باتیں کرنے والے تھے۔)

اعلیٰ حضرت آپ کی شیریں باتوں پر شیریں درود پیش کرتے ہیں

میٹھی میٹھی عبارت پہ شیریں درود
اچھی اچھی اشارت پہ لاکھوں سلام (١)

(ج) آپ کی آواز میں ترنم بھی رچا بسا تھا۔ حضرت جبیر ابن مطعمؓ آپ کے

---

(١) دوسرے مصرعے میں جانِ دو عالم ﷺ کے اشارہ کرنے کی عادت پر سلام ہے۔ آپ کا معمول تھا کہ اپنی بات کی وضاحت کرنے کے لئے حسبِ موقعہ ہاتھوں اور انگلیوں سے اشارہ کیا کرتے تھے۔ مثلاً ایک دفعہ فرمایا---''جو شخص یتیم کی کفالت کرے گا، وہ جنت میں اس طرح میرے ساتھ ہوگا''---اور اپنی دونوں انگلیوں کو باہم ملا کر دکھایا۔ ایک بار فرمایا---''اَلتَّقْوٰی ھٰھُنَا'' (تقویٰ یہاں پایا جاتا ہے۔) اور دل کی طرف اشارہ کیا۔ اس طرح کے متعدد حسبِ حال وضرورت اشارات حدیث کی کتابوں میں مذکور ہیں۔

بارے میں فرماتے ہیں "حَسَنُ النَّغْمَةِ" عمدہ نغمگی والے تھے۔

کیا عجیب منظر ہوتا ہوگا، جب آپ اپنی نغمہ بار اور ترنم ریز آواز میں دنیا کا سب سے فصیح کلام قرآن مجید پڑھتے ہوں گے!

حضرت براء بن عازبؓ کہتے ہیں

"قَرَءَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ فِی الْعِشَآءِ "وَالتِّیْنِ وَ الزَّیْتُوْنِ" فَلَمْ اَسْمَعْ صَوْتًا اَحْسَنَ مِنْهُ."

(رسول اللہ ﷺ نے عشاء کی نماز میں سورۃ التین پڑھا اور ایسے خوبصورت لہجے میں پڑھا کہ میں نے اس سے زیادہ حسین آواز کبھی نہیں سنی۔)

جانِ دو عالم ﷺ کے خوش آہنگ گلے کی یہ تمام خصوصیات ذہن میں رکھئے اور پھر دیکھئے کہ اعلیٰ حضرتؒ نے اس گلے کی تروتازگی اور نضارت پر کیا دلآویز سلام پیش کیا ہے

جس میں نہریں ہیں شیر و شکر کی رواں
اس گلے کی نضارت پہ لاکھوں سلام

مَنظر کَشی

جانِ دو عالم ﷺ کے انداز بیان کا ایک اور وصف، کمال درجے کی منظر کشی ہے۔ جنت کے انعامات، دوزخ کی مہلکات، قبضِ روح کی کیفیات، برزخ کے حالات اور حشر ونشر کی مشکلات، سب "غیب" کے زمرے میں داخل ہیں۔ اسی لئے ان پر ایمان کو "اِیْمَان بِالْغَیْب" کہا جاتا ہے، مگر جانِ دو عالم ﷺ جب اپنے مخصوص انداز میں ان مراحل کی تفصیلات بیان کرتے تھے تو سامعین کے سامنے ایک نقشہ سا کھنچ جاتا تھا اور انہیں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہم یہ چیزیں دیکھ رہے ہیں۔

حضرت حنظلہؓ نے ایک موقع پر اس کیفیت کو یوں واضح کیا

"نَکُوْنُ عِنْدَ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ یُذَکِّرُنَا بِالْجَنَّةِ وَالنَّارِ کَاَنَّا رَأْیَ عَیْنٍ."

(جب ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھے ہوتے ہیں اور آپ ہمیں جنت اور دوزخ کے بارے میں بتا رہے ہوتے ہیں تو ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ تمام مناظر ہمیں

اپنی آنکھوں سے دکھائی دے رہے ہوں۔)

اثر انگیزی

جانِ دو عالم ﷺ کے جو خطبات حدیث و سیرت کی کتابوں میں منقول ہیں وہ سب فصاحت و بلاغت کے شہپارے ہیں اور نہایت ہی مؤثر ہیں مگر وہی الفاظ جب آپ کی زبان خوش بیان اور آواز دلنواز میں ادا ہوتے تھے تو ایک سماں بندھ جاتا تھا اور سامعین پر رقت قلب، سوز و گداز اور خشیت الٰہیہ کی ایسی کیفیت طاری ہو جاتی تھی کہ وہ بے اختیار اشکبار ہو جاتے تھے اور کبھی چپکے چپکے آنسو بہانے لگتے تھے کبھی نالہ و فغاں ضبط کرنے کے لئے منہ چھپا لیتے تھے اور کبھی بیساختہ چیخ پڑتے تھے۔

حضرت عرباضؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول ﷺ نے ایک دفعہ ہم سے خطاب فرمایا، جس سے دلوں پر خشیت طاری ہوگئی اور آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

حضرت انسؓ بتاتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے بے مثال خطبہ دیا اور جب یہ کہا کہ جو کچھ میں جانتا ہوں اگر تم جان لو تو تمہارا ہنسنا کم ہو جائے اور رونا زیادہ تو لوگوں نے اپنے چہرے ڈھانپ کر رونا شروع کر دیا۔

حضرت اسماءؓ کہتی ہیں کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ نے موت کے بعد پیش آنے والے حالات بتائے تو لوگ بے ساختہ چیخ اٹھے۔

صحابہ کرامؓ کی دل گدازی کا تو یہ عالم ہو گیا تھا کہ ابھی جانِ دو عالم ﷺ گفتگو کا آغاز ہی کرتے تھے کہ صحابہؓ کی حالت روتے روتے دگرگوں ہو جاتی تھی۔

ایک دن جانِ دو عالم ﷺ خطبہ دینے کے لئے رونق افروز ہوئے اور فرمایا

''قسم ہے اس ذات کی، جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔''

یہ قسم آپ نے تین بار اٹھائی اور مزید کچھ کہے بنا خاموش ہو گئے مگر صحابہ کرام کے لئے آپ کی یہ قسم ہی کافی تھی، اسی کو سن کر سر جھکا لئے اور رونے لگ گئے، حالانکہ اس روایت کے راوی حضرت ابو سعید خدریؓ کہتے ہیں کہ ہمیں کچھ پتہ نہیں تھا کہ رسول اللہ ﷺ کیا بات کہنا چاہ رہے ہیں، جس کے لئے آپ نے قسم اٹھائی ہے۔

قارئینِ کرام! تاریخ عالم میں ایسی اثر انگیزی کہیں سنی یا پڑھی آپ نے---!!؟

اس کی باتوں کی لذت پہ بے حد درود
اس کے خطبے کی ہیبت پہ لاکھوں سلام

ذقن مُبارک

جانِ دو عالم ﷺ کی ذقن، یعنی ٹھوڑی کی ساخت اور بناوٹ کی تفصیل مجھے تلاشِ بسیار کے باوجود نہیں مل سکی۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ ریش مبارک کے نیچے چھپ جانے کی وجہ سے، آپ کا حلیہ بیان کرنے والوں نے اس کا مفصل تذکرہ کرنا ضروری نہ سمجھا ہو؛ تاہم آپ کے چہرے کی مجموعی ساخت سے ٹھوڑی کے حسن واعتدال کا اندازہ بخوبی کیا جاسکتا ہے، کیونکہ لمبی اور نیچے کو نکلی ہوئی ٹھوڑی سے چہرہ لمبوترا اور مخروطی سا ہو جاتا ہے اور بہت چھوٹی اور اندر کو دھنسی ہوئی ٹھوڑی سے چہرہ بالکل گول نظر آنے لگتا ہے جب کہ جانِ دو عالم ﷺ کے بارے میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں۔

''لَمْ یَکُنْ بِالْمُطَهَّمِ وَلَا بِالْمُكَلْثَمِ، وَكَانَ فِيْ وَجْهِهٖ تَدْوِیْرٌ.''

(رسول اللہ ﷺ کا نہ تو رنگ کالا تھا، نہ چہرہ گول مٹول؛ البتہ چہرے میں کسی قدر گولائی ضرور تھی۔)

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی ٹھوڑی نہایت ہی متوازن، متناسب اور معتدل تھی۔ نہ بہت لمبی کہ چہرہ مستطیل دکھائی دینے لگے، نہ بہت چھوٹی کہ چہرہ بالکل مدور نظر آنے لگے۔

کان مبارک

پیشانی سے ٹھوڑی تک جانِ دو عالم ﷺ کے روئے بے مثال وخوش جمال کا تذکرہ مکمل ہوا۔ اب آپ کے کانوں کے متعلق گفتگو کرتے ہیں۔

جہاں تک آپ کے کانوں کی ظاہری شکل وصورت کا تعلق ہے تو حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ''تَامُّ الْاُذُنَیْن'' تھے۔ یعنی آپ کے کان مکمل اور تام تھے،

کہیں سے کٹے پھٹے ہوئے نہیں تھے۔

چونکہ چہرۂ انور کا رنگ سرخی مائل سفید تھا، اس لیے کان بھی ویسی ہی رنگت رکھتے تھے، جب کہ بال بھرپور سیاہ تھے۔ داڑھی اور سر کے مکمل طور پر کالے بالوں میں سفید رنگ کے ابھرے ہوئے کان عجیب دلآویز نظارہ پیش کرتے تھے۔

اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ کالی زلفوں میں آپ کے سفید کان یوں دکھائی دیتے تھے، جیسے تاریکی میں روشن ستارے چمک رہے ہوں --- **كَاَنَّمَا تُوْقَدُ الْكَوَاكِبُ الدُّرِّيَّةُ بَيْنَ ذٰلِكَ السَّوَادِ.**

ظاہری جمال کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے کانوں کو غیر معمولی سماعت کا کمال بھی عطا کر رکھا تھا۔ خود فرماتے ہیں

''اَسْمَعُ مَالَا تَسْمَعُوْنَ.'' (جو کچھ میں سنتا ہوں وہ تم نہیں سنتے۔)

واقعی، ہم کیا اور ہمارا سننا کیا---!!

ہم صرف وہی آواز سن سکتے ہیں جو سنتے وقت پیدا ہو رہی ہو۔ جدید آلات کے ذریعے ماضی میں بھری گئی کیسٹوں کی آواز بھی سنی جا سکتی ہے مگر مستقبل میں پیدا ہونے والی آواز ہم قطعاً نہیں سن سکتے، خواہ وہ صرف ایک سیکنڈ بعد پیدا ہونے والی ہو--- نہ اپنے کانوں سے، نہ کسی آلے کی مدد سے؛ جبکہ جانِ دو عالم ﷺ بغیر کسی آلے کے ہزاروں سال بعد پیدا ہونے والی آواز سن لیتے تھے۔

متفق علیہ حدیث ہے کہ ایک دن نمازِ فجر کے وقت رسول اللہ ﷺ نے حضرت بلالؓ سے کہا

''بلال! مجھے بتاؤ کہ اسلام لانے کے بعد تم نے کونسا ایسا عمل کیا ہے، جس پر تمہیں بہت زیادہ ثواب کی امید ہے، کیونکہ میں نے جنت میں اپنے آگے تمہارے جوتوں کی آہٹ سنی ہے۔''

حضرت بلالؓ نے عرض کی---''یارسول اللہ! اور تو کوئی ایسا عمل نہیں ہے؛ البتہ یہ ہے کہ دن ہو یا رات، میں جب بھی وضو کرتا ہوں تو چند رکعات نفل ضرور پڑھ لیتا ہوں۔

جس وقت جانِ دو عالم ﷺ نے حضرت بلالؓ سے یہ بات کہی تھی، اس وقت حضرت بلالؓ زندہ موجود تھے اور ابھی جنت میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ نہ جانے کب قیامت برپا ہوگی اور کب حضرت بلالؓ آپ کے آگے آگے خادمانہ انداز سے چلتے ہوئے جنت میں داخل ہوں گے مگر آپ کی بے انتہا غیر معمولی سماعت کا اندازہ کیجئے کہ آپ نے ہزاروں سال بعد پیدا ہونے والی حضرت بلالؓ کے جوتوں کی آہٹ کو اس وقت سن لیا تھا؛ جبکہ حضرت بلالؓ ابھی مدینہ منورہ میں بقید حیات تھے۔

صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلٰی حَبِیْبِهٖ وَسَمْعِهٖ وَسَمَاعَتِهٖ اَلْفَ اَلْفَ مَرَّةٍ.

جس طرح بُعدِ زمانہ جانِ دو عالم ﷺ کی سماعت میں حائل نہیں ہوتا تھا، اسی طرح بُعدِ مکان بھی آپ کے سننے میں رکاوٹ نہیں بنتا تھا۔ فرماتے ہیں

''اِنِّی اَسْمَعُ اَطِیْطَ السَّمَآءِ'' (میں آسمان کی چرچراہٹ سنتا ہوں۔)

(مسند امام احمد)

آسمان کی دوری کا یہ عالم ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے--- وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ ..... بے شک ہم نے آسمانِ دنیا کو چراغوں سے مزین کیا ہے۔

آسمانِ دنیا سے مراد پہلا آسمان ہے اور اس کے چراغ، چمکتے دمکتے ستارے ہیں۔ گویا قرآن کے مطابق تمام ستارے پہلے آسمان کی تزئین و آرائش کے لئے بنائے گئے ہیں اور ہمارے علم الافلاک کی کم مائیگی کا یہ حال ہے کہ آسمان تو کجا، ابھی تک ان ستاروں کے بارے میں بھی پوری طرح پتہ نہیں چل سکا جو آسمان کی زینت ہیں کہ ان کی تعداد کتنی ہے اور ان کی محیر العقول مسافتوں کی مقدار کیا ہے---!

اب تک جو معلومات حاصل ہوئی ہیں، ان کے مطابق بعض چمکدار سیارے زمین سے کئی لاکھ نوری سال کے فاصلے پر ہیں۔ یعنی اگر زمین سے کوئی چیز ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے روانہ ہو تو ان سیاروں تک پہنچنے میں اسے لاکھوں سال لگ جائیں گے۔ پھر آپ خود ہی سوچئے کہ جس چرخ نیلی فام کی زیبائش کے لئے یہ ستارے اور سیارے بنائے گئے ہیں، وہ خود کتنے لاکھ یا کروڑ یا ارب نوری سال کے فاصلے پر

ہوگا---!!

اس بات کو ذہن میں رکھیئے اور پھر دل کی گہرائیوں سے درود و سلام بھیجئے، علم و خبر کے اس بحرِ بے کراں پر جس کے کان آسمان کی چرچراہٹ کو مدینہ منورہ میں سن لیتے تھے---!!!

دور و نزدیک سے سننے والے وہ کان
کانِ لعلِ کرامت پہ لاکھوں سلام

رِیش مُبارک

جانِ دو عالم ﷺ کی داڑھی گھنی اور بڑی تھی جس سے آپ کا سینہ ڈھک جاتا تھا۔ صحابہ کرامؓ بیان کرتے ہیں

''كَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ كَثَّ اللِّحْيَةِ، تَمْلَأُ صَدْرَهٗ.''

(رسول اللہ ﷺ گھنی داڑھی والے تھے، جو آپ کے سینے کو بھر دیتی تھی، یعنی ڈھانپ لیتی تھی۔)

مگر واضح رہے کہ آپ کی داڑھی بے ڈھب انداز میں بڑھی ہوئی نہیں تھی؛ بلکہ آپ مناسب حد تک اس کو تراش دیا کرتے تھے۔ حضرت عمر ابن شعیبؒ بیان کرتے ہیں

''كَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ يَأْخُذُ مِنْ لِحْيَتِهٖ، مِنْ طُوْلِهَا وَ عَرْضِهَا بِالسَّوِيَّةِ.'' (رسول اللہ ﷺ اپنی داڑھی کو طول و عرض سے برابر برابر کاٹ دیا کرتے تھے۔)

رہا یہ سوال کہ آپ کے کاٹنے کی حد اور مقدار کیا تھی؟ تو اس بارے میں کوئی روایت میری نظر سے نہیں گزری؛ البتہ بعض صحابہ کا معمول تھا کہ وہ ایک مشت سے زائد بال کٹوا دیا کرتے تھے۔

اعلیٰ حضرتؒ نے جانِ دو عالم ﷺ کی داڑھی مبارک پر دو بہت عمدہ شعر کہے ہیں۔ پہلے شعر میں انہوں نے جانِ دو عالم ﷺ کے دہن مبارک کو ''نہرِ رحمت'' قرار دیا ہے اور اس کے گرد نمودار ہونے والے داڑھی اور مونچھوں کے نرم و ملائم بالوں کو نہر کے

کناروں پر اگنے والے سبزے سے تشبیہہ دی ہے، کہتے ہیں

خط کی گرد دہن ، وہ دل آرا پھبن

سبزۂ نہرِ رحمت پہ لاکھوں سلام

غالباً یہ اس دور کی منظر کشی ہے جب جانِ دو عالم ﷺ کی تازہ تازہ داڑھی مونچھیں آئی تھیں اور منہ کے گرد باریک سیاہ خط کی طرح دکھائی دیتی تھیں۔

دوسرے شعر میں جانِ دو عالم ﷺ کے روئے زیبا کو نادر و کم یاب چاند سے تشبیہہ دی ہے اور اس کے گرد احاطہ کئے ہوئے داڑھی کو ماہ کا ہالہ قرار دیا ہے۔

ریشِ خوش معتدل ، مرہم ریش دل

ہالۂ ماہِ ندرت پہ لاکھوں سلام

ابتداء میں داڑھی مکمل سیاہ تھی، بعد میں چند بال سفید ہو گئے تھے۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں---''اِنَّمَا كَانَ الْبَيَاضُ فِىْ عَنْفَقَتِهٖ وَفِىْ صُدْغَيْهِ.''یعنی سفیدی صرف آپ کے زیریں ہونٹ کے نیچے اور کانوں کے پاس تھی۔

مگر یہ سفیدی انتہائی قلیل مقدار میں تھی۔ حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ سر اور داڑھی میں مجموعی طور پر بیس کے لگ بھگ بال سفید تھے اور حضرت انسؓ ان کی تعداد سترہ یا اٹھارہ بتاتے ہیں۔ حضرت انسؓ چونکہ خادمِ خاص تھے اور انہیں جانِ دو عالم ﷺ کو قریب سے دیکھنے کے مواقع زیادہ میسر تھے، اس لئے ان کی بیان کردہ تعداد زیادہ مستند ہے۔

اس قدر کم سفیدی چونکہ داڑھی کی مجموعی سیاہی پر کوئی اثر نہیں ڈالتی، اس لئے اکثر وصّاف آپ کو''اَسْوَدُ اللِّحْيَةِ''اور''شَدِيْدُ سَوَادِ اللِّحْيَةِ''ہی کہتے ہیں۔ یعنی داڑھی مبارک نہایت ہی سیاہ تھی۔

بہر حال سفید بال خواہ تھوڑے ہی ہوں، بڑھاپے کی علامت ہیں اور اگر جانِ دو عالم ﷺ کی مجموعی صحت اور اعتدال طبیعت کو مدنظر رکھتے ہوئے آدمی سوچے تو آپ کے بال آخر تک سیاہ رہنے چاہئے تھے مگر خشیت الٰہیہ کی وجہ سے آپ پر قبل از وقت بڑھاپے کے آثار طاری ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اسی لئے جب صدیق اکبرؓ نے پہلے پہل آپ کے سفید

بال دیکھ کر افسوس بھرے لہجے میں عرض کی تھی کہ ''یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! قَدْ شِبْتَ!''
(یارسول اللہ! آپ تو بوڑھے ہوگئے ہیں۔)
تو آپ نے چند سورتوں کے نام لے کر فرمایا کہ مجھے ان سورتوں نے بوڑھا کر دیا ہے۔(۱)

تراشیدہ مونچھیں

بڑی بڑی مونچھیں نہ صرف یہ کہ بھدی لگتی ہیں؛ بلکہ طبی طور پر بھی انتہائی مضر ثابت ہوتی ہیں کیونکہ ان پر ناک کے ذریعے خارج ہونے والی غیر مصفیٰ گیسوں کی تہہ جم جاتی ہے اور جب پانی وغیرہ پیتے وقت مونچھیں اس میں ڈوبتی ہیں تو انہی گیسوں کا کچھ حصہ دوبارہ اندر چلا جاتا ہے اور ضرر رسانی کا باعث بنتا ہے۔ اسی لئے جانِ دو عالم ﷺ مونچھیں ترشوا دیا کرتے تھے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں ---کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ یَقُصُّ شَارِبَہٗ. (رسول اللہ ﷺ اپنی مونچھوں کو کاٹ دیا کرتے تھے۔)

دوسروں کو بھی اس کی تلقین کیا کرتے تھے۔ ارشاد ہوا---خَالِفُوا الْمُشْرِکِیْنَ، وَفِرُّوْا اللُّحٰی وَاحْفُوا الشَّوَارِبَ. (مشرکین کی مخالفت کرو، داڑھیاں بڑھاؤ اور مونچھیں کٹوا دو۔)

اس سلسلے میں یہاں تک شدت فرمائی کہ اعلان کر دیا---مَنْ لَمْ یَأْخُذْ مِنْ

---

(۱) مختلف روایات کو جمع کرنے سے یہ نو سورتیں بنتی ہیں، جن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

۱۔ ھود پارہ ۱۱، ۱۲	۲۔ واقعۃ پارہ ۲۷	۳۔ حاقۃ پارہ ۲۹
۴۔ معارج پارہ ۲۹	۵۔ مرسلات پارہ ۲۹	۶۔ نبأ پارہ ۳۰
۷۔ تکویر پارہ ۳۰	۸۔ غاشیۃ پارہ ۳۰	۹۔ قارعۃ پارہ ۳۰

چونکہ ان سورتوں میں زیادہ تر قیامت اور حشر ونشر کے احوال واہوال کا بیان ہے اس لئے جانِ دو عالم ﷺ نے فرمایا کہ ان سورتوں نے مجھے بوڑھا کر دیا ہے۔ عام علماء نے یہی وجہ بیان فرمائی ہے لیکن اس میں یہ اشکال ہے کہ اس طرح کے مضامین بعض دیگر سورتوں میں بھی پائے جاتے ہیں، مثلاً انفطار، انشقاق اور زلزال وغیرہ مگر وہ اس فہرست میں شامل نہیں ہیں۔ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ بِحَقِیْقَۃِ الْحَالِ.

شَارِبِه، فَلَيْسَ مِنَّا. (جو شخص اپنی مونچھوں کو نہ تراشے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔)

ایک شخص کی بہت بڑھی ہوئی مونچھیں دیکھیں تو لوگوں سے فرمایا کہ مجھے قینچی اور مسواک لاکر دو۔ دونوں چیزیں پیش کی گئیں تو اپنے دست مبارک سے اس شخص کے ہونٹوں پر مسواک رکھ کر زائد بال کاٹ دیئے۔

اللہ اکبر! کتنا خیال رہتا تھا غمخوارِ امت کو اپنے متعلقین کی اصلاح کا---! آپ اس کو حکم بھی دے سکتے تھے کہ جاؤ اور مونچھیں کٹوا کر آؤ! مگر اپنے ہاتھ سے اس کی مونچھیں تراشنے میں شفقت و محبت اور پیار و الفت کی جو دنیا آباد ہے، اس کا مظاہرہ صرف حکم دینے سے کہاں ہوسکتا تھا---! صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمْ.

گیسوئے پاک

اعلیٰ حضرتؒ، جانِ دو عالم ﷺ کے گیسوؤں کو ابر رحمت کا ٹکڑا قرار دیتے ہوئے یوں سلام پیش کرتے ہیں

وہ کرم کی گھٹا، گیسوئے مشک سا

لکۂ ابر رحمت پہ لاکھوں سلام

گھٹا عام طور پر کالی ہوتی ہے اور مشک، یعنی کستوری تو ہوتی ہی انتہائی سیاہ ہے۔ جانِ دو عالم ﷺ کے گیسوئے پاک بھی داڑھی کی طرح بھرپور سیاہ تھے۔

حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ فرماتے ہیں---كَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ شَدِيْدَ سَوَادِ الرَّاسِ وَالِلّحْيَةِ. (رسول اللہ ﷺ کا سر اور داڑھی انتہائی سیاہ تھی۔)

داڑھی ہی کی طرح سر کے بھی چند بال آخر عمر میں سفید ہوگئے تھے مگر ان کی تعداد اتنی کم تھی کہ صرف اس وقت دکھائی دیتے جب بال خشک ہوں۔ تیل وغیرہ لگانے سے سفیدی اوجھل ہو جاتی تھی۔

حضرت جابر ابن سمرہؓ سے کسی نے پوچھا---''هَلْ كَانَ فِيْ شَعْرِ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ شَيْبٌ؟'' (کیا رسول اللہ ﷺ کے بالوں میں سفیدی پائی جاتی تھی؟)

انہوں نے جواب دیا---لَمْ يَكُنْ فِيْ رَأْسِهٖ ﷺ شَيْبٌ، اِلا شَعْرَاتٌ

فِیْ مَفْرَقِ رَأْسِہٖ، اِذَا ادَّھَنَ وَارَاھُنَّ الدُّھْنُ.''
(رسول اللہ ﷺ کی مانگ میں تھوڑے سے سفید بال تھے، وہ بھی جب آپ تیل لگاتے تھے تو چھپ جاتے تھے۔)

ویسے آپ تیل کا استعمال بہت کثرت سے کرتے تھے۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں ---''کَانَ رَسُوْلُ اللہِ ﷺ یُکْثِرُ دَھْنَ رَأْسِہٖ.'' (رسول اللہ ﷺ بہت تیل لگایا کرتے تھے۔)

تکیے وغیرہ کو تیل سے بچانے کے لئے سر پر کپڑا باندھ لیتے تھے۔ حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں --- کَانَ رَسُوْلُ اللہِ ﷺ یُکْثِرُ التَّقَنُّعَ بِثَوْبِہٖ حَتّٰی کَاَنَّ ثَوْبَہٗ ثَوْبُ زَیَّاتٍ. (رسول اللہ ﷺ سر پر کپڑا لپیٹ لیتے تھے اور (کثرت سے تیل استعمال کرنے کی وجہ سے) وہ اس طرح چکنا ہو جاتا تھا جیسے تیل کا کام کرنے والوں کا کپڑا ہوتا ہے۔)

جانِ دو عالم ﷺ کے بال ساخت کے اعتبار سے نہ تو بہت گھنگھریالے تھے، نہ بہت سیدھے؛ بلکہ ہلکے سے خمدار تھے۔ حضرت انس ؓ فرماتے ہیں ---''لَا رَجِلٌ بَسَطٌ، وَلَا جَعْدٌ قَطَطٌ'' (نہ بالکل سیدھے، نہ زیادہ خم والے۔)

جب آپ کنگھی کرتے تو کنڈل کھل جاتے اور زلفیں پہلے سے لمبی دکھائی دینے لگتیں بعد میں پھر سکڑ جاتیں۔ اسی وجہ سے احادیث میں آپ کے بالوں کی لمبائی میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض صحابہ کرام نے آپ کے بالوں کو ''وَفْرَۃ'' قرار دیا ہے، بعض نے ''لِمَّہ'' اور بعض نے ''جُمَّہ''۔ وَفْرَہ، ان بالوں کو کہا جاتا ہے جو کانوں کی لو تک ہوں۔ لِمَّہ، وہ جو لو سے تھوڑے سے نیچے ہوں اور جمہ کندھوں تک پہنچ جانے والے بالوں کو کہا جاتا ہے۔

اس اختلاف کی تطبیق بعض علماء نے یوں کی ہے کہ جب آپ بال چھوٹے کراتے تھے تو وفرہ ہو جاتے تھے، جب تھوڑا سا بڑھ جاتے تھے تو لمہ بن جاتے تھے اور مزید دراز ہوتے تھے تو جمہ کہلاتے تھے۔ بعض نے کہا ہے کہ کنگھی کرتے تھے تو لمبے ہو جاتے تھے، پھر سکڑتے رہتے تھے اور پہلے لمہ بنتے تھے، پھر وفرہ ہو جاتے تھے۔

کنگھی کرنا

بالوں میں کنگھی کرنا بھی جانِ دو عالم ﷺ کا معمول تھا۔ حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں ---كَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ يُكْثِرُ تَسْرِيحَ لِحْيَتِهٖ. (رسول اللہ ﷺ اکثر کنگھی کیا کرتے تھے۔)

دوسروں کو بھی اس کی تلقین کیا کرتے تھے۔ حضرت عطاء ابن یسارؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص کو رسول اللہ ﷺ نے دیکھا کہ اس کے سر اور داڑھی کے بال بکھرے ہوئے تھے تو آپ نے اسے بلا کر فرمایا کہ بالوں کو سنوار کر رکھا کرو! وہ شخص واپس چلا گیا اور آپ کے فرمان کے مطابق بالوں میں کنگھی کر کے آیا۔ آپ نے اسے دیکھ کر فرمایا

''اَلَيْسَ هٰذَا خَيْرًا مِنْ اَنْ يَأْتِيَ اَحَدُ كُمْ وَهُوَ ثَائِرُ الرَّأْسِ!''

(کیا یہ بہتر نہیں ہے، بہ نسبت اس کے کہ کوئی پراگندہ بالوں کے ساتھ آئے؟)

فارسی ادب کی دو تراکیب ہیں، جو اردو میں بھی مستعمل ہیں

''دل لخت لخت''---اور---''جگر چاک''

''لخت'' ٹکڑے کو کہتے ہیں۔ ''دل لخت لخت'' اس دل کو کہا جاتا ہے جو غم واندوہ سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہو اور ''جگر چاک'' سے مراد وہ شخص ہوتا ہے جس کا صدمات کی وجہ سے کلیجہ شق ہو گیا ہو۔ کنگھی کے دندانے بھی عاشق کے دل وجگر کی طرح لخت لخت اور چاک شدہ ہوتے ہیں مگر جب آدمی کنگھی کرتا ہے تو درمیان میں بال آ جانے کی وجہ سے دندانوں کے ٹکڑے ایک طرح سے جڑ جاتے ہیں اور ان کے چاک سل جاتے ہیں۔ اس مناسبت سے اعلیٰ حضرت بریلویؒ نے جانِ دو عالم ﷺ کے کنگھی کرنے پر یہ دل کش اور انوکھا سلام پیش کیا ہے۔

لختِ لختِ دلِ ہر جگر چاک سے
شانہ کرنے کی حالت پہ لاکھوں سلام

یعنی شدتِ صدمات سے جس شخص کا جگر چاک ہو چکا ہو، اس کے دل کے ہر ٹکڑے کی جانب سے آپ کے شانہ کرنے کی حالت پہ لاکھوں سلام، کیونکہ یہ منظر دیکھ کر اسے یقین

ہو جاتا ہے کہ میرے دل کے ٹکڑے جوڑنے اور جگر کے چاک سینے کا اہتمام ہو رہا ہے۔

مانگ نکالنا

جس چیز کے بارے میں کوئی صریح حکم نہ ہو، اس میں جانِ دو عالم ﷺ مشرکین کی بنسبت اہل کتاب کی موافقت زیادہ پسند کرتے تھے اور مشرکین مانگ نکالا کرتے تھے، جب کہ اہل کتاب نہیں نکالتے تھے، اس لئے ابتداء میں آپ بھی اہل کتاب کی طرح مانگ نکالنے سے گریز کیا کرتے تھے۔ بعد میں (شاید اس وقت جب مشرکین کا زور ٹوٹ چکا تھا اور ان کی موافقت کا اشتباہ نہیں رہا تھا۔) آپ نے مانگ نکالنا شروع کر دیا۔

بہر حال یہ دونوں عمل سنت ہیں؛ البتہ آخری عمل ہونے کی وجہ سے مانگ نکالنا افضل ہے۔ اعلیٰ حضرتؒ فرماتے ہیں

لَیْلَۃُ الْقَدْرُ میں مَطْلَعُ الْفَجْرُ حق
مانگ کی استقامت پہ لاکھوں سلام

کیا خوبصورت شعر ہے اور کیا ہی جگمگاتی تشبیہات ہیں---!!

کہنا تو یہ چاہتے ہیں کہ آپ کی زلفیں رات کی طرح کالی تھیں مگر عام رات کے ساتھ تشبیہ دینا مناسب نہیں سمجھا، اس لئے مقدس رات یعنی لَیْلَۃُ الْقَدْرُ سے تشبیہ دی ہے اور ان زلفوں میں تابندہ و درخشاں مانگ کو مَطْلَعُ الْفَجْرُ قرار دیا ہے۔ یعنی وہ سیدھی اور استقامت والی مانگ بالوں کی سیاہی میں یوں دمکتی تھی جیسے لَیْلَۃُ الْقَدْرُ میں فجر طلوع ہو رہی ہو۔

سبحان اللہ! اس خوش ذوقی اور لطافت کا کیا کہنا---!!

آئینہ دیکھنا

کنگھی کرتے وقت آئینہ دیکھنا بھی آپ کا معمول تھا۔ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں---''کَانَ یَنْظُرُ فِیْ الْمِرْأَۃِ اِذَا سَرَحَ لِحُیَتَہ''(جب آپ ریش مبارک میں کنگھی کرتے تھے تو شیشہ دیکھا کرتے تھے۔)

خوشبو لگانا

بالوں میں خوشبو بھی استعمال فرمایا کرتے تھے۔ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ

صدیقہؓ ہی بیان کرتی ہیں کہ میں آپ کو اتنی خوشبو لگایا کرتی تھی کہ آپ کی مانگ میں خوشبو کا نشان صاف دکھائی دیتا تھا۔

قارئینِ کرام! یہ تو ہوئے آپ کے مقدس بالوں کے رنگ روپ اور ساخت وغیرہ سے متعلق چند حقائق۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے بالوں سے متعلق چند مزید باتیں ''شہکار ربوبیت'' کے حوالے سے پیش کر دی جائیں۔

مبارک بالوں کا تقسیم فرمانا

آپ ﷺ نے اپنے غلاموں پر یہ کرم بھی فرمایا کہ اپنے بال مبارک اپنے چاہنے والوں میں تقسیم فرما دیتے، تاکہ محبین ان کے ذریعے برکات حاصل کرلیں اور ان کی زیارت سے اپنے من کی دنیا کو آباد رکھیں۔

حضرت انسؓ اس مقدس خیرات کی تقسیم کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ جب آقائے دو جہاں حج کے موقع پر منیٰ تشریف لائے تو جمرۃ العقبہ کو کنکریاں مارنے کے بعد قربانی دے کر اپنے خیمے میں تشریف لائے۔

''ثُمَّ دَعَا بِالْحَلَّاقِ وَنَاوَلَ الْحَلَّاقَ شِقَّهُ الْاَيْمَنَ فَحَلَقَه' ثُمَّ دَعَا اَبَا طَلْحَةَ الْاَنْصَارِىَ فَاَعْطَاهُ، ثُمَّ نَاوَلَ شِقَّهُ الْاَيْسَرَ فَقَالَ : اِحْلِقْ، فَحَلَقَه' فَاَعْطَاهُ اَبَاطَلْحَةَ فَقَالَ: اَقْسِمْهُ بَيْنَ النَّاسِ.'' (مُتفقٌ عَلَيْهِ)

(تو آپ نے حجام کو طلب فرمایا اور پہلے سر کا دایاں حصہ اسکے سامنے کیا۔ اس نے اس جانب کے بال اُتار دیئے تو آپ ﷺ نے ابوطلحہ انصاری کو بلایا اور یہ بال ان کو عنایت فرمائے۔ پھر حجام کو بائیں جانب کے بال تراشنے کا کہا۔ اس نے تراشے تو آپ نے وہ بھی ابوطلحہ کو عطا کئے اور فرمایا کہ یہ لوگوں میں تقسیم کر دو۔)

بوقتِ حجامت بالوں کے حصول کا عجیب منظر

صحابہ آپ کی مقدس زلفوں کے ساتھ اس قدر عقیدت رکھتے تھے کہ جب آپ حجامت کرواتے تو صحابہ آپ کے اردگرد حلقہ باندھ لیتے۔ جیسے جیسے حجام آپ کی حجامت بناتا، دیوانے اپنی جھولیاں رحمتوں کے خزانوں سے بھرتے جاتے۔ آپ کے مبارک بالوں

میں سے کسی ایک بال کو بھی زمین پر نہ گرنے دیتے؛ بلکہ اپنی اپنی ہتھیلیوں پر اٹھا لیتے۔ یہ سہانا منظر حضرت انسؓ کی زبان سے سنیئے!

رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ وَالْحَلَّاقُ يَحْلِقُه' وَطَافَ بِهٖ اَصْحَابُه' فَمَا يُرِيْدُوْنَ اَنْ تَقَعَ شَعْرَةٌ اِلَّا فِيْ يَدِ رَجُلٍ. (المسلم كتاب الفضائل)

(میں نے اپنے آقا ﷺ کو اس حال میں دیکھا کہ حجام آپ کی حجامت کر رہا تھا اور صحابہ آپ کے اردگرد حلقہ باندھے ہوئے تھے۔ وہ آپ کا کوئی بال بھی زمین پر نہیں گرنے دیتے تھے؛ بلکہ اپنے ہاتھوں پر اٹھا لیتے تھے۔)

ہمیں دولتِ کونین ملی

صحابہ کرام آپ ﷺ کے مبارک بالوں کو حاصل کر کے محفوظ کر لیتے اور فخریہ طور پر یہ بیان کرتے کہ ان کے پاس آقا علیہ السلام کا موئے مبارک ہے اور اسے کونین سے بڑھ کر دولت تصور کرتے ہوئے اپنے ساتھ دفن کرنے کی وصیت کرتے۔

مشہور تابعی محمد ابن سیرینؒ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عبیدہ سلمانیؒ کو بتایا کہ ہمارے پاس رسالت مآب ﷺ کے مبارک بال ہیں، جو ہمیں آلِ انس سے ملے ہیں۔

اس پر حضرت عبیدہؒ نے فرمایا

لَاَنْ تَكُوْنَ عِنْدِيْ شَعْرَةٌ مِّنْهُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا. (بخاری، ج۱، ص ۲۹) (میرے پاس آقا علیہ السلام کے ایک بال کا ہونا مجھے دنیا و مافیہا سے بڑھ کر محبوب ہے۔)

محبت اور حصول برکت کی خاطر وہ صحابہ اور تابعین جن کے پاس آپ ﷺ کے موئے مبارک ہوتے وصیت کر جاتے کہ انہیں ہمارے ساتھ کفن میں رکھ دینا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی وصیت

آپ ﷺ کے خادم خاص حضرت انسؓ کے بارے میں حضرت ثابت بنانی بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت انسؓ کی موت کا وقت آیا تو انہوں نے مجھے وصیت کی کہ اے ثابت! یہ میرے آقا کا مقدس بال لے لو۔ جب میں فوت ہو جاؤں تو اسے میری زبان کے

نیچے رکھ کر مجھے دفن کر دینا۔

هٰذِهٖ شَعْرَةٌ مِنْ شَعْرِ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ فَضَعْهَا تَحْتَ لِسَانِيْ. قَالَ فَوَضَعْتُهَا تَحْتَ لِسَانِهٖ فَدُفِنَ وَهِيَ تَحْتَ لِسَانِهٖ. (اَلْاِصَابَةَ فِيْ تَمْيِيْزِ الصَّحَابَةِ، ۱: ۷۱)

(یہ میرے آقا کا بال مبارک ہے۔ جب میں فوت ہو جاؤں تو اسے میری زبان کے نیچے رکھ دینا۔ میں نے آپ کے وصیت کے مطابق وہ بال آپ کی زبان کے نیچے رکھ دیا۔ پس آپ کو اس حال میں دفن کیا گیا کہ بال مبارک آپ کی زبان کے نیچے تھا۔)

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وصیت

حضرت معاویہؓ کی وفات کا وقت آیا تو انہوں نے اپنے اہل خانہ کو وصیت فرمائی کہ رسالت مآب ﷺ کے بال اور ناخن مبارک جو میرے پاس موجود ہیں، انہیں تدفین کے وقت میرے منہ میں رکھ دینا، پھر مجھے اور ارحم الراحمین کو تنہا چھوڑ دینا۔ (تاریخ الخلفاء، ص ۱۳۵) حضرت عمر ابنِ عبدالعزیزؒ نے بھی ایسی ہی وصیت کی تھی۔ (طبقات ابن سعد، ج ۵، ص ۳۰۰)

بالوں کی برکت سے شفاء

جن جن صحابہ کرام کے پاس آپ ﷺ کے موئے مبارک ہوتے وہ ان سے برکتیں حاصل کرتے۔ لوگوں میں سے اگر کوئی بیمار ہوتا تو وہ اس صحابی سے رجوع کرتا، تاکہ اس بال مبارک کے ذریعے شفا حاصل کر سکے۔

حضرت عثمان بن عبداللہؓ بیان کرتے ہیں کہ ام المؤمنین حضرت اُمِ سلمہؓ کے پاس بھی آپ ﷺ کا ایک موئے مبارک تھا جو انہوں نے بڑے ہی ادب و محبت سے چاندی کی ایک ڈبیہ میں رکھا ہوا تھا۔ آپ اس چاندی کی ڈبیہ کو جس میں موئے مبارک تھا، پانی میں رکھ کر حرکت دیتیں، بیمار اس پانی کو پیتا تو شفا پاتا۔ (بخاری، کتاب اللباس)

حضرت امارہؓ بیان کرتی ہیں کہ مقام حدیبیہ میں حضور ﷺ نے حجامت بنوا کر اپنے تمام بال ایک سرسبز درخت کے اوپر پھینک دیئے۔ تمام صحابہ کرام اس درخت کے نیچے

جمع ہوکر اپنی اپنی قسمت کے مطابق بال حاصل کرنے لگے۔ میں نے بھی ان میں سے چند بال حاصل کر لئے۔ اب اگر کوئی شخص بیمار ہوتا ہے تو میں ان مبارک بالوں کو پانی میں ڈبو کر پانی اس مریض کو پلاتی ہوں اور رب العزت اس مریض کو صحت عطا فرما دیتا ہے۔ (شواھد النبوت، ۱۴۸)

شاہ ہرقل کو ہمیشہ دردِ سر رہتا تھا۔ متعدد علاج کرنے کے باوجود شفا نہ ہوئی۔ خوش قسمتی سے اسے آپ ﷺ کا ایک مبارک بال ملا۔ اسے اس نے اپنی ٹوپی میں سی کر اپنے سر پر رکھا تو فوراً درد کافور ہوگیا اور شفا حاصل ہوگئی۔ (اشرف التفاسیر، ۱۲۸)

مُوئے مُبارک اور حصُولِ فتح

آپ کے موئے مبارک کی برکت سے صرف بیمار ہی شفایاب نہ ہوتے تھے؛ بلکہ ان کی برکت سے اللہ تعالیٰ جہاد کے بڑے بڑے معرکوں میں فتح عطا کرتا تھا۔ اس کی شہادت تاریخ اسلام کے مشہور سپہ سالار حضرت خالد بن ولیدؓ یوں دیتے ہیں۔

''ایک دفعہ رسالت مآب ﷺ نے عمرہ ادا فرما کر حجامت بنوائی۔ اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے لوگوں نے آپ کے موئے مبارک حاصل کر لئے اور لوگوں کا وہاں اس قدر جمگھٹا تھا کہ ان کا حصول نہایت ہی دشوار تھا۔

فَسَبَقْتُهُمْ اِلیٰ نَاصِيَتِهٖ فَجَعَلْتُهَا فِیْ هٰذِهِ الْقَلَنْسُوَةِ فَلَمْ اَشْهَدْ قِتَالًا وَهِیَ مَعِیَ اِلَّا رُزِقْتُ النَّصْرَ. (المستدرک، ۳:۲۹۹)

میں نے بھی آپ کی پیشانی مبارک کا ایک بال حاصل کر کے اپنی ٹوپی میں محفوظ کرلیا۔ (اب صورت حال یہ ہے) کہ جب بھی اس بال کو اپنے ساتھ لے کر جنگ میں شریک ہوتا ہوں، فتح پاتا ہوں۔''

ٹوپی کی فکر کیوں؟

جنگ یرموک کے موقع پر حضرت خالد بن ولیدؓ کا مقابلہ نسطورہ نامی ایک پہلوان سے ہو رہا تھا کہ آپ کی ٹوپی زمین پر گر پڑی۔ آپ اس کے مقابلے کے بجائے ٹوپی کی طرف لپکے اور رفقاء کو بھی پکار کر کہا کہ خدا تم پر رحم کرے، میری ٹوپی مجھے دو۔ اتنے میں بنی

مخزوم کی قوم میں سے ایک آدمی نے آپ کو ٹوپی پکڑا دی۔ آپ نے پہن کر مقابلہ کیا، یہاں تک کہ آپ نے نسطورہ کو قتل کر دیا۔

جب جنگ ختم ہوئی تو اہل لشکر نے آپ سے سوال کیا کہ اتنے کڑے وقت میں آپ ٹوپی کی طرف متوجہ کیوں ہوئے؟ اگر وہ اس وقت سر پر نہ بھی ہوتی تو اس سے کیا فرق پڑتا؟ اس پر حضرت خالد بن ولیدؓ نے فرمایا

لَمْ اَفْعَلْهَا بِسَبَبِ الْقَلَنْسُوَةِ بَلْ لِمَا تَضَمَّنَتْهُ مِنْ شَعْرِ رَسُوْلِ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم لِئَلَّا اُسْلَبَ بَرْكَتَهَا وَتَقَعَ فِيْ اَيْدِي الْمُشْرِكِيْنَ. (اَلشِّفَاء، ۲: ۶۱۹)

(میں نے یہ فکر اپنی ٹوپی کی وجہ سے نہیں کی؛ بلکہ اس میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا مبارک بال تھا۔ مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں اس کی برکت سے محروم نہ ہو جاؤں اور یہ کافروں کے ہاتھ نہ لگ جائے۔)

آپ کی اہلیہ اُمِ تمیم رضی اللہ عنہا کا ٹوپی لے کر حالتِ جنگ میں پہنچنا

تاریخ واقدی اور دیگر کتبِ سیر میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت خالد بن ولیدؓ ملک شام میں قوم جبلہ کے مقابلے کے لئے تھوڑی سی فوج لے کر تشریف لے گئے لیکن ٹوپی گھر بھول گئے۔ وقت مقابلہ رومیوں کا ایک بڑا افسر مارا گیا۔ تو جبلہ نے تمام لشکر کو یکبارگی حملے کا حکم دے دیا۔ اس وقت مجاہدین صحابہ کی حالت اتنی پریشان کن تھی کہ رافع بن عمر طائی نے حضرت خالدؓ سے عرض کیا --- ''آج یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہم سب کی موت آ گئی ہے۔

حضرت خالدؓ نے فرمایا --- ''واقعی یوں ہی محسوس ہو رہا ہے۔ افسوس! آج وہ ٹوپی بھول آیا ہوں جس میں حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک تھے۔''

اِدھر یہ حالت تھی، اُدھر حالات سے باخبر آقا علیہ السلام نے اسلامی فوج کے امیر حضرت ابوعبیدہؓ کو خواب میں فرمایا --- ''تم سو رہے ہو، اٹھو! اور فی الفور خالد بن ولید کی مدد کے لئے روانہ ہو جاؤ۔'' چنانچہ تمام لشکر اسی وقت تیار ہو کر بڑی تیزی سے روانہ ہو گیا۔

راستے میں ایک سوار کو دیکھا جو بڑی تیزی سے جا رہا تھا۔ امیر لشکر نے چند افراد کو

حکم دیا کہ اس سوار کے بارے میں معلوم کرو۔ انہوں نے اس کے قریب جا کر پوچھا کہ آپ کون ہیں؟

سوار نے جواب دیا---''میں حضرت خالد بن ولید کی بیوی ام تمیم ہوں۔''

حضرت ابوعبیدہؓ نے سفر کی وجہ پوچھی تو کہنے لگیں---''جب پچھلی رات آپ نے اعلان کیا کہ خالد بن ولید دشمن کے گھیرے میں ہیں اسلئے ان کی مدد کے لئے تمام لشکر تیار ہو جائے تو مجھے خیال آیا کہ خالد جنگ میں ناکام نہیں ہو سکتے کیونکہ ان کے پاس آقا علیہ السلام کے بال مبارک ہیں۔ لیکن بعد میں ان کی اس ٹوپی پر میری نظر پڑی تو مجھے احساس ہوا کہ وہ ٹوپی تو یہیں رہ گئی ہے جس میں وہ موئے مبارک ہیں۔ لہٰذا میں اسی وقت روانہ ہو گئی تا کہ یہ مبارک ٹوپی ان تک پہنچاؤں۔''

چنانچہ حضرت ابوعبیدہؓ نے ان کو لشکر میں شامل کر لیا۔ اُدھر مجاہدین اپنی زندگیوں سے مایوس ہو چکے تھے کہ اچانک تکبیر کی آواز بلند ہوئی۔ سب نے دیکھا کہ ایک عظیم لشکر ہے جو رومیوں کو بھگا رہا ہے۔ حضرت خالدؓ نے ایک سوار کے قریب ہو کر پوچھا کہ تم کون ہو؟

آواز آئی---''میں آپ کی بیوی ہوں۔ آپ کی ٹوپی لائی ہوں۔''

حضرت خالدؓ کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ آپ نے ٹوپی لی اور پہن کر حملہ کیا تو اسی وقت تمام کافر میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔

آپ کے موئے مبارک کی بے ادبی کفر ھے

سیدنا علی المرتضیٰؓ سے منقول ہے کہ رسالت مآب ﷺ نے اپنا موئے مبارک ہاتھ میں پکڑ کر ارشاد فرمایا

مَنْ اٰذٰی شَعْرَۃً مِنْ شَعْرِی فَالْجَنَّۃُ عَلَیْہِ حَرَامٌ. (کَنْزُ الْعُمَّال،۲:۲۷۶)

(جس نے میرے ایک بال کی بھی بے ادبی کی اس پر جنت حرام ہے۔)

ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ آپ ﷺ کے بارے میں خوب ادب و احتیاط سے کام لے۔ (اقتباس ختم ہوا)

گردن مبارک

جانِ دو عالم ﷺ کی گردن مبارک ساخت کے اعتبار سے لمبی اور صراحی دار تھی اور رنگت کے لحاظ سے انتہائی سفید تھی۔

حضرت ہند ابن ابی ہالہؓ فرماتے ہیں

''كَانَ عُنُقُ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ كَجِيْدِ دُمْيَةٍ فِىْ صَفَآءِ فِضَّةٍ.''

(رسول اللہ ﷺ کی گردن (کی ساخت) ایسی تھی، جیسی مورتی کی گردن ہوتی ہے اور اس کی سفیدی وصفائی ایسی تھی جیسی چاندی کی ہوتی ہے۔)

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں

''كَانَ عُنُقُ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ اِبْرِيْقَ فِضَّةٍ.'' (رسول اللہ ﷺ کی گردن چاندی کی صراحی جیسی تھی۔)

نازک اور شفاف اتنی تھی کہ اگر کوئی زور سے آپ کی چادر کھینچتا، جس سے گردن پر دباؤ پڑتا تو گردن مبارک کی جلد پر نشان پڑ جاتا تھا۔

عرب کے بدو اسلامی تعلیمات سے پہلے کسی بھی قسم کے آداب اور تہذیب سے نا آشنا تھے۔ اسلام لانے کے بعد بھی ان کے مزاج کی خشونت خاصی دیر بعد بدلی۔

ایک دفعہ اسی طرح کے ایک بدو نے جانِ دو عالم ﷺ کی چادر کو پیچھے سے زور سے کھینچا اور کہا

مُرْ لِىْ مِنْ مَالِ اللهِ الَّذِىْ عِنْدَكَ. (اللہ کا جو مال آپ کے پاس ہے اس میں مجھے بھی کچھ دینے کا حکم دیجئے!)

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ اس کے زور سے کھینچنے کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کی گردنِ اقدس پر چادر کے کناروں کے نشان پڑ گئے مگر آپ غصہ ہونے کے بجائے بدو کی جانب دیکھ کر ہنس پڑے، پھر اس کو کچھ دینے کا حکم صادر فرما دیا۔

سبحان اللہ! کیا حسنِ خلق اور عالی ظرفی ہے۔

دوش مبارک

مردانہ وجاہت میں کندھوں اور سینے کا چوڑا ہونا خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ جانِ دوعالم ﷺ کے کندھے نمایاں طور پر چوڑے اور ایک دوسرے سے فاصلے پر تھے۔ حضرت براء بن عازبؓ فرماتے ہیں کہ

كَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ بَعِيْدَ مَابَيْنَ الْمَنْكِبَيْنِ. (رسول اللہ ﷺ کے کندھے ایک دوسرے سے دور تھے۔)

باقی جسم کی طرح کندھے بھی سفید تھے۔ حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں كَاَنَّه' سَبِيْكَةُ فِضَّةٍ. (جیسے چاندی سے ڈھالے گئے ہوں۔)

اور حضرت انسؓ ''شِقَّةُ الْقَمَرِ'' کہتے ہیں۔ یعنی چاند کے ٹکڑے۔

اعلیٰ حضرتؒ نے ان مقدس شانوں پر یوں سلام پیش کیا ہے

دوش بر دوش ہے جن سے شانِ شرف
ایسے شانوں کی شوکت پہ لاکھوں سلام

ان شانوں کی شوکت وعظمت کا کیا کہنا کہ ان پر رب العلمین نے خود اپنا دست مبارک رکھا تھا۔

حضرت عبدالرحمٰن ابن عائشؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''میں نے اپنے رب کو بہت خوبصورت شکل میں دیکھا۔ رب کریم نے مجھ سے پوچھا

يَا مُحَمَّدُ! فِيْمَ يَخْتَصِمُ الْمَلَأُ الْاَعْلٰى. (اے محمد! ملاء اعلیٰ کس موضوع پر بحث مباحثہ کر رہے ہیں؟)

میں نے کہا---لَا اَدْرِیْ. (میں نہیں جانتا۔)

فَوَضَعَ كَفَّه' بَيْنَ كَتِفَيَّ حَتّٰى وَجَدْتُّ بَرْدَه' بَيْنَ ثَدْيَيَّ. (تو اللہ تعالیٰ نے اپنا ہاتھ میرے دونوں کندھوں کے درمیان رکھا، یہاں تک کہ اس کی ٹھنڈک میرے پستانوں تک سرایت کرگئی۔) فَتَجَلّٰى لِيْ كُلُّ شَيْءٍ وَ عَرَفْتُ. (پس ظاہر ہوگئی میرے لئے ہر شئے اور میں نے پہچان لیا۔)

بہر حال آپ کا سینہ تو بے شمار علوم و معارف کا گنجینہ تھا ہی، آپ کی توجہ سے دوسروں کے سینے بھی علم کے خزینے بن جاتے تھے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے احادیث کا ایک بہت بڑا ذخیرہ منقول ہے۔ اس قدر حدیثوں کا یاد رکھنا بلاشبہ حیرت انگیز تھا، چنانچہ لوگوں نے اس پر تعجب کا اظہار کیا تو انہوں نے اپنے غیر معمولی حافظے کا راز بتاتے ہوئے کہا کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

''تم میں سے جو کوئی میرے سامنے اپنا کوئی کپڑا بچھا دے اور میں جو کچھ کہنے لگا ہوں اس کے اختتام پر اس کپڑے کو اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لے تو اس کو میری گفتگو کا کوئی حصہ کبھی نہیں بھولے گا۔''

یہ سنتے ہی میں نے اپنی دھاری دار چادر اتاری اور آپ کے روبرو بچھا دی۔ آپ کا بیان ختم ہونے پر میں نے وہ چادر اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لی اور اس ذات کی قسم، جس نے ان کو سچا رسول بنا کر بھیجا تھا، میں ان کی اس گفتگو سے آج تک کوئی حصہ بھی نہیں بھولا۔

مُہرِ نبوت؟

روایات میں ہے کہ جانِ دو عالم ﷺ کی پشت کی جانب بائیں کندھے پر ''مہر نبوت'' تھی جو کستوری کی طرح مہکتی تھی اور منور تھی لیکن مہر نبوت کی تعیین میں روایات اس قدر متعارض ہیں کہ ان میں تطبیق ازبس دشوار ہے۔

۱---مقدار میں اختلاف ہے کہ مسہری کی گھنڈی جتنی تھی، کبوتری کے انڈے جتنی تھی یا بند مٹھی جتنی تھی، جس کے گرد مسوں کی طرح ابھرے ہوئے تل تھے۔

۲---ابھری ہوئی تھی یا اندر کو دھنسی ہوئی؟

۳---اگر ابھری ہوئی تھی تو کس چیز کی بنی ہوئی تھی---؟ گوشت کی یا بالوں کی؟

۴---اس کا رنگ کیا تھا---؟ گوشت کی ہم رنگ تھی، سیاہ تھی، سبز تھی یا سیاہی مائل زرد تھی؟

۵---کب سے تھی---؟ ولادت کے ساتھ ہی موجود تھی، شق صدر کے دوران لگائی گئی تھی، اعلان نبوت کے وقت لگائی گئی تھی، معراج کی رات لگائی گئی تھی،

تینوں مواقع پر لگائی گئی تھی؟

۶---کب تک رہی---؟ وصال کے ساتھ ہی ختم ہو گئی تھی، یا بعد میں بھی باقی رہی تھی؟

۷---اس میں کچھ لکھا تھا یا نہیں؟ اگر لکھا تھا تو کیا---؟ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہِ، تَوَجَّهُ حَيْثُ شِئْتَ فَاِنَّکَ مَنْصُوْرٌ. یا. اَللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِيْکَ لَہٗ.؟

الغرض، یہ ایسی الجھی ہوئی ڈور ہے کہ کوشش بسیار کے باوجود اس کا سرا ابھی تک میرے ہاتھ میں نہیں آسکا۔ محدثین اور مؤرخین نے ان روایات کو تطبیق دینے کے لئے جو توجیہات کی ہیں وہ باہم متعارض ہونے کی وجہ سے اطمینان بخش نہیں ہیں۔ مثلاً مقدار کے اختلاف کو رفع کرنے کے لئے علامہ قرطبیؒ نے یہ توجیہہ کی ہے کہ مہر نبوت کی مقدار گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔ جب چھوٹی ہوتی تھی تو مسہری کی گھنڈی جتنی ہو جاتی تھی اور جب بڑھنے لگتی تھی تو پہلے کبوتری کے انڈے جتنی ہوتی تھی، پھر بند مٹھی جتنی ہو جاتی تھی۔

قطع نظر اس سے کہ علامہ قرطبی کو یہ بات کہاں سے معلوم ہوئی، یہ توجیہہ شیخ عبداللہ شامیؒ کی رائے سے معارض ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مقدار میں کمی بیشی نہیں ہوتی تھی، بلکہ دیکھنے والوں نے اپنے اپنے خیال کے مطابق تشبیہات دی ہیں۔

ان تمام اختلافات کے پیش نظر صرف اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ جانِ دو عالم ﷺ کے بائیں کندھے پر کوئی ایسی نشانی موجود تھی جو سابقہ کتابوں میں آپ کی علامت نبوت کے طور پر مذکور تھی۔ اس سے نورانی شعاعیں پھوٹتی تھیں اور کستوری کی خوشبو مہکتی تھی۔ کئی صحابہ کرام نے اس کو چومنے کی سعادت بھی حاصل کی۔

رہا یہ کہ وہ کتنی تھی، کیسی تھی، کب سے تھی، کب تک رہی اور اس میں کچھ لکھا تھا یا نہیں، اگر لکھا تھا تو کیا---؟ تو ان سوالات کا جواب کوئی بھی قطعیت کے ساتھ نہیں دے سکتا۔ وَاللّٰہُ وَ رَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ.

سینہ مبارک

جانِ دو عالم ﷺ کا سینہ مبارک کشادہ اور فراخ تھا۔ حضرت ہند ابن ابی ہالہؓ فرماتے ہیں

كَانَ رَسُوْلُ اللہِ ﷺ عَرِيْضَ الصَّدْرِ (رسول اللہ ﷺ چوڑے سینے

والے تھے۔)

سینہ آگے کو نکلا ہوا نہ تھا، نہ پیٹ بڑھا ہوا تھا۔ حضرت ہندؓ ہی کا بیان ہے
كَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ سَوَآءَ الْبَطْنِ وَالصَّدْرِ. (رسول اللہ کا سینہ مبارک اور شکم مبارک برابر تھے۔)

سینہ مبارک کے بالائی حصے پر بکثرت بال تھے۔ حضرت ہندؓ ہی بیان کرتے ہیں
كَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اَشْعَرَ الذِّرَاعَيْنِ وَالْمَنْكَبَيْنِ وَاَعَالِیُ الصَّدْرِ. (رسول اللہ ﷺ کے بازوؤں پر، شانوں پر اور سینے کے اوپر والے حصے پر بہت بال تھے۔)

بچپن میں جب آپ حضرت حلیمہ سعدیہؓ کے ہاں تھے تو آپ کا سینہ مبارک فرشتوں نے چاک کیا تھا، جس کی تفصیل جلد اول میں گزر چکی ہے۔ اس چاک کرنے کا اثر آخر تک برقرار رہا۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں آپ کے سینہ اقدس پر سلنے کا نشان دیکھا کرتا تھا۔

یہ تو اس سرچشمہ علوم سینہ کی ظاہری صورت کی بات تھی، جہاں تک اس کی باطنی وسعت و فراخی کا تعلق ہے تو اس کا کون اندازہ کرسکتا ہے---!

ذرا دیکھئے تو---! اللہ تعالیٰ اپنے اس بے پایاں انعام کا احسان جتلاتے ہوئے کتنے پیار بھرے انداز میں پوچھتا ہے ﴿اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ؟﴾ (کیا ہم نے تیرے لئے تیرا سینہ کھول نہیں دیا؟)

بلاشبہ کھول دیا تھا اور ایسا کھولا تھا کہ ارض و سماء کی ہر چیز کا علم اس سینے کی وسعت میں سما گیا تھا۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کے شانوں پر اپنا ہاتھ رکھا تو اس کی ٹھنڈک اور برودت آپ کے سینہ اقدس میں اتر آئی اور ایک روایت کے الفاظ یوں ہیں
فَعَلِمْتُ مَافِی السَّمٰوٰتِ وَمَافِی الْاَرْضِ. (جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، سب مجھے معلوم ہوگیا۔)

علامہ آلوسیؒ نے روح المعانی میں شرح صدر کی کیفیت یوں بیان کی ہے
تَاییدُ النَّفْسِ بِقُوَّةٍ قُدْسِيَّةٍ وَاَنْوَارِ اِلٰهِيَّةٍ........فَلَا يُشْغِلُه شَأْنٌ عَنْ

شَأْن، وَيَسْتَوِیْ لَدَيْهِ مَايَكُوْنُ وَ كَائِنٌ وَمَا كَانَ.

(نفس کو قوت قدسیہ اور انوار الٰہیہ سے ایسی قوت عطا کی جائے --- کہ ایک چیز میں مشغولیت دوسری طرف توجہ کرنے میں مانع نہ رہے اور اس کے لئے ماضی، حال اور مستقبل یکساں ہو جائیں۔)

قلبِ مبارک

جانِ دو عالم ﷺ کے قلب انور کی قوت برداشت اور طاقت و توانائی کا یہ عالم تھا کہ اس نے ''قَوْلِ ثَقِيْل ''یعنی قرآن کریم کے نزول کو برداشت کرلیا؛ حالانکہ قرآن کے ثقل وجلال کا تذکرہ خود اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں کیا ہے

﴿لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْآنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَأَيْتَه، خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللهِ.﴾

(اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو تم دیکھتے کہ وہ اللہ کے خوف سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا۔)

گویا قرآن کریم اگر کوہ ہمالیہ پر نازل ہوتا تو اس کے پرخچے اڑ جاتے اور یہ قرآن جانِ دو عالم ﷺ کے دل پر نازل ہوا۔

﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ.﴾ (اس کو روح الامین نے تیرے دل پر نازل کیا ہے۔)

پھر اس دل کی استطاعت و برداشت کا خود ہی اندازہ کیجئے جس نے وہ چیز برداشت کرلی جو ہمالیہ جیسے پہاڑ کو ریزہ ریزہ کر دیتی!

قرآن کریم نے اس مقدس دل کا متعدد مقام پر تذکرہ کیا ہے۔ کہیں فرمایا کہ اے محبوب ہم نے قرآن کو بتدریج اس لئے نازل کیا ہے کہ تیرا دل اس کے ذریعے مضبوط ہو جائے ﴿كَذٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا.﴾

کہیں ارشاد ہوا کہ شب معراج جو کچھ میرے حبیب کی آنکھوں نے دیکھا، دل نے اس کی تصدیق کی ﴿مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَارَاٰى﴾

کسی جگہ فرمایا کہ اے نبی! تیرے گرد پروانوں کا یہ ہجوم اسی لئے تو اکٹھا ہوا ہے کہ

اللہ کی رحمت سے تُو نرم خو ہے، اگر تُو سخت دل ہوتا تو یہ لوگ اِدھر اُدھر ہو جاتے۔

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ.﴾

انبیائے کرام علیہم السلام کے دلوں میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے کہ وہ ہمہ وقت بیدار رہتے ہیں؛ حتیٰ کہ نیند سے بھی ان کی بیداری قلب پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اسی لئے ان کے خواب یقینی وحی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب ہی تو دیکھا تھا، مگر چونکہ وہ وحی تھی اس لئے اپنے بیٹے کو قربان کرنے کے لئے چل پڑے تھے۔

یہ خصوصیت جانِ دو عالم ﷺ کے قلب انور میں بھی بدرجۂ اتم پائی جاتی تھی۔

جانِ دو عالم ﷺ وتر عموماً تہجد کے وقت ادا کیا کرتے تھے۔ ام المؤمنین عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک دفعہ میں نے پوچھا

''اَتَنَامُ قَبْلَ اَنْ تُوْتِرَ؟'' (کیا آپ وتر پڑھنے سے پہلے ہی سو جاتے ہیں؟)

پوچھنے کا مقصد یہ تھا کہ بعض دفعہ آدمی کو جاگ نہیں آتی، اس صورت میں وتر قضا ہو جانے کا خطرہ ہے۔

جانِ دو عالم ﷺ نے جواب دیا---''اِنَّ عَيْنَيَّ تَنَامَانِ وَ لَايَنَامُ قَلْبِيْ.''

(میری صرف آنکھیں سوتی ہیں، دل نہیں سوتا۔)

ظاہر ہے کہ جس ہستی کا دل عالم خواب راحت میں بھی بیدار رہتا ہو، اس کے وتر قضا ہونے کا کیا امکان ہے!

اسی وجہ سے آپ کو نیند کے بعد وضو کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ گہری نیند سوئے ہوئے تھے، یہاں تک کہ آپ کے سانس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اسی دوران بلال آئے اور نماز کے بارے عرض کی۔ چنانچہ آپ نے اٹھ کر نماز ادا کی اور وضو نہیں کیا۔

وضو نہ کرنے کی محدثین یہ وجہ بیان کرتے ہیں

لِاَنَّ مِنْ خَصَائِصِهٖ ﷺ اَنَّ وُضُوْءَهٗ لَايَنْقُضُ بِالنَّوْمِ مُطْلَقًا لِبَقَاءِ

يَقْظَةِ قَلْبِهٖ. (آپ کی خصوصیات میں سے ہے کہ آپ کا وضو نیند سے نہیں ٹوٹتا، کیونکہ آپ کا دل بیدار رہتا ہے۔)

دل سمجھ سے ورا ہے ، مگر یوں کہو
غنچۂ رازِ وحدت پہ لاکھوں سلام

شکمِ مُبارک

پہلے گزر چکا ہے کہ جانِ دو عالم ﷺ کا پیٹ سینے کے ساتھ برابر تھا اور بڑھا ہوا نہیں تھا۔ باقی جسم کی طرح اس کا رنگ بھی انتہائی نورانی تھا۔ حلق سے ناف تک بالوں کی ایک خوبصورت لکیر تھی۔

حضرت ہند ابن ابی ہالہؓ بیان کرتے ہیں کہ آپ کا جسم مبارک بہت منور تھا اور حلق سے ناف تک بالوں کی ایک باریک لکیر تھی۔

یہ لکیر خاصی لمبی تھی۔ اسی لئے حضرت علیؓ نے آپ کو ''طَوِيْلُ الْمَسْرَبَةِ'' کہا ہے، یعنی بالوں کی لمبی لکیر والے۔

متعدد صحابہ کرامؓ کو یہ سعادت حاصل ہوئی کہ انہوں نے آپ کے شکم مبارک کو چوما جن میں حضرت سواد بن غزیہؓ کا واقعہ بہت مشہور ہے کہ غزوۂ بدر میں جب جانِ دو عالم ﷺ مجاہدین کی صفیں سیدھی کر رہے تھے حضرت سوادؓ صف سے کچھ آگے کھڑے ہوئے تھے۔ جانِ دو عالم ﷺ نے ان کے پیٹ پر چھڑی رکھ کر دبائی اور کہا کہ پیچھے ہو جاؤ!

انہوں نے کہا---''یا رسول اللہ! آپ نے تو مجھے دُکھا دیا ہے۔''

جانِ دو عالم ﷺ نے فرمایا کہ بدلہ لے لو اور اپنے پیٹ سے کپڑا اٹھا دیا۔ حضرت سوادؓ لپک کر آپ کے ساتھ چمٹ گئے اور آپ کے شکم پر بوسوں کی بارش کر دی۔

جانِ دو عالم ﷺ نے پوچھا---''سواد! یہ کیا کر رہے ہو تم!؟''

عرض کی---''یا رسول اللہ! جنگ کا مرحلہ در پیش ہے، ہوسکتا ہے کہ یہ آخری ملاقات ہو اور میں یہ چاہتا ہوں کہ میرا آخری عمل یہ ہو کہ آپ کے جسدِ اطہر کے ساتھ میرا جسم مس ہو جائے۔''

شکم مبارک کے اطراف یعنی پہلو بھی سفید تھے۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں---''کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم اَبْیَضَ الْکَشْحَیْنِ.''(رسول اللہ ﷺ کے دونوں پہلو سفید تھے۔)

ایک صحابی نے آپ کے پہلو مبارک کا بھی بوسہ لینے کی سعادت حاصل کی ہے۔ ان کا نام اسید بن حضیرؓ تھا۔ وہ نہایت ظریف الطبع اور ہنسنے ہنسانے والے آدمی تھے۔ ایک دن اپنی پُر لطف گفتگو سے لوگوں کو ہنسا رہے تھے کہ جانِ دو عالم ﷺ نے زور سے ان کے پہلو پر ہاتھ مارا۔

مقصد یہ تھا کہ اب بس بھی کرو۔ انہوں نے کہا---''یا رسول اللہ! مجھے تو آپ نے بہت تکلیف پہنچائی ہے۔''

جانِ دو عالم ﷺ نے فرمایا---''بدلہ لے لو!''

عرض کی---''میرا پہلو ننگا تھا، جب کہ آپ نے قمیص پہن رکھا ہے۔''

یہ سن کر جانِ دو عالم ﷺ نے اپنا قمیص اٹھا دیا تو وہ آپ سے چمٹ گئے اور آپ کے پہلو پر بوسے دینے لگے۔ پھر عرض کی

''بِاَبِیْ اَنْتَ وَاُمِّیْ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ! اِنَّمَا اَرَدْتُّ ھٰذَا.''(میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں یا رسول اللہ! میری مراد یہی تھی۔) یعنی آپ کے پہلو کو چومنا۔

پُشت مبارک

جانِ دو عالم ﷺ کی پشت مقدس کا قرآن کریم میں یوں ذکر کیا گیا ہے

﴿وَوَضَعْنَا عَنْکَ وِزْرَکَ o الَّذِیْ اَنْقَضَ ظَھْرَکَ o﴾

(اور ہم نے اتار دیا تم سے وہ بوجھ جو تمہاری پیٹھ کو توڑے ڈالتا تھا۔)

عائشہ صدیقہؓ نے آپ کو''وَاسِعُ الظَّھْرِ''اور''طَوِیْلُ مَسْرَبَۃِ الظَّھْرِ''کہا ہے۔ یعنی آپ کی پشت مبارک کشادہ تھی اور ریڑھ کی ہڈی لمبی تھی، بالفاظ دیگر لمبی چوڑی پشت تھی جو غیر معمولی قوت وطاقت اور صحت کی علامت ہے۔

پشت انور کا رنگ نہایت سفید تھا۔ حضرت محرشؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول

اللہ ﷺ نے احرام باندھنے کے لئے قمیص اتارا

''فَنظَرْتُ اِلٰی ظَهْرِهٖ كَاَنَّه' سَبِيْكَةُ فِضَّةٍ.'' (تو میں نے آپ کی پشتِ انور کو دیکھا جو ڈھلی ہوئی چاندی جیسی تھی۔)

عام لوگوں کو پشت کے پیچھے کچھ نظر نہیں آتا لیکن جانِ دو عالم ﷺ پیٹھ کے پیچھے بھی دیکھتے تھے۔ فرماتے ہیں

''اِنِّیْ لَاَرَا كُمْ مِنْ وَّرَآءِ ظَهْرِیْ كَمَآ اَرَا كُمْ اَمَامِیْ.'' (میں تمہیں پیٹھ کے پیچھے بھی اسی طرح دیکھتا ہوں جیسے سامنے دیکھتا ہوں۔)

اسی لئے اعلیٰ حضرت نے معنوی مناسبت سے آپ کی پشت کو آئینۂ علم کا چہرہ قرار دیا ہے اور لفظی مناسبت سے قصرِ ملت کی پشتی کہا ہے۔

روئے آئینۂ علم ، پشتِ حضور
پشتیِ قصرِ ملت پہ لاکھوں سلام

بازو مُبارک

جانِ دو عالم ﷺ کے بازو لمبے اور بڑے تھے۔ کلائیاں بھی کشادہ اور مضبوط تھیں۔ مختلف صحابہ کرام نے آپ کو عَظِيْمُ السَّاعِدَيْنِ ، شَبِيْعُ السَّاعِدَيْنِ اور طَوِيْلُ الزَّنْدَيْنِ کہا ہے۔ مفہوم سب کا یہی ہے کہ بازو مکمل مردانہ شان کے حامل تھے۔ یعنی بڑے، لمبے اور مضبوط تھے۔ یہ تمام صفات قوت و توانائی کی علامت ہیں۔ اس لئے اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں

جس کو بارِ دو عالم کی پروا نہیں
ایسے بازو کی قوت پہ لاکھوں سلام

دستِ مبارک

جتنے لوگوں کو بھی جانِ دو عالم ﷺ کے ساتھ مصافحے کی سعادت حاصل ہوئی، وہ سب متفق ہیں کہ آپ کی ہتھیلی مبارک سے زیادہ نرم اور ملائم چیز کوئی نہیں دیکھی۔

عائشہ صدیقہؓ اور حضرت شدادؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ہتھیلی مبارک ریشم

سے زیادہ نرم تھی اور حضرت انسؓ زیادہ تصریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں

''مَامَسَسْتُ حَرِیْرًا وَلَادِیْبَاجًا قَطُّ اَلْیَنَ مِنْ کَفِّ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ.''

(میں نے نہ کبھی کسی ایسے ریشم کو چھوا ہے نہ دیباج کو، جو رسول اللہ ﷺ کی ہتھیلی سے زیادہ نرم ہو۔)

ساخت کے اعتبار سے ہتھیلیاں بھری بھری اور بڑی بڑی تھیں۔ مختلف صحابہ کرام نے آپ کو شَثْنُ الْکَفَّیْنِ، بَسْطُ الْکَفَّیْنِ اور رَحْبُ الرَّاحَۃِ قرار دیا ہے۔ یعنی آپ کی ہتھیلیاں پر گوشت تھیں، پھیلی ہوئی تھیں اور وسیع تھیں۔

ہتھیلی کی مناسبت سے خوش نما انگلیاں بھی لمبی لمبی تھیں۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ آپ سَآئِلُ الْاَطْرَافِ تھے۔ یعنی آپ کی انگلیاں بہتے پانی کی طرح تھیں۔ نہ گانٹھ دار، نہ مڑی ہوئی اور کوتاہ۔

صحابہ کرامؓ کا حسن ادب ملاحظہ فرمایئے کہ ایک صحابی نے ایک سوال کے جواب میں چند چیزیں انگلیوں پر گن کر بتائیں اور کہا کہ یہی سوال رسول اللہ ﷺ سے بھی کیا گیا تھا اور آپ نے اسی طرح انگلیوں پر شمار کر کے جواب دیا تھا۔ پھر فرمایا

''لیکن خیال رہے کہ میری انگلیاں رسول اللہ ﷺ کی انگشتانِ مبارک جیسی نہیں ہیں۔ ان کی انگلیاں بہت خوبصورت اور لمبی تھیں۔''

یہ عجیب بات ہے کہ بھرپور توانائی اور قوت وطاقت والے ہاتھ عام طور پر نسبتاً گرم رہتے ہیں مگر جانِ دو عالم ﷺ کے ہاتھ مبارک ہمیشہ ٹھنڈے رہتے تھے اور ان سے کستوری جیسی دلآویز خوشبو پھوٹتی رہتی تھی۔

جن لوگوں نے آپ کے دست مبارک کو چھونے کی سعادت حاصل کی، ان میں سے چند کے بیانات ملاحظہ فرمایئے!

۱---حضرت شدادؓ کہتے ہیں کہ میں نے آپ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تو وہ ریشم سے ملائم اور برف سے زیادہ ٹھنڈا تھا۔

۲---حضرت ہلالؓ بیان کرتے ہیں کہ میرے والد مجھے رسول اللہ ﷺ کے

پاس لائے تو آپ نے میرے لئے دعا فرمائی پھر میرے سر پر اپنا دستِ شفقت رکھا۔اس کی برودت اور ٹھنڈک مجھے کبھی نہیں بھولتی۔

۳---حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ بتاتے ہیں کہ ایک دفعہ میں بیمار تھا رسول اللہ ﷺ میری عیادت کے لئے تشریف لائے تو میری پیشانی اور سینے پر اپنا ہاتھ پھیرا۔اس کے بعد اب تک میں ان کے ہاتھ کی ٹھنڈک اور خنکی کو اپنے جگر میں محسوس کرتا ہوں۔

۴---حضرت ابو جحیفہؓ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ بطحاء کی طرف تشریف لے گئے وہاں آپ نے وضو کیا اور نمازِ ظہر ادا کی۔اس کے بعد لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور آپ کا دستِ مبارک تبرک کے لئے اپنے چہروں پر پھیرنے لگے۔میں نے بھی آگے بڑھ کر آپ کا دست مبارک اپنے ہاتھ میں لیا اور اپنے چہرے پر پھیرا تو وہ برف سے زیادہ ٹھنڈا اور کستوری سے زیادہ خوشبودار تھا۔

۵---حضرت یزید ابن اسودؓ مقامِ منیٰ کا ایک دلکش نظارا یوں بیان کرتے ہیں

''لوگ تیزی سے آپ کی طرف بڑھے۔میں بھی ان میں شامل تھا۔ان دنوں میں نوجوان اور توانا تھا۔اس لئے لوگوں کو اِدھر اُدھر کرتے ہوئے جلد ہی آپ تک پہنچ گیا اور آپ کا دست اقدس ہاتھ میں لے کر اپنے چہرے اور سینے پر پھیرا۔میں نے کوئی ایسی چیز نہیں دیکھی جو رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ سے بڑھ کر خوشبودار اور ٹھنڈی ہو۔''

۶---حضرت جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ظہر کی نماز رسول اللہ ﷺ کی اقتداء میں پڑھی اور جب آپ مسجد سے باہر تشریف لائے تو میں بھی ساتھ تھا۔مدینے کے بچے آپ کے سامنے آئے تو آپ نے ان کے رخساروں پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔بچوں کے ساتھ مجھے بھی یہ سعادت حاصل ہوگئی اور میں نے آپ کے ہاتھ کی ٹھنڈک کو اپنے رخسار پر محسوس کیا۔آپ کا ہاتھ یوں مہک رہا تھا جیسے ابھی ابھی عطار کی ڈبیہ سے باہر نکلا ہو۔

۷---خوشبو اس قدر زیادہ ہوتی تھی کہ جو شخص آپ سے مصافحہ کرتا اس کے ہاتھ بھی مہک اٹھتے تھے۔حضرت وائل ابنِ حجرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے مصافحے کے بعد میرے ہاتھ مشک سے زیادہ معطر ہو جایا کرتے تھے۔

۸---حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ خوشبو لگاتے یا نہ لگاتے، آپ کے ہاتھ عطار کے ہاتھ جیسے خوشبودار رہتے تھے۔ آپ سے مصافحہ کرنے والا شخص دن بھر اپنے ہاتھ میں خوشبو محسوس کرتا تھا اور اگر آپ کسی بچے کے سر پر ہاتھ رکھ دیتے تھے تو وہ خوشبو کی وجہ سے بچوں میں صاف پہچانا جاتا تھا۔

۹---حضرت عتبہ بن فرقدؓ کی بیوی اُمِ عاصمؓ بیان کرتی ہیں کہ ہم عتبہؓ کی چار بیویاں تھیں اور اعلیٰ سے اعلیٰ عطر استعمال کرکے اپنے شوہر کو خوش کرنا چاہتی تھیں مگر عجیب بات یہ تھی کہ ہمارے شوہر باوجودیکہ خوشبو بالکل نہیں لگاتے تھے، لیکن ان کے جسم سے اٹھنے والی خوشبو کے سامنے ہماری تمام خوشبوئیں ماند پڑ جاتی تھیں۔ ایک دن ہم سب نے مل کر ان سے پوچھا کہ ہم ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر خوشبوئیں لگاتی ہیں مگر اس کے باوجود آپ کی خوشبو ہماری خوشبوؤں پر غالب آجاتی ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟

انہوں نے جواب دیا کہ ایک دفعہ میرے جسم پر پھنسیاں نکل آئی تھیں۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی تکلیف بیان کی تو آپ نے مجھے کپڑے اتارنے کا حکم دیا۔ میں نے ستر ڈھانپ کر باقی کپڑے اتار دیئے تو آپ نے اپنے ہاتھ پر دم کرکے میرے پیٹ اور پیٹھ پر پھیرا۔ بس اس دن سے میرا جسم مہک اٹھا اور اب تک مہک رہا ہے۔

یہ نزاکتیں، لطافتیں اور عطر بیزیاں تو آپ کے ہاتھوں کی ظاہری خصوصیات تھیں۔ جہاں تک ان کی برکات کا تعلق ہے تو وہ حدو حساب سے باہر تھیں۔ بطور تبرک چند واقعات پیش خدمت ہیں۔

۱---کسی کے سینے پر ہاتھ مارتے تو اس کے سینے میں علوم کے سمندر موجزن ہو جاتے۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ نے مجھے یمن کا حاکم بنا کر بھیجنا چاہا تو میں نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! مجھے تو لوگوں کے نزاعی معاملات میں فیصلہ کرنے کا کوئی تجربہ نہیں، پھر میں کس طرح وہاں کے حالات سنبھال سکوں گا؟

یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے اپنا دست مبارک میرے سینے پر مارا۔ اور فرمایا "اے اللہ! اس کے دل کی رہنمائی فرما اور اس کی زبان کو سچائی پر ثابت رکھ!"

حضرت علیؓ فرماتے ہیں---''فَوَالَّذِیْ فَلَقَ الْحَبَّۃَ مَاشَکَکْتُ فِیْ قَضَآءٍ بَیْنَ اِثْنَیْنِ.'' (پس قسم ہے اس ذات کی جو بیج کو پھاڑتی ہے اس کے بعد مجھے دو آدمیوں کے تنازع میں فیصلہ کرتے ہوئے کبھی کوئی تردد نہیں ہوا۔)

۲---کسی کے سینے پر ہاتھ رکھتے تو اس میں ایمان اور عشقِ نبی ﷺ کی شمع فروزاں ہو جاتی اور مریض نسیان کا نسیان دور ہو جاتا۔

فضالہ ابن عمیرؓ کہتے ہیں کہ پہلے مجھے رسول اللہ ﷺ سے سخت عداوت تھی اور میں آپ کو (معاذ اللہ) قتل کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ حجۃ الوداع کے دن جب آپ طواف کر رہے تھے تو میں بھی اس خیال سے ساتھ شامل ہو گیا کہ موقع پا کر آپ کو مار ڈالوں گا۔ دوران طواف اسی خیال سے جب میں آپ کے نزدیک پہنچا تو آپ نے اچانک میری طرف دیکھا اور کہا---''تو فضالہ ہے؟''

میں حیران ہوا کہ آپ میرا نام کیسے جانتے ہیں، بہر حال میں نے کہا

''جی ہاں، میں فضالہ ہی ہوں۔''

فرمایا---''کیا سوچ رہے تھے؟''

میں نے کہا---''کچھ نہیں، بس اللہ کو یاد کر رہا تھا۔''

فرمایا---''اس جھوٹ پر اللہ سے مغفرت طلب کر!''

یہ کہتے ہوئے اپنا ہاتھ میرے سینے پر رکھ دیا اور ابھی آپ نے ہاتھ اٹھایا نہیں تھا کہ میرے دل کی دنیا بدل چکی تھی اور مجھے آپ تمام کائنات سے زیادہ پیارے ہو چکے تھے۔

۳---حضرت عثمان ابن ابی العاصؓ نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! مجھے قرآن یاد نہیں رہتا۔

فرمایا---''یہ خنزب نامی شیطان کی کارستانی ہے---ذرا میرے قریب آ!''

میں قریب ہوا تو آپ نے اپنا دستِ مبارک میرے سینے پر رکھا، جس کی ٹھنڈک میں نے اپنے دونوں کندھوں تک محسوس کی۔ اس کے بعد میں جو کچھ بھی سنتا، مجھے یاد ہو جاتا۔

۴---کسی کے سینے پر ہاتھ پھیرتے تو اس کے نفاق کا خاتمہ ہو جاتا۔

ابو محذورہ یوں تو مسلمانوں کے ساتھ شامل تھا مگر دل میں منافقت تھی اور جانِ دو عالم ﷺ سے نفرت کا زہر سینے میں بھرا تھا۔ ایک دفعہ اس نے ایک مؤذن کی نقل اتارنا شروع کر دی۔ اتفاق سے جانِ دو عالم ﷺ نے اس کی آواز سن لی اور اسے بلا کر اذان دینے کا حکم دیا۔ پھر اپنا ہاتھ اس کی پیشانی پر رکھا اور دو دفعہ اس کے منہ پر پھیرا، پھر ہاتھ نیچے لائے اور سینے سے گذارتے ہوئے اس کی ناف تک پہنچے۔ پھر دعا فرمائی کہ اے اللہ! ابو محذورہ کو بابرکت بنا دے۔

ابو محذورہ کا بیان ہے کہ اس کے ساتھ ہی میرے دل سے رسول اللہ ﷺ کی نفرت ختم ہوگئی اور اس کی جگہ والہانہ محبت نے لے لی۔ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالیٰ عَنْہُ

۵---اگر کسی کے چہرے پر ہاتھ پھیر دیتے تو وہ آخر تک شاداب اور تروتازہ رہتا۔

حضرت خزیمہؓ کے چہرے پر آپ نے بیعت لیتے وقت ہاتھ پھیرا تھا۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ مؤرخین کہتے ہیں---''فَمَا زَالَ وَجْهُه' جَدِيْدًا حَتّٰى مَاتَ.'' (مرتے دم تک ان کا چہرہ تروتازہ رہا۔)

۶---بعض دفعہ آپ کے ہاتھ پھیرنے سے چہرہ آئینے کی مانند شفاف اور عکاس ہو جاتا تھا۔

ایک دفعہ آپ نے حضرت قتادہ ابن طحانؓ کے چہرے پر ہاتھ پھیرا تو وہ اتنا شفاف ہو گیا کہ اس میں ہر چیز کا عکس دکھائی دینے لگا۔

حضرت علاء ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ ایک دن میں ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک آدمی خاصے فاصلے سے گزرا۔ میں نے اس کا عکس قتادہؓ کے چہرے میں دیکھ لیا۔

۷---کسی کا چہرہ روشن اور چمکدار ہو جاتا۔

حضرت اسید ابن ابی ایاسؓ کے چہرے پر آپ نے ہاتھ پھیرا تو وہ اتنا تابناک ہو گیا کہ حضرت اسیدؓ اگر اندھیرے کمرے میں داخل ہوتے تو وہاں روشنی پھیل جاتی۔

۸---حضرت مدلوکؓ کا باقی سر سفید ہو گیا مگر ایک حصہ سیاہ رہا۔ اسی طرح

حضرت سائبؓ کی داڑھی سفید ہوگئی مگر سر کے بال آخر تک سیاہ رہے۔ دونوں کو دیکھ کر لوگوں کو تعجب ہوتا اور ان سے اس کی وجہ پوچھتے تو وہ جواب دیتے کہ یہاں رسول اللہ ﷺ نے ہاتھ پھیرا تھا اس لئے یہ بال سیاہ رہ گئے ہیں؛ جبکہ باقی بال عمر کے تقاضے کے مطابق سفید ہوگئے ہیں۔

الغرض آپ کے دست مبارک کی برکات نوع بنوع اور بے شمار تھیں۔ صحابہ کرامؓ کے بچے اور خادم انہی برکات کو حاصل کرنے کے لئے پانی کے کٹورے ہاتھوں میں لئے مسجد کے باہر کھڑے ہو جاتے اور جب جانِ دو عالم ﷺ باہر تشریف لاتے تو اپنے اپنے برتن آگے کر دیتے اور جانِ دو عالم ﷺ ان میں اپنا ہاتھ مبارک ڈبو کر ان کے پانی کو متبرک بنا دیتے۔ بچوں کے جذباتِ محبت کا آپ کو اس قدر پاس ہوتا تھا کہ آپ شدید سردی میں بھی ٹھنڈے پانی میں اپنا دست مبارک رکھ دیتے تھے کہ کہیں بچوں کا دل نہ ٹوٹ جائے --- کیسے خوش نصیب بچے تھے، جنہوں نے عشق ومحبت کی علیحدہ دنیا آباد کر رکھی تھی۔

رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالیٰ عَنْھُمْ

علاوہ ازیں جانِ دو عالم ﷺ کی انگلیوں سے پانی نکلنا مشہور ومعروف ہے۔ اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں

نور کے چشمے لہرائیں ، دریا بہیں
انگلیوں کی کرامت پہ لاکھوں سلام

دوسری نعت میں انگلیوں کی اسی معجزانہ شان کو یوں بیان کرتے ہیں

انگلیاں ہیں فیض پر، ٹوٹے ہیں پیاسے جھوم کر
ندیاں پنجابِ رحمت کی ہیں جاری ، واہ، واہ!!

ایسے واقعات متعدد مرتبہ پیش آئے جو عنقریب معجزات کے باب میں بیان کئے جائیں گے۔ انشاءاللہ

سَاقِ مقدس

جانِ دو عالم ﷺ کی مبارک پنڈلیاں پر گوشت نہیں تھیں؛ بلکہ نسبتاً پتلی تھیں۔

حضرت جابرؓ فرماتے ہیں---"کَانَ فِیْ سَاقَیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ حَمُوْشَۃٌ۔"(رسول اللہ ﷺ کی پنڈلیوں میں "حموشت" تھی۔) یعنی موٹی نہیں تھیں۔ پنڈلیوں کی رنگت سفید اوراس قدر دل کش تھی کہ دیکھنے والے کو عمر بھر یاد رہتی تھی۔

حضرت ابوجحیفہؓ فرماتے ہیں کہ ایک دن میں مقام ابطح میں رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا۔اس وقت آپ خیمے کے اندر تشریف رکھتے تھے۔تھوڑی دیر بعد حضرت بلالؓ خیمہ سے باہر آئے اوراذان دی، پھر دوبارہ خیمے میں چلے گئے۔ چند لمحوں بعد پھر باہر نکلے تو ان کے ہاتھ میں آپ کے وضو کا بچاہوا پانی تھا۔ یہ دیکھ کر لوگ ان کے گرد کھڑے ہوگئے اور بطور تبرک اس پانی سے تھوڑا تھوڑا حاصل کرنے لگے۔ اس کے بعد حضرت بلالؓ پھر اندر چلے گئے اور ہاتھ میں نیزہ لئے ہوئے برآمد ہوئے۔ ان کے پیچھے رسول اللہ ﷺ بھی باہر تشریف لے آئے اور مجھے یوں لگتا ہے کہ میں آج بھی آپ کی پنڈلیوں کی سفیدی اور چمک اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔

اہل محبت کو جب بھی موقع ملتا، ان مقدس پنڈلیوں پر حصول برکت کے لئے ہاتھ پھیر لیتے تھے یا چوم لیتے تھے۔

حضرت عمر ابن ابی عمرؓ کہتے ہیں کہ مجھے میرے والد مقام منیٰ پر رسول اللہ ﷺ کے پاس لے گئے۔اس وقت آپ سواری پر تھے۔میرے والد نے بتایا کہ یہ اللہ کے رسول ﷺ ہیں تو میں نے نزدیک ہوکر آپ کی پنڈلی پکڑی اور بطور تبرک اس پر اپنا ہاتھ پھیرا۔

حضرت عبداللہ ابن ابی سبقہؓ کہتے ہیں کہ حجۃ الوداع کے دن میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا تو آپ سواری پر تھے، میں فرطِ محبت سے آپ کی ٹانگ سے چمٹ گیا اور آپ کی پنڈلی اور پاؤں کا بوسہ لیا۔

واللہ! کیا ہی سچے عشق والے لوگ تھے---! الفت وعقیدت کے کیسے کیسے گلزار کھلا گئے---!!

اعلیٰ حضرت بریلویؒ نے آپ کی مقدس پنڈلی پر یوں سلام پیش کیا ہے

ساقِ اصلِ قدم ، شاخِ نخلِ کرم
شمعِ راہِ اصابت پہ لاکھوں سلام

یعنی جانِ دو عالم ﷺ کا جسم اطہر ''نخل مکرم'' ہے اور پنڈلی، جو آپ کے پاؤں کی اصل ہے، اس نخل کرم کی شاخ ہے اور حق تک پہنچانے والی راہ میں شمع کی طرح فروزاں ہے۔

پنڈلی کو ''نخل کرم کی شاخ'' اور ''راہ اصابت کی شمع'' قرار دینا بلاشبہ حسن تشبیہ کی معراج ہے۔ نیز پہلے مصرعہ کے حصہ اول کے تین الفاظ حصہ دوم کے تین الفاظ کے ساتھ متجانس وہم وزن ہیں۔ یعنی ساق اور شاخ، نخل اور اصل، قدم اور کرم۔ اس وجہ سے شعر میں مزید روانی اور حسن پیدا ہو گیا ہے۔ فَجَزَى اللّٰهُ الرِّضَا، اَحْسَنَ الْجَزَاءِ.

پاؤں مبارک

زہے عزت و اعتلائے محمدؐ
کہ ہے عرشِ حق زیرِ پائے محمدؐ

جانِ دو عالم ﷺ کے مقدس پاؤں کا حسن و جمال اور کمالات و برکات ''شہکارِ ربوبیت'' کے گرامی قدر مصنف نے بہت عمدہ طریقے سے بیان کی ہیں۔ اس لئے ہم اس کی تلخیص پیش کرنے پر اکتفا کر رہے ہیں۔

قدمین شریفین

حضور سرورِ عالم ﷺ کے دونوں پاؤں مبارک نرم اور پُر گوشت تھے۔ تلوے قدرے گہرے تھے۔ انگلیاں تناسب کے ساتھ لمبی تھیں اور خوبصورتی میں اپنی مثال آپ تھیں۔

قدم مبارک بڑے تھے

آپ کے مبارک قدم میں چھوٹا پن نہ تھا؛ بلکہ دونوں پاؤں مبارک بڑے تھے۔

حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ضَخْمَ الْقَدَمَيْن. (البخاری) (آپ کے مبارک قدم نسبتاً بڑے تھے۔)

دوسری روایت میں ہے

كَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ رَحْبَ الْقَدَمَيْن. (یعنی آپ کے قدم مبارک وسیع تھے۔)

پاؤں مبارک پُر گوشت تھے

حضرت ہند ابن ابی ہالہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے

كَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ شَثْنَ الْقَدَمَيْن. (آپ کے دونوں پاؤں پُر گوشت تھے۔)

مُرقّع حُسن بے مثال

حضرت عبداللہ بن بریدہ رضی اللہ عنہ قدمین کی خوبصورتی بیان کرتے ہیں

كَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اَحْسَنَ الْبَشَرِ قَدَمًا. (نبی اکرم ﷺ کے پائے مبارک تمام انسانوں سے خوبصورت تھے۔)

حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ کے مبارک قدم پُر گوشت اور تناسب کے ساتھ بھاری تھے۔ لَمْ اَرَ بَعْدَه، شَبِيْهًا بِه (میں نے اتنے خوبصورت پاؤں آپ کے بعد کسی کے نہیں دیکھے۔)

انگلیاں لمبی تھیں

حضرت ہند ابن ابی ہالہ رضی اللہ عنہ پاؤں کی انگلیوں کے بارے میں بیان کرتے ہیں۔

كَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ شَثْنَ الْقَدَمَيْنِ سَآئِلَ الْاَطْرَافِ. (رحمت عالم ﷺ کے مبارک پاؤں پُر گوشت تھے اور ان کی انگلیاں لمبی تھیں۔)

آپ کے پاؤں مبارک کی انگشت سبابہ (جو انگوٹھے کے ساتھ ہوتی ہے) باقی انگلیوں کی بنسبت لمبی تھی۔ حضرت میمونہ بنتِ کروم رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے اپنے والدِ گرامی کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی زیارت کا شرف پایا۔ اس وقت آپ اونٹنی پر سوار تھے اور آپ کے ہاتھ میں اس طرح کی چھڑی تھی جیسی اساتذہ کے پاس ہوتی ہے۔

فَدَنَا اَبِىْ فَاَخَذَ بِقَدَمِهٖ فَاَقَرَّ لِرَسُوْلِ اللهِ ﷺ (میرے والد نے قریب ہو کر آپ کا مبارک قدم پکڑ لیا اور حضور علیہ السلام کی رسالت و نبوت کا اعتراف کیا۔)

اس موقعہ پر میں نے آپ کے مبارک پاؤں کی انگلیوں کی زیارت کی۔

فَمَا نَسِيتُ طُولَ اِصْبَعِ قَدَمِهِ السَّبَابَةِ عَلٰى سَآئِرِ اَصَابِعِهٖ. (سبابہ کا پاؤں کی دوسری انگلیوں پر حسنِ طول میں آج تک نہیں بھولی۔)

پاؤں کے تلوے

حضرت ہند ابن ابی ہالہؓ بیان کرتے ہیں کہ آپ کے تلوے گہرے تھے۔

كَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ شَثْنَ الْقَدَمَيْنِ خَمْصَ الْاَخْمَصَيْنِ. (آپ کے دونوں قدم پُرگوشت تھے اور ان کے تلوے قدرے گہرے۔)

ابن الاعرابیؒ سے آپ کے تلووں کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ تلوے قدرے گہرے تھے۔ اتنے گہرے نہ تھے کہ زمین سے زیادہ بلند ہوں اور نہ اتنے برابر تھے کہ بالکل سیدھے ہوں۔ یعنی ان کی گہرائی میں اعتدال تھا۔

پاؤں کی ٹھنڈک

آپ کے مبارک قدموں کو مس کرنے والا ہر شخص ان کی ٹھنڈک محسوس کرتا۔ حضرت میمونہ بنتِ کرومؓ بیان کرتی ہیں کہ میرے والد گرامی نے آپ کے مبارک قدموں کو مس کرنے کے بعد بتایا۔

فَقَبَضْتُ عَلٰى رِجْلِهٖ فَمَا رَأَيْتُ شَيْئًا اَبْرَدَ مِنْهَا. (میں نے آپ کے مبارک پاؤں کو مس کیا تو اس سے بڑھ کر میں نے کسی شے کو ٹھنڈا نہیں پایا۔)

حضرت عمرو ابن ابی عمروؓ بیان کرتے ہیں کہ حجۃ الوداع کے موقعہ پر میری عمر پانچ چھ سال تھی۔ یوم نحر کو میرے والد مجھے پکڑ کر منیٰ میں اس مقام تک لے گئے جہاں آپ ﷺ اپنی سواری پر خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ میں نے والد سے پوچھا کہ یہ شخصیت کون ہیں؟ انہوں نے بتایا کہ یہ اللہ کے رسول ہیں۔ میں یہ سن کر آگے بڑھا اور آپ کے قریب ہوا۔

حَتّٰى اَخَذْتُ بِسَاقِهٖ ثُمَّ مَسَحْتُهَا حَتّٰى اَدْخَلْتُ كَفِّىْ فِيْمَا بَيْنَ اَخْمَصِ قَدَمِهٖ وَالنَّعْلِ فَكَاَنِّىْ اَجِدُ بَرْدَهَا عَلٰى كَفِّىْ. (یہاں تک کہ میں نے آپ کی مبارک پنڈلی کو پکڑ لیا، پھر میں نے اسے تبرکاً چھوا۔ اس کے بعد اپنا ہاتھ آپ کے مبارک

قدموں کے تلوؤں اور نعلین مقدس کے درمیان رکھا۔ پس اب بھی میں اپنے ہاتھ میں ان کی ٹھنڈک محسوس کرتا ہوں۔)

ایڑیاں مبارک

حضرت جابر بن سمرۃؓ آپ کی مقدس ایڑیوں کے بارے میں بیان کرتے ہیں

كَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ مَنْهُوْسَ الْعَقِبِ. (آپ ﷺ کی مبارک ایڑیوں پر بہت کم گوشت تھا۔)

شیخ عبدالحق محدثِ دہلویؒ اپنے شیخ مکرم کی ایڑیوں کے بارے میں لکھتے ہیں

''پاشنہ پائے سیدی موسیٰ الجیلانیؒ در صفا و لطافت بحدے لطیف بود کہ رخسارۂ ہیچ خوش شکلے آنچناں نمی باشد و بود وے قدس سرہ وافر الحظ از حلیۂ رسول اللہ ﷺ۔''

(میرے سرتاج و شیخ موسیٰ جیلانیؒ کی ایڑیاں صفائی اور لطافت میں اس قدر لطیف تھیں کہ کسی خوبصورت انسان کا رخسار بھی اس طرح نہیں تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ قدس سرہ، کو رسول اللہ ﷺ کے حلیہ مبارک سے وافر حصہ ملا تھا۔)

اندازہ کیجئے، کہ جب معمولی خیرات پانے والوں کی ایڑیوں کے حسن کا یہ عالم ہے تو اس تاجدارِ حسن ﷺ کی ایڑیاں کتنی حسین ہوں گی اور اس کے رخسار زیبا کا کیا عالم ہوگا!

مولانا احمد رضا خان بریلویؒ نے کیا خوب کہا

عارضِ شمس و قمر سے بھی ہیں انور ایڑیاں
عرش کی آنکھوں کے تارے ہیں وہ خوش تر ایڑیاں

برکاتِ قدمین شریفین

یہ ساری کائنات آپ کے مبارک قدموں کی برکت ہی ہے۔ یہاں ہم بعض واقعات کا تذکرہ کرتے ہیں تاکہ واضح ہو کہ جن مقامات نے آپ کے مبارک قدموں کو مس کیا، انہیں وہ درجہ ملا جس کی مثال دنیا و آخرت میں نہیں ملتی۔

قدمین شریفین اور ریاض الجنۃ

مسجد حرام کے بعد مسجد نبوی کو تمام مساجد پر فضیلت حاصل ہے مگر اس کا وہ حصہ

جسے ریاض الجنۃ کہا جاتا ہے، مسجد نبوی کے باقی حصوں سے بھی افضل ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ آپ ﷺ دن میں کم از کم پانچ مرتبہ نماز پڑھانے کے لئے حجرۂ مبارکہ سے نکل کر محراب تک تشریف لاتے تھے۔ چونکہ وہاں آپ کا آنا جانا کثرت کے ساتھ تھا، اس لئے وہ جگہ جہاں آپ کے مبارک قدم کثرت کے ساتھ لگے، رِیَاضُ الْجَنَّۃ کہلایا۔ اسی لئے آپ نے فرمایا

مَابَیْنَ بَیْتِیْ وَمِنْبَرِیْ رَوْضَۃٌ مِّنْ رِّیَاضِ الْجَنَّۃِ. (میرے گھر اور منبر کے درمیان جو جگہ ہے، یہ جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے۔)

پاؤں کی ٹھوکر سے چشمہ کا جاری ہونا

حضرت عمرو بن شعیبؓ سے مروی ہے ایک دفعہ آپ اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ مقام ذی المجاز میں تھے۔ یہ مقام عرفات سے تین میل کے فاصلہ پر ہے۔ حضرت ابو طالب کو سخت پیاس لگی۔ کوشش بسیار کے باوجود پانی نہ ملا۔ جب آپ ﷺ نے ان کی پیاس کی شدت کو محسوس فرمایا

فَضَرَبَ بِقَدَمِہٖ الْاَرْضَ فَخَرَجَ الْمَآءُ فَقَالَ اِشْرَبْ. (آپ نے زمین کو قدم سے ایک ضرب لگائی تو اس سے پانی کا چشمہ بہہ نکلا۔ آپ نے فرمایا۔۔۔ ''خوب سیر ہو کر پی لو۔'' جب انہوں نے پانی پی لیا تو آپ نے اسی جگہ قدم رکھا، پانی بند ہو گیا۔

قرآن اور خاکِ پا کی قسم

نبی اکرم ﷺ کا اللہ تعالیٰ کے ہاں جو مقام و مرتبہ ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں اپنے پیارے حبیب ﷺ کے زمانے، گفتگو، چہرہ و زلف اور زندگی کی قسم کھائی ہے، وہاں اس نے آپ کی خاکِ گزر کی بھی قسم کھائی ہے۔ ارشادِ رب العزت ہے

﴿لَا اُقْسِمُ بِھٰذَا الْبَلَدِo وَاَنْتَ حِلٌّ بِھٰذَا الْبَلَدِo﴾ (میں اس شہر کی قسم کھاتا ہوں، جس میں آپ جلوہ افروز ہیں۔)

کسی شہر کی قسم کھانے سے خاکِ پا ہی مراد ہوتی ہے کیونکہ شہر سے مراد وہی سرزمین

ہے جو اس شخصیت کے قدموں سے مس کر رہی ہوتی ہے۔

اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں سیدنا عمر فاروقؓ سے جو قول منقول ہے، وہ نہایت ہی قابلِ توجہ ہے اور اہل ایمان و محبت کے دل کی ٹھنڈک ہے۔ آپ اپنے پیارے آقا علیہ السلام کی خدمت میں عرض کرتے ہیں

بِاَبِیْ اَنْتَ وَ اُمِّیْ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! قَدْ بَلَغْتَ مِنَ الْفَضِیْلَةِ عِنْدَہ' اَنْ اَقْسَمَ بِتُرَابِ قَدَمَیْکَ فَقَالَ لَآ اُقْسِمُ بِھٰذَا الْبَلَدِ. (یارسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں، اللہ تعالیٰ کے ہاں آپ کا کتنا عظیم مرتبہ ہے کہ اس نے آپ کے قدموں کی خاک کی قسم اٹھاتے ہوئے فرمایا ہے، لَآ اُقْسِمُ بِھٰذَا الْبَلَدِ.)

عاشقِ رسول مولانا شاہ احمد رضا خان بریلویؒ نے اس آیت کے مفہوم کو اس شعر میں بیان کیا ہے۔

کھائی قرآں نے خاکِ گزر کی قسم
اس کفِ پا کی حرمت پہ لاکھوں سلام

پہاڑوں کا خوشی سے جُھومنا

بعض اوقات جب آپ اپنے غلاموں کے ساتھ کسی پہاڑ پر تشریف فرما ہوتے تو وہ اس خوشی میں جھومنے لگ جاتا کہ آج مجھے آپ کے مبارک قدموں کا بوسہ نصیب ہوا ہے۔

حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ آپ اُحد پہاڑ پر تشریف فرما تھے۔ آپ کے ساتھ حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ بھی تھے۔ احد نے خوشی و مسرت میں جھومتے ہوئے حرکت کی۔

فَضَرَبَهُ النَّبِیُّ ﷺ بِرِجْلِهٖ وَقَالَ: اُثْبُتْ! فَاِنَّمَا عَلَیْکَ نَبِیٌّ وَّ صِدِّیْقٌ وَ شَھِیْدَانِ. (تو آپ نے اس پر اپنا پاؤں مارا اور فرمایا، ٹھہر جا، تجھ پر ایک نبی، ایک صدیق اور دو شہید ہیں۔)

اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں

ایک ٹھوکر سے اُحد کا زلزلہ جاتا رہا
رکھتی ہیں کتنا وقار اَللّٰہُ اَکْبَرُ ایڑیاں

اسی طرح کا واقعہ (جبل نور) حرا اور جبل ثبیر کے بارے میں بھی ہے۔

ٹھوکر سے سواریوں کا تیز رفتار ہونا

دوران سفر اگر کوئی سواری لاغر و کمزور ہونے یا کسی اور وجہ سے سست رفتار ہو جاتی تو آپ اسے پاؤں کی ٹھوکر لگاتے جس کی برکت سے وہ تمام دیگر سواریوں سے آگے گزر جاتی۔ اس پر احادیث میں متعدد واقعات موجود ہیں۔ ان میں سے چند کا تذکرہ یہاں کیا جاتا ہے۔

حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ میں غزوہ ذات الرقاع کے موقع پر سفر کر رہا تھا۔ میرا اونٹ کمزور اور لاغر تھا جس کی وجہ سے وہ تھک کر بیٹھ گیا۔ حبیب خدا تشریف لائے۔ فرمایا، کیا ہوا؟ سارا ماجرا عرض کیا۔

فَضَرَبَه' بِرِجْلِهٖ وَدَعَالَه' فَسَارَ سَيْرًا لَمْ يَسِرْ مِثْلَه'. (تو آپ نے دعا فرماتے ہوئے اسے پاؤں کی ٹھوکر لگائی۔ اب وہ اتنا تیز رفتار ہوا کہ پہلے کبھی نہ تھا۔)

بخاری شریف میں ہے کہ پھر مجھے میرے آقا نے پوچھا---''اب تیرے اونٹ کا کیا حال ہے؟ میں نے عرض کیا---'' یارسول اللہ! بِخَيْرٍ. قَدْ اَصَابَتْهُ بَرْكَتُكَ.'' (یارسول اللہ! اب ٹھیک ہے۔ اسے آپ سے برکت پہنچ گئی ہے۔)

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص حضور کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور عرض کی۔

''یارسول اللہ! یہ میری اونٹنی ہے جو نہایت سست رفتار ہے۔ اس پر کرم کیجئے۔''

فَاَتَاهَا فَضَرَبَهَا بِرِجْلِهٖ. (آپ اس کے پاس آئے اور اسے پاؤں مبارک سے ٹھوکر لگائی۔)

سیدنا ابو ہریرہؓ قسم اٹھا کر کہتے ہیں۔

لَقَدْ رَاَيْتُهَا تَسْبِقُ الْقَائِدَ. (میں نے اسے دیکھا کہ وہ اس کے بعد کسی سواری

کو اپنے سے آگے نہ بڑھنے دیتی تھی۔)

قدمین شریفین کا بوسہ

تمام انسانیت کی ہمیشہ یہ آرزو رہتی ہے کہ کاش ہمیں آپ کے نقشِ پا کی زیارت و دیدار نصیب ہو۔ صحابہ میں کچھ ایسے خوش قسمت ہیں جن کو آپ کے مبارک قدموں کا بوسہ اور ان کے ساتھ چمٹنا نصیب ہوا۔

حضرت وازع بن عامرؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم وفد کی صورت میں آپ کی خدمت عالیہ میں حاضر ہوئے۔ اس وقت ہم اللہ تعالیٰ کے حبیب کی صورت مبارکہ سے نا آشنا تھے۔ ہمارے پوچھنے پر کسی نے اشارہ کر کے بتایا کہ وہ ہیں اللہ کے رسول۔

فَاَخَذْنَا بِيَدَيْهِ وَرِجْلَيْهِ نُقَبِّلُهُمَا. (تو ہم نے آپ کے دستِ اقدس اور مبارک قدموں کو اپنے ہاتھوں میں لیا اور انہیں چومنے لگے۔)

دورِ حاضر کے مشہور محدث شیخ عبداللہ محمد صدیق اعلام النبیل میں اس حدیث کے ماتحت لکھتے ہیں

هٰذَا يَقْتَضِیْ اَنَّهُمْ كَانُوْ يَخِرُّوْنَ عَلٰى رِجْلَيِ النَّبِیِّ ﷺ لِيُقَبِّلُوْهُمَا. وَلَوْ كَانَ هٰذَا الْعَمَلُ سُجُوْدًا كَمَا يَقُوْلُ الْمُتَخَرِّصُوْنَ لَنَهَا هُمْ عَنْهُ كَمَا نَهٰى غَيْرَ هُمْ اَنْ يَسْجُدَلَهٗ. (یہ حدیث واضح کر رہی ہے کہ وہ حضور ﷺ کے قدموں پر بوسے کے لئے گر پڑے تھے۔ اگر یہ عمل سجدہ ہوتا جیسا کہ مخالفین کہتے ہیں تو آپ ان کو منع فرماتے، جیسا کہ بعض لوگوں کو آپ نے سجدہ کرنے سے روکا تھا۔)

مسند بزاز میں حضرت بریدہؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ مجھے اپنی نبوت و رسالت پر کوئی نشانی بتائیں۔

آپ نے فرمایا ''اس درخت کے پاس جاؤ اور اسے کہو کہ رسول اللہ تجھے بلا رہے ہیں۔'' جب درخت کو آپ کا پیغام ملا تو اس نے فی الفور اِدھر اُدھر حرکت کی اور اپنی جڑوں کو گھسیٹتے ہوئے آپ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہو گیا۔ پھر اسے آپ نے واپس لوٹنے کا اشارہ فرمایا تو وہ واپس ہو گیا۔

امام بوصیریؒ نے اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے

وَجَآءَ تْ لِدَعْوَتِهِ الْاَشْجَارُ سَاجِدَةً
تَمْشِیْ اِلَیْهِ عَلٰی سَاقٍ بِلَا قَدَمٖ

(آپ کے بلانے پر درخت پنڈلیوں کے بل چل کر آئے، حالانکہ وہ پاؤں نہیں رکھتے تھے۔)

اس پر اس شخص نے آپ سے عرض کیا

یَارَسُوْلَ اللّٰهِ! اِئْذَنْ لِیْ اَنْ اُقَبِّلَ رَأْسَکَ وَرِجْلَیْکَ، فَاَذِنَ لَهٗ فَقَبَّلَ رَأْسَهٗ وَرِجْلَیْهِ، ثُمَّ قَالَ: اِئْذَنْ لِیْ اَنْ اَسْجُدَلَکَ، قَالَ: لَا یَسْجُدُ اَحَدٌ اَحَدًا.

(یارسول اللہ! مجھے اجازت دیجئے، کہ میں آپ کے سرِ اقدس اور پاؤں مبارک کو بوسہ دوں۔ آپ نے اجازت مرحمت فرمائی۔ لہٰذا اس نے آپ کے سرِ انور اور مبارک قدموں کو بوسہ دیا۔ پھر اس نے عرض کی، یارسول اللہ! مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ کو سجدہ کروں۔ آپ نے ارشاد فرمایا، تم میں سے کوئی بھی دوسرے کو سجدہ نہ کرے۔)

امام بغوی، طبرانی نے حصن بن دحوح انصاری سے بیان کیا ہے کہ ایک دن حضرت طلحہ بن براءؓ حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ سے ملاقات کرتے ہوئے ---یَلْصَقُ بِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَیُقَبِّلُ قَدَمَیْهِ---(آپ کے جسمِ اطہر کے ساتھ چمٹ گئے اور آپ کے مبارک قدموں کو چومنا شروع کر دیا۔)

(اقتباس ختم ہوا)

الغرض جانِ دوعالم ﷺ از سرتاقدم حسن و جمال اور زیبائی ورعنائی کا ایک ایسا شاہکار ہیں کہ جس کی مثال نہ پہلے کبھی پائی گئی، نہ آئندہ کبھی پائی جائے گی۔ بقول اعلیحضرتؒ۔

اللہ کی سر تا بقدم شان ہیں یہ
ان سا نہیں انسان، وہ انسان ہیں یہ

گذشتہ صفحات میں ہم نے کوشش کی ہے کہ قارئین کو اس جمال جہاں آرا کی چند

جھلکیاں دکھادی جائیں۔ ہم اپنی کوشش میں کس حدتک کامیاب ہوئے ہیں، اس کا فیصلہ تو قارئینِ کرام ہی بہتر طور پر کر سکتے ہیں؛ تاہم اپنی طرف سے دانستہ کوئی کوتاہی نہیں کی ہے۔ اگر نادانستگی میں کوئی لغزش یا غلطی ہوگئی ہو تو ہم اللہ تعالیٰ اور اس کے پیارے ان ﷺ سے عفوودرگزر کے طلبگار رہیں۔

شمائل نبویہ ہی کے ساتھ متعلق آپ کے لباس وغذا کا تذکرہ بھی ہے۔ علامہ شبلی نعمانی نے ''سیرۃ النبی'' کی دوسری جلد میں اس موضوع پر کافی تفصیلات مہیا کی ہیں۔ کسی قدر تقدیم وتاخیراور تلخیص کے ساتھ ہم انہی کی کتاب سے ایک اقتباس پیش کر رہے ہیں۔ علامہ شبلی لکھتے ہیں۔

لباس

لباس کے متعلق کسی قسم کا التزام نہ تھا۔ عام لباس چادر قمیص اور تہمد تھی۔ پاجامہ کبھی استعمال نہیں فرمایا لیکن امام احمد اور اصحاب سنن اربعہ نے روایت کی ہے کہ آپ نے منیٰ کے بازار میں پاجامہ خریدا تھا۔ حافظ ابن قیم نے لکھا ہے کہ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ آپ نے استعمال بھی فرمایا ہوگا۔ موزوں کی عادت نہ تھی، لیکن نجاشی نے جو سیاہ موزے بھیجے تھے، آپ نے استعمال فرمائے تھے۔ بظاہر روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ چرمی تھے۔ عمامہ کا شملہ کبھی دوش مبارک پر، کبھی دونوں شانوں کے بیچ میں پڑارہتا تھا، کبھی ٹھوڑی کے گرد لپیٹ لیتے تھے۔ عمامہ اکثر سیاہ رنگ کا ہوتا تھا۔ عمامہ کے نیچے سر سے لپٹی ہوئی ٹوپی ہوتی تھی۔ اونچی ٹوپی کبھی استعمال نہیں فرمائی۔ (عمامہ کے نیچے ٹوپی کا التزام تھا۔ فرماتے تھے کہ ہم میں اور مشرکین میں یہی امتیاز ہے کہ ہم ٹوپیوں پر عمامہ باندھتے ہیں۔)

لباس میں سب سے زیادہ یمن کی دھاری دار چادریں پسند تھیں جن کو عربی میں حبرہ کہتے ہیں۔

بعض اوقات شامی عبا استعمال کی تھی جس کی آستین اس قدر تنگ تھی کہ جب وضو کرنا چاہا تو اوپر نہ چڑھ سکی اور ہاتھ کو آستین سے نکالنا پڑا۔ نوشیروانی قبا بھی استعمال کی ہے جس کی جیب اور آستینوں پر دیبا کی سنجاف تھی۔

جب انتقال ہوا تو حضرت عائشہ صدیقہؓ نے کمبل جس میں پیوند لگے ہوئے تھے اور گاڑھے کی ایک تہمد نکال کر دکھائی کہ انہی کپڑوں میں آپ نے وفات پائی۔

روایتوں میں آیا ہے کہ آپ نے حُلَّۃٌ حَمْراء بھی استعمال کیا ہے۔ حمراء کے معنی سرخ کے ہیں۔ اس لئے اکثر محدثین نے وہی عام معنی لئے ہیں، لیکن ابن القیم نے اصرار کے ساتھ دعویٰ کیا ہے کہ سرخ لباس آپ نے کبھی نہیں پہنا اور نہ ہی آپ مردوں کے لئے اس کو جائز رکھتے تھے۔ حُلَّۃٌ حَمْراء ایک قسم کی یمنی چادر تھی جس میں سرخ دھاریاں بھی ہوتی تھیں۔ اس بنا پر اس کو حمراء کہتے تھے اور یہی کبھی کبھی استعمال کرتے تھے۔ عام محدثین کہتے ہیں کہ اس تخصیص کا کوئی ثبوت نہیں۔ (۱) زرقانی میں یہ بحث نہایت تفصیل سے مذکور ہے۔

مختلف روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے سیاہ، سرخ، سبز، زعفرانی، ہر رنگ کے کپڑے پہنے ہیں، لیکن سفید رنگ بہت مرغوب تھا۔ (بعض اوقات اس قسم کی چادر بھی استعمال فرمائی جس پر کجاوے کی شکل بنی ہوئی تھی۔)

نعلین مبارک اس طرز کے تھے جس کو اس ملک میں چپل کہتے ہیں۔ یہ صرف ایک تلا ہوتا تھا جس میں تسمے لگے ہوتے تھے۔ بچھونا چمڑے کا گدا ہوتا تھا جس میں روئی کے بجائے کھجور کے پتے ہوتے تھے۔ چارپائی بان کی بُنی ہوتی تھی، جس سے اکثر جسم پر نشانات پڑ جاتے تھے۔

جب آپ نے نجاشی اور قیصرِ روم کو خط لکھنا چاہا تو لوگوں نے عرض کی کہ سلاطین مُہر کے بغیر کوئی تحریر قبول نہیں کرتے۔ اس بنا پر چاندی کی انگوٹھی بنوائی، جس میں اوپر تلے تین سطروں میں مُحَمَّدٌ، رَسُوْلُ، اللہِ لکھا ہوا تھا۔ بعض صحابہ سے روایت ہے کہ آپ صرف

---

(۱) ہمارے خیال میں اس الجھن کا آسان حل یہ ہے کہ ہر رنگ میں مختلف شیڈ ہوتے ہیں جن میں سے کچھ خوشنما اور دیدہ زیب ہوتے ہیں اور کچھ ناگوار و ناپسندیدہ۔ سرخ رنگ کا شمار چونکہ شوخ رنگوں میں ہوتا ہے اس لئے اس کا ناپسندیدہ شیڈ آپ کو بہت ناگوار گزرتا تھا؛ جبکہ عمدہ اور دلکش شیڈ آپ کو پسند تھا اور اس کو استعمال بھی کرتے تھے۔ وَاللہُ اَعْلَم بِالصَّواب.

مُہر لگانے کے وقت استعمال کرتے تھے، پہنتے نہ تھے۔ لیکن شمائل ترمذی میں متعدد صحابہ سے روایت ہے کہ آپ یوں بھی استعمال فرماتے تھے اور داہنے ہاتھ کی انگلی میں پہنتے تھے۔

لڑائیوں میں زرہ اور مغفر (خَود) بھی پہنتے تھے۔ اُحد کے معرکہ میں جسم مبارک پر دو زرہیں تھیں۔ تلوار کا قبضہ کبھی چاندی کا بھی ہوتا تھا۔

خوش لباسی

گو تکلف اور جاہ پسندی سے آپ کو نفرت تھی لیکن کبھی کبھی نہایت قیمتی اور خوش نما لباس بھی زیب تن فرماتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ جب حروریہ (خارجیوں کا فرقہ) کے پاس سفیر ہو کر گئے تو یمن کے نہایت قیمتی کپڑے پہن کر گئے۔ حروریہ نے کہا کیوں ابن عباس! یہ کیا لباس ہے؟ بولے کہ تم اس پر معترض ہو، میں نے آنحضرت ﷺ کو بہتر سے بہتر کپڑوں میں دیکھا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نہایت زاہد تھے۔ ایک دفعہ بازار سے ایک شامی حلہ مول لیا۔ گھر پر آکر دیکھا تو اس میں سرخ دھاریاں تھیں۔ جاکر واپس کر آئے۔ کسی نے یہ واقعہ حضرت اسماء (حضرت عائشہ کی بہن) سے کہا، انہوں نے آنحضرت ﷺ کا جبہ منگوا کر لوگوں کو دکھایا جس کی جیبوں اور آستینوں اور دامن پر دیبا کی سنجاف تھی۔

(بعض امراء وسلاطین نے آنحضرت ﷺ کو بیش قیمت کپڑے ہدیہ بھیجے۔ آپ نے قبول فرمائے اور کبھی زیبِ تن کئے۔)

مرغوب رنگ

رنگوں میں زرد رنگ بہت پسند تھا۔ حدیثوں میں ہے کہ کبھی کبھی آپ تمام کپڑے یہاں تک کہ عمامہ بھی اسی رنگ کا رنگوا کر پہنتے تھے۔ (سفید رنگ بھی بہت پسند تھا۔ فرماتے تھے کہ یہ رنگ سب رنگوں میں اچھا ہے۔)

نامَرغُوب رنگ

سرخ لباس ناپسند فرماتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سرخ کپڑے پہن کر آئے تو فرمایا یہ کیا لباس ہے؟ عبداللہ نے جاکر آگ میں ڈال دیا۔ آپ نے سنا تو فرمایا

کہ جلانے کی ضرورت نہ تھی، کسی عورت کو دے دیا ہوتا۔

عرب میں سرخ رنگ کی مٹی ہوتی ہے جس کو مغرہ کہتے ہیں۔ اس سے کپڑے رنگا کرتے تھے۔ یہ رنگ آپ کو بالکل پسند نہ تھا۔ ایک دفعہ حضرت زینبؓ اس سے کپڑے رنگ رہی تھیں، آپ گھر میں آئے اور دیکھا تو واپس چلے گئے۔ حضرت زینب سمجھ گئیں اور کپڑے دھوڈالے۔ آنحضرت ﷺ دوبارہ تشریف لائے اور جب دیکھ لیا کہ اس رنگ کی کوئی چیز نہیں، تب گھر میں قدم رکھا۔

ایک دن ایک شخص سرخ پوشاک پہن کر آیا تو آپ نے اس کے سلام کا جواب نہیں دیا۔ ایک دفعہ صحابہ نے سواری کے اونٹوں پر سرخ رنگ کی چادریں ڈال دیں تھیں۔ آپ نے فرمایا، میں یہ نہیں دیکھنا چاہتا کہ یہ رنگ تم پر چھا جائے۔ صحابہ کرام نہایت تیزی سے دوڑے اور چادریں اُتار کر پھینک دیں۔

خوشبو کا استعمال

خوشبو آپ کو بہت پسند تھی، کوئی شخص خوشبو کی چیز ہدیۃً بھیجتا تو کبھی رد نہ فرماتے ایک خاص قسم کی خوشبو یا عطر ہوتا ہے جس کو سکہ کہتے ہیں، یہ ہمیشہ آپ کے استعمال میں رہتا تھا (یہ خوشبو اس مہک کے علاوہ تھی جو آپ کے جسم اطہر سے ہر وقت از خود پھوٹتی رہتی تھی۔) صحابہ کہتے ہیں کہ جس گلی کوچہ سے آپ نکل جاتے وہ معطر ہو جاتا۔ اکثر فرمایا کرتے کہ مردوں کی خوشبو ایسی ہونی چاہئے کہ خوشبو پھیلے اور رنگ نظر نہ آئے اور عورتوں کی ایسی خوشبو جو نہ پھیلے اور رنگ نظر آئے۔

نظافت پسندی

مزاج میں نظافت تھی۔ ایک شخص کو میلے کپڑے پہنے دیکھا تو فرمایا کہ اس سے اتنا نہیں ہوتا کہ کپڑے دھولیا کرے۔

ایک دفعہ ایک شخص خراب کپڑے پہنے ہوئے خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ ﷺ نے پوچھا، تم کو کچھ مقدور ہے؟ وہ بولا، جی ہاں، ارشاد ہوا کہ خدا نے نعمت دی ہے تو صورت سے بھی اس کا اظہار ہونا چاہئے۔

ایک شخص کے بال پریشان دیکھے تو فرمایا کہ اس سے اتنا نہیں ہوسکتا کہ بالوں کو درست کرلے۔

ایک دن لوگ مسجد نبوی میں آئے۔ چونکہ مسجد تنگ تھی اور کاروباری لوگ میلے کپڑوں میں چلے آئے تھے۔ اس لئے جب پسینہ آیا تو تمام مسجد میں بو پھیل گئی۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ نہا کر آتے تو اچھا ہوتا۔

اسی دن سے غسلِ جمعہ ایک شرعی حکم بن گیا۔

غذا اور طریقۂ طعام

اگرچہ ایثار اور قناعت کی وجہ سے لذیذ اور پر تکلف کھانے کبھی نصیب نہ ہوتے۔ یہاں تک کہ (جیسا کہ صحیح بخاری کتاب الاطعمہ میں ہے) تمام عمر آپ نے چپاتی کی صورت تک نہیں دیکھی؛ تاہم بعض کھانے آپ کو نہایت مرغوب تھے۔ سرکہ، شہد، حلوا، روغن زیتون اور کدو خصوصیت کے ساتھ پسند تھے۔ سالن میں کدو ہوتا تو پیالہ میں اس کی قاشیں انگلیوں سے ڈھونڈتے۔

ایک دفعہ حضرت امِ ہانیؓ کے گھر تشریف لے گئے اور پوچھا کہ کچھ کھانے کو ہے؟ بولیں کہ سرکہ ہے۔ فرمایا کہ جس گھر میں سرکہ ہو تو اس کو نادار نہیں کہہ سکتے۔

عرب میں ایک کھانا ہوتا ہے جس کو حیس کہتے ہیں، یہ گھی میں پنیر اور کھجور ڈال کر پکایا جاتا ہے۔ وہ آپ ﷺ کو بہت مرغوب تھا۔

ایک دفعہ حضرت امام حسنؓ اور عبداللہ بن عباسؓ، سلمیٰؓ کے پاس گئے اور کہا کہ آج ہم کو وہ کھانا پکا کر کھلاؤ جو آنحضرت ﷺ کو بہت مرغوب تھا۔ بولیں، تم کو وہ کیا پسند آئے گا! ان لوگوں نے اصرار کیا تو انہوں نے جَو کا آٹا پیس کر ہانڈی میں چڑھا دیا۔ اوپر سے روغن زیتون، زیرہ اور کالی مرچیں ڈال دیں۔ پک گیا تو لوگوں کے سامنے رکھا اور کہا کہ یہ آپ کی محبوب ترین غذا تھی۔

گوشت کی اقسام میں سے آپ نے دنبہ، مرغ، بٹیر (حباری)، اونٹ، بکری، بھیڑ، خرگوش، مچھلی کا گوشت کھایا ہے۔ دستی کا گوشت بہت پسند تھا۔ شمائل ترمذی میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کا قول نقل کیا ہے کہ دستی کا گوشت فی نفسہ آپ کو چنداں مرغوب نہ تھا۔ بات یہ

تھی کہ کئی کئی دن تک گوشت نصیب نہیں ہوتا تھا، اس لئے جب کبھی مل جاتا تو آپ چاہتے تھے کہ جلد پک کر تیار ہو جائے۔ دستی کا گوشت جلدی گل جاتا ہے اس لئے آپ اسی کی فرمائش کرتے۔ لیکن متعدد روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ یوں بھی آپ کو یہ گوشت پسند تھا۔

اُمّ المؤمنین حضرت صفیہؓ کے نکاح میں آپ نے ولیمہ کا جو کھانا کھلایا تھا وہ صرف کھجور اور ستو پر مشتمل تھا۔ تربوز کو کھجور کے ساتھ ملا کر کھاتے تھے۔ پتلی ککڑیاں پسند تھیں۔ ایک دفعہ معوذ بن عفراء کی صاحبزادی نے کھجور اور پتلی ککڑیاں خدمت میں پیش کیں۔ (بعض اوقات روٹی کے ساتھ بھی کھجور تناول فرمائی ہے۔)

ٹھنڈا پانی نہایت مرغوب تھا۔ دودھ کبھی خالص نوش فرماتے، کبھی اس میں پانی ملا دیتے۔ کشمش، کھجور، انگور پانی میں بھگو دیا جاتا، کچھ دیر کے بعد وہ پانی نوشِ جان فرماتے۔ کھانے کے ظروف میں ایک لکڑی کا پیالہ تھا جو لوہے کے تاروں سے بندھا ہوا تھا۔ روایت میں اسی قدر ہے۔ قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹوٹ گیا ہوگا اس لئے تاروں سے جوڑ دیا ہوگا۔

دسترخوان پر جو کھانا آتا، اگر ناپسند ہوتا تو اس میں ہاتھ نہ ڈالتے، لیکن اس کو برا نہ کہتے۔ جو سالن سامنے ہوتا اسی میں ہاتھ ڈالتے، اِدھر اُدھر ہاتھ نہ بڑھاتے اور اس سے اوروں کو بھی منع فرماتے۔ کھانا کبھی مسند یا تکیہ پر ٹیک لگا کر نہ کھاتے اور اس کو ناپسند فرماتے۔ میز یا خوان پر کبھی نہیں کھایا۔

خوان زمین سے کسی قدر اونچی میز ہوتی تھی، عجم اسی پر کھانا رکھ کر کھاتے تھے۔ چونکہ یہ بھی فخر اور امتیاز کی علامت تھی، یعنی امراء اور اہل جاہ کے ساتھ مخصوص تھی۔ اس لئے آپ نے اس پر کھانا پسند نہیں فرمایا۔

کھانا صرف تین انگلیوں سے کھاتے۔ گوشت کو کبھی کبھی چھری سے کاٹ کر بھی کھاتے۔ صحیح بخاری میں یہ روایت موجود ہے۔

ابوداؤد میں ایک حدیث ہے کہ گوشت کو چھری سے نہ کاٹو کیونکہ یہ اہل عجم کا شعار ہے، لیکن ابو داؤد نے خود اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔ اس حدیث کے ایک راوی ابو معشر نجیح ہیں، جن کی نسبت بخاری نے لکھا ہے کہ وہ منکر الحدیث ہیں اور انہی

منکرات میں حدیث مذکور بھی ہے۔

بودار چیزیں، مثلاً پیاز، لہسن وغیرہ پسند نہیں فرماتے تھے۔ حکم تھا کہ یہ چیزیں کھا کر لوگ مسجد میں نہ آئیں۔ بخاری میں حدیث ہے کہ جو شخص پیاز، لہسن کھائے وہ ہمارے پاس نہ آئے اور نہ ہمارے ساتھ نماز پڑھے۔

زمانۂ خلافت میں حضرت عمرؓ نے خطبہ میں کہا کہ تم لوگ پیاز اور لہسن کھا کر مسجد میں آجاتے ہو، حالانکہ میں نے آنحضرت ﷺ کو دیکھا تھا کہ کوئی شخص یہ چیزیں کھا کر مسجد میں آتا تو آپ حکم دیتے کہ اسے مسجد سے نکال کر بقیع میں پہنچا دیا جائے۔"

✿✿✿

اخلاق کریمانہ

﴿اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡمٍ○﴾

(بلاشبہ آپ خلق عظیم پر ہیں)

قارئینِ کرام! شمائل نبویہ کا اختتام ہم جانِ دوعالم ﷺ کے خلق عظیم کی صرف چند جھلکیوں پر کر رہے ہیں اس موضوع پر تفصیل سے لکھنے کی ضرورت اس لئے محسوس نہیں ہوتی کہ "سیدالوریٰ" کا ہر صفحہ کسی نہ کسی پہلو سے جانِ دوعالم ﷺ کے اخلاقِ کریمانہ ہی کی تعبیر و تصویر ہے۔ یہ مضمون درحقیقت اخلاق نبوی پر لکھی گئی ایک رونمائی ہے، جسے ہم یہاں پیش کر رہے ہیں۔

حسنِ اخلاق

ترے خُلق کو حق نے عظیم کہا، تری خَلق کو حق نے جمیل کیا
کوئی تجھ سا ہُوا ہے نہ ہوگا شہا! ترے خالقِ حُسن و ادا کی قسم

معلم اخلاق ﷺ کے ''خلق عظیم'' کا صحیح مفہوم بیان کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ اس کی تفصیلات اتنی زیادہ ہیں کہ چند الفاظ میں ان کا احاطہ کرنا از بس دشوار ہے۔

اللہ تعالیٰ لاکھوں رحمتیں نازل فرمائے عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی مقدس روح پر کہ انہوں نے دو لفظوں میں یہ مسئلہ حل کر دیا اور فرمایا --- ''کَانَ خُلُقُهُ' الْقُرْاٰن'' (رسول اللہ کا خلق قرآن تھا۔) یعنی قرآنِ کریم نے جن اخلاقِ عالیہ کی تعلیم دی ہے، ان کا مجسم نمونہ رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی تھی۔

آیئے! قرآن کریم کی اخلاقی تعلیمات کا مطالعہ کریں اور ان کی روشنی میں جانِ دوعالم ﷺ کی سیرت مطہرہ پر نظر ڈالیں۔

قارئین کرام! اگر خدانخواستہ کوئی شخص آپ کو دکھ پہنچائے اور برا سلوک کرے تو اس کے جواب میں آپ کو کیا کرنا چاہئے ---؟

اس سلسلے میں قرآنِ کریم آپ کو اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی اجازت تو نہیں دیتا؛ البتہ قانون عدل کے لحاظ سے اینٹ کا جواب اینٹ سے دینے کی اجازت دیتا ہے --- وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا --- برائی کا بدلہ اتنی ہی برائی سے دیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس صورت میں آپ کو کوئی اجر نہیں ملے گا۔ اگر آپ اجر و ثواب حاصل کرنا چاہتے ہوں تو برا سلوک کرنے والے سے درگزر کیجئے اور اسے معاف کر دیجئے۔ اس طرح آپ کو یقیناً بہترین اجر ملے گا --- فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُه' عَلَى اللّٰهِ --- جس نے معاف کر دیا اور اچھا طریقہ اختیار کر لیا تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے --- اور اگر آپ اس سے بھی بلند تر

مقام تک رسائی حاصل کرنا چاہتے ہوں اور ان لوگوں کی صف میں کھڑا ہونے کی آرزو رکھتے ہوں جو اللہ تعالیٰ کے ہاں --- ذُوْ حَظٍّ عَظِيْم (بڑے حصے والے) کے لقب سے سرفراز ہوتے ہیں تو معاف کرنے پر ہی اکتفا نہ کرلیں؛ بلکہ مزید ضبطِ نفس کا مظاہرہ کرتے ہوئے، برائی کرنے والے کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔ یعنی برائی کے بدلے اچھائی کریں --- اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ..... وَمَا يُلَقّٰهَا اِلَّا ذُوْحَظٍّ عَظِيْمٍ ٥ برائی کا بدلہ اچھائی سے دو..... مگر یہ کام وہی کرسکتا ہے جو ذو حظ عظیم ہو۔

اس آخری بلند ترین طرزِ عمل کو سرورِ عالم ﷺ نے اپنے الفاظ میں یوں بیان فرمایا ---
اَحْسِنْ اِلٰی مَنْ اَسَاءَ اِلَيْکَ --- اس کے ساتھ اچھائی کر جو تیرے ساتھ برائی کرے۔

یہ صرف زبانی وعظ نہ تھا؛ بلکہ آپ ﷺ نے انتہائی کڑے وقت اور مشکل حالات میں اس صبر آزما تعلیم پر عمل کر کے ثابت کر دیا کہ آپ کے اعضاء کی ہر حرکت اور لبوں کی ہر جنبش کلامِ ذوالجلال کی تعبیر و ترجمان تھی --- کان خلقه القرآن.

چند جھلکیاں ملاحظہ فرمائیے!

ماں کی مامتا مشہورِ عالم ہے۔ بیٹا خواہ کیسا ہی برا کیوں نہ ہو، ماں اس کی برائی نہیں چاہتی۔ اگر بیٹا کسی کا سر پھوڑ دے یا دانت توڑ دے تو ماں اسے ناسمجھ اور نادان قرار دے کر لوگوں کا جذبۂ ترحم ابھارتی ہے اور اس کو بچا لیتی ہے۔ کہتی ہے ''اس سے غلطی ہوگئی ہے۔ یہ احمق ہے، بے وقوف ہے، نادانی میں یہ حرکت کر بیٹھا ہے۔ اس کو معاف کر دیجئے!''

اس طریقے سے التجا خاصی پر اثر ثابت ہوتی ہے اور لوگوں کا غصہ ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔

یہ ایک انداز ہے ماں کی شفقت و محبت کا ---! دلکش اور پیارا پیارا۔

لیکن یہ مشفقانہ طرزِ عمل اس وقت ہوتا ہے، جب سر اور دانت کسی اور کے ٹوٹے ہوں۔ اگر خدانخواستہ کوئی ناخلف اپنی مہربان ماں کو زخمی کر دے تو پھر ماں کا پیمانۂ صبر لبریز ہو جاتا ہے اور وہ تمام تر مامتا کے باوجود کوسنے اور بددعائیں دینے لگ جاتی ہے اور پیار کی ساری ادائیں بھول جاتی ہے۔

ماں باپ سے ہزار درجہ زیادہ شفیق و مہربان آقا --- فِدَاهُ اٰبَائُنَا

وَ اُمَّھَاتُنَا--- پر لاکھوں سلام، جو طائف کے بازار سے اس حال میں نکلتا ہے کہ تن ہمہ داغ داغ ہے۔ حریر و پرنیاں سے زیادہ نازک جسم لہولہان ہے اور خون کی روانی کا یہ عالم ہے کہ جوتیاں بھر چکی ہیں--- جو اُحد کے میدانِ کارزار میں زخمی کھڑا ہے۔ کسی ظالم نے اس زور کا وار کیا ہے کہ خود کی کڑیاں ٹوٹ کر شبنمی رخساروں کو کاٹتی ہوئی گزر گئی ہیں اور دندان مبارک میں پیوست ہوگئی ہیں۔ خون ہے کہ اُبل اُبل کر بہہ رہا ہے اور کسی طرح بند ہونے میں نہیں آتا۔

طائف کا بازار گواہ ہے اور اُحد کا میدان شاہد ہے کہ ان حوصلہ شکن لمحات میں بھی رؤف و رحیم آقا کی زبان پر کوئی کوسنا اور کوئی بددعا نہیں آئی؛ بلکہ وہ پیکرِ عفو و احسان، دونوں مقامات پر اپنی امتیازی شان کے ساتھ جلوہ آرا نظر آتا ہے اور جو لوگ اس سے بددعا کا مطالبہ کرتے ہیں، انہیں اپنے بلند و بالا مقام کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہتا ہے

''لَمْ اُبْعَثْ لَعَّانًا، اِنَّمَا بُعِثْتُ هَادِيًا وَّرَحْمَةً''

(میں لعنتیں اور بددعائیں دینے کے لئے نہیں بھیجا گیا ہوں، میں تو ہادی اور رحمت بن کر آیا ہوں۔)

پھر اپنی شانِ رحمت کا یوں مظاہرہ کرتا ہے کہ بارگاہِ رب العزت میں ہاتھ اٹھا کر دعا کرتا ہے

''اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِقَوْمِیْ فَاِنَّهُمْ لَايَعْلَمُوْنَ''

الٰہی! میری قوم کو معاف فرمادے کہ یہ ناسمجھ ہیں، نادان ہیں۔

اللہ اکبر! ظالموں نے جانتے بوجھتے ہوئے حق سے انکار کیا اور محبوب خدا کو زخمی کر کے قہر خداوندی کو دعوت دی مگر رحمت للعالمین نے ناسمجھ اور نادان قرار دے کر ان کو دامنِ رحمت میں چھپالیا اور اللہ کے غضب سے بچالیا۔

حَسُنَتْ جَمِیْعُ خِصَالِهٖ صَلُّوْا عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ

✡✡✡

سرورِ عالم ﷺ کو اپنے دادا جان حضرت عبدالمطلب کی عظمت پر بہت ناز تھا اور

آپ انتہائی جانکاہ مراحل میں اس بات پر فخر کیا کرتے تھے کہ میں عبدالمطلب کا فرزند ہوں۔

غزوہ حنین میں جب اسلامی لشکر پر دشمنوں نے اچانک تیروں کی بارش برسادی تو سب لوگ منتشر اور تتر بتر ہو گئے، مگر اللہ کا سچا رسول چند جانثاروں کی معیت میں نہ صرف ثابت قدم رہا؛ بلکہ اس حالت میں بھی پیش قدمی جاری رکھی اور آگے ہی آگے بڑھتا رہا۔ اس وقت زبان حق بیان پر یہ رجزیہ شعر جاری تھا

اَنَا النَّبِیُّ لَا کَذِبُ اَنَا اِبْنُ عَبْدِالْمُطَّلِبُ

(میں نبی ہوں، اس میں کوئی جھوٹ نہیں، میں عبدالمطلب کا فرزند ہوں۔)

قارئین کرام! آپ خود ہی سوچئے کہ تیروں کی بوچھاڑ میں بھی جس شفیق و مہربان ہستی کا نام آپ کی زبان پر تھا، اس کے ساتھ آپ کے جذباتی تعلق کی نوعیت کیا ہوگی؟

اس بات کو ذہن میں رکھئے اور پھر آیئے اس واقعہ کی طرف!

زید ابن سعنہ سے سرور کونین ﷺ نے کچھ قرض لے رکھا تھا۔ ابھی واپس کرنے کا طے شدہ وقت نہیں آیا تھا، کہ ایک دن زید ابن سعنہ آیا اور آپ کی چادر مبارک کو انتہائی گستاخانہ انداز میں پکڑ کر زور سے کھینچا، پھر نہایت درشت لہجے میں قرض کی ادائیگی کا مطالبہ کیا اور کہا---"تم---عبدالمطلب کی اولاد، ہو ہی ٹال مٹول کرنے والے اور بدعہد۔"

کیا گزری ہوگی آقا ﷺ کے دل پر یہ طعنہ سن کر---! جس دادا کا فرزند ہونا، آپ باعثِ صد افتخار سمجھتے تھے، اسی نامور دادا کی اولاد ہونے کا ایک شخص آپ کو طعنہ دے رہا تھا اور عبدالمطلب کی پوری نسل کو بدعہد قرار دے رہا تھا--- حالانکہ قرض واپس کرنے کا مقررہ وقت ابھی آیا ہی نہیں تھا۔ کوئی اور ہوتا تو حکم دیتا کہ اس بدزبان شخص کے دانت توڑ دیئے جائیں اور یہ کم سے کم سزا ہوتی، مگر قربان جائیں آقائے کونین کے حِلم وتحمل پر کہ آپ کی جبینِ انور پر ناگواری کی بھی کوئی شکن نمودار نہ ہوئی؛ بلکہ اس کی تلخ کلامی اور گستاخی کے دوران مسلسل مسکراتے رہے---اس تبسم کی عادت پہ لاکھوں سلام

فاروقِ اعظمؓ سے برداشت نہ ہوسکا اور انہوں نے نہایت سختی سے زید ابن سعنہ کو جھڑک دیا، مگر رحمتِ عالم ﷺ نے ان کو روک دیا اور نصیحت کرتے ہوئے فرمایا

''اے عمر! ہم تو تم سے کسی اور طرزِ عمل کے خواہش مند تھے، تمہیں چاہئے تھا کہ مجھے ادائیگی میں درستگی کا مشورہ دیتے اور زید کو تقاضا کرنے کا صحیح طریقہ بتاتے۔''

پھر فاروقِ اعظمؓ کو حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا---''اگر چہ قرض کی واپسی کی جو مدت اس کے ساتھ طے ہوئی تھی، اس کا ابھی ایک تہائی حصہ باقی ہے، مگر اب یہ تقاضا کر رہا ہے تو اس کا مال اس کو واپس کر دو اور ہاں---! اس کے حق سے بیس صاع اس کو زیادہ دینا، کیونکہ تم نے جھڑک کر اس کا دل دکھایا ہے اور اسے خوفزدہ کیا ہے۔''

اللہ اکبر! اس نے جو دل آزار حرکتیں اور باتیں کیں، ان کا تو خیال نہیں ہے، مگر یہ غم کھائے جا رہا ہے کہ عمر کی سرزنش سے یہ ''بے چارہ'' خوفزدہ ہو گیا ہے--- اور اس کی تلافی کے لئے اس کو انعام واکرام سے نوازا جا رہا ہے۔

بد کریں ہر دم برائی تم کہو ''ان کا بھلا ہو''
چرخ بدلے، دہر بدلے تم بدلنے سے ورا ہو

اخلاق کریمانہ کی یہ عظمت و رفعت دیکھ کر زید بے ساختہ پکار اٹھا

اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمدا عبدہ ورسولہ.

پھر اس نے بتایا کہ سابقہ الہامی کتابوں میں آخری نبی کی جتنی بھی علامات بیان کی گئی ہیں، وہ سب کی سب میں نے آپ کے اندر موجود پائی تھیں؛ البتہ ایک علامت کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلتا تھا اور وہ علامت یہ ہے کہ نبی منتظَر کا غضب کبھی بھی اس کے حلم پر غالب نہیں آ سکے گا اور خواہ اس کے ساتھ کیسا ہی ناشائستہ سلوک کیا جائے، اس کی بردباری میں فرق نہیں آئے گا۔ آج تجربہ کر کے دیکھ لیا کہ یہ علامت بھی آپ میں حرف بحرف موجود ہے۔ بلاشبہ آپ وہی نبی منتظَر اور سچے رسول ہیں۔

ایسے دلربا واقعات سے محبوبِ خدا کی زندگی بھری پڑی ہے، مگر یہاں ان سب کا استقصاء و احاطہ ممکن نہیں، اس لئے فی الحال اسی پر اکتفا کیجئے؛ البتہ آخر میں رحمتِ عالم ﷺ کی ایک جانفزا دعا پیشِ خدمت ہے، اسے پڑھیئے اور وسیع النظر فی وکشادہ دلی کے ایک نئے جہاں کی سیر کیجئے۔

قارئین کرام! جیسا کہ آپ جانتے ہیں جانِ دو عالم ﷺ حتی الوسع نہ تو غضبناک ہوتے تھے، نہ کسی کے لئے بددعا کرتے تھے؛ تاہم بالفرض اگر آپ سے ایسا واقعہ ہو جائے تو---؟ اس فرضی احتمال کے انسداد کے لئے میرے اور آپ کے آقا نے کیا ہی دلآویز طریقہ اختیار کیا ہے---سبحان اللہ!

آپ نے دعا فرمائی اور اللہ تعالیٰ سے عہد لیا کہ اگر میں کسی کو برا کہہ دوں یا کسی پر لعنت بھیج دوں تو اے میرے مولا! اس چیز کو اس کے حق میں پاکیزگی، رحمت، دعا، طہارت اور ایسی قربت کا سبب بنا دے، جو قیامت کے دن اس کو میرے قریب کر دے۔
اللہ اکبر! کچھ سمجھے آپ---!؟ یقیناً سمجھ گئے ہوں گے، نہ سمجھنے کا کیا سوال؟

باب ۱۱
سایۂ و افسانہ

کیا جانِ دو عالم ﷺ کا سایہ نہ تھا؟
کیا جانِ دو عالم ﷺ پر جادو اثر انداز ہؤا تھا؟

ان دو موضوعات کا خالص علمی اور
تحقیقی انداز میں تجزیہ اور جائزہ

پرانے دور کے تاریخ داں بھی
عجب قصے روایت کر گئے ہیں
فسانوں کو حقیقت کا لبادہ
اُڑھا کر وہ حکایت کر گئے ہیں
دائم

محترم قارئین!

جانِ دو عالمﷺ کے بارے میں دو باتوں نے خاصی شہرت پائی ہے۔

ایک یہ کہ آپﷺ کا سایہ نہیں تھا۔

دوسری یہ کہ آپﷺ پر جادو کیا گیا تھا۔

ہم نے جب ان مسائل کا تحقیقی جائزہ لیا تو معلوم ہؤا کہ دونوں شہرت یافتہ باتیں بے اصل اور بے حقیقت ہیں۔ اس موضوع پر میری دو مستقل کتابیں ''سایۂ مصطفیٰ'' اور حقیقت یا فسانہ'' کے ناموں سے چھپ چکی ہیں۔ حقیقت یا فسانہ کا انگریزی ترجمہ بنام Fact Or Fiction بھی طبع ہو چکا ہے۔ ان دونوں کتابوں کو اللہ تعالیٰ نے بہت شہرت و پذیرائی عطا فرمائی اور ان کے کئی ایڈیشن شائع ہوکر اہلِ علم اور اربابِ ذوق سے داد تحسین وصول کر چکے ہیں۔ چونکہ ان موضوعات کا تعلق بنیادی طور پر جسمِ نبوی سے ہے اس لئے یہ بھی شمائل نبویہ ہی کا ایک حصہ ہیں۔ اس بنا پر شمائل کے بعد ہم ان دونوں کتابوں کی تلخیص پیش کر رہے ہیں۔ جو اہلِ علم ان مسائل پر مزید تحقیق کرنا چاہیں وہ ''سایۂ مصطفیٰ'' اور ''حقیقت یا فسانہ'' کا مطالعہ کریں۔ دائمؔ

ہم سیہ کاروں پہ یا رب! تپش محشر میں
سایہ افگن ہوں ترے پیارے کے پیارے گیسو

(اعلیٰ حضرت)

ظلِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے موضوع پر
ایک بالکل نئی اور اَچھوتی تحقیق

سایۂ مصطفی

صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمۡ

جس میں روایات نفی ظل کا محدّثانہ اصول وضوابط کی روشنی میں
مفصل جائزہ لیا گیا ہے اور جانِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم
کی شان رحمت ورأفت اور امتزاجِ نورانیت
وبشریت کو ایک نئے انداز سے اجاگر
کیا گیا ہے۔

علمی اور تحقیقی ذوق رکھنے والوں کے لئے توشۂ خاص
بادہ کشانِ عشقِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے جرعۂ خاص

با خدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار!

روایاتِ نفی ظل کی حقیقت

قارئینِ کرام! بعض روایات میں آیا ہے کہ جانِ دو عالم ﷺ کا سایہ نہیں تھا مگر تحقیق کے بعد یہ بات پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچی کیونکہ اس سلسلے میں جو روایات ذکر کی جاتی ہیں ہیں وہ معیار سے گری ہوئی اور انتہائی نا قابلِ اعتبار ہیں۔ ہم ان روایات کا مفصل تجزیہ پیش کر رہے ہیں مگر اس سے پہلے چند اصولی باتیں آپ کے گوش گزار کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

حدیث کی اکثر کتابیں ایسی ہیں جن کے جامعین نے التزام صحت نہیں کیا، یعنی اپنے آپ پر لازم نہیں کیا کہ صرف صحیح حدیثیں ذکر کریں گے؛ بلکہ ہر قسم کی احادیث جمع کر دی ہیں۔ خواہ صحیح ہوں، ضعیف ہوں یا موضوع؛ البتہ چند محدثین ایسے بھی گزرے ہیں جنہوں نے اپنی بعض کتابوں میں التزام صحت کیا ہے، یعنی صرف صحیح حدیثیں ذکر کرنے کا دعویٰ کیا ہے۔

ان کتابوں میں امام بخاری کی صحیح بخاری، امام مسلم کی صحیح مسلم، ابوعبداللہ حاکم نیشاپوری کی مستدرک اور ابو حاتم محمد ابن حبان کی کتاب التقاسیم والانواع شامل ہیں، لیکن ائمہ علم حدیث نے تصریح کی ہے کہ اول تا آخر صحیح حدیثیں درج کرنے کے دعوے میں صرف امام بخاری پورے اترے ہیں، بعض کے نزدیک امام مسلم بھی اس میں کامیاب رہے ہیں، لیکن حاکم اور ابن حبان کا دعوائے صحت درست ثابت نہ ہوسکا اور انہوں نے ضعیف؛ بلکہ موضوع اور من گھڑت روایتیں بھی اپنی کتابوں میں جمع کر دی ہیں۔

اسی بناء پر جمہور محدثین کے نزدیک یہ بات طے شدہ ہے کہ صحیح بخاری کی تو ہر روایت سند کے اعتبار سے صحیح ہے لیکن حدیث کی باقی کتابوں میں مندرج روایتیں اس درجے کی نہیں ہیں؛ بلکہ ان کی صحت کا دار و مدار اسناد پر ہے۔ اگر سند قوی ہو تو روایت صحیح ہوگی، اگر سند کمزور ہو تو روایت ضعیف ہوگی اور اگر سند جھوٹے راویوں پر مشتمل ہو تو روایت

موضوع ہوگی۔(۱)

اسی حقیقت کو واضح کرتے ہوئے امام احمد رضا لکھتے ہیں۔

''نہ التزامِ تصحیح صحت کو مستلزم، نہ عدمِ التزام اس کا مزاحم۔ اہلِ التزام کی تصانیف میں بہت روایاتِ باطلہ ہوتی ہیں اور التزام نہ کرنے والوں کی تصنیفوں میں اکثر احادیثِ صحیحہ۔ آخر مستدرکِ حاکم کا حال نہ سنا، جنہوں نے صحت کیا معنی، التزامِ شرطِ شیخین کا ادعا کیا اور بقدرِ چہارم احادیثِ ضعیفہ ومنکرہ و باطلہ وموضوعہ بھر دیں۔ اسی طرح ابن حبان کا بھی یہ دعویٰ کتاب التقاسیم والانواع میں ٹھیک نہ اترا، اور سنن ابی داؤد جس میں التزامِ صحاح ہرگز نہیں، صحاحِ ستہ میں شمار اور ان کا مسکوت عنہ مقبول ومحمود۔ یہ سب امور خادمِ حدیث پر جلی وروشن ہیں۔

عزیزا! مدارِ کار اسناد پر ہے۔ التزام وعدم التزام کوئی چیز نہیں۔ یہ سعادت تو روز ازل سے بخاری کے حصہ میں تھی کہ احادیث مسندہ میں حق سبحانہ نے ان کا قصد پورا کیا۔(۲)

اس عبارت سے دو اصول نکھر کر سامنے آتے ہیں۔

(۱) صحیح بخاری کی روایات مسندہ سب کی سب سند کے اعتبار سے درست ہیں۔(۳)

(۲) صحیح بخاری کے علاوہ باقی کتب حدیث کی روایات اس معیار کی نہیں ہیں اسلئے کوئی روایت محض اس بناء پر صحیح نہیں سمجھی جائے گی کہ کسی ایسی کتاب میں درج ہے جس کے مصنف نے التزام صحت کیا ہے، نہ اس بناء پر رد کی جائے گی کہ مصنف نے التزام صحت نہیں کیا ہے، بلکہ صحت وعدم صحت کا دار و مدار اسناد پر ہوگا۔ اگر اسناد صحیح اور قوی ہوا تو روایت صحیح اور قوی ہوگی، خواہ مصنف نے التزام صحت نہ کیا ہو اور اگر اسناد ضعیف اور کمزور

---

(۱) موضوعیت روایت کے کچھ اور اسباب بھی ہیں مگر سبب اعظم بہر حال یہی ہے۔

(۲) مجموعہ رسائل نور و سایہ۔ ص ۱۰۷۔

(۳) یہ رائے جمہور محدثین کی ہے؛ جبکہ بعض محققین نے صحیح بخاری کی کچھ روایات پر بھی جرح کر رکھی ہے، اور جمہور کی یہ رائے بھی صرف صحیح بخاری کے ساتھ مختص ہے، یعنی امام بخاری کی دیگر تصانیف اس پائے کی نہیں ہیں۔

ہوا، یا جھوٹے راویوں پر مشتمل ہوا تو حدیث ضعیف یا موضوع ہوگی، خواہ مصنف نے بزعمِ خویش التزام صحت کر رکھا ہو۔

ان محدثانہ ضوابط کو ملحوظ رکھتے ہوئے جب ہم روایات نفی ظل کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ حیرت انگیز حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ حدیث و سیرت کے تمام ذخیرے میں صرف ایک روایت ایسی ہے جس کا اسناد مذکور ہے۔ یعنی وہ روایت جسے حکیم ترمذی کی کتاب نوادرالاصول کے حوالے سے بیان کیا جاتا ہے، لیکن اس روایت کی سند کا تجزیہ کرنے سے پہلے یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ نوادرالاصول کو محدثین کس نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان کے ہاں اس کتاب کی کیا حیثیت ہے؟

اس سلسلے میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کی شہرہ آفاق کتاب ''بستان المحدثین'' کے اردو ترجمے سے چند اقتباسات پیشِ خدمت ہیں۔ شاہ صاحب لکھتے ہیں۔

نوادرالاصول

اس کے مصنف حکیم ترمذی، ان ابوعیسیٰ ترمذی کے علاوہ ہیں جن کی کتاب صحاح ستہ میں شمار کی جاتی ہے۔ نوادرالاصول میں اکثر حدیثیں غیر معتبر ہیں۔ اکثر جاہلوں کو چونکہ یہ بات معلوم نہیں ہے اس وجہ سے حکیم ترمذی کو وہی ترمذی خیال کر کے ان کی واہیات کو ابوعیسیٰ ترمذی سے منسوب کر کے کہہ دیتے ہیں کہ ترمذی میں اس طرح ہے۔ اس لئے ان دونوں میں فرق کرنا نہایت ضروری ہے۔

ان کی کنیت ابوعبداللہ اور نام محمد ہے۔۔۔ حکیم ترمذی لقب ہے۔

اپنے زمانے کے زاہدوں کے رئیس تھے۔ ان کی تصنیفات بکثرت ہیں۔ اپنے والد علی ابن الحسین (کے علاوہ) قتیبہ ابن سعید بلخی، صالح ابن عبداللہ ترمذی اور ان کے ہم عصروں سے روایت کرتے ہیں۔ علماء نیشاپور اور قاضی یحییٰ ابن منصور خود ان سے روایت کرتے ہیں۔

یہ بھی جاننا چاہیئے کہ ان کی تصانیف میں احادیث غیر معتبرہ اور موضوعات کثرت سے درج ہیں۔ اس حادثہ کا سبب خود انہوں نے بیان کیا ہے۔ (جو طبقات شعرانی میں مذکور

ہے) وہ یہ کہتے ہیں کہ میں نے تصنیف سے پہلے کبھی تفکر، تدبر اور تامل نہیں کیا اور نہ میری یہ غرض تھی کہ کوئی شخص ان مؤلفات کی نسبت میری طرف کرے گا؛ بلکہ جب کبھی مجھے کبیدگی پیدا ہوتی تھی تو میں اپنی تسلی اور تسکین، تالیف وتصنیف میں سمجھتا تھا اور جو کچھ میرے دل میں آتا تھا، اس کو لکھ لیا کرتا تھا۔(۱)

اب آپ خود ہی سوچئے محترم قارئین! کہ جو بزرگوار تصنیف سے پہلے غور وفکر کی زحمت گوارا نہ کریں اور جو کچھ دل میں آئے، محض کبیدگی دور کرنے کے لئے لکھتے چلے جائیں، خواہ وہ غیر معتبر، من گھڑت اور واہیات روایات ہی کیوں نہ ہوں، ان کی کتابوں پر اور کتابوں میں مندرج روایتوں پر کہاں تک اعتماد کیا جاسکتا ہے---؟!

اس کے باوجود چونکہ یہ ضروری نہیں کہ ناقابل اعتبار کتاب کی ہر روایت ہی غیر معتبر ہو؛ بلکہ مدار کار اسناد پر ہے اس لئے اب ہم بالخصوص روایت نفی ظل اور اس کی سند ملا علی قاری کے حوالے سے پیش کر کے اس پر گفتگو کرتے ہیں۔

سند پر اجمالی جرح تو خود ملا علی قاری نے کر دی ہے، ہم صرف اس کی تفصیل آپ کے گوش گذار کریں گے۔

ملا علی قاری اس روایت کے بارے میں لکھتے ہیں۔

ذَكَرَهُ الْحَكِيْمُ التِّرمِذِیُ فِیْ نَوَادِرِ الْاُصُوْلِ

عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ ابْنِ قَيْسٍ --- وَهُوَ مَطْعُوْنٌ

عَنْ عَبْدِالْمَلِکِ ابْنِ عَبْدِاللهِ ابْنِ الْوَلِيْد---وَهُوَ مَجْهُوْلٌ

عَنْ ذَكْوَانَ---وَلَفْظُهَا: لَمْ يَكُنْ لَّهٗ ﷺ ظِلٌّ فِیْ شَمْسٍ وَّلَاقَمَرٍ. (۲)

(اس روایت کو حکیم ترمذی نے نوادر الاصول میں ذکر کیا ہے

عبدالرحمٰن ابن قیس سے--- جو کہ مطعون ہے۔

اس نے عبدالملک ابن عبداللہ ابن الولید سے--- جو کہ مجہول ہے۔

(۱) بستان المحدثین، مترجم اردو، مطبوعہ نور محمد، کراچی، ص ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳۔

(۲) شرح الشفا الملاعلی القاری، بهامش نسيم الرياض للخفاجی، ج ۳، ص ۲۳۲۔

اس نے ذکوان سے --- روایت کے الفاظ یہ ہیں ''لَمْ یَکُنْ لَّہ، ظِلٌّ فِیْ شَمْسٍ وَّلَا قَمَرٍ.'' یعنی آپ ﷺ کا سایہ نہ سورج میں ہوتا تھا، نہ چاند میں۔)

پہلی بات تو یہ ہے کہ ذکوان صحابی نہیں ہیں؛ بلکہ تابعی ہیں۔ (۱) انہوں نے تو رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہی نہیں تھا، پھر وہ کیسے دعویٰ کرتے ہیں کہ آپ کا سایہ نہیں تھا؟

چلئے، اس الجھن سے ہم صرف نظر کئے لیتے ہیں کیونکہ ذکوان تک سلسلہ روایت اگر درست ثابت ہو جائے تو اس اعتراض کا یہ جواب دیا جا سکتا ہے کہ ذکوان چونکہ بہت ثقہ اور معتبر راوی ہیں اس لئے غالب گمان یہی ہے کہ یہ بات انہوں نے کسی صحابی سے سنی ہوگی۔ اسی بنا پر اکثر محدثین ثقہ اور مستند تابعین کی مرسل روایات کو حجت مانتے ہیں، لیکن مسئلہ تو یہ ہے کہ یہ بات ذکوان نے کہی بھی ہے یا نہیں؟

اس چیز کو جاننے کے لئے آیئے سند کے باقی راویوں پر نظر ڈالتے ہیں۔

صاحب نوادرالاصول سمیت یہ تین راوی ہیں۔

(۱) حکیم ترمذی (۲) عبدالرحمٰن بن قیس (۳) عبدالملک ابن عبداللہ ابن الولید۔

حکیم ترمذی اور ان کی کتاب نوادرالاصول کی حیثیت کے بارے میں بستان المحدثین کے حوالے سے ہم گفتگو کر چکے ہیں۔

دوسرا راوی حکیم ترمذی کا استاد عبدالرحمٰن ابن قیس ہے۔ اسماء الرجال کی کتابوں میں اس نام کے پانچ راوی پائے جاتے ہیں۔

(۱) عبدالرحمٰن ابن قیس کندی (۲) عبدالرحمٰن ابن قیس حنفی (۳) عبدالرحمٰن ابن قیس عتکی (۴) عبدالرحمٰن ابن قیس ارجی (۵) عبدالرحمٰن ابن قیس ضبی، جس کی ایک نسبت زعفرانی بھی ہے۔

---

(۱) واضح رہے کہ تابعین میں ذکوان نام کے دو راوی گزرے ہیں۔ ایک ذکوان ابوسلمان، دوسرے ذکوان ابوعمر، دونوں بالاتفاق ثقہ ہیں۔ علامہ زرقانی کہتے ہیں کہ یہاں انہی دو ذکوان میں سے ایک مراد ہیں۔ زرقانی علی المواہب، ج ۴، ص ۲۵۳۔

عبدالرحمٰن کندی کو حجاج ابن یوسف ثقفی نے قتل کرادیا تھا اور خود حجاج ۹۵ھ میں مر گیا تھا اس لئے اس کا کوئی مقتول، حکیم ترمذی متوفی ۲۵۵ھ(۱) کا استاد نہیں ہوسکتا۔

عبدالرحمٰن حنفی، مسلم، ابوداؤد اور نسائی کے راوی ہیں۔ اعلیٰ درجے کے تابعین میں سے ہیں۔ ذکوان کے ہم عصر ہیں اور انہیں کی طرح ثقہ اور مستند ہیں۔ یہ بھی حکیم ترمذی سے متقدم ہیں۔ نیز یہ مطعون بھی نہیں ہیں اس لئے حکیم ترمذی والی روایت میں یہ مراد نہیں ہوسکتے۔

عبدالرحمٰن عتکی، ابوداؤد کے راوی ہیں۔ ابن حبان نے ان کو ثقہ راویوں میں شمار کیا ہے اور ابن حجر نے مقبول قرار دیا ہے۔ اسماء الرجال کی کتابوں میں ان پر کوئی طعن و جرح منقول نہیں ہے اس لئے یہ بھی روایت نفی ظل کے راوی نہیں ہوسکتے کیونکہ وہ عبدالرحمٰن بقول ملاعلی قاری مطعون ہے۔

عبدالرحمٰن ارجی سے سوائے ہاشم ابن برید کے اور کوئی روایت نہیں لیتا اس لئے وہ بھی خارج از بحث ہے۔

اب رہ گیا عبدالرحمٰن ضبی تو یہ بلاشبہ حکیم ترمذی کا ہم زمان بھی ہے اور مطعون بھی اس لئے اس روایت کا موجد و صانع یہی شخص ہے۔ ملاعلی قاری نے اس کو مطعون کہا ہے مگر صرف ''مطعون'' کہنے سے اس ذاتِ شریف کی پوری طرح نقاب کشائی نہیں ہوتی جب تک نقد و جرح کی تفصیلات بیان نہ کردی جائیں، اس لئے آیئے، دیکھتے ہیں کہ علماء حدیث

---

(۱) کشف الظنون، جلد۲، ص ۶۱۵، پر حکیم ترمذی کی یہی وفات لکھی ہے مگر لندن سے ہمارے ایک مہربان علامہ طارق مجاہد جہلمی نے اپنے ایک مکتوب میں مشہور جرمن مستشرق کارل بروکلمن کی تصنیف تاریخ الادب العربی، ج۴، ص ۶۹، کے حوالے سے لکھا ہے کہ حکیم ترمذی کی وفات ۲۲۰ھ میں ہوئی تھی۔ علامہ جہلمی نے اس پر متعدد دلائل بھی پیش کئے ہیں اس لئے یہی بات درست معلوم ہوتی ہے مگر اس سے ہمارے موقف پر کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ حجاج کا کوئی مقتول اگر متوفی ۲۵۵ھ کا استاد نہیں ہوسکتا، تو متوفی ۲۲۰ھ کا بھی نہیں ہوسکتا۔

واسماء الرجال اس کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔

۱--- امام احمد ابن حنبل فرماتے ہیں --- ضَعِیْفٌ وَلَمْ یَکُنْ بِشَیْءٍ. مَتْرُوْکُ الْحَدِیْثِ. (ضعیف ہے، کچھ شئے نہیں ہے، اس کی حدیث متروک ہے۔)

(۲) بخاری کہتے ہیں---ذَھَبَ حَدِیْثُہ'. (اس کی حدیث گئی گزری ہے۔)

(۳) مسلم کہتے ہیں---ذَاھِبُ الْحَدِیْثِ. (گئی گزری حدیثوں والا ہے۔)

(۴) نسائی کہتے ہیں---مَتْرُوْکُ الْحَدِیْثِ. (اس کی حدیث متروک ہے)

(۵) زکریا ابن یحییٰ کہتے ہیں---ضَعِیْفٌ. (ضعیف ہے)

(٦) ابن جوزی نے بھی اس کو---ضُعَفَاء. میں شمار کیا ہے۔

(۷) ابن حجر کہتے ہیں---مَتْرُوْکٌ. (متروک ہے)

(۸) ابوحاتم رازی کہتے ہیں---ذَھَبَ حَدِیْثُہ'. (اس کی حدیث گئی گزری ہے)

(۹) بزارے نے کہا ہے---فِیْ حَدِیْثِہٖ لِیْنٌ. (اس کی حدیث میں کمزوری ہے۔)

(۱۰) ابونعیم اصبہانی کہتے ہیں---لَاشَیْءَ. (لاشئ اور بے کار ہے۔)

(۱۱) ابواحمد ابن عدی کہتے ہیں---عَامَۃُ مَایَرْوِیْہِ لَایُتَابِعُہُ الثِّقَاتُ عَلَیْہِ. (عام طور پر جو روایتیں یہ بیان کرتا ہے، ان کے ساتھ ثقہ راوی اتفاق نہیں کرتے۔)

(۱۲) ابن حبان کہتے ہیں---کَانَ مِمَّنْ یُقَلِّبُ الْاَسَانِیْدَ وَیَنْفَرِدُ عَنِ الثِّقَاتِ بِمَا لَایَشْبَہُ حَدِیْثَ الثِّقَاتِ. (سندیں الٹ پلٹ دیتا تھا اور ثقہ راویوں سے ایسی روایتیں بیان کرنے میں منفرد تھا جو قوی راویوں کی روایات سے مطابقت نہیں رکھتی تھیں۔)

(۱۳) صالح ابن محمد نے کہا ہے--- کَانَ یَضَعُ الْحَدِیْثَ. (حدیثیں گھڑا کرتا تھا)

(۱۴) عبدالرحمٰن ابن مہدی اس کو جھوٹا قرار دیا کرتے تھے۔

(۱۵) اور ابوزرعہ نے یہ فیصلہ دیا ہے کہ--- کَذَّابٌ، لَایُکْتَبُ حَدِیْثُہ'. (پرلے درجے کا جھوٹا ہے۔ اس کی حدیث نہ لکھی جائے۔)(۱)

---

(۱) تَھْذِیْبُ الْکَمَالِ فِیْ اَسْمَاءِ الرِّجَالِ مع حاشیہ، ج۱۷، ص۳۲٦، ۳۲۷۔

(۱۶) شیخ احمد مقری بالخصوص اس روایت پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں

رَوٰی الْحَکِیْمُ التِرمُذِیُ فِیْ نَوَادِرِالْاُصُوْلِ عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ ابْنِ قَیْسٍ، وَھُوَ وَضَّاعٌ کَذَّابٌ. (روایت کیا ہے حکیم ترمذی نے نوادرالاصول میں عبدالرحمٰن ابن قیس سے جو کہ بہت حدیثیں گھڑنے والا، انتہائی جھوٹا ہے۔)(۱)

ملاحظہ فرمائیں آپ نے عبدالرحمٰن ضبی کے بارے میں محدثین کی آراء---! سولہ ائمہ جرح وتعدیل میں سے کسی ایک نے بھی اس کے بارے میں کوئی کلمہ خیر نہیں کہا؛ بلکہ سب کے سب اسے ضعیف، متروک الحدیث، لاشی، گئی گزری حدیثیں روایت کرنے والا، سندوں میں الٹ پھیر کرنے والا، ثقہ راویوں کے حوالے سے غلط روایتیں بیان کرنے والا، بہت حدیثیں گھڑنے والا اور انتہائی دروغ گو قرار دے رہے ہیں۔ جھوٹا آدمی تو ویسے بھی لَعْنَةُ اللهِ عَلَى الْكَاذِبِيْنَ. کے مصداق لعنتی ہوتا ہے، پھر محبوبِ خدا ﷺ کی طرف جھوٹی حدیثیں منسوب کرنا تو اتنی بڑی جسارت اور ذنب عظیم ہے کہ سرورِ عالم ﷺ نے فرمایا

''جو شخص جان بوجھ کر میری طرف کوئی جھوٹی بات منسوب کرے، اسے چاہئے کہ جہنم میں اپنا ٹھکانا تیار کرلے۔''

کیا ایسے وضاع وکذاب اور جعلساز راویوں کی جھوٹی، جعلی، خودساختہ اور من گھڑت روایتوں کے سہارے ہم اللہ کے سچے رسول (ﷺ) کے معجزات ثابت کریں گے---؟! اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

عبدالرحمٰن کے بعد تیسرا راوی عبدالملک ابن عبداللہ ابن الولید ہے، جسے ملا علی قاری نے مجہول قرار دیا ہے۔

علامہ زرقانی کہتے ہیں کہ مجہول تین قسم کے ہوتے ہیں---''مَجْھُوْلُ الْعَیْنِ، مَنْ لَّہٗ رَاوٍفَقَطْ، وَ مَجْھُوْلُ الْحَالِ، وَھُمَا مَرْدُوْدَانِ عِنْدَالْجَمْھُوْرِ وَ مَجْھُوْلُ الْعَدَالَةِ وَفِیْہِ خَلْفٌ. (ایک مجہول العین، جس سے صرف ایک ہی شخص نے

(۱) فتح المتعال، ص۳۵۳۔

روایت کی ہو، دوسرا مجہول الحال (جس کے حالات سے آگاہی نہ ہو) اور یہ دونوں جمہور کے نزدیک مردود ہیں، تیسرا مجہول العدالۃ (جس کا عادل یا غیر عادل ہونا معلوم نہ ہو) اس میں اختلاف ہے، یعنی بعض اس کو مردود قرار دیتے ہیں اور بعض مقبول۔)

عبدالملک مجہول تو ہے ہی، مگر جس درجے کا یہ مجہول ہے، ایسا شاید ہی کوئی ہو۔ اسماء الرجال کی کتابوں میں متعدد راوی آپ کو ایسے ملیں گے جن کا نام لکھنے کے بعد لکھا ہوتا ہے کہ یہ مجہول ہے۔ یعنی اسماء الرجال والوں کو کم از کم اس کا نام ضرور معلوم ہوتا ہے؛ البتہ اس کی شخصیت اور حالات زندگی سے آگاہی نہیں ہوتی اس لئے اس کو مجہول کہہ دیتے ہیں، لیکن یہ عبدالملک ایسا مجہول ہے کہ اسماء الرجال کی جو کتابیں ہمیں دستیاب ہوسکیں ان میں سرے سے اس نام کا کوئی راوی موجود ہی نہیں ہے۔(۱)

ہمارے خیال میں اس نام کا کوئی راوی ہوگا بھی نہیں؛ بلکہ عبدالرحمٰن ضبی نے جب یہ روایت گھڑی ہوگی اور ذکوان جیسے ثقہ تابعی کے ماتھے مڑھنے کا ارادہ کیا ہوگا تو اس کو ایک واسطے کی ضرورت پڑی ہوگی کیونکہ ذکوان عبدالرحمٰن سے پہلے گزر چکے تھے، اس لئے اس نے ایک فرضی کردار تخلیق کرلیا اور اس کا نام عبدالملک ابن عبداللہ ابن الولید رکھ دیا۔ ظاہر ہے کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کی طرف جھوٹی روایتیں منسوب کرنے سے نہ شرمائے اور خود

---

(۱) اس سلسلے میں درج ذیل کتابوں کا مطالعہ کیا گیا ہے۔

(۱) الجرح والتعدیل، للرازی (۲) تهذیب التهذیب، لا بن حجر (۳) لسان المیزان، لابن حجر (۴) درة الحجال، للمکناسی (۵) الضعفاء الکبیر، للعقیلی (۶) الکاشف، للذهبی (۷) میزان الاعتدال، للذهبی (۸) التاریخ الکبیر، للبخاری (۹) خلاصة تذهیب، للخزرجی (۱۰) وفیات الاعیان، لابن خلکان (۱۱) تاریخ بغداد، للخطیب (۱۲) طبقات ابن سعد

ان کتابوں میں ہمیں عبدالملک ابن عبداللہ ابن الولید نام کا کوئی راوی نہیں مل سکا۔ ہوسکتا ہے یہ ہماری تلاش کی کوتاہی ہو، اگر کوئی فاضل اس نام کا راوی ڈھونڈ دیں تو ہم بے حد ممنون ہوں گے۔

ساختہ حدیثیں تیار کرنے میں بے باک ہو، اس کے لئے ایک فرضی راوی بنا لینا کیا مشکل تھا---! یوں یہ جھوٹ در جھوٹ روایت چل پڑی اور بہت سے لوگوں نے اس کو نقل کرنا شروع کر دیا--- یہ سوچے بغیر کہ عبدالرحمٰن ضبی کے بارے میں امام احمد، امام بخاری، امام مسلم، امام نسائی اور دیگر محدثین کیا کہہ گئے ہیں اور ابوزرعہ جیسا امام جرح و تعدیل اس کی روایتیں لکھنے سے کیسے صاف لفظوں میں منع کر گیا ہے---!

واضح رہے کہ یہ کہنا کہ اگر یہ روایت موضوع اور من گھڑت ہے تو اس کو فلاں فلاں محدث نے کیوں نقل کیا ہے، لایعنی بات ہے۔ جو روایت سند میں وضاع و کذاب راوی موجود ہونے کی وجہ سے موضوع ہو، اس کو اس سند کے ساتھ خواہ ہزار آدمی نقل کرتے رہیں، وہ روایت موضوع ہی رہے گی۔ ہاں، اگر اس کی تائید کسی ایسی مسند روایت سے ہو جائے جس کی سند میں کوئی جھوٹا راوی نہ پایا جاتا ہو(۱) تو پھر موضوعیت سے نکل جائے گی مگر نفی ظل کے لئے دوسری باسند روایت لائی کہاں سے جائے گی---؟

---

(۱) کوئی جھوٹا موجود نہ ہونے کی قید ہم نے اس لئے لگائی ہے کہ اگر کوئی روایت متعدد سندوں سے مروی ہو اور ہر سند میں کوئی نہ کوئی جھوٹا پایا جاتا ہو تو متعدد اسناد کے باوجود وہ روایت موضوع ہی رہتی ہے۔

مثلاً ایک روایت ہے کہ سرورِ عالم ﷺ فرماتے ہیں کہ شب معراج میں نے جنت میں انتہائی خوبصورت درخت کا میوہ کھایا تو وہ میری صلب میں نطفہ بن گیا۔ واپس آ کر میں نے خدیجہ سے مباشرت کی (تو وہ نطفہ اس میں منتقل ہو گیا) اور وہ فاطمہ کے ساتھ حاملہ ہو گئی۔ (مختصراً)

یہ بیہودہ اور رکیک اللفظ والمعنی روایت ہم نے دل پر بہت جبر کر کے لکھی ہے مگر آپ حیران ہوں گے کہ اس کو پانچ بڑے محدثوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے، ایک نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے اور ایک نے حضرت سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت کر رکھا ہے۔ مجموعی طور پر اس حدیث کی چھ سندیں موجود ہیں مگر ہر سند میں ایک جھوٹا بیٹھا ہوا ہے اس لئے متعدد سندوں کے باوجود یہ حدیث موضوع اور من گھڑت ہے۔

فَقَدْ صَرَّحَ اِبْنُ الْجَوْزِیُ وَالذَّهَبِیُ وَالْحَافِظُ بِاَنَّه‘ مَوْضُوْعٌ (ابن جوزی، ذہبی اور حافظ نے تصریح کی ہے کہ یہ موضوع ہے) ☜

ویسے محدثانہ نقد وجرح سے قطع نظر، ہمارے خیال میں تو اس روایت کے وضع
ہونے کے لئے یہ عام فہم سی بات ہی کافی ہے کہ ذکوان کے متعدد ثقہ اور قابل اعتماد شاگر

ذیل میں ہم اہل علم کے لئے بلا ترجمہ واعراب، علامہ زرقانی کی وہ عبارت پیش کرتے ہیں جس میں انہوں نے اس روایت کی چھ سندوں میں پائے جانے والے جھوٹوں کی نشاندہی کی ہے۔

(۱) (وفی الطبرانی) وابن حبان، من طریق ابی واقدالحرانی، قال الذهبی، وهو الآفة

(۲) والخطیب، من طریق محمد ابن خلیل، قال ابن الجوزی: کذاب، یضع

(۳) وابن غیلان، من طریق احمد ابن احجم المروزی، وهو کذاب

(۴) وابن الجوزی، من طریق غلام خلیل، وهو کذاب --- کلهم (من حدیث عائشه) مرفوعاً---

(۵) ورواه ابن الجوزی عن ابن عباس ﷺ، من طریق الابرادی، وهو وضاع کذاب

(۶) والحاکم فی المستدرک عن سعد ابن ابی وقاص ﷺ، قال الذهبی فی تلخیصه: هذا کذب جلی، وهو من وضع مسلم ابن عیسیٰ الصفار (زرقانی علی المواهب، ج ۶، ص ۱۱۱)

ہمیں ان سادہ لوح لوگوں پر سخت حیرت ہوتی ہے جو اسناد کی طرف مطلق توجہ نہیں دیتے اور ہر روایت کو اس بناء پر قبول کر لیتے ہیں کہ اگر یہ موضوع ہوتی تو فلاں فلاں محدث نے اس کو کیوں بیان کیا ہوتا---! آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ مندرجہ بالا روایت کو چھ جلیل القدر محدثین، چھ مختلف طریقوں سے حضرت عائشہ، حضرت ابن عباس اور حضرت سعد ﷺ جیسی عظیم ہستیوں کی طرف منسوب کر کے مرفوعاً روایت کر رہے ہیں، اس کے باوجود یہ حدیث بالاتفاق موضوع ہے کیونکہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا واقعہ معراج سے سولہ، سترہ سال پہلے پیدا ہو چکی تھیں اس لئے شب معراج پھل کھانے کے نتیجے میں ان کی دوبارہ ولادت ممکن نہیں۔

پائے جاتے ہیں مگران میں سے کوئی ایک بھی ذکوان سے یہ روایت نقل نہیں کرتا۔ لے دے کے صرف ایک مجہول مطلق راوی دستیاب ہوا ہے جوان کی طرف یہ بات منسوب کرتا ہے۔ کیا جناب ذکوان نے صرف عبدالملک کے کان میں سرگوشی کی تھی---؟ کیا یہ کوئی راز کی بات تھی یا صدری نسخہ تھا جو انہوں نے اپنے معروف تلامذہ کو بتانا مناسب نہیں سمجھا اور عبدالملک مجہول کوتنہائی میں بتادیا---؟

ان عقلی ونقلی دلائل کے بعد بھی اگرکوئی یہ کہے کہ ذکوان نفی ظل کے قائل تھے تو اس کو خوش فہمی کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے---!

قارئین کرام! یہ ساری بحث وتمحیص ہمیں اس لئے کرنی پڑی کہ ملاعلی قاری سمیت چند محدثین نے اس روایت کونوادرالاصول کے حوالے سے بیان کررکھا ہے؛ ورنہ درحقیقت اس سعی وکاوش کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی کیونکہ نوادرالاصول میں یہ روایت پائی ہی نہیں جاتی۔ نوادرالاصول چھپی ہوئی ہے اور ہرجگہ دستیاب ہے، اگرکوئی فاضل اس میں یہ روایت ڈھونڈ نکالیں تو ہمیں ضرور آگاہ کریں۔ شکریہ!

یہ تو اس اکلوتی مسند روایت کا حال تھا جوحکیم ترمذی کے ذمے لگادی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ایک تعلیق ہے جو علامہ ابن جوزی کی کتاب الوفاء میں پائی جاتی ہے مگراس پر گفتگو کرنے سے پہلے ایک اضافے کا مطالعہ کرلیجئے!

اضافہ

اس مضمون کی اشاعت کے بعد ہمیں بعض قارئین کے خطوط موصول ہوئے جن میں دوسوال کئے گئے تھے۔ ایک یہ کہ آپ نے حکیم ترمذی والی روایت کوعبدالرحمٰن ضبی کے کذاب ہونے کی وجہ سے موضوع کہا ہے مگر ایسا کوئی حوالہ پیش نہیں کیا جس سے ثابت ہوتا ہو کہ جس روایت کی سند میں کذاب راوی پایا جاتا ہو، وہ بالیقین موضوع ہوتی ہے۔ دوسرا یہ کہ حکیم ترمذی والی روایت سے علامہ سیوطی جیسے فاضل نے خصائص کبرٰی میں استدلال کیا ہے، اگر یہ روایت موضوع تھی تو علامہ سیوطی نے کیوں اس کو بطورِ دلیل پیش کیا ہے؟ کیا انہیں پتہ نہیں تھا کہ یہ حدیث موضوع ہے؟

ان ہر دوسوالات کے جواب میں عرض ہے کہ سند کے اعتبار سے موضوع حدیث ہوتی ہی وہ ہے جس میں کوئی کذاب یا متہم بالکذب راوی پایا جاتا ہو۔

ملا علی قاری لکھتے ہیں: ''اَلْمَوْضُوْعُ هُوَ الْحَدِيْثُ الَّذِیْ فِيْهِ الطَّعْنُ بِكِذْبِ الرَّاوِیْ'' (موضوع حدیث وہ ہوتی ہے جس کا راوی کذب سے مطعون ہو) (۱)

علامہ زرقانی کہتے ہیں---''اَلْمَدَارُ عَلَى الْاَسْنَادِ فَاِنْ تَفَرَّدَبِهٖ كَذَّابٌ اَوْ وَضَّاعٌ فَحَدِيْثُهٗ مَوْضُوْعٌ'' (دارومدار اسناد پر ہے۔ اگر حدیث کو صرف ایسا راوی روایت کرے جو وضّاع وکذاب ہو تو اس کی بیان کردہ حدیث موضوع ہوگی) (۲)

پھر کذاب راوی دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کا جھوٹا ہونا یقینی طور پر معلوم ہو اور محدثین ان کو وضّاع، کذاب اور دجال جیسے شرمناک القاب سے یاد کریں۔

دوسرے وہ جن کا جھوٹ بولنا بالیقین تو معلوم نہ ہو؛ البتہ ان پر کذب کی تہمت لگی ہوئی ہو اور محدثین ان کو متہم بالکذب اور متہم بالوضع قرار دیں۔

قسم اول کی روایت بالاتفاق موضوع اور قسم ثانی کی بیان کردہ حدیث علامہ ابن حجر اور چند دوسرے محدثین کے نزدیک متروک ہے لیکن جمہور علماء ان دونوں قسموں میں کچھ فرق نہیں کرتے اور ہر دو کو یکساں موضوع اور من گھڑت قرار دیتے ہیں۔ اعلیٰ حضرت بریلویؒ اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''بہت سے علماء جہاں حدیث پر سے وضع کا حکم اٹھاتے ہیں، وجہ رد میں کذب کے ساتھ تہمت کذب بھی شامل فرماتے ہیں کہ یہ کیونکر موضوع ہوسکتی ہے، حالانکہ اس کا کوئی راوی نہ کذاب ہے، نہ متہم بالکذب۔ کبھی فرماتے ہیں ''موضوع تو جب ہوتی ہے کہ اس کا راوی متہم بالکذب ہوتا، یہاں ایسا نہیں تو موضوع نہیں۔'' افادۂ نہم میں امام زرکشی وامام سیوطی کا ارشاد گزرا ہے کہ حدیث موضوع نہیں ہوتی جب تک اس کا راوی متہم بالوضع نہ

(۱) حاشیہ نزھۃ النظر، ص۶۵۔ (۲) زرقانی علی المواھب، ج۷، ص۵۹۔

ہو---الخ‘‘(۱)

بہر حال راوی کذاب ہوتو بالاتفاق اور متہم بالکذب ہوتو عندالاکثر وہ حدیث موضوع ہوتی ہے اور موضوع حدیث سے نہ احکام ثابت کئے جاسکتے ہیں نہ فضائل۔ اعلیٰ حضرتؒ فرماتے ہیں:

’’اِنَّ الْمَوْضُوْعَ لَایَصْلَحُ لِشَیْئٍ اَصْلًا وَلَایَلْتَئِمُ جَرْحُہ' اَبَدًا؛ وَلَوْ کَثُرَتْ طُرُقُہ' مَاکَثُرَتْ، فَاِنَّ زِیَادَۃَ الشَّرِّ لَایَزِیْدُ اِلَّاشَرًّا، وَاَیْضًا الْمَوْضُوْعُ کَالْمَعْدُوْمِ وَالْمَعْدُوْمُ لَایُقَوِّیْ وَلَا یَتَقَوّٰی........اَمَّا الضُّعْفُ بِغَیْرِ الْکِذْبِ وَ التُّھْمَۃِ........فَھٰذَا یُعْمَلُ بِہٖ فِیْ الْفَضَائِلِ.‘‘ (۲)

(موضوع حدیث کسی مقصد کے لئے بھی کارآمد نہیں (یعنی اس سے نہ کوئی حکم ثابت ہوتا ہے، نہ فضیلت) اوراس پر جو جرح ہے وہ کبھی بھی مندمل نہیں ہوسکتی، خواہ اس کے طرق کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہوجائیں، کیونکہ شرزیادہ ہونے سے شرہی میں اضافہ ہوتا ہے۔ نیز موضوع روایت کالعدم ہوتی ہے اور معدوم چیز نہ کسی دوسری شئے کو قوی کرسکتی ہے، نہ خود قوی ہوتی ہے--- ہاں کذب اور تہمت کذب کے علاوہ کسی اور وجہ سے ضعف پایا جاتا ہو---تو ایسی حدیث فضائل میں قابلِ عمل ہوتی ہے۔)

ان عبارات سے دو اصول واضح ہوتے ہیں۔

۱---جب تک سند میں کوئی کذاب یا متہم بالکذب راوی نہ پایا جائے، اس وقت تک سند کے اعتبار سے حدیث موضوع نہیں ہوسکتی۔

۲---جس سند میں وضاع وکذاب راوی پایا جائے، وہ بالاتفاق موضوع ہوتی ہے اور موضوع حدیث نہ احکام میں قابل استدلال ہوتی ہے، نہ فضائل میں۔

ان طے شدہ اور مسلمہ قواعد کے بعد اگر کوئی محدث کسی ایسی حدیث کو موضوع کہہ دیں، جس کی سند میں نہ کوئی کذاب ہو، نہ متہم بالکذب تو یہ قول محدث مذکور کا تشدد ہوگا کیونکہ

---

(۱) فتاویٰ رضویہ، ج۵، ص۳۶۶، ۳۶۸، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور۔ (۲) حوالہ مذکورہ، ص۵۳۴۔

اس سے اصل اول کی خلاف ورزی لازم آتی ہے اور اصول کی مخالفت قابل التفات نہیں ہوتی۔ مثلاً ایک حدیث ہے---اِنَّ اللّٰہَ عَزَّوَجَلَّ قَرَأَ طٰہٰ وَ یٰسٓ...... الخ---اس حدیث کو ابن حبان اور ابن جوزی نے موضوع قرار دیا ہے مگر علامہ سیوطی نے اس بات سے اتفاق نہیں کیا اور کہا ہے کہ اس کا راوی اگرچہ اکثر کے نزدیک متروک ہے اور بعض کے نزدیک ضعیف ہے؛ تاہم وہ متہم بالوضع نہیں ہے۔(۱)

اسی طرح اگر کوئی محدث وضّاع وکذاب راوی پر مشتمل روایت کو احکام یا فضائل میں قابل استدلال جانیں تو یہ محدث مذکور کا تساہل ہوگا، کیونکہ اس سے اصل دوم کی مخالفت لازم آتی ہے اور اصول کے خلاف بات قابل تسلیم نہیں ہوتی۔ مثلاً یہی علامہ سیوطی، جو الآلی میں ابن حبان اور ابن جوزی کے تشدد پر معترض ہیں، خود عبدالرحمٰن ضبی کی روایت سے خصائص کبریٰ میں استشہاد کرکے تساہل کا شکار ہوگئے ہیں کیونکہ یہ روایت کذاب راوی کی وجہ سے موضوع ہے اور موضوع روایت نہ احکام میں قابل استدلال ہے، نہ فضائل میں۔

ہوسکتا ہے آپ کو یہ خیال گزرے کہ ممکن ہے علامہ سیوطی، عبدالرحمٰن ابن قیس ضبی کو کذاب نہ سمجھتے ہوں اس لئے اس کی روایت سے استدلال کرلیا ہو، تو جواباً عرض ہے کہ یہ بات نہیں ہے۔ علامہ سیوطی کو اچھی طرح پتہ تھا کہ عبدالرحمٰن ابن قیس کذاب اور وضاع ہے۔ چنانچہ مناھل الصفا میں خود لکھتے ہیں۔

وَاَخْرَجَ الْحَکِیْمُ التِّرْمِذِیُّ فِیْ نَوَادِرِالْاُصُوْلِ مِنْ طَرِیْقِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ ابْنِ قَیْسٍ، وَھُوَ وَضَّاعٌ کَذَّاب۔(۲)

گویا عبدالرحمٰن ابن قیس کا وضاع وکذاب ہونا علامہ سیوطی کو بھی تسلیم ہے، اس کے باوجود اگر وہ اس کی بیان کردہ روایت کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں تو یہ ان کا حد درجے کا تساہل ہے اور تشدد ہو یا تساہل، شخصی ذوق تو ہوسکتے ہیں، اصول وضوابط نہیں بن سکتے اور

---

(۱) الآلی المصنوعہ ج ۱، ص ۱۰.

(۲) مناھل الصفافی تخریج احادیث الشفا، ص ۷.

پیروی قواعد کی ہوتی ہے، نہ کہ شخصی اذواق کی۔

(اضافه ختم هؤا)

اب آیئے اس تعلیق کی طرف جس کو علامہ ابن جوزی نے ذکر کیا ہے۔

عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: لَمْ يَكُنْ لِرَسُوْلِ اللهِ ﷺ ظِلٌّ وَلَمْ مَعَ يَقُمْ شَمْسٍ قَطُّ اِلَّا غَلَبَ ضَوْءُ ه' ضَوْءَ الشَّمْسِ وَلَمْ يَقُمْ مَعَ سِرَاجٍ قَطُّ اِلَّا غَلَبَ ضَوْءُ ه' ضَوْءَ السِّرَاجِ. (۱)

(حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا سایہ نہ تھا اور ایسا کبھی نہیں ہوا کہ آپ سورج کے سامنے کھڑے ہوئے ہوں اور آپ کی روشنی سورج کی روشنی سے غالب نہ ہوگئی ہو، نہ کبھی ایسا ہوا کہ آپ چراغ کے روبرو کھڑے ہوئے ہوں اور آپ کی روشنی چراغ کی روشنی پر غالب نہ آ گئی ہو۔)

جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں اس روایت کی کوئی سند نہیں ہے۔ علامہ ابن جوزی ۵۱۰ھ میں پیدا ہوئے، ان کے اور حضرت ابن عباسؓ کے درمیان صدیوں کا فاصلہ ہے۔ معلوم نہیں کہ ابن جوزی کو جن راویوں کے ذریعے یہ حدیث پہنچی وہ ثقہ تھے، ضعیف تھے یا عبدالرحمٰن ضبی جیسے کذاب ووضاع تھے۔

اسی لئے علامہ ابن حجر نے ایسی معلق روایات کو مردود قرار دیا ہے اور اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا ہے--- وَاِنَّمَا ذُكِرَ التَّعْلِيْقُ فِیْ قِسْمِ الْمَرْدُوْدِ لِلْجَهْلِ بِحَالِ الْمَحْذُوْفِ. (تعلیق کو مردود روایتوں کی قسم میں اس لئے ذکر کیا گیا ہے کہ حذف شدہ راویوں کے حالات کا کچھ پتہ نہیں ہوتا۔)

حاشیے پر علامہ محمد عبداللہ نے مزید وضاحت کی ہے--- فَالْمُعَلَّقُ مِنْ حَيْثُ هُوَ مُعَلَّقٌ لَيْسَ مَقْبُوْلًا اَصْلًا، وَاِنَّمَا يُقْبَلُ حَيْثُ يُقْبَلُ لِاُمُوْرٍ خَارِجِيَّةٍ كَكَوْنِهٖ

(۱) الوفاء، ج ۲، ص ۴۰۷، طبع بیروت۔

مِنْ مُعَلَّقَاتِ مُلْتَزِمِ الصِّحَّةِ اَوْ مَجِيْئِهٖ مِنْ طَرِيْقٍ اٰخَرَ. (۱)

(معلق بحیثیت معلق ہونے کے قطعاً قابل قبول نہیں ہے اور جہاں قبول کی جاتی ہے تو خارجی امور کی وجہ سے کی جاتی ہے۔ مثلاً کسی ایسی کتاب کی تعلیق ہو جس کے مصنف نے التزام صحت کیا ہو (جیسے صحیح بخاری کی تعلیقات) یا کسی اور طریقے سے اس تعلیق کی سند دستیاب ہو گئی ہو۔)

ابن جوزی نے نہ التزام صحت کیا ہے، نہ کسی اور طریقے سے اس روایت کی قابل اعتماد سند دریافت ہوئی ہے، پھر اس کو کیونکر قبول کیا جا سکتا ہے---؟!

نفی ظل کے قائلین اہل علم اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ علامہ ابن جوزی حدیث کے سلسلے میں بہت محتاط ہیں۔ ان کی احتیاط پسندی کا یہ عالم ہے کہ جو حدیثیں صرف ضعیف ہوتی ہیں ان کو بھی اپنی کتاب ''موضوعات'' میں وضعی قرار دیتے ہیں۔ جب ایسا احتیاط پسند اور حدیث کے معاملے میں حساس محدث کوئی روایت ذکر کرے تو اس کے صحیح ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے---!

جواباً عرض ہے کہ علامہ ابن جوزی کا محتاط محدث ہونا محض خوش فہمی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علامہ ابن جوزی بہت بڑے حافظ الحدیث، کثیر التصانیف مصنف اور بے مثال واعظ ہونے کے باوجود متلون مزاج آدمی سمجھے جاتے ہیں۔ مذہباً حنبلی ہوئے ہیں اس لئے آیئے، دیکھتے ہیں کہ ان کے ہم مذہب محدثین ان کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔

علامہ ابن رجب، طبقات الحنابلہ میں لکھتے ہیں۔

نَقَمَ عَلَيْهِ جَمَاعَةٌ مِنْ مَشَائِخِ اَصْحَابِنَا مَيْلَهٗ اِلَى التَّاوِيْلِ فِيْ بَعْضِ كَلَامِهٖ وَاشْتَدَّ نَكِيْرُهُمْ عَلَيْهِ فِيْ ذٰلِكَ، وَلَارَيْبَ اَنَّ كَلَامَهٗ فِيْ ذٰلِكَ مُضْطَرِبٌ مُخْتَلِفٌ. (مشائخ حنابلہ کی ایک جماعت نے ان پر اعتراض کیا ہے اور اس بات پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے کہ ان کے کلام کے کچھ حصوں میں تاویل کی طرف میلان پایا جاتا ہے اور کوئی شک نہیں کہ ان کا کلام اس سلسلے میں مضطرب اور مختلف ہے۔)

اس اضطراب واختلاف کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک متلوّن مزاج محدث کے پیروکار

---

(۱) نزهة النظر شرح نخبة الفكر، مطبع سعيدى، ص ۵۰.

تھے اس لئے ان کی اپنی تصانیف میں بھی یہ تلوّن اور اضطراب درآیا۔

''كَانَ مُعَظِّمًا لِاَبِیْ الْوَفَاءِ ابْنِ عَقِیْلٍ مُتَابِعًا لِاَكْثَرِ مَایَجِدُه' مِنْ كَلَامِهٖ؛ وَاِنْ كَانَ قَدْرَدَّ عَلَیْهِ فِیْ بَعْضِ الْمَسَآئِلِ. وَكَانَ اِبْنُ عَقِیْلٍ بَارِعًا فِیْ الْكَلَامِ وَلَمْ یَكُنْ تَامَّ الْخَبْرَةِ بِالْحَدِیْثِ وَالْاٰثَارِ، فَلِهٰذَا یَضْطَرِبُ كَلَامُه' فِیْ هٰذَا الْبَابِ وَ تَتَلَوَّنُ فِیْهِ اٰرَائُه' وَاَبُوالْفَرَجِ تَابِعٌ لَه' فِیْ هٰذَا التَّلَوُّنِ. (۱)

(ابن جوزی، ابوالوفاء ابن عقیل کی تعظیم کرنے والے اوران کے کلام کے اکثر حصے سے اتفاق رکھنے والے تھے، اگرچہ بعض مسائل میں انہوں نے ابن عقیل کی تردید بھی کی ہے، اورابن عقیل اگرچہ علم کلام میں ماہر تھے مگر حدیث وآثار کے بارے میں پوری طرح باخبر نہیں تھے۔اسی لئے ان کا کلام اس سلسلے میں مضطرب ہوجاتا تھااوران کی آراء میں تلوّن پیدا ہوجاتا تھااورابن جوزی اس تلوّن میں ان کے تابع ہیں۔)

یہ ان کی متلوّن مزاجی ہی تو ہے کہ جب نقد وجرح پراترتے ہیں تو صرف ضعیف ہی نہیں، صحیح احادیث کو بھی موضوع قرار دے دیتے ہیں اور جمع وتدوین پرآتے ہیں تو انتہائی منکر؛ بلکہ موضوع روایات تک اپنی کتابوں میں درج کرلیتے ہیں۔

تنقید میں ان کی شدت کا یہ عالم ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب ''موضوعات'' میں حدیث ردِّ شمس (۲) کو یکسر موضوع اور باطل قرار دے دیا ہے، حالانکہ اس حدیث کو قاضی عیاض اور متعدد محدثین نے صحیح کہا ہے کیونکہ یہ اتنی سندوں کے ساتھ مروی ہے کہ علامہ شامی کہتے ہیں---یَتَعَذَّرُ مَعَهَا الْحُكْمُ عَلَیْهِ بِالضُّعْفِ، فَضْلًا عَنِ الْوَضْعِ---یعنی ان اسانید کی موجودگی میں اس روایت کو ضعیف کہنا بھی مشکل ہے؛ چہ جائیکہ موضوع ہی قرار دے دیا جائے۔

---

(۱) طبقات الحنابلة، ج۱، ص ۴۱۴۔

(۲) حدیث ردشمس سے مراد وہ حدیث ہے جس میں مذکور ہے کہ ایک دفعہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ' کی نماز عصر قضا ہوگئی تو رسول اللہ ﷺ کی دعا سے سورج، غروب ہونے کے بعد پھر لوٹ آیا اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ' نے عصر کی نماز ادا کی۔

اسی لئے حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں صاف لکھا ہے

''اَخْطَأَ اِبْنُ الْجَوْزِیُ بِذِکْرِہٖ فِیُ الْمَوْضُوْعَاتِ.'' (ابن جوزی نے اس روایت کو موضوعات میں شمار کر کے غلطی کی ہے۔)

اگر اس روایت کو صحیح نہ بھی تسلیم کیا جائے تو زیادہ سے زیادہ ضعیف ہوگی، نہ کہ موضوع، موضوع ہونا اور چیز ہے اور ضعیف ہونا اور شئے مگر ابن جوزی اس فرق کو ملحوظ نہیں رکھتے اور ضعیف حدیثوں کو بھی موضوع کہہ دیتے ہیں۔

وَقَدْ نَصَّ اِبْنُ الصَّلَاحِ وَمَنْ تَبِعَہ' عَلٰی تَسَاھُلِ اِبْنِ الْجَوْزِیُ فِیُ کِتَابِ الْمَوْضُوْعَاتِ بِحَیْثُ خَرَجَ عَنْ مَوْضُوْعِہٖ لِمُطْلَقِ الضُّعْفِ.

(ابن صلاح اور ان کے متبعین نے تصریح کی ہے کہ ابن جوزی نے ''موضوعات'' میں اپنے موضوع سے نکل کر زیادتی کی ہے اور جو حدیثیں محض ضعیف تھیں ان کو بھی من گھڑت کہہ دیا ہے۔)

یہی بات علامہ عراقی نے ایک شعر میں بیان کی ہے۔

وَاَکْثَرَ الْجَامِعُ فِیْہِ اِذْ خَرَجُ
لِمُطْلَقِ الضُّعْفِ اَعْنِیُ اَبَا الْفَرَجُ

(موضوعات جمع کرنے والے، یعنی ابن جوزی نے موضوعات کی تعداد بہت بڑھادی ہے کیونکہ محض ضعف پر بھی وضع کا حکم لگادیا ہے۔)

غرضیکہ حدیث ردشمس یا تو صحیح ہوگی یا زیادہ سے زیادہ ضعیف ہوسکتی ہے۔ اس کو بغیر کسی شک وشبہے کے موضوع اور باطل کہنا ابن جوزی کی خطا ہے؛ تاہم اس خطا میں چونکہ وہ منفرد نہیں ہیں؛ بلکہ بعض دیگر محدثین نے بھی اس حدیث کو موضوع قرار دیا ہے اس لئے ابن جوزی کی اس کوتاہی سے صرف نظر کیا جاسکتا ہے مگر اس کا کیا علاج کہ ابن جوزی بعض دفعہ قطعی طور پر صحیح حدیث کو بھی بے دریغ موضوع کہہ دیتے ہیں، حتی کہ انہوں نے صحیح مسلم کی ایک حدیث کو بھی موضوع قرار دے دیا ہے۔ چنانچہ علامہ سیوطی ان کی کتاب موضوعات کے بارے میں کہتے ہیں۔

وَمِنْ عَجِيْبِ. مَا تَرَاهُ فَاعْلَمِ
اَنَّ فِيْهِ حَدِيْثًا مِّنْ صَحِيْحِ مُسْلِمِ

(اس کتاب میں جو عجیب باتیں تم دیکھو گے، ان میں سے ایک یہ بھی جان رکھو کہ اس میں صحیح مسلم کی ایک حدیث بھی پائی جاتی ہے۔)

فَهٰذِهِ غَفْلَةٌ شَدِيْدَةٌ مِنْهُ، يَحْكُمُ بِوَضْعِ حَدِيْثٍ مِّنْ اَحَدِ الصَّحِيْحَيْنِ۔(۱)

(یہ ان کی شدید غفلت ہے کہ صحیحین میں سے ایک کتاب کی حدیث پر وضع کا حکم لگا دیا ہے۔)

یہ تو علامہ ابن جوزی کی وہ خطائیں، غفلتیں اور کوتاہیاں ہیں جو نقد و جرح میں ان سے سرزد ہوئیں۔ جہاں تک جمع و تدوین میں تساہل کا تعلق ہے تو ابن جوزی کا یہ پہلو اگرچہ ابھی تک پوشیدہ رہا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ موصوف اس میں بھی اپنی مثال آپ ہیں اور نہ صرف ضعیف بلکہ سخت منکر اور موضوع روایات تک اپنی کتابوں میں درج کر لیتے ہیں۔

مثلاً ایک روایت ہے کہ جانِ دوعالم ﷺ نے ایک شخص کو بطور خوشبو اپنا پسینہ عطا فرمایا اور جب اس کے گھر والے اس کو استعمال کرتے تھے تو پورا مدینہ اس کی خوشبو سے مہک اٹھتا تھا، اس وجہ سے ان لوگوں کے گھر کا نام ہی ''بَيْتُ الْمُطَيِّبِيْن'' پڑ گیا، یعنی خوشبو داروں کا گھر۔ (مختصراً)

اس روایت کو علامہ ذہبی نے انتہائی منکر قرار دیا ہے۔ اس کا ایک راوی جلیس ہے جس کو ابن عدی نے ''منکر روایتیں بیان کرنے والا'' اور دارقطنی نے ''متروک'' کہا ہے۔ اسی جلیس کی وجہ سے خطیب نے اس کو موضوع کہا ہے اور واضح کیا ہے کہ اٰفَتُه' جَلِيْس (اس روایت کو جو آفت لاحق ہے وہ یہی جلیس ہے۔)(۲)

---

(۱) حوالہ جات کے لئے ملاحظہ ہو زرقانی علی المواہب، ج ۵، ص ۱۳۷، ۱۳۸۔

(۲) اللآلی المصنوعہ، ص ۲۷۴۔

آپ حیران ہوں گے کہ جلیس جیسے متروک اور آفت کے پرکالے کی یہ سخت منکر اور بقول خطیب موضوع روایت بھی ابن جوزی کی کتاب الوفاء میں پوری آب وتاب کے ساتھ موجود ہے---!(۱)

چلیں، اس روایت کے بارے میں تو پھر بھی یہ جواز پیش کیا جاسکتا ہے کہ ممکن ہے ابن جوزی بذاتِ خود اس کو منکر یا موضوع نہ سمجھتے ہوں مگر انتہائی حیرت کی بات یہ ہے کہ ابن جوزی نے اسی کتاب الوفاء میں وہ حدیثیں بھی درج کر رکھی ہیں جن کو ''موضوعات'' میں خود ہی سربسر من گھڑت اور جعلی قرار دیتے ہیں۔

مثلاً ایک طویل روایت میں ہے کہ حضرت عباسؓ نے جانِ دو عالم ﷺ کی مدح میں ایک قصیدہ کہا جس کے آخری دوشعر یہ ہیں۔

وَاَنْتَ لَمَّا وُلِدْتَّ اَشْرَقَتِ الْ-----اَرْضُ وَضَاءَ بِنُوْرِکَ الْاُفُق

فَنَحْنُ فِیْ ذٰلِکَ الضِّیَاءِ وَفِی النُّ-----وْرِ وَسُبُلِ الرَّشَادِ نَخْتَرِق

(یارسول اللہ! جب آپ پیدا ہوئے تو زمین چمک اٹھی اور آپ کی روشنی سے افق منور ہوگیا۔ اب ہم اسی روشنی میں، نور میں اور ہدایت کے راستوں میں آگے بڑھ رہے ہیں۔)

''موضوعات'' میں ابن جوزی نے اس پوری روایت کو موضوع قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ یہ قصے کہانیاں بیان کرنے والوں کی گھڑی ہوئی ہے---مِنْ وَضْعِ الْقُصَّاصِ لیکن تعجب ہے کہ داستان طرازوں کی یہ خودساختہ روایت بھی کتاب الوفاء میں موجود ہے۔(۲)

اسی لئے الوفاء کا جو نسخہ دارالمعرفۃ، بیروت سے مصطفیٰ عبدالواحد کی تحقیق وتعلیق کے ساتھ چھپا ہے، اس میں جہاں ابن جوزی نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ لَا اَخْلَطُ الصَّحِیْحَ بِالْکَذِبِ (میں صحیح کو جھوٹ کے ساتھ نہیں ملاتا) وہاں مصطفیٰ عبدالواحد نے بڑی حسرت

---

(۱) الوفاء، ج۲، ص ۴۰۸۔ (۲) الوفاء، ج۱، ص ۳۵۔ واضح رہے کہ فی الواقع یہ روایت موضوع ہے یا نہیں، یہ ایک علیحدہ بحث ہے۔ ہمارا مقصد صرف اتنا ہے کہ ابن جوزی اس کو موضوع سمجھتے ہیں۔

سے کہا ہے:

لَيْتَه' رَاعٰى هٰذَا الْوَعْدَ الَّذِیْ قَطَعَه' عَلٰى نَفْسِهٖ، فَلَقَدْ خَلَطَ الصَّحِيْحَ بِالْكَذِبِ فِیْ بَعْضِ الْمَوَاضِعِ.(۱)

(کاش کہ ابن جوزی نے اپنے اس قطعی وعدے کا پاس کیا ہوتا---! حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے صحیح کو جھوٹ کے ساتھ بعض جگہوں میں خلط ملط کر دیا ہے۔)

اور حدیث ''قِطَفُ الْعِنَبُ'' کے ذیل میں حیرانی کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وَالْعَجَبُ مِنْ اَنَّ اِبْنَ الْجَوْزِیْ رَحِمَهُ اللّٰهُ يُوْرِدُ فِیْ كِتَابِهٖ هٰذَا الْاَحَادِيْثَ الْمَوْضُوْعَةَ الَّتِیْ يَذْكُرُهَا هُوَ نَفْسُه' فِی الْمَوْضُوْعَاتِ.(۲)

(حیرت کی بات ہے کہ ابن جوزی اپنی اس کتاب (الوفاء) میں ایسی من گھڑت روایتیں بھی لے آتے ہیں جن کو خود ہی ''موضوعات'' میں وضعی شمار کرتے ہیں۔)

واقعی اس طرز عمل پر اظہار حیرت کے سوا کیا کیا جا سکتا ہے---!!

حاصل کلام یہ کہ ابن جوزی ایک متلون مزاج ہستی ہیں جو نہ نقد وجرح میں اعتدال ملحوظ رکھ سکتے ہیں، نہ جمع وتدوین میں تساہل سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ موضوعات میں انہوں نے کئی صحیح حدیثوں کو موضوع کہہ دیا ہے اور الوفاء میں متعدد موضوع روایتوں کو درج کر دیا ہے۔ کیا ایسے محدث کو ''محتاط'' کہا جا سکتا ہے---؟ کیا احتیاط اسی چیز کا نام ہے---؟

قارئین کرام! اب آپ ہی بتائیے کہ جب الوفاء میں ایسی روایتیں بھی موجود ہیں جن کو خود ابن جوزی جعلی اور خود ساختہ تصور کرتے ہیں تو اس کتاب کی نفی ظل والی روایت کو کسی سند کے بغیر کیسے قبول کیا جا سکتا ہے---!

اگر کوئی روایت محض اس بناء پر صحیح اور قابل قبول تصور کی جائے کہ ابن جوزی نے اس کو اپنی کسی کتاب میں ذکر کیا ہے تو پھر اس روایت کو بھی ماننا پڑے گا جو اسی کتاب الوفاء میں موجود ہے کہ ابولہب نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا:

---

(۱) الوفاء، ج ۱، ص ۱ (۲) الوفاء، ج ۱، ص ۳، ۴۔

''یَامُحَمَّدُ! اَیَدْخُلُ عَبْدُالْمُطَّلِبِ النَّارَ؟'' (اے محمد! کیا عبدالمطلب جہنم میں جائیں گے؟)

رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا---''نَعَمْ، وَمَنْ مَاتَ عَلٰی مِثْلِ مَامَاتَ عَلَیْهِ عَبْدُالْمُطَّلِبِ دَخَلَ النَّارَ!''(۱)

(ہاں، نہ صرف عبدالمطلب؛ بلکہ جو شخص بھی اس عقیدے پر مرے گا، جس پر عبدالمطلب مرے ہیں، تو جہنم میں داخل ہوگا!)

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ o کاش! کہ اس روایت کو درج کرنے سے پہلے ابن جوزی نے حضرت عبدالمطلب کی اس پاکیزہ زندگی پر ایک نظر ڈال لی ہوتی جس کو خود ہی سابقہ صفحات میں تفصیل سے بیان کرکے آئے ہیں اور یہ آیت بھی ذہن میں رکھی ہوتی --- وَمَا کُنَّا مُعَذِّبِیْنَ حَتّٰی نَبْعَثَ رَسُوْلًا--- (ہم عذاب دینے والے نہیں ہیں، جب تک رسول نہ بھیج دیں۔)

عبدالمطلب تو---''فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ''(انقطاع رسل) --- کے زمانے کے آدمی ہیں اور رسول اللہ ﷺ کے اعلانِ رسالت سے تقریباً بتیس سال پہلے انتقال کرچکے تھے، انہوں نے بھلا ایسا کون سا ناقابل معافی جرم کردیا تھا کہ نص قرآنی کے برعکس انہیں خواہی نخواہی جہنم میں ڈال دیا جائے گا---!!

بہرحال ہمارا یہ مقصد نہیں ہے کہ الوفاء کی ہر روایت ناقابل اعتبار ہے، ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ روایت کے صحیح، ضعیف یا موضوع وغیرہ ہونے کا دارومدار اسناد پر ہے، جیسی سند ہوگی ویسی ہی روایت ہوگی، اگر سند ہی موجود نہ ہو تو اس روایت کو محض اس لئے قبول نہیں کیا جاسکتا کہ ابن جوزی کی کتاب الوفاء میں لکھی ہوئی ہے۔

اگر کہا جائے کہ علامہ زرقانی نے حضرت ابن عباسؓ والی یہ روایت امام عبداللہ ابن مبارک کے حوالے سے بھی بیان کی ہے اور عبداللہ ابن مبارک کی عظمت وجلالت شک و

---

(۱) الوفاء، ج۱، ص۳۷۳۔

شبہے سے بالاتر ہے، تو جواباً عرض ہے کہ امام عبداللہ ابن مبارک بلاشبہ عظیم ہستی ہیں اور ان کی جو روایتیں مسانید و اصول میں ہیں، بالاتفاق حجت ہیں مگر ان کی طرف منسوب کتابیں اس درجے کی مستند نہیں ہیں کہ ان میں پائی جانے والی روایات بغیر کسی سند کے قبول کر لی جائیں۔

ان کی معروف تصنیف ''کتاب الزھد والرقائق'' کے بارے میں علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں

''وَمِنْ اَجَلِّ مَاصُنِّفَ فِیْ ذٰلِکَ کِتَابُ الزُّھْدِ لِعَبْدِاللّٰہِ ابْنِ مُبَارَکِ وَفِیْہِ اَحَادِیْثُ وَاھِیَۃٌ.''(۱) (زہد کے موضوع پر جو بہت عمدہ کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں عبداللہ ابن مبارک کی کتاب الزہد بھی ہے لیکن اس میں احادیث واہیہ پائی جاتی ہیں۔)

کتاب الزہد والرقائق احادیثِ واہیہ پر مشتمل ہو یا نہ ہو، بہرصورت اس میں یہ روایت نہیں پائی جاتی اور اس کتاب کے علاوہ ان کی کسی اور مطبوعہ کتاب کا تلاش بسیار کے باوجود ہمیں سراغ نہیں مل سکا۔(۲)

ہماری علمیت تو خیر ہے ہی بہت محدود، اعلیٰ حضرتؒ کی وسعتِ علم اور احاطۂ کتب سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا مگر عبداللہ ابنِ مبارک کی کتابیں ایسی غیر معروف ہیں کہ اعلیٰ حضرت کو بھی ان سے آگاہی نہیں تھی، چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں

''بر تصانیف امام حجت سیدنا عبداللہ ابن مبارک وقوف نہ یافتہ ام۔''(۳)

اب آپ ہی بتایئے کہ ایسی ناپید کتابوں کی کسی بے سند روایت پر کیسے اعتماد کیا جا سکتا ہے جب کہ عبداللہ ابن مبارک نے جن راویوں سے حدیثیں لی ہیں ان میں ''اجلح کندی'' جیسے مختلف فیہ اور ''حنظلہ سدوسی'' جیسے ''منکر الحدیث'' اور ''لیس بشی'' راوی بھی موجود ہیں۔(۴)

---

(۱) کشف الظنون، ج ۲، کالم ۱۴۲۳۔ (۲) ''الاعلام'' کے مطابق عبداللہ ابن مبارک کی غیر مطبوعہ کتاب بھی فقط ایک ہے جو جہاد کے موضوع پر ہے۔ (۳) مجموعہ رسائل نور سایہ، ص ۱۲۶، ۱۳۸۔ (۴) عبداللہ ابن مبارک کے اساتذہ کی فہرست سیر اعلام النبلاء ج ۸، ص ۳۷۹ پر دیکھئے۔ اجلح اور حنظلہ کے بارے میں محدثین کی آراء، میزان الاعتدال، ج ۱ علی الترتیب ص ۱۲۸ اور ۲۹۲ پر دیکھئے۔

یہ گفتگو تو اس صورت میں ہے جب یہ تسلیم کیا جائے کہ یہ روایت عبداللہ ابن مبارک کی کسی نامعلوم کتاب میں پائی جاتی ہے؛ جب کہ ہمارے خیال میں اس روایت کو عبداللہ ابن مبارک کی طرف منسوب کرنے میں علامہ زرقانی کو شاید سہو ہوا ہے کیونکہ ان کے علاوہ کسی محدث نے اس روایت کو عبداللہ ابن مبارک کے حوالے سے بیان نہیں کیا، حالانکہ عبداللہ ابن مبارک صحاح ستہ کے راوی ہیں اور بڑے ائمہ حدیث میں سے ایک ہیں۔ اگر انہوں نے یہ روایت بیان کی ہوتی، یا اپنی کسی کتاب میں لکھی ہوتی تو اتنی غیر معروف نہ ہوتی کہ علامہ زرقانی کے سوا کسی کو اس کا پتہ ہی نہ چلتا --- جبکہ عبداللہ ابن مبارک متوفی ۱۸۱ھ اور علامہ زرقانی متوفی ۱۱۲۲ھ کے درمیان نوسو سال سے زیادہ عرصہ حائل ہے۔

حضرت عبداللہ ابن مبارک تو اتنے بڑے محدث ہیں کہ مؤرخین ان کے شاگردوں کے بارے میں لکھتے ہیں خَلْقٌ لَّا یُحْصٰی عَدَدُھُمْ، یعنی اتنی مخلوق ہے کہ شمار نہیں کی جاسکتی۔ اس بے شمار مخلوق کے سامنے عبداللہ ابن مبارک ایک حدیث بیان کریں اور ان لاتعداد لوگوں میں سے کوئی بھی عبداللہ ابن مبارک کے حوالے سے اس کو روایت نہ کرے، یہاں تک کہ پوری نو صدیاں گزر جائیں، پھر اچانک ایک فاضل یہ انکشاف کریں کہ یہ روایت عبداللہ ابن مبارک سے بھی مروی ہے اور نہ وہ سلسلہ روایت ذکر کریں جس کے ذریعے نوسو سال پہلے بیان کی گئی یہ روایت ان تک پہنچی، نہ عبداللہ ابن مبارک کی کسی کتاب کا حوالہ دیں، تو اس انکشاف کو فاضل مذکور کے سہو کے علاوہ کیا نام دیا جاسکتا ہے!؟ خصوصاً اس صورت میں جب وہ اس روایت کو عبداللہ ابن مبارک کی طرف منسوب کرنے میں یکہ وتنہا ہوں اور کوئی محدث بھی اس نسبت میں ان کا ہمنوا نہ ہو---! (۱)

---

(۱) سعودی عرب سے ہمارے ایک دوست جناب عبداللہ نے لکھا ہے کہ یہ سہو علامہ زرقانی کو نہیں؛ بلکہ ان سے پہلے علامہ مناوی کو ہوا ہے۔ جناب عبداللہ نے تیسیر المناوی کے متعلقہ صفحے کا عکس بھی بھیجا ہے۔ اسطرف توجہ دلانے پر ہم محترم عبداللہ صاحب کے ممنون ہیں مگر اس سے اصل مسئلے، یعنی سہو نسبت پر فرق نہیں پڑتا کیونکہ عبداللہ ابن مبارک اور علامہ مناوی کے درمیان بھی آٹھ سو سال کا فاصلہ حائل ہے۔ اندریں صورت سہو والی ساری گفتگو علامہ مناوی سے متعلق ہوجائے گی۔

بے سند ہونے کے علاوہ ایک اور لحاظ سے بھی یہ روایت موضوع اور من گھڑت ثابت ہوتی ہے۔

جانِ دو عالم ﷺ کے متعدد معجزات وقتی ہیں، یعنی ان کا ظہور تھوڑی دیر کے لئے ہوا۔ مثلاً شقِ قمر، انگشتان مبارکہ سے پانی نکلنا، آپ کے فراق میں کھجور کے تنے کا رونا اور دیگر بے شمار معجزے۔ اگر ایسے معجزات کو کوئی ایک ہی صحابی روایت کرتا تو کہا جا سکتا تھا کہ ممکن ہے جب یہ واقعہ پیش آیا ہو، اس وقت روایت بیان کرنے والے صحابہ میں سے وہی ایک صحابی موقعے پر موجود ہوں، لیکن تعجب کی بات ہے کہ ایسے وقتی معجزات کو تو متعدد صحابہ بیان کریں اور ان کی روایات صحاح ستہ اور دیگر کتب معتبرہ میں موجود ہوں، مگر سایہ نہ ہونے جیسے ہمہ وقتی معجزہ کو سوائے حضرت ابن عباسؓ کے کوئی ذکر نہ کرے اور ابن عباسؓ کی طرف یہ بات منسوب کرنے کے لئے بھی ایک بے سند تعلق کا سہارا تلاش کرنا پڑے---!!

شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی عجالہ نافعہ میں لکھتے ہیں

''علامات وضع حدیث وکذب راوی چند چیز است۔'' (حدیث موضوع ہونے اور راوی کے جھوٹا ہونے کی چند علامات ہیں۔)

اس کے بعد انہوں نے گیارہ علامات بیان کی ہیں، جن میں سے چھٹی یہ ہے۔

''ششم آنکہ درحدیث قصہ باشد ازامر حسی واقعی کہ اگر بالحقیقہ متحقق می شد ہزاراں کس آں رانقل مے کردند۔''(۱)

(چھٹی علامت یہ ہے کہ روایت میں کوئی ایسا محسوس ہونے والا واقعہ مذکور ہو کہ اگر وہ درحقیقت وقوع پذیر ہوا ہوتا تو ہزاروں آدمی اس کو بیان کرتے۔)

یہ علامت حرف بہ حرف حضرت ابنِ عباسؓ کی طرف منسوب روایت میں پائی جاتی ہے۔ اگر فی الواقع رحمتِ عالم ﷺ کا سایہ نہ ہوتا تو آپ کی ولادت کے ساتھ ہی مکے میں اس کمال کا چرچا ہو جاتا اور لوگ حیرت سے ایک دوسرے کو بتاتے کہ عبدالمطلب کا ایسا

---

(۱) عجالہ نافعہ، ص ۲۴۔

پوتا پیدا ہوا ہے جس کا سایہ نہیں ہے۔ جب یہ شہرت زیادہ پھیلتی تو لوگ دور دور سے آپ کو دیکھنے آتے اور تعجب کا اظہار کرتے۔ خود عبدالمطلب جو اپنے پوتے کے کمالات بیان کر کے بہت مسرور ہوا کرتے تھے، ہر کسی کو بتاتے پھرتے اور خوشی سے پھولے نہ سماتے۔

فرض کیجئے کہ آج کل کوئی ایسا بچہ پیدا ہو جائے جس کا سایہ نہ ہو تو کیا ساری دنیا میں ہلچل نہیں مچ جائے گی---؟ یقیناً دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ کے نمائندے اس بچے کو دیکھنے کے لئے دوڑ پڑیں گے اور اپنے قارئین و ناظرین کو قدرت کے اس انوکھے کرشمے سے آگاہ کرنے کے لئے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کریں گے۔ مانا، کہ اُس دور میں اِس طرح کے ذرائع ابلاغ نہیں پائے جاتے تھے مگر مکے والوں میں تو اس کا شہرہ ہونا چاہئے تھا۔ تعجب ہے کہ ایسا محیر العقول واقعہ پیش آ جائے اور نہ عبدالمطلب اس کا ذکر کریں، نہ ابوطالب۔ نہ سیدہ آمنہ بیان کریں، نہ حلیمہ سعدیہ۔ نہ ازواج مطہرات روایت کریں، نہ آلِ عبا۔ دعوائے نبوت سے پہلے آپ کی امانت و صداقت کا تذکرہ تو ہر زبان پر ہو مگر سایہ نہ ہونے کا کوئی ذکر نہ ہو۔ ام معبد اور دیگر وصافان نبوی آپ کے خدوخال کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیں لیکن اس کمال کو زبان پر نہ لائیں۔ شق القمر، نبع الماء، حنین الجذع اور تکثیر الطعام جیسے وقتی معجزات کو متعدد صحابہ بیان کریں مگر یہ معجزہ، جو ولادت سے وصال تک برقرار رہا ہو، اس کو سوائے ابن عباسؓ کے کوئی بیان نہ کرے--- اس سے بڑا ثبوت اس روایت کے وضعی ہونے کا اور کیا ہوگا؟!!!(۱)

---

(۱) ممکن ہے کسی کو یہ اشتباہ لگے کہ اہل مکہ اور اہل مدینہ میں اگر نفی ظل کا چرچا نہیں ہوا تو ان کے ہاں ثبوت ظل کا بھی تو کوئی تذکرہ نہیں ہوا، حالانکہ اگر آپ کا سایہ ہوتا تو احادیث میں اس کا جا بجا ذکر ہونا چاہئے تھا---!

یہ بات ایک فاضل نے زبانی گفتگو کے دوران بھی کہی تھی۔ میں نے ان سے کہا کہ خلفاء راشدین کے حالات کتب تاریخ میں پوری تفصیل سے مذکور ہیں، کیا ان کے بارے میں کہیں آپ نے پڑھا ہے کہ صدیق اکبر عمر فاروق، عثمان غنی یا علی مرتضیٰ کا سایہ تھا اور جدھر یہ جاتے تھے ساتھ ساتھ

نہ جانے کس ظالم نے یہ بات گھڑ کر حضرت ابن عباس کی طرف منسوب کر ڈالی---! افسوس تو یہ ہے کہ سند نہ ہونے کی وجہ سے ہم یہ تعین بھی نہیں کر سکتے کہ یہ کس کذاب کی کارستانی ہے---!

ان تمام باتوں سے قطع نظر، اگر متنِ روایت کو دیکھیں تو وہ بھی ناقابل تسلیم ہے کیونکہ روایت میں مذکور ہے کہ آپ کی روشنی، سورج کی روشنی پر غالب آجاتی تھی۔

ان کا سایہ بھی جایا کرتا تھا؟ خلفاء راشدین کے علاوہ سینکڑوں بادشاہوں اور بزرگوں کے حالات وسوانح تاریخ میں مذکور ہیں مگر کسی کی سوانح حیات میں آپ کو یہ لکھاہوا نظر آیا کہ اس کا سایہ بھی ہوا کرتا تھا---؟

اصل بات یہ ہے کہ سایہ ہونا تو ایک معمول کی چیز ہے۔ اس کو بیان کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔! ہاں، ان میں سے کسی کا سایہ نہ ہوتا تو اسے ایک دنیا بیان کرتی اور اس خصوصیت یا کرامت کے تذکرے تاریخ اسلام کی ہر کتاب میں موجود ہوتے۔ خود جانِ دوعالم ﷺ سے متعلقہ کئی چیزیں احادیث وسیرت میں مذکور نہیں ہیں، مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ موجود ہی نہیں تھیں؟

مثلاً آپ نے کہیں پڑھا ہے کہ جانِ دوعالم ﷺ کی نورانی ناک میں معطر انفاس کی آمدورفت کے لئے اللہ تعالیٰ نے دو راستے بنائے تھے---؟ ''لباں سرخ آکھاں کہ لعل یمن'' کی تائید میں کوئی روایت پیش کی جاسکتی ہے؟

''جس کے ہر خط میں ہے موجِ نورِ کرم
اس کفِ بحرِ ہمت پہ لاکھوں سلام''

میں ہتھیلی کے جن خطوط کا بیان ہے، ان کو کسی روایت سے ثابت کیا جاسکتا ہے؟ ایسی باتیں نہ کوئی ذکر کرتا ہے، نہ ان کے ذکر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی صورت حال سائے کی ہے۔ اعلیٰحضرت فرماتے ہیں۔

''اسی طرح سایہ ایک امر عام، شامل ہے۔ اگر بعض آدمیوں کا سایہ پڑتا اور بعض کا نہیں، تو البتہ بے شک خیال جانے کی بات تھی کہ دیکھیں حضور ﷺ کا سایہ ہے یا نہیں۔ نہ اس سے کوئی امر دینی مثل اتباع و اقتداء کے متعلق تھا، کہ اس کے خیال سے بالقصد اس طرف لحاظ کیا جاتا۔'' (مجموعہ رسائل نور و سایہ ص ۹۱)

آپ ہی بتائیے قارئین کرام! کہ کیا ایسا ہونا ممکن ہے---؟

سورج کروڑوں میل کے فاصلے پر ہے مگر اس کے باوجود اس کو دیکھنے سے آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں اور زیادہ دیر دیکھنے سے نظر چلے جانے کا خطرہ رہتا ہے۔ اگر جانِ دو عالم ﷺ کی روشنی سورج سے زیادہ ہوتی تو آپ کو دیکھنا ہی ممکن نہ رہتا۔ سورج کو اتنی دور سے کوئی نہیں دیکھ سکتا تو آپ کو انتہائی قریب سے دیکھنے والوں کا کیا حشر ہوتا---؟

بلاشبہ آپ کا روئے انور تاباں و درخشاں تھا، پیشانی مصباح الدجیٰ کی طرح دمکتی تھی، بینی پُر نور پر، نور کا بُکہّ چمکتا تھا اور دانتوں سے نور کے لچھے جھڑتے تھے--- اور ایسا کیوں نہ ہوتا، جب کہ آپ اصلاً اور حقیقۃً نور تھے---مگر یہ سب کچھ اسی حد تک ہوتا تھا، جتنا کہ حسنِ ملیح کے ساتھ مناسب تھا

حسن کھاتا ہے جس کے نمک کی قسم
وہ ملیحِ دل آرا ہمارا نبی

جو ذاتِ اقدس خود اپنی ملاحت پر فخر کرے اور فرمائے---"اَخِیْ یُوْسُفُ اَصْبَحُ وَاَنَا اَمْلَحُ." (میرے بھائی یوسف صبیح زیادہ تھے اور میں ملیح زیادہ ہوں۔)

جس ہستی کے روئے دلآویز کی دلکشی و ملاحت کا یہ عالم ہو کہ آنکھیں دیکھ دیکھ کر سیر نہ ہوں اور نظریں ہٹائے نہ ہٹیں۔ صدیق اکبرؓ اور عمر فاروقؓ جس کے روئے زیبا کو دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی کرتے رہیں اور مسکراتے رہیں--- کَانَا یَنْظُرَانِ اِلَیْہِ وَ یَنْظُرُ اِلَیْھِمَا وَ یَتَبَسَّمَانِ اِلَیْہِ وَیَتَبَسَّمُ اِلَیْھِمَا--- اس املح عالم ﷺ کے بارے میں یہ کہنا کہ اس کی روشنی سورج کی روشنی پر غالب آجاتی تھی، اس کی ملاحت کی نفی کرنا ہے اور یہ ثابت کرنا ہے کہ سورج کو دیکھنے سے جس قدر آنکھیں چندھیا جاتی ہیں اس سے بدرجہا زیادہ آپ کو دیکھنے سے خیرہ ہو جاتی تھیں۔

اللہ بچائے ایسی سادہ لوحی سے---!

ہاں، اگر سورج کے ذکر سے آپ کے غیر معمولی حسن و جمال کا اظہار مقصود ہو جیسا کہ حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت ربیعؓ نے کہا ہے، تو یہ عرفاً اور محاورۃً صحیح ہے مگر اس روایت

میں توحقیقۃً آپ کی روشنی کوسورج پر غالب قرار دیا جارہا ہے جو قطعاً غلط اور خلافِ واقعہ ہے؛ البتہ یہ درست ہے کہ اکثر صحابہ کرام آپ کی طرف نظر بھر کرنہیں دیکھتے تھے مگر یہ تعظیم واکرام کی وجہ سے تھا، نہ کہ آنکھیں چندھیا جانے کی بنا پر۔

غرضیکہ یہ بے سند تعلیق ہر لحاظ سے مردود، موضوع اور باطل ہے

❁❁❁

اب نفی ظل کی تیسری روایت ملاحظہ فرمایئے جو تفسیر مدارک میں پائی جاتی ہے۔

اس روایت کا پسِ منظر یہ ہے کہ جب منافقین نے ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ پر ایک قبیح بہتان باندھا تو حضرت عمر حضرت عثمان اور حضرت علی نے اس کی بھر پور تردید کی اور اپنے اپنے انداز میں منافقین کے جھوٹ کا پول کھولا۔ اس موقع پر حضرت عثمان نے کہا

اِنَّ اللّٰہَ مَااَوْقَعَ ظِلَّکَ عَلَی الْاَرْضِ لِئَلَّا یَضَعَ اِنْسَانٌ قَدَمَہٗ عَلٰی ذٰلِکَ الظِّلِّ، فَلَمَّا لَمْ یُمَکِّنْ اَحَدًا مِنْ وَضْعِ الْقَدَمِ عَلٰی ظِلِّکَ کَیْفَ یُمَکِّنُ اَحَدًا مِنْ تَلْوِیْثِ عِرْضِکَ. (۱)

(اللہ تعالیٰ نے آپ کا سایہ زمین پر نہیں پڑنے دیا تا کہ کوئی انسان اس پر پاؤں نہ رکھ سکے۔ جب اللہ تعالیٰ نے کسی کے لئے یہ گنجائش نہیں چھوڑی کہ آپ کے سائے پر پاؤں رکھ سکے تو کسی کو اس بات کا موقع کیسے دے سکتا ہے کہ وہ آپ کی عزت کو آلودہ کرے۔)

اس روایت کا عجیب وغریب پہلو یہ ہے کہ ہمیں جہاں بھی با حوالہ دکھائی دی، تفسیر مدارک ہی کے حوالے سے لکھی نظر آئی۔

تفسیر مدارک کے مصنف علامہ عبداللہ ابنِ احمد نسفی کی وفات ۷۱۰ھ میں ہوئی۔ اس لحاظ سے یہ ساتویں صدی ہجری کے آدمی ہیں۔ ان سے پہلے چھ سو سال کے طویل عرصے میں ہزاروں محدث، مفسر اور مؤرخ گزرے ہیں مگر یہ نادر ونایاب روایت کسی کو بھی

(۱) مدارک، بھامش خازن، ج۲، ص۳۲۱۔

معلوم نہ ہوسکی؛ بلکہ ابنِ جوزی، جو علامہ نسفی کے تقریباً سوسال پہلے گزرے ہیں اور سیوطی، جو نسفی سے تقریباً سوسال بعد میں ہوئے ہیں---اوران دونوں سے زیادہ باخبر محدث شاید ہی کوئی ہو--- یہ دونوں بھی اس انوکھی روایت سے بے خبر رہے اوراپنی کسی کتاب میں اس کو ذکرنہیں کیا۔

علامہ نسفی نے بھی اس کو ''یُرْوٰی'' کے ساتھ ذکر کیا ہے، یعنی روایت کی جاتی ہے۔کون روایت کرتا ہے؟ کس سے روایت کرتا ہے؟ اور حدیث وسیرت کی کون سی کتاب میں یہ روایت پائی جاتی ہے؟ ان سب باتوں کو علامہ نسفی نے مضارع مجہول میں لپیٹ دیا ہے۔صحیح بخاری کے علاوہ باقی کتابوں کی تعلیقات تو ویسے بھی مردود ہوتی ہیں، پھر جو تعلیق صیغۂ مجہول سے بیان کی جائے، وہ اور بھی زیادہ گئی گزری ہوتی ہے۔حاشیہ نزہۃ النظر میں ہے

صِیْغَةُ الْمَجْهُوْلِ اَبْعَدُ مِنَ الْمَعْلُوْمِ فِیْ کَوْنِهٖ مَقْبُوْلًا. (۱)

(مجہول صیغے سے بیان کی گئی تعلیق، صیغۂ معلوم سے ذکر کی گئی تعلیق کی بہ نسبت قبولیت سے زیادہ دور ہوتی ہے۔)

بھلا ایسی غیر مقبول روایتیں کون قبول کرسکتا ہے---؟!

پھر یہ بھی طے نہیں ہے کہ حضرت عثمانؓ نے درحقیقت کیا کہا تھا؟ علامہ نسفی کے بقول حضرت عثمان نے زمین پر سایہ نہ پڑنے کی وجہ یہ بیان کی تھی کہ کوئی انسان اس پر قدم نہ رکھ سکے مگر شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے بقول حضرت عثمان نے اس کا سبب یہ بیان کیا تھا۔

''سایہ شریف تو برزمین نمے افتد کہ مبادا برزمین نجس افتد۔'' (۲) (یعنی آپ کا سایہ زمین پر اس لئے نہیں پڑتا کہ کہیں نجس زمین پر نہ پڑ جائے۔)

گویا مدارک والی روایت کے مطابق سایہ غائب کرنے کا مقصد یہ تھا کہ سائے کے اوپر کوئی نامناسب چیز نہ رکھی جائے اور مدارج والی روایت کی رو سے سایہ معدوم کرنے کا سبب یہ تھا کہ خود سایہ کسی ناگوار چیز کے اوپر نہ پڑ جائے۔ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں

---

(۱) حاشیہ نزھۃ النظر نخبتہ الفکر، ص۵۱۔(۲) مدارج النبوہ، ج۲، ص۱۶۱۔

متعارض ہیں، اگر سایہ دوسری چیز کے اوپر پڑتا ہے اور وہ چیز اس کے نیچے ہوتی ہے تو پہلی توجیہہ غلط ہو جاتی ہے، کیونکہ اس صورت میں یہ کہنا چاہئے تھا---''تاکہ کسی انسان کے پاؤں پر آپ کا سایہ نہ پڑ جائے۔''

اور اگر سایہ دوسری چیز کے نیچے رہتا ہے اور وہ چیز اس کے اوپر ہوتی ہے تو دوسری وجہ صحیح نہیں رہتی، کیونکہ اس صورت میں تو یوں کہنا چاہئے تھا---''تاکہ آپ کے سائے پر کوئی نجس چیز نہ پڑ جائے۔''(۱)

---

(۱) یہاں قارئین کو یہ بتانا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ ایک دفعہ اطہر عالم ﷺ نے باجماعت نماز کے دوران اپنی نعلین مبارکین اتار دیں۔ صحابہ کرامؓ نے بھی آپ کے اتباع میں ایسا ہی کیا۔ نماز سے فراغت کے بعد آپ نے صحابہ سے پوچھا کہ تم نے اپنی جوتیاں کیوں اتار دی تھیں؟ انہوں نے عرض کی کہ ہم نے آپ کو ایسا کرتے دیکھا تھا اس لئے ہم نے بھی اتار دیں۔ جانِ دوعالم ﷺ نے فرمایا ''میں نے تو اس لئے اتار دی تھیں کہ مجھے جبریل نے خبر دی تھی کہ ان کے ساتھ کوئی ناگوار چیز ہے۔ اس لئے جب تم مسجد کو آؤ تو اپنی جوتیوں کو دیکھ لیا کرو، اگر ان کے ساتھ کوئی ایسی چیز ہو تو اس کو پونچھ دیا کرو، پھر ان میں نماز پڑھ لیا کرو۔'' (مشکوٰۃ، ص۷۳)

متن میں مذکور مدارک والی روایت کے مطابق حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے اس واقعہ کا حوالہ دیتے ہوئے حضرت عائشہ صدیقہ کی برأت ان الفاظ میں بیان کی تھی

اِنَّ جِبْرِیْلَ اَخْبَرَکَ اَنَّ عَلٰی نَعْلَیْکَ قَذَرًا وَ اَمَرَکَ بِاِخْرَاجِ النَّعْلِ عَنْ رِجْلِکَ بِسَبَبِ مَاالْتَصَقَ بِہٖ مِنَ الْقَذَرِ --- الخ۔

یعنی جبریل نے آپ کو خبر دی تھی کہ آپ کی نعلین پر آلودگی پائی جاتی ہے اور ان کو اتارنے کا کہا تھا--- اس نجاست کی وجہ سے جو ان پر لگی تھی۔ اگر (بفرض محال) آپ کی اہلیہ کسی غلط کام میں ملوث ہوتیں، تو کیسے ممکن تھا کہ جبریل ان کو علیحدہ کرنے کا نہ کہتے۔

قطع نظر اس سے کہ جب سرور کونین ﷺ نے حضرت علی سے اس بارے میں رائے لی ☜

ظاہر ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شان اس سے بہت بلند و بالا ہے کہ وہ ایسی متعارض اور بے سروپا باتیں کریں اس لئے ان دونوں اقوال کی نسبت ان کی طرف درست نہیں ہے۔ ہاں، اگران ہر دو اقوال کی سندیں مذکور ہوتیں تو پھر جس کی سند زیادہ صحیح ہوتی اس کو ترجیح دے دی جاتی مگر مسئلہ تو یہی ہے کہ سند کہاں سے لائی جائے!؟

خلاصۂ کلام

یہ ہے کہ نظریہ نفی ظل کو ثابت کرنے کے لئے کل سرمایہ تین روایتیں ہیں۔

(۱) نوادرالاصول کی طرف منسوب روایت--- جس کا ایک راوی عبدالرحمٰن ابن قیس ضبی پرلے درجے کا جھوٹا اور متروک الحدیث ہے اور دوسرا عبدالملک ابن عبداللہ ابن الولید، مجہول العین ہے۔ ان میں سے اگر صرف ایک ہی سند میں موجود ہوتا، تب بھی یہ روایت قابل قبول نہ ہوتی، یہاں تو یک نہ شد دو شد والا معاملہ ہے--- یہ سند ذکوان تابعی پر جا کر ختم ہو جاتی ہے۔

(۲) کتاب الوفاء والی روایت--- جو ایک صحابی حضرت عبداللہ ابن عباس کی طرف منسوب ہے مگر بے سند ہونے کی وجہ سے مردود ہے کیونکہ ابن جوزی نے التزام صحت کیا ہے، نہ اس روایت کی کوئی اور سند دستیاب ہے۔

(۳) مدارک والی روایت--- جو وصال نبوی سے چھ سو سال بعد ایک تفسیر میں

تھی تو انہوں نے یہی جواب دیا تھا یا صحیح روایت کے مطابق کچھ اور کہا تھا، ہم قارئین کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ اس روایت کے گھڑنے والے کو خود جانِ دو عالم ﷺ کا آلودہ جگہ پر چلنا تو گوارا ہے، آپ کی نعلین شریفین کی آلودگی بھی تسلیم ہے مگر آپ کے سائے کا زمین نجس پر پڑنا اس کے خیال میں اتنا ناقابل برداشت ہے کہ اس مقصد کے لئے سائے کو ہی ختم کر دینا پڑا؛ حالانکہ سایہ اگر زمین نجس پر پڑ بھی جائے تو قطعاً آلودہ نہیں ہوتا۔

غالباً روایت گھڑنے والے کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ترجمانی کرتے وقت یہ یاد ہی نہیں رہا کہ میں ابھی ابھی حضرت عثمان سے کیا کہلوا چکا ہوں۔ سچ ہے--- دروغ گو را حافظہ نباشد۔

نمودار ہوئی اور عالمگیر شہرت رکھنے والے تمام محدثین ومؤرخین اس سے بے خبر رہے۔ یہ روایت بھی بے سند تو ہے ہی، مگر بصیغۂ مجہول مذکور ہونے کی وجہ سے اس کی نامقبولیت مزید بڑھ جاتی ہے۔

اب آپ ہی بتایئے کہ ایسی موضوع، مردود اور ناقابل قبول روایات کے سہارے بھی بھلا کوئی مسئلہ ثابت کیا جاسکتا ہے---؟!

یہاں خلط مبحث کرتے ہوئے کہہ دیا جاسکتا ہے کہ یہ مسئلہ ظنی ہے اور ظنی مسئلے کے لئے ظنی دلیلیں کافی ہوتی ہیں، جیسا کہ شرح عقائد میں لکھا ہے

لَاخِفَاءَ فِیْ اَنَّ الْمَسْئَلَةَ ظَنِّيَّةٌ يُكْتَفٰى فِيْهَا بِالْاَدِلَّةِ الظَّنِّيَّةِ. (۱)

جواباً عرض ہے کہ ہمیں یہ اصول دل وجان سے تسلیم ہے مگر اس کا انطباق روایات نفی ظل پر درست نہیں کیونکہ ظنی دلائل سے مراد یا تو وہ دلائل ہوتے ہیں جو قطعی الثبوت ہوں مگر کسی عارض کی وجہ سے ظنی الشمول ہو جائیں، جیسے وہ آیات قرآنیہ جو عام مخصوص منہ البعض پر مشتمل ہوں کیونکہ تخصیص کے بعد عام ظنی ہو جاتا ہے۔ شرح عقائد کی عبارت کا تعلق اس صورت سے ہے۔

یا وہ دلائل مراد ہوتے ہیں جو ظنی الثبوت ہوں مگر صحیح روایات سے ثابت ہوں، جیسے صحیح اخبار آحاد کیونکہ اخبار آحاد سب ظنی ہیں۔

علام زرقانی مسئلہ رؤیت باری تعالیٰ میں گفتگو کرتے ہوئے علامہ سبکی کے حوالے سے لکھتے ہیں

لَيْسَ مِنْ شَرْطِهٖ اَنْ يَّكُوْنَ قَاطِعًا مُتَوَاتِرًا؛ بَلْ مَتٰى كَانَ حَدِيْثًا صَحِيْحًا وَ لَوْ ظَاهِرًا وَهُوَ مِنْ رِوَايَةِ الْآحَادِ، جَازَ اَنْ يُّعْتَمَدَ عَلَيْهِ فِیْ ذٰلِكَ، لِاَنَّ ذٰلِكَ لَيْسَ مِنْ مَسَائِلِ الْاِعْتِقَادِ الَّتِیْ يُشْتَرَطُ فِيْهَا الْقَطْعُ. (۲)

(ایسے اعتقادیات کی دلیل کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ قطعی اور متواتر ہو؛ بلکہ

---

(۱) شرح عقائد نسفی، ص۱۲۲۔ (۲) زرقانی، ج۵، ص۱۴۴۔

اخبارِ آحاد میں سے جو حدیث بظاہر صحیح ہو، اس پر بھی اس مسئلے میں اعتماد کیا جا سکتا ہے کیونکہ یہ مسئلہ (رؤیت باری) ان مسائل اعتقادیہ میں سے نہیں ہے جن کے لئے قطعی ثبوت شرط ہو۔)

یعنی جن مسائل اعتقادیہ کے لئے قطعی ثبوت شرط ہے ان کے لئے حدیث متواتر کا ہونا لازمی ہے؛ البتہ جن اعتقادی مسائل کے لئے قطعی ثبوت شرط نہیں ہے، ان میں حدیث کا متواتر ہونا ضروری نہیں ہے؛ بلکہ اخبارِ آحاد میں سے جو حدیث صحیح ہو اس پر بھی اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

اس میں زیادہ سے زیادہ یہ توسیع کی جا سکتی ہے کہ معجزات میں صحیح کے علاوہ ضعیف حدیثیں بھی تسلیم کر لی جائیں کیونکہ اکثر محدثین کے نزدیک فضائل و مناقب میں ضعیف احادیث قابل قبول ہوتی ہیں، لیکن جعلی، من گھڑت اور سر بسر بے سند و بے اصل روایتیں تو سرے سے قابل استدلال ہی نہیں ہوتیں؛ چہ جائیکہ ان سے اعتقادی مسئلے ثابت کئے جانے لگیں---!!

اگر کہا جائے کہ بہت سے محدثین اور اہل علم نے ان روایات سے استدلال و استشہاد کیا ہے، اگر یہ روایتیں ایسی ہی مردود اور نا قابل اعتبار تھیں تو انہوں نے کیسے قبول کر لیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جن علماء نے ان روایات سے استدلال کیا ہے وہ بلاشبہ آسمانِ علم وفضل کے تابندہ ستارے ہیں مگر ان روایات کو انہوں نے محض جذبۂ محبت کی بناء پر قبول کیا ہے اور اس مبارک جذبے کے تحت جو بھی علمی کام کیا جائے، اس پر یقیناً بے بہا اجر و ثواب ملے گا لیکن جذباتِ عشق ومحبت ظاہر کرنے کے انداز اپنے اپنے ہوتے ہیں۔

ایک طریقہ یہ ہے کہ محبوب کے فضائل و کمالات سے متعلق جو کچھ بیان کیا جائے اس کے بارے میں زیادہ چھان پھٹک نہ کی جائے اور اس کو بے چون وچرا تسلیم کر لیا جائے کیونکہ اس طرح محبوب کے فضائل کی تکثیر ہوتی ہے اور ہر عاشق کی خواہش ہوتی ہے کہ میرا محبوب زیادہ سے زیادہ محاسن وفضائل کا جامع ہو۔

بلاشبہ یہ بھی محبت کا ایک انداز ہے اور بہت ہی پیارا انداز ہے، لیکن محبت ہی کا

ایک انداز یہ بھی ہے کہ محبوب کی طرف منسوب ہر چیز کا پوری باریک بینی سے جائزہ لیا جائے اور صرف انہی چیزوں کو قبول کیا جائے جن کا ثبوت قابلِ اعتماد ذرائع سے مل جائے کیونکہ اس جامع الکمالات محبوب کی شان اس سے بہت عالی و برتر ہے کہ اس کے فضائل ثابت کرنے کے لئے بے ثبوت سہارے تلاش کئے جائیں۔

یہ دونوں انداز قدیم زمانے سے چلے آتے ہیں اور صحابہ کرامؓ سے امام احمد رضا تک بیسیوں شواہد پیش کئے جاسکتے ہیں۔ہم صرف تین مثالیں ذکر کررہے ہیں۔

(۱)---صحابہ کرامؓ کی اکثریت اس بات کی قائل ہے کہ شب معراج جانِ دو عالم ﷺ کو اللہ کا دیدار نصیب ہؤا تھا لیکن حضرت عائشہ صدیقہ اس سے یکسر انکار کرتی ہیں اور فرماتی ہیں کہ قرآن کریم میں صاف مذکور ہے کہ آنکھیں اللہ تعالیٰ کا ادراک نہیں کرسکتیں۔لَاتُدْرِکُهُ الْاَبْصَار---

جانِ دو عالم ﷺ کے لئے دیدار الٰہی جیسی عظیم سعادت سے انکار کرنے کی وجہ سے کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ ام المؤمنینؓ کو جانِ دو عالم ﷺ سے محبت نہیں تھی؟ نہیں؛ بلکہ انکار کا اصل پسِ منظر یہ تھا کہ یہ بات ان کی رائے میں قرآن کے خلاف تھی اور انہیں اپنے محبوب شوہر کی طرف کسی ایسی چیز کی نسبت گوارا نہ تھی، جو قرآن کے مطابق نہ ہو۔

اب ام المؤمنین کے استدلال سے تو اختلاف کیا جاسکتا ہے اور کیا گیا ہے، مگر ان کے جذبۂ محبت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

(۲)---اہل محبت علماء کی اکثریت جانِ دو عالم ﷺ کے والدین کریمین کی وفات عقیدۂ توحید پر مانتی ہے، مگر ملا علی قاری کو اصرار ہے کہ ان کی موت کفر پر ہوئی تھی۔کیا ملا علی قاری کے جذبۂ محبت میں کوئی خامی تھی---؟ نہیں، ان کی محبت رسول پر تو شرح شفاء، شرح شمائل اور المورد الروی وغیرہ شاہد ہیں۔بات یہی تھی کہ ان کے نزدیک چونکہ والدین کریمین کے ایمان کی روایات پایۂ ثبوت تک نہیں پہنچی تھیں اس لئے انہوں نے اس نظریئے سے اتفاق نہیں کیا اور اس کی مخالفت میں پورا زورِ بیان صرف کردیا۔

اب ملا علی قاری کے دلائل کی تردید تو کی جاسکتی ہے لیکن ان کا عشقِ رسول نا قابلِ

انکار ہے۔

(۳) ---اہل سنت کی اکثریت ابوطالب کی موت کفر پر مانتی ہے، مگر اہل سنت ہی کا ایک چھوٹا سا گروہ ابوطالب کو مومن سمجھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نظریئے کی بنیاد جذبۂ محبت ہی ہے۔ ان لوگوں کی محبت رسول یہ گوارا نہیں کرتی کہ ابوطالب جیسا رسول اللہ ﷺ کا مددگار ومعاون جہنم میں جائے اس لئے وہ ابوطالب کے ایمان کے قائل ہیں۔ علامہ احمد ابن زینی دحلان نے اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ بنام **اسنی المطالب فی ایمان ابی طالب** لکھا ہے مگر اعلیٰ حضرت نے اس نظریئے سے اختلاف کیا ہے اور **شرح المطالب فی مبحث ابی طالب** لکھ کر دلائل کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ ابوطالب کی موت کفر پر ہوئی تھی۔

اعلیٰ حضرت کو جانِ دوعالم ﷺ سے جو والہانہ محبت تھی اس سے کون انکار کرسکتا ہے مگر ایمانِ ابوطالب کی روایات چونکہ ان کی تحقیق کے مطابق وضعی اور جعلی تھیں اس لئے انہوں نے ایسی روایات پر اعتماد کرنا مناسب نہ سمجھا۔

غرضیکہ اربابِ عشق ومحبت کے یہ دونوں انداز شروع سے چلے آتے ہیں۔ کوئی ہر حال میں تساہل اختیار کرتے ہیں، کوئی ہر صورت میں شدت اپناتے ہیں اور کوئی بعض مسائل میں تساہل کر لیتے ہیں اور بعض میں شدت۔ طریقے اپنے اپنے ہیں مگر جذبہ ایک ہی ہے، یعنی حُبّ رسول، اس لئے ہر ایک کو اس کے حسن نیت کی وجہ سے بارگاہ رب العزت سے صلہ ملتا ہے۔

ابوعبداللہ حاکم نیشاپوری حد درجے کے متساہل ہیں۔ ''مستدرک'' میں بعض قطعی طور پر من گھڑت حدیثوں کو نہ صرف صحیح قرار دے دیتے ہیں؛ بلکہ علیٰ شرط الشیخین کہہ دیتے ہیں۔ جب ان کی وفات ہوئی تو کسی شخص نے خواب میں دیکھا کہ فرما رہے تھے---''میں نے نجات پائی''--- دیکھنے والے نے پوچھا---''کس وجہ سے؟'' فرمایا---''رسول اللہ ﷺ کی حدیثیں لکھنے کی وجہ سے۔''(۱)

---

(۱) بستان المحدثین مترجم، ص۷۲۔

حاکم کے برعکس یحییٰ ابنِ معین انتہائی متشدد ہیں؛ خصوصاً راویان حدیث پر جرح و تنقید کے معاملے میں۔ بہت سے ایسے راوی جن پر متعدد محدثین اعتماد کرتے تھے، یحییٰ ابن معین نے ان کے حالات کا باریک بینی سے جائزہ لینے کے بعد انہیں مسترد کر دیا اور پوری بے باکی سے کسی کو جھوٹا، کسی کو جعلساز اور کسی کو افتراء پرداز قرار دے کر نا قابل اعتبار ٹھہرایا۔ ان کے اس طرز عمل سے بعض لوگ سخت نالاں رہے ہیں۔ ایک عربی شاعر بکر ابن حماد ان پر تنقید کرتے ہوئے کہتا ہے

وَلابْنِ مُعِيْنٍ فِیْ الرِّجَالِ مَقَالَۃٌ
سَیُسْأَلُ عَنْهَا وَالْمَلِیْکُ شَهِیْد'
فَاِنْ یَّکُ حَقًّا فَهِیَ فِیْ الْحُکْمِ غِیْبَۃٌ
وَاِنْ یَّکُ زُوْرًا فَالْقِصَاصُ شَدِیْد'

(ابن معین نے راویوں پر جو اعتراضات کئے ہیں، ان کے بارے میں اس سے عنقریب پوچھا جائے گا؛ جبکہ اللہ بادشاہ روبرو ہوگا، کیونکہ اگر اس نے سچ کہا ہے، تب بھی یہ غیبت کے حکم میں داخل ہے اور اگر جھوٹ بولا ہے تو اس کی سزا مزید سخت ہے۔)

بکر ابن حماد جیسے معترضین نے یہ نہ سوچا کہ ابنِ معین کی ان راویوں سے کوئی ذاتی عداوت تو نہ تھی، نہ زر یا زمین کا جھگڑا تھا، وہ تو ان کے پول اس لئے کھولتے رہے کہ کہیں یہ لوگ اہل محبت کی عقیدتوں پر ڈاکے ڈال کے آقائے دو جہاں ﷺ کی طرف غلط چیزیں منسوب کرنے میں کامیاب نہ ہو جائیں۔

ابنِ معین کا یہ عمل بکر ابن حماد اور اس کے ہمنواؤں کی نظر میں خواہ کتنا ہی ناپسندیدہ رہا ہو، اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیب ﷺ کو اتنا پسند آیا کہ ابن معین کا وصال دیار حبیب میں ہوا اور ان کو خاص اس مبارک تختے پر نہلایا گیا، جس پر جانِ دو عالم ﷺ کو آخری غسل دیا گیا تھا۔ جب ان کا جنازہ اٹھا تو مخلوق خدا کا ایک جمِ غفیر پیچھے پیچھے رواں تھا اور آگے آگے ایک نقیب اعلان کرتا جا رہا تھا کہ یہ اس جلیل القدر محدث کا جنازہ ہے جو رسول اللہ ﷺ کی

حدیثوں کو جھوٹ کی آمیزش سے بچایا کرتا تھا۔(۱)

ہم نے بھی روایات نفی ظل کا محدثانہ اصول وضوابط کی روشنی میں مفصل جائزہ اس لئے لیا ہے کہ کوئی بے ثبوت چیز جانِ دو عالم ﷺ کی طرف منسوب نہ ہونے پائے، لیکن ہمیں نہ تو علمیت کا دعویٰ ہے، نہ اپنے تجزیئے کی صحت پر اصرار۔ اگر کوئی فاضل جذباتی باتوں سے ہٹ کر خالص علمی اور استدلالی طریقے سے ہماری معروضات کو غلط ثابت کر دیں تو ہم اپنے نظریئے سے رجوع کرنے میں ایک لمحے کا تامل بھی نہیں کریں گے۔ وَاللہُ عَلٰی مَانَقُوْلُ وَکِیْلٌ ○

❁❁❁

قارئین کرام! اب تک تو گفتگو ہوئی ہے روایات نفی ظل پر۔ اب آیئے ان آیات قرآنیہ واحادیث صحیحہ کی طرف جن میں سایہ نہ ہونے کا مطلق ذکر نہیں ہے مگر ان سے بزور استدلال نفی ظل کا استنباط کیا جاتا ہے، یعنی وہ آیات واحادیث جن میں جانِ دو عالم ﷺ کے نور ہونے کا بیان ہے۔ ان کو پیش کر کے کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ چونکہ نور تھے اور نور بے سایہ ہوتا ہے، اس لئے آپ کا سایہ نہیں تھا جیسے سورج کا سایہ نہیں ہوتا۔

لیکن یہ استدلال محلِ نظر ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے نور ہونے سے اگر مراد یہ ہے کہ آپ شائبۂ بشریت کے بغیر نور محض تھے تو یہ بات قرآن وسنت سے متصادم ہونے کی وجہ سے قطعی طور پر باطل ہے، اور اگر مراد یہ ہے کہ آپ کی نورانیت لباس بشریت میں جلوہ گر تھی تو اس میں کوئی نزاع نہیں ہے لیکن اس سے سائے کی نفی کیسے ہوگی؟ اس سے تو سایہ ثابت ہوگا کیونکہ لباس بشریت میں ہونے کی وجہ سے آپ کے لئے تمام عوارض بشریت ثابت تھے۔ مثلاً سونا، جاگنا، پسینہ آنا، پیشاب کرنا وغیرہ وغیرہ۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ آپ چونکہ بشر محض نہیں تھے؛ بلکہ بشریت اور نورانیت کا حسین امتزاج تھے اس لئے آپ کے عوارض بشریہ بھی اس طرح نہیں تھے جیسے عام بشر کے ہوتے ہیں۔

---

(۱) کتب اسماء الرجال، ذکر یحییٰ ابن معین۔

مثلاً ہر بشر سوتا ہے، آپ بھی سوتے تھے مگر آپ کی نیند عام بشر کی نیند جیسی نہیں ہوتی تھی؛ بلکہ آپ کا دل بیدار اور ادراک بحال رہتا تھا---لیکن بہر حال آپ سوتے تو تھے، یہ تو نہیں کہ آپ کو نیند ہی نہ آتی ہو۔

ہر انسان کو پسینہ آتا ہے، آپ کو بھی آتا تھا، مگر اس میں عام انسانوں کے پسینے جیسی ناگوار بو نہیں پائی جاتی تھی؛ بلکہ اس کی خوشبو سے گلیاں مہک اٹھا کرتی تھیں---لیکن پسینہ آتا تو تھا، یہ تو نہیں کہ آپ کے جسم سے پسینہ نکلتا ہی نہ ہو۔

ہر آدمی کو پیشاب کی ضرورت پڑتی ہے، آپ کو بھی پڑتی تھی، مگر آپ کا مبارک پیشاب عام آدمیوں جیسا نہیں تھا؛ بلکہ انتہائی پاک صاف اور پینے والے کے لئے باعث شفا تھا---لیکن پیشاب کرتے تو تھے، یہ تو نہیں کہ آپ کو پیشاب آتا ہی نہ ہو۔

علیٰ ہذا القیاس آپ کے جملہ عوارضِ بشریہ ہیں۔

جب بشریت کے دیگر تمام عوارض آپ کے لئے ثابت تھے تو سایہ بھی ثابت ہونا چاہئے کیونکہ وہ بھی عوارض بشریہ میں سے ایک عارضہ ہے۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ اس کو اس طرح نہیں ہونا چاہئے جس طرح عام سائے ہوتے ہیں؛ بلکہ ان سے زیادہ خنک، زیادہ ٹھنڈا، زیادہ آرام بخش اور زیادہ تسکین دہ ہونا چاہئے۔ کَمَا یَلِیقُ بِشَانِہٖ ﷺ---لیکن سایہ ہونا تو چاہئے، یہ تو نہیں کہ سائے ہی کی نفی کر دی جائے۔

امید ہے کہ قارئین کرام پوری طرح بات سمجھ گئے ہوں گے؛ البتہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ منطقی ذوق رکھنے والے اہل علم کے لئے تھوڑی سی اصطلاحی گفتگو کر دی جائے۔

نورانیت سے نفی ظل پر استدلال یوں ہے

صُغریٰ---رسول اللہ ﷺ نور ہیں۔

کُبریٰ---ہر نور بے سایہ ہے۔

نتیجہ---رسول اللہ ﷺ بے سایہ ہیں۔

ہمارا سوال یہ ہے کہ اس قیاس میں ''نور'' جو حد اوسط واقع ہو رہا ہے، اس سے مراد اگر نور محض ہے تو کبریٰ مسلم ہے مگر صغریٰ باطل ہے اور اگر نور سے مراد نور مع البشریت

ہے تو صغریٰ مسلم ہے لیکن کبریٰ ممنوع ہے اور اگر صغریٰ میں نور مع البشریت مراد ہے اور کبریٰ میں نور محض مراد ہے تو دونوں مقدمے درست ہیں مگر اس صورت میں حداوسط مکرر نہیں رہتی جو شرط انتاج ہے۔

یہ استدلال ایسا ہی مغالطہ آمیز ہے، جیسے مندرجہ ذیل قیاسات ہیں۔

(۱)---صُغریٰ---رسول اللہ ﷺ متحرک بالارادہ نور تھے۔

کُبریٰ---ہر متحرک بالارادہ نور عام حالات میں دکھائی نہیں دیتا۔

نتیجہ---رسول اللہ ﷺ عام حالات میں دکھائی نہیں دیتے تھے۔

(۲)---صُغریٰ---رسول اللہ ﷺ نور تھے۔

کُبریٰ---نور کھاتا پیتا نہیں۔

نتیجہ---رسول اللہ ﷺ کھاتے پیتے نہیں تھے۔

(۳)---صُغریٰ---رسول اللہ ﷺ نور تھے

کُبریٰ---نور کے جسم میں خون نہیں۔

نتیجہ---رسول اللہ ﷺ کے جسم میں خون نہیں۔

دیکھنے میں یہ تمام قیاسات شکل اول سے ہیں جو بدیہی الانتاج ہے، اس کے باوجود نتائج غلط برآمد ہو رہے ہیں کیونکہ حداوسط یعنی ''نور'' اگرچہ بظاہر مکرر ہے مگر درحقیقت مکرر نہیں ہے کیونکہ صغریٰ میں جو ''نور'' ہے وہ نور مع البشریت ہے اور کبریٰ میں ''نور'' سے مراد نور بغیر بشریت ہے اس لئے حدِ اوسط مکرر نہیں ہوتی جو شرطِ انتاج ہے۔ منطق کی کتابوں میں اس مغالطے کی مثال یوں دی جاتی ہے۔

صغریٰ:- ''اَلْغَلْطُ'' غَلَطٌ.

کبریٰ:- ''اَلْغَلَطُ'' صَحِیْحٌ.

نتیجہ:- ''اَلْغَلْطُ'' صَحِیْحٌ.

اس قیاس میں اور خامیوں کے علاوہ بڑی غلطی یہی ہے کہ حداوسط جو بظاہر مکرر نظر آتی ہے، حقیقۃً مکرر نہیں ہے کیونکہ صغریٰ میں ''غلط'' سے معنیٰ غلط مراد ہے، یعنی نادرست،

جبکہ کبریٰ میں ''غلط'' سے مراد لفظ ''غلط'' ہے۔ یعنی غ، ل، ط، کا ایسا مجموعہ جس کا ''ل'' مفتوح (زبروالا) ہو۔

ظاہر ہے کہ ایسے قیاسات سے کوئی مدعا ثابت نہیں کیا جاسکتا اس لئے نفی ظل کی یہ دلیل کارآمد نہیں ہے۔

۞۞۞

اس سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ رسول اللہ ﷺ کے نور کو نورِ شمس پر قیاس کر کے یہ کہنا کہ جس طرح سورج کا سایہ نہیں کیونکہ وہ نور ہے، اسی طرح رسول اللہ ﷺ کا بھی سایہ نہیں تھا کیونکہ آپ نور تھے، قیاس مع الفارق ہے۔ کیونکہ سورج تو نور محض ہے اور اس کو بشریت کے عوارض میں سے کوئی بھی عارضہ لاحق نہیں ہے؛ جبکہ رسول اللہ ﷺ نور مع البشریت ہیں، اس لئے سورج کا سایہ نہ ہونا، آپ کے لئے سایہ نہ ہونے کی دلیل نہیں بن سکتا۔ ہاں، جب رسول اللہ ﷺ نور محض تھے اور ابھی بشریت کا جامہ زیب تن نہیں فرمایا تھا، اس وقت یقیناً آپ کا سایہ نہیں ہوگا، جس طرح سورج کا سایہ نہیں ہوتا، لیکن جب آپ کو خلعت بشریت سے نوازا گیا تو جس طرح بشریت کے دیگر عوارض آپ کی معیت سے مشرف ہوگئے، اسی طرح سایہ بھی مشرف ہوجائے گا۔

آخر سائے نے کیا قصور کیا ہے کہ اس کو جسم اطہر کی رفاقت سے خواہ مخواہ محروم کر دیا جائے---!(۱)

---

(۱) شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ سائے کو نورانیت کے منافی سمجھا جاتا ہو اس لئے اس کو ثابت کرنے سے گریز کیا جاتا ہو، لیکن یہ تصور درست نہیں ہے۔ سایہ تو دیگر عوارض کی بہ نسبت نورانیت کے زیادہ قریب ہے کیونکہ سایہ بذات خود روشنی ہی کی ایک قسم ہے۔ اعلیٰ حضرت سائے کے تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''سایہ کیا شئے ہے؟ سورج چمکنے لگا۔ ہر جگہ نور کی چادر بچھادی، درمیانی اجسام رکاوٹ بنے اور روشنی کے آگے پردہ لٹکا دیا، پردگی نور سے مہجور ہوگئی۔ ہوائے متوسط نے بسبب مقابلہ وشدت قابلیت روشنی سے کافی حصہ لیا اور اس محروم کو بھی روشنی کا کچھ حصہ عطا کیا، اس دوسری روشنی کو ظل (سایہ) ☜

یہ گفتگو تو اس صورت میں ہے، جب یہ مانا جائے کہ سورج کا سایہ نہ ہونے کی وجہ اس کا نور ہونا ہے؛ جبکہ یہی بات درست نہیں ہے۔

سایہ کسی جسم سے از خود تو نہیں پھوٹتا، بلکہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب جسم باہر سے آنے والی روشنی کے درمیان حجاب بنتا ہے۔ سورج کا سایہ اس لئے نہیں ہوتا کہ اس نظام شمسی میں کوئی دوسرا ایسا تاباں کرہ نہیں ہے جس کی روشنی اور زمین کے درمیان سورج حائل ہو جائے۔ اگر ایسا ہوتا تو سورج کا سایہ بھی زمین پر پڑتا، جس طرح چاند کو اللہ تعالیٰ نے نور کہا ہے۔ وَالْقَمَرَ نُوْرًا مگر یہی نور جب سورج اور زمین کے درمیان حائل ہو جاتا ہے تو اس کا سایہ زمین پر پڑنے لگتا ہے اور اسی کو سورج گرہن لگنا کہا جاتا ہے۔

غرضیکہ سورج کے لئے سایہ نہ ہونے سے ہرگز یہ لازم نہیں آتا کہ آپ ﷺ کا سایہ نہ ہو۔ یہ قیاس ہر لحاظ سے قیاس مع الفارق ہے۔

خیر، یہ تو ایک ضمنی بحث بیچ میں آ گئی، اصل مدعا یہ ہے کہ آیات واحایث نور سے رسول اللہ ﷺ کے نور ہونے پر استدلال تو درست ہے اور اس پر ہمارا ایمان ہے، لیکن ان کو نفی ظل کی دلیل بنانا صحیح نہیں ہے۔

❁❁❁

حاصل کلام

اب ہم اپنی گفتگو کو سمیٹتے ہوئے گزشتہ تحریر کی تلخیص مع اضافات مفیدہ پیش کرتے ہیں

(۱)---روایاتِ نفی ظل میں سے حکیم ترمذی کے ذمے لگی ہوئی روایت جو ذکوان

کہتے ہیں۔'' (مجموعہ رسائل نور و سایہ ص ۱۳۱)

تعجب ہے کہ خون اور پسینہ وغیرہ جو روشنی کے اقسام نہیں ہیں، ان کو تو رسول اللہ ﷺ کے لئے ثابت مانا جائے اور ان کی نورانیت کے لئے دعائے نور کو بطور ثبوت پیش کیا جائے، مگر سایہ، جو روشنی ہی کی ایک قسم ہے، اس کو ماننے سے انکار کر دیا جائے۔

تابعی کی طرف منسوب ہے، عبدالرحمٰن ضبی جیسے کذاب کی وجہ سے موضوع ہے اور عبدالملک جیسے مجہول کی وجہ سے مردود ہے۔

۲---ابن جوزی والی روایت جو حضرت ابنِ عباسؓ کے حوالے سے پیش کی جاتی ہے بے سند ہونے کی وجہ سے مردود اور ناقابل اعتبار ہے۔ سند سے قطع نظر متن روایت میں جو ذکر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی روشنی سورج کی روشنی پر غالب آجاتی تھی، ناقابل تسلیم ہے۔ ایسا ہوتا تو آقا ﷺ کے روئے زیبا کا دیدار ہی ممکن نہ رہتا۔

۳---مدارک والی روایت بے سند ہونے کے علاوہ بصیغۂ مجہول مذکور ہونے کی وجہ سے مزید ناقابل قبول ہے۔ نیز اس میں یہی طے نہیں ہو رہا کہ حضرت عثمان نے درحقیقت کیا کہا تھا؟ مدارک میں کچھ لکھا ہے اور مدارج میں کچھ اور۔

شد پریشاں خوابِ من از کثرتِ تعبیرہا

۴---یہ درست ہے کہ متعدد ضعیف روایتیں مل کر قوی ہو جاتی ہیں اور قوی نہ بھی ہوں تو حرج نہیں کیونکہ معجزات میں ضعیف روایات بھی قابل قبول ہوتی ہیں، لیکن ضعیف ہونے کے لئے بھی سند کا ہونا ضروری ہے۔ علامہ کاظمی لکھتے ہیں

''صحیح یا ضعیف ہونا دراصل سند کی صفت ہے، اگر سند کا وجود نہ ہو تو صحت وضعف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''(۱)

۵---یہ جو کہا جاتا ہے کہ ظنی مسئلے کے لئے ظنی دلیل کافی ہوتی ہے، تو اس سے مراد یا تو وہ دلیل ہوتی ہے جو اصلاً قطعی ہو، مگر کسی عارض کی وجہ سے اس کا شمول ظنی ہو جائے، یا وہ دلیل ہوتی ہے، جو ظنی الثبوت ہو مگر صحیح سند سے ثابت ہو جیسے صحیح خبر واحد---معجزات و فضائل کی حد تک اس میں ضعیف حدیث بھی شامل کی جا سکتی ہے---رہیں موضوع اور بے سند روایتیں، تو وہ دلیل بننے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتیں کیونکہ دلیل اثبات مدعا کے لئے ہوتی ہے اور جو چیز خود ہی باطل اور مردود ہو، اس سے کوئی دوسری چیز کیسے

(۱) ماہنامہ السعید، ملتان، ظل نمبر، ص ۲۳۔

ثابت کی جا سکتی ہے---!

۶--- جو اہل علم ایسی روایات کی تحقیق میں تساہل اختیار فرماتے ہیں، وہ بھی عنداللہ درجات عظیمہ کے مستحق قرار پاتے ہیں کیونکہ ان کے مدنظر محبوبِ خدا ﷺ کے فضائل کی تکثیر ہوتی ہے۔

۷--- جو لوگ ایسی روایات پر محدثین کے مسلمہ قواعد وضوابط کوملحوظ رکھتے ہوئے جرح وتنقید کرتے ہیں وہ بھی اپنی تحقیق کی بنا پر ماجور ہوتے ہیں کیونکہ ان کے پیش نظر یہ بات ہوتی ہے کہ محبوب رب العالمین کی طرف کوئی ایسی چیز منسوب نہ ہو جائے جو خلاف واقعہ ہو۔

۸---نفی ظل پر مندرجہ بالا تین نا قابل اعتبار روایات کے علاوہ کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔

۹--- وہ آیات واحادیث صحیحہ جن میں رسول اللہ ﷺ کے نور ہونے کا بیان ہے، ان سے نفی ظل پر استدلال درست نہیں ہے کیونکہ ان آیات واحادیث میں نور سے مراد نور مع البشریہ ہے اور سائے کے منافی نور محض ہے، نہ کہ نور مع البشریہ--- اور وہ بھی اس صورت میں جب یہ مان لیا جائے کہ نورانیت سائے کے منافی ہے؛ جبکہ درحقیقت سائے کے منافی نورانیت نہیں بلکہ شفافیت ہے۔

۱۰--- رسول اللہ ﷺ کا نورانی وجود اولین تخلیق الٰہی ہے۔ باقی تمام کائنات اسی نور سے ظہور پذیر ہوئی ہے۔

۱۱--- اس وجود کے اعتبار سے آپ نورِ محض تھے اور بقول حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی ؒ آپ کی اصل نشأت نورِ الٰہی سے اور عالم امکان سے ماوراء ہے اس لئے اس دور میں آپ کے لئے امکانی عوارضات وتغیرات بھی ثابت نہیں تھے۔ مثلاً، بچپن، جوانی، کہولت اور بیماری وغیرہ۔

۱۲--- پھر وہ ساعت ہمایوں آئی جب اللہ تعالیٰ نے آپ کے نورِ کامل کو بشریت کاملہ کے ساتھ امتزاجِ کامل عطا کر کے دنیا میں بھیجا۔

۱۳--- بشریت کاملہ کی وجہ سے آپ ان تمام عوارض سے متصف تھے جو ایک

بشر میں پائے جاتے ہیں اور نورانیت کاملہ کی بنا پر ان عوارض کی نوعیت وکیفیت عام بشر کے عوارضات سے مختلف تھی۔

۱۴---چونکہ پوری کائنات میں صرف اور صرف آپ ہی ایسی ہستی ہیں جس میں کمال نورانیت اور کمال بشریت یکجا ہیں، اس لئے آپ کے بشری عوارضات کو نہ تو چاند، سورج اور ملائکہ وغیرہ پر قیاس کیا جاسکتا ہے کیونکہ وہ انوارِ محضہ ہیں اور نہ عام انسانوں کے عوارض سے موازنہ کیا جاسکتا ہے کیونکہ وہ بشر محض ہیں؛ بلکہ آپ کے کسی ایک عارضے کو آپ ہی کے دیگر عوارض پر قیاس کرکے اس کی کیفیت معلوم کی جاسکتی ہے، خواہ اس سے روایات یکسر ساکت ہی کیوں نہ ہوں۔

مثلاً کسی روایت میں یہ نہیں آیا کہ آپ کے آنسو خوشبودار تھے لیکن اس کے باوجود ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ آپ کے اشکہائے مبارکہ بے حد معطر تھے، کیونکہ جب آپ کا پسینہ خوشبودار تھا---جو کہ عام طور پر بدبودار ہوتا ہے---تو آپ کے آنسوؤں کی خوشبو کا کیا عالم ہوگا؛ جبکہ آنسو تو عام آدمی کے بھی بدبودار نہیں ہوتے---!!

۱۵---اللہ تعالیٰ نے آپ کی بشریت کی تکمیل کا اتنا اہتمام فرمایا کہ جو عوارض عام بشر میں ناگوار ہوتے ہیں، مثلاً پسینہ، پیشاب وغیرہ، ان کی ناگواری کا تو اللہ تعالیٰ نے یکسر خاتمہ کردیا مگر عوارض کو اپنی جگہ پر برقرار رکھا، تاکہ محبوبِ دلنواز کے بشری پہلو میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔

۱۶---باوجودیکہ آپ حقیقت کے اعتبار سے نورانی ہیں اور نور کا اپنا رنگ سفید ہے مگر جب اللہ تعالیٰ نے آپ کے نور کو بشریت کے قالب میں ڈھالا تو عالم بشریت میں جس چیز کا جو رنگ روپ حسن شمار کیا جاتا ہے، وہی رنگ روپ اللہ تعالیٰ نے آپ کے نور کو دے دیا۔

دانتوں میں سفیدی ممدوح ہے تو آپ کے دندان مبارکہ کو سفید موتیوں کی لڑیاں بنادیا۔ رخساروں میں گلابی رنگ پسندیدہ ہے تو آپ کے عذاروں کو گلاب کے پھول جیسا بنادیا۔ ہونٹوں میں سرخ رنگ اچھا لگتا ہے تو آپ کے لبہائے نازک کو رشک لعل یمن بنادیا۔ حتیٰ کہ سیاہی، جس کا بظاہر نور کے ساتھ تضاد ہے کیونکہ نور کبھی کالا نہیں ہوتا، مگر چونکہ بالوں کا

حسن ہی انتہائی کالا ہونا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کے نور کو اپنی قدرتِ کاملہ سے اتنے سیاہ رنگ میں بدل دیا کہ شب کی تاریکیاں آپ کی زلفوں سے فیض پاتی ہیں---
وَاللَّيْلُ دَجٰى مِنْ وَفْرَتِهٖ.

۱۷---سایہ عوارض بشریہ میں سے ایک ممدوح وپسندیدہ عارضہ ہے۔ رہا اس کا سیاہ وتاریک ہونا، تو وہ خواہ کتنا ہی سیاہ کیوں نہ ہو، آپ کی زلف ''واللیل'' سے زیادہ کالا نہیں ہوسکتا، جب آپ کی شبگوں زلفیں نورانی ہوسکتی ہیں تو سرمئی سایہ کیوں نورانی نہیں ہوسکتا؟ جب کہ سایہ بذاتِ خود روشنی ہی کی ایک قسم ہے۔

۱۸---یہ جو کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے جسم اقدس کو ہر قسم کی جسمانی اور مادی کثافت سے پاک کر دیا تھا اس لئے آپ کا سایہ نہیں تھا، تو اس ''کثافت'' سے مراد اگر اردو والی کثافت ہے، یعنی گندگی اور آلودگی وغیرہ، تو جانِ دوعالم ﷺ میں ایسی کثافت پائے جانے کا کوئی مومن تصور بھی نہیں کرسکتا، لیکن اس کی نفی سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ کا سایہ نہ ہو، کیونکہ اس طرح کی کثافت پھول اور کلیوں میں بالکل نہیں پائی جاتی، اس کے باوجود انکا سایہ ہوتا ہے۔ اور اگر اس سے مراد عربی والی کثافت ہے، جو زیادہ ہونے، گھنا ہونے اور موٹا ہونے کے معنوں میں مستعمل ہے تو اس کی جانِ دوعالم ﷺ کے بدن سے علی الاطلاق نفی ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ جن چیزوں کا کثیف ہونا پسندیدہ ہے وہ آپ کی بھی کثیف تھیں۔ مثلاً بالوں کا زیادہ ہونا اور گھنا ہونا ممدوح ہے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کے حسین بالوں کو کثیف بنا دیا تا کہ آپ کا حسن ہر لحاظ سے کامل ومکمل ہو۔ حدیث شریف میں آیا ہے--- كَانَ رَسُوْلُ اللهِ كَثِيْفَ اللِّحْيَةِ. (۱) --- (رسول اللہ ﷺ کی ریش مبارک کثیف تھی، یعنی گھنی تھی۔)

غرضیکہ جو کثافت منفی ہے وہ عدم ظل کو مستلزم نہیں ہے اور جو مستلزم ہے وہ منفی نہیں ہے اسلئے یہ استدلال محض الفاظ کی مینا کاری ہے۔

---

(۱) سیرت حلبیہ، ج ۳، ص ۳۷۰، شرح شفا لملا علی قاری، ج ۲، ص ۲۷۰، بہامش نسیم الریاض

۱۹---اگر آپ کے لئے سایہ نہ مانا جائے تو آپ کے جسم کو شفاف ماننا پڑے گا۔اس صورت میں لازم آئے گا کہ روشنی کی کرنیں آپ کے بدن سے گزرتی رہیں، اور جہاں سے شمس وقمر کی شعائیں گزرتی ہیں وہاں سے شعاع بصر بھی گزرنے لگتی ہے، تو جس رسول کی حیا کا یہ عالم ہو کہ کَانَ اَشَدَّ حَیَاءً مِّنَ الْعَذْرَاء فِیْ خِدْرِھَا۔اس کے لئے ایسا جسم ثابت کرنا، جس کے ہر حصے سے روشنیاں اور لوگوں کی نظریں آر پار گزر رہی ہوں، کوئی عاشق کیسے گوارا کر سکتا ہے---!

۲۰---بشریت سے قطع نظر، سایہ فی نفسہ امن و عافیت اور سکون وراحت کی علامت ہے۔تھکا ماندہ اور گرمی کا ستایا ہوا انسان خنک سائے میں آکر آرام پاتا ہے اور سکھ کا سانس لیتا ہے۔

بیٹھ جاتے ہیں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے
ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

تعجب ہے کہ سراپا رحمت ذات سے سائے جیسی رحمت بداماں شئے کا انکار کر دیا جائے اور شجر بے سایہ کی طرح آپ کے لئے جسم بے سایہ مانا جائے---اَسْتَغْفِرُ اللهَ۔

۲۱---عرفاً سائے کا ساتھ چھوڑ دینا مصائب و آلام میں یکہ وتنہا رہ جانے سے کنایہ ہے۔(بچپن میں اس مفہوم کا کوئی شعر بھی سنا تھا، جو اس وقت یاد نہیں آرہا۔) حالانکہ سایہ حقیقتاً کسی سے جدا نہیں ہوتا۔یہ تو محض ایک تخیل ہے، مگر عرفاً اس تخیل سے بے یاری و بے کسی کا اتنا بھرپور تاثر ابھرتا ہے کہ وقتی طور پر بھی اس کو گوارا نہیں کیا جاتا، پھر کتنی حیرت کی بات ہے کہ جس چیز کی ذرا سی تصوراتی جدائی بھی مصیبت زدہ ہونے کی علامت ہو، اس کو رسول اللہ ﷺ سے حقیقتاً جدا مان لیا جائے---اور وہ بھی ہمیشہ کے لئے---!! رَبَّنَا لَاتُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِیْنَا اَوْ اَخْطَانَا۔

۲۲---مزید حیران کن بات یہ ہے کہ حقیقی سائے کی نفی کرنے والے کنایۃً اور مجازاً آپ کے لئے سایہ ضرور ثابت کرتے ہیں، حالانکہ کنائی اور مجازی معنی میں حسن تب ہی متصور ہو سکتا ہے، جب حقیقی معنی میں بھی خوبی اور اچھائی پائی جائے۔یہ عجیب بات ہے کہ

حقیقی سائے کو تو آپ کے لئے معیوب سمجھا جائے اور اس کی زشتی اور کثافت ظاہر کرنے پر پورا زور بیان صرف کر دیا جائے، مگر مجازی سایہ آپ کے لئے زور وشور سے ثابت کیا جائے اور اس کو سارے جہاں پر پھیلا ہوا سمجھا جائے---!

اگر کہا جائے کہ پھر تو اللہ تعالیٰ کے لئے بھی ظل حقیقی ماننا چاہئے تو جواباً عرض ہے کہ یہ بات محض مغالطہ ہے۔ اللہ تعالیٰ سے سائے کی نفی اس لئے نہیں کی جاتی کہ سایہ بذاتِ خود کوئی معیوب شئے ہے؛ بلکہ اس لئے کی جاتی ہے کہ سائے کے لئے پہلی شرط ٹھوس جسم کا ہونا ہے اور اللہ تعالیٰ چونکہ جسم وجسمانیات سے پاک ہے اس لئے اس کا سایہ ہو ہی نہیں سکتا، یہ نہیں کہ ہو سکتا ہو، مگر معیوب ہونے کی وجہ سے ہوتا نہ ہو۔

عالم عناصر میں اس کی مثال آپ ہوا لے لیں۔ ہوا کا سایہ نہیں ہوتا مگر ہوا کا سایہ نہ ہونے کی یہ وجہ نہیں کہ سایہ عیب ہے؛ بلکہ سائے کے لئے جس قسم کے جسم کی ضرورت ہوتی ہے، ایسا جسم ہوا کے لئے ثابت نہیں ہے۔ ہاں، جس اکمل البشر ذاتِ گرامی کو عالم امکان و بشریت میں بھیجتے وقت اللہ تعالیٰ نے جملہ امکانی تغیرات اور بشری عوارض وصفات سے آراستہ و پیراستہ کر کے بھیجا ہو، اس سے سائے کی نفی یقیناً عیب ہے اور نادانستگی میں اس کے کمال بشریت کی نفی کے مترادف ہے۔ **حَفِظَنَا اللّٰہُ تَعَالیٰ عَنْ اِعْتِقَادِ مَالاَ یَلِیْقُ بِشَانِ حَبِیْبِہٖ الْکَرِیْمِ، اَلْجَامِعِ بَیْنَ النُّوْرَ انِیَّۃِ وَالْبَشَرِیَّۃِ بِاَکْمَلِ وَجْہٍ وَّاَحْسَنِ تَنْظِیْمٍ.**

۲۳---اگر بفرض محال یہ مان لیا جائے کہ آپ کا سایہ نہیں تھا اور روشنی کی کرنیں آپ کے جسم سے آر پار گزر جاتی تھیں، تو لازماً سرخ ہو جاتی ہوں گی کیونکہ آپ کے بدنِ اطہر میں سرخ خون رواں تھا اور روشنی کی کرنیں جب کسی رنگین شئے سے گزرتی ہیں تو اسی کا رنگ اختیار کر لیتی ہیں۔ اس صورت میں آپ کے بدن سے گزر کر زمین تک پہنچنے والی کرنیں خون کی ہم رنگ ہوں گی، کیا ایسی خونیں قبا کرنیں اچھی لگیں گی---!؟

۲۴---اگر اس کے باوجود یہ اصرار کیا جائے کہ آپ کے جسم اقدس سے روشنی کی کرنیں گزرا کرتی تھیں تو یہ چیز آپ کے لباس کے لئے قطعاً نہیں مانی جا سکتی کیونکہ لباس ہوتا ہی اس لئے ہے کہ ساتر ہو اور گرمی وغیرہ سے بچائے---**وَسَرَابِیْلَ تَقِیْکُمُ**

الْحَر ---اور گرمی سے بچاؤ تب ہی ہوسکتا ہے جب سورج کی کرنیں آپ کے لباس سے ٹکرا کر رک جائیں اور آگے نہ بڑھیں، ورنہ لازم آئے گا کہ آپ گرمی سے بچاؤ کے لئے سر پر چادر رکھیں تو سورج کی کرنیں اس سے گزر کر آپ کے سرِ اقدس تک پہنچ جائیں، پھر گرمی سے تحفظ کی کیا صورت ہوگی؟

حدیث شریف میں سرورِ عالم ﷺ کا ایک وصف ''اَنْوَرُ الْمُتَجَرِّدُ'' بھی مذکور ہے یعنی ایسی ہستی جس کے جسم کے کھلے حصے زیادہ روشن اور تابناک تھے۔ اس کی شرح بیان کرتے ہوئے علامہ خفاجی لکھتے ہیں

لِاَنَّ مَا تَحْتَ الثِّيَابِ مِنَ الْبَدَنِ لِعَدَمِ مُلَاقَاتِهِ الشَّمْسَ وَالْهَوَآءَ اَبْيَضُ مِنَ الْاِطْرَافِ الْمَكْشُوْفَةِ. (کیونکہ کپڑوں کے نیچے بدن کا جو حصہ ہوتا ہے، اس کو چونکہ دھوپ اور کشادہ ہوا نہیں لگتی اس لئے کھلے رہنے والے اعضاء کی بہ نسبت زیادہ سفید ہوتا ہے۔)

یہی بات علامہ شریف غرناطی بھی کہتے ہیں

لِاَنَّ مَا تَحْتَ الثِّيَابِ مِمَّا لَمْ يُبَاشِرْهُ الشَّمْسُ، خَالِصُ الْبَيَاضِ. (۱)

(کپڑوں کے نیچے جس حصے کو سورج نہیں پہنچتا، خالص سفید ہوتا ہے۔)

ان حوالوں سے ہمارا مقصد صرف اتنا ہے کہ جانِ دو عالم ﷺ کے بدن اقدس کے جو حصے لباس میں مستور ہوتے تھے، ان تک دھوپ نہیں پہنچتی تھی اور سورج کی کرنیں آپ کے لباس سے ٹکرا کر رک جاتی تھیں، اور روشنی کی کرنوں کے رک جانے کا نام ہی سایہ ہے۔ یہی سایہ آپ کے بدن کے مستور حصوں کو دھوپ اور گرمی سے بچاتا تھا۔

اب اگر آپ کے جسم کے کھلے حصوں کو بے سایہ سمجھا جائے تو آپ کے سائے کی جو حالت بنے گی وہ کسی طور پر بھی شایانِ شانِ اقدس نہیں ہے۔ یعنی اگر آپ نے صرف قمیص اور ازار پہن رکھی ہو تو ہاتھ، پاؤں، گلے، چہرے اور سر کا سایہ نہیں ہوگا، جب کہ باقی جسم کا لباس کی وجہ سے سایہ نظر آئے گا۔

---

(۱) شرح شفاء، للخفاجی، ج ۲، ص ۱۷۱.

ہم ایسے قبیح تصورات سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں، مگر یہ نفی ظل کے لازمی نتائج ہیں

اے بادِ صبا! ایں ہمہ آوردۂ تُست

قارئین کرام! یہ ہیں وہ چند وجوہ جن کی وجہ سے ہم جانِ دو عالم ﷺ کے جسم اطہر وانور کو سائے جیسی مظہر امان و عافیت اور علامت تسکین و آسائش چیز سے محروم قرار دینے میں فریق نہیں بن سکتے۔ ہمیں یقین ہے کہ جن اہل علم نے نفی ظل کا قول کیا ہے وہ اپنے بے حساب علمی و عملی مشاغل کی وجہ سے اس موضوع کے جملہ پہلوؤں پر غور نہیں کر سکے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ ایسا ہوتا رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جن فضلاء نے حدیث ردشمس کو موضوع قرار دیا، انہوں نے اس کی جملہ اسانید کو پیش نظر نہیں رکھا، ورنہ وضع کا حکم نہ لگاتے

اسی طرح جن اہل علم نے --- وَالِدَا رَسُوْلِ اللّٰہِ مَاتَا عَلَی الْکُفْرِ --- (رسول اللہ ﷺ کے والدین کی موت کفر پر ہوئی) کی تائید میں اوراق سیاہ کئے انہوں نے بھی پوری طرح تامل وتدبر نہیں فرمایا، ورنہ ایسی بات نہ کہتے۔

یہ بھی واضح رہے کہ کسی شخصیت یا اشخاص سے کسی مسئلے میں اختلاف کرنے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اختلاف کرنے والا ان ہستیوں کی عظمت وکمال کا انکار کر رہا ہے۔ امام ربانی مجدد الف ثانی ؒ نے متعدد اکابرین اولیاء کے ساتھ مسئلہ وحدۃ الوجود میں شدید اختلاف کیا ہے مگر ساتھ ساتھ ان کی عظمتوں کا اعتراف بھی کیا ہے۔ اعلیٰحضرت سمیت بے شمار علماء نے متعدد مسائل میں متقدمین سے اتفاق نہیں کیا مگر سابقین کی رفعت شان پر بھی کوئی حرف نہیں آنے دیا۔

ہم نے بھی مسئلہ نفی ظل میں اکابرین سے اختلاف ان کی تمام تر عظمتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری اس سعی وکاوش کو قبول فرمائے، ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرمائے اور صراطِ مستقیم پر گامزن رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ بِحُرْمَۃِ سَیِّدِ الْاَبْرَارِ، صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہِ الْاَطْھَارِ الْاَخْیَارِ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ مَاتَعَاقَبَ اللَّیْلُ وَالنَّھَارُ.

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ ○

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

وَ قَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلاً مَّسْحُوْرًا ○
اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلاً ○

(قرآن مجید، سورہ فرقان، آیات ۸، ۹)

اور کہا ظالموں نے (اے مسلمانو!) تم تو ایک ایسے آدمی کی پیروی کر رہے ہو جس پر جادو کیا گیا ہے۔
دیکھ لو (اے نبی!) یہ لوگ تمہارے لئے کس قسم کی مثالیں بیان کرتے ہیں۔
یہ گمراہ ہو چکے ہیں اور صحیح رستے پر چلنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔

کیا جانِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو اثر انداز ہؤا تھا؟

حقیقت یا فسانہ؟

یعنی

قرآن و سنت، اصول حدیث، اسماء الرجال اور عقل سلیم کی روشنی میں
ان روایات کا تحقیقی تجزیہ جن میں کہا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
پر جادو کیا گیا تھا اور آپ کچھ مدت تک اس کے زیر اثر رہے تھے۔

جادو کی کہانی---روایات کی زبانی

قارئینِ کرام! روایات میں آیا ہے کہ جانِ دو عالم ﷺ پر جادو کیا گیا تھا اور آپ کچھ عرصہ تک اس کے زیر اثر رہے تھے۔ آئندہ صفحات میں ان روایات کا تجزیہ پیش کیا جا رہا ہے مگر اس سے پہلے انہی روایات سے ترتیب دی گئی جادو کی کہانی پڑھ لیجئے!

''رسول اللہ ﷺ جب حدیبیہ سے ذی الحجہ میں واپس تشریف لائے اور محرم کا مہینہ داخل ہو گیا تو جو یہودی منافقانہ طور پر اسلام قبول کر کے مدینہ میں رہ گئے تھے، ان کے بڑے لبید ابن اعصم منافق کے پاس آئے۔ لبید قبیلہ بنی زریق کا حلیف تھا اور جادو کا بہت بڑا ماہر تھا۔ بظاہر مسلمان بنا ہوا تھا مگر اندر سے پکا یہودی تھا۔ یہودی اکابر نے اس سے کہا کہ ہم نے محمد پر بارہا جادو کیا اور مردوں عورتوں نے بڑھ چڑھ کر اس کام میں حصہ لیا مگر افسوس کہ تمام کوششیں رائگاں گئیں اور محمد پر کچھ اثر نہ ہوا۔ اب ہم تمہارے پاس آئے ہیں کیونکہ تم ہم سب سے بڑے جادوگر ہو اور اس بات سے بھی بخوبی واقف ہو کہ محمد نے ہمارے ساتھ کیا کچھ کیا ہے۔ وہ نہ صرف ہمارے دین کی مخالفت کرتا ہے، بلکہ اس نے ہمارے متعدد افراد قتل کر دئے ہیں اور بہت سوں کو جلاوطن کر کے طرح طرح کی آزمائشوں سے دوچار کر دیا ہے۔ اب تم محمد پر کوئی ایسا زوردار جادو کرو کہ وہ اس کو کمزور و ناتواں کر دے۔ اس کے عوض ہم تم کو معقول رقم دیں گے۔

آخر تین دینار پر معاملہ طے ہو گیا اور لبید نے جادو کرنے کی ہامی بھر لی۔''(۱)

لبید کو جادو کرنے کے لئے رسول اللہ ﷺ کے کچھ بال اور آپ کی زیر استعمال کنگھی کے چند دندانے چاہئے تھے۔ ان کو حاصل کرنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ

''ایک یہودی لڑکا رسول اللہ ﷺ کی خدمت کیا کرتا تھا۔ یہودیوں نے اس کے

(۱) ابن سعد، جلد ۲، صفحہ ۴۔

ساتھ خفیہ رابطہ کیا اور مسلسل کوششوں سے اس کو اس بات پر آمادہ کرنے پر کامیاب ہو گئے کہ وہ یہ چیزیں مہیا کر دے گا۔ چنانچہ اس نے آپ کے سر کے بال اور کنگھی کے دندانے لاکر ان کے حوالے کر دیئے۔"(۱)

جادو میں ضرورت پڑنے والی تمام اشیاء مہیا ہو گئیں تو اکثر روایات کے مطابق خود لبید نے اور بعض روایتوں کے مطابق لبید کی بہنوں نے جو لبید سے بھی دو ہاتھ آگے تھیں، ان چیزوں پر پھونکیں مار کر اور گانٹھیں لگا کر جادو کیا اور پھر ان کو ایک کنویں میں پتھر کے نیچے دبا دیا(۲)

جادو کے اثرات جلد ہی ظاہر ہونے شروع ہو گئے --- کیا آثار ظہور پذیر ہوئے ---؟ ذرا دل تھام کر سنئے!

(ا) --- رسول اللہ ﷺ نے جو کام نہیں کیا ہوتا تھا اس کے بارے میں خیال کرنے لگتے تھے کہ میں کر چکا ہوں۔(۳)

(ب) --- عورتوں، یعنی بیویوں کے پاس جانا چاہتے تھے مگر نہیں جا پاتے تھے(۴)

(ج) کسی چیز کو دیکھتے تھے تو وہ پہلی نظر میں آپ کو کچھ اور طرح دکھائی دیتی تھی، پھر جب بغور دیکھتے تھے تب اس کو پہچان پاتے تھے۔(۵)

(د) --- کھانا پینا چھوٹ گیا تھا۔(٦)

(ھ) --- سر کے بال جھڑ گئے تھے۔(۷)

(و) --- بدن روز بروز گھلتا چلا جا رہا تھا مگر آپ کو پتہ نہیں چلتا تھا کہ مجھے ہو کیا گیا ہے۔(۸)

(ز) --- صحابہ کرامؓ آپ کی عیادت کے لئے آنے لگے تھے۔(۹)

یہ حالت آپ کی کتنی مدت رہی ---؟ چند روز، چالیس دن، چھ مہینے --- مختلف

(۱) تفسیر ابن کثیر، ج ۴، ص ۵۷۴ (۲) ابن سعد، ۲/۲، ص ۵ (۳) صحیح بخاری، ج ۲، ص ۸۵۷ (۴) صحیح بخاری، ج ۲، ص ۸۵۸ (۵) فتح الباری، ج ۱۲، ص ۳۵۸ (٦) ابن سعد، ۲/۲، ص ۵ (۷) تفسیر ابن کثیر، ج ۴، ص ۵۷۴ (۸) تفسیر ابن کثیر، ج ۴، ص ۵۷۴ (۹) ابن سعد، ۲/۲، ص ۴.

روایات ہیں، مگر اسماعیلی اور امام احمد کی روایت کے مطابق پورا سال آپ کی یہی کیفیت رہی۔ حافظ ابن حجر نے کہا ہے کہ سال والی روایت چونکہ سند کے اعتبار سے متصل ہے اس لئے اسی پر اعتماد کیا جائے گا۔(۱)

پہلے آپ ان اثرات کو بیماری کا نتیجہ سمجھتے رہے اور فصد کھلواتے رہے مگر افاقہ نہ ہوُا۔(۲)

غرضیکہ پورے ایک سال تک اس کرب واذیت سے دوچار رہنے کے بعد ایک رات آپ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تھے تو آپ نے بار بار دعا کی۔ پھر جب آپ محواستراحت تھے---یا نینداور بیداری کی درمیانی کیفیت میں تھے---تو انسانی شکل میں دو فرشتوں کو دیکھا۔ یہ دونوں جبریل اور میکائیل تھے۔ ان میں سے ایک آپ کے سرہانے بیٹھ گیا اور دوسرا پائینتی۔ پھر ایک نے آپ کے بارے میں سوالات کرنے شروع کر دیئے اور دوسرا جواب دیتا گیا۔

''انہیں کیا ہوُا ہے؟''

''ان پر جادو کیا گیا ہے۔''

''کس نے کیا ہے؟''

''لبید ابن اعصم یہودی نے۔''

''کس چیز میں؟''

''نر کھجور کے خوشے کے غلاف میں۔''

''پھر اس کو کہاں رکھا ہے؟''

''ذروان یاذی اروان نامی کنویں میں ایک پتھر کے نیچے۔''

''اب اس کا توڑ کیا ہو؟''

''یہ کہ کنویں کا پانی نکالا جائے اور پتھر ہٹا کر جادو والا خوشہ باہر نکال دیا جائے۔''

---

(۱) فتح الباری، ج ۲۱، ص ۳۵۷ (۲) فتح الباری، ج ۲۱، ص ۳۶۰.

مکالمہ ختم ہوا اور فرشتے پرواز کر گئے۔(۱)

اس مشاہدے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ، حضرت عمارؓ اور حضرت زبیرؓ کو بلایا۔(۲) بعض روایات میں زہیر ابن ایاس زرقیؓ اور قیس بن محصن زرقیؓ کا بھی ذکر ہے۔(۳) اور ان کو بنی زریق کے باغ میں واقع ذروان نامی کنویں سے جادو والی اشیاء نکالنے کے لئے بھیجا۔ بعد میں رسول اللہ ﷺ خود بھی اس جگہ کا معائنہ کرنے تشریف لے گئے اور واپس آکر حضرت عائشہؓ کو خود بتایا کہ اس کنویں کا پانی ایسا ہے جیسے اس میں مہندی گھولی گئی ہو (یعنی گہرا سرخ) اور اس کے درخت ایسے کریہہ المنظر ہیں جیسے شیطانوں کے سر ہوں۔(۴)

جو صحابہ جادو والی چیزیں نکالنے کیلئے بھیجے گئے تھے انہوں نے حسب ارشاد کنویں کا پانی نکال کر اس میں رکھے ہوئے بھاری پتھر کو اٹھایا تو نیچے سے کھجور کے خوشے کا غلاف برآمد ہوا جس میں رسول اللہ ﷺ کے بال اور کنگھی کے دندانے موجود تھے۔ نیز اس میں موم کا بنایا ہوا رسول اللہ ﷺ کا مجسمہ تھا جس میں سوئیاں کھبی ہوئی تھیں اور ایک تانت تھی جس میں گیارہ گرہیں لگی ہوئی تھیں۔ مومی مجسمے سے سوئیاں نکالی جانے لگیں تو جونہی کوئی سوئی نکلتی، ابتداء میں آپ کو درد ہوتا مگر بعد میں راحت محسوس ہوتی۔ تانت کی گرہیں کھولنے لگے تو جبریل امین سورہ فلق اور سورہ ناس لے کر نازل ہوئے اور انہیں پڑھ کر گرہیں کھولنے کا کہا۔ ان سورتوں میں گیارہ آیتیں ہیں اور گیارہ ہی گرہیں تھیں۔ چنانچہ جونہی ایک آیت پڑھی جاتی ایک گرہ کھل جاتی۔ جب تمام گرہیں کھل گئیں اور مجسمے سے سوئیاں بھی ایک ایک کر کے نکالی گئیں تو رسول اللہ ﷺ سحر کے اثر سے نکل گئے اور یوں ہلکے پھلکے ہو گئے جیسے رسی کی گرہوں سے آزاد ہو گئے ہوں۔(۵)

لبید اندر سے اگرچہ یہودی تھا مگر بظاہر مسلمان بنا ہوا تھا اس لئے رسول اللہ ﷺ

---

(۱) ابن سعد، ۲/۲، ص ۵ (۲) تفسیر قرطبی، ج ۱۰، ص ۲۵۳ (۳) فتح الباری، ج ۲۱، ص ۳۶۲ (۴) صحیح بخاری، ج ۲، ص ۸۵۷ (۵) فتح الباری، ج ۲۱، ص ۳۶۲.

نے اس کو بلایا اور کہا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے تیرے جادو کے کرتوت سے مطلع کر دیا ہے، بتا کہ تو نے ایسا کیوں کیا؟ اس نے کہا کہ دیناروں کی محبت نے مجھے اس کام پر اکسایا۔ آپ نے اس کو کوئی سزا دیئے بغیر چھوڑ دیا کیوں کہ آپ اپنی ذات کے لئے کسی سے انتقام نہیں لیا کرتے تھے۔ بعد میں وہ کنواں پاٹ دیا گیا جس میں جادو والی چیزیں رکھی گئی تھیں اور اس کا متبادل دوسرا کنواں کھود دیا گیا۔(۱)

قارئین کرام!

یہ ہے سحر اور جادو کی کہانی جسے متعدد کتابوں سے اخذ کر کے ایک مربوط شکل میں آپ کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔(۲)

میری عمر اس وقت غالباً چودہ پندرہ سال ہوگی جب میں نے پہلی مرتبہ جادو والی روایت پڑھی اور اس وقت بھی مجھے اس کی صحت پر ذرا یقین نہیں آیا تھا کیونکہ میرے خیال میں یہ بات ناممکن تھی کہ سرورِ کونین ﷺ جیسی عظیم ہستی پر جادو جیسی گھٹیا اور مکروہ چیز اثر انداز ہو سکے، لیکن ظاہر ہے کہ یہ محض میری ایک جذباتی سوچ تھی اور اس پر میرے پاس کوئی دلیل نہیں تھی اس لئے اہلِ علم کے سامنے یہ بات کرتے ہوئے ہچکچاتا تھا کیونکہ علمی دنیا میں عقیدت پر مبنی جذبات کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی جب تک ان کی تائید قرآن وسنت اور واضح دلائل سے نہ ہو جائے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے مجھے سیرت نبویہ پر ''سیدالورٰی'' لکھنے کی توفیق عطا فرمائی تو اس میں حتی الوسع کوشش کی گئی کہ کوئی ناقابلِ اعتبار بات شامل نہ ہونے پائے۔ اس سلسلے میں ان روایات پر بھی تحقیق کرنی پڑی جن میں جانِ دو عالم ﷺ پر جادو کئے جانے کا تذکرہ ہے۔ آخر طویل غور وخوض کے بعد یہ حقیقت سامنے آئی کہ یہ روایات ہرگز اس قابل نہیں کہ انہیں تسلیم کیا جائے اور جانِ دو عالم ﷺ کے بارے میں یہ عقیدہ رکھا جائے کہ (معاذ اللہ!) سحر کے اثر سے دو چار دن نہیں، بلکہ پورے ایک سال تک آپ کا

(۱) ابن سعد، ج ۲/۲، ص ۵

(۲) تفہیم القرآن، ج ۶، تفسیر سورہ فلق میں بھی اس سے ملتی جلتی داستان مرقوم ہے۔

حافظہ اس قدر متاثر ہوگیا تھا کہ جو کام نہیں کیا ہوتا تھا اس کے بارے میں خیال کرنے لگتے تھے کہ میں یہ کام کر چکا ہوں، مردانہ طاقت اس حد تک غیر فعال ہوگئی تھی کہ خواہش کے باوجود بیویوں کے پاس جانے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے، معدے پر اتنا اثر پڑ گیا تھا کہ بھوک، پیاس ختم ہوگئی تھی اور کھانا پینا چھوٹ گیا تھا، نظر میں اتنا التباس واقع ہوگیا تھا کہ کسی چیز کو پہلی نگاہ میں پہچان نہیں پاتے تھے، شاداب و رعنا بدن روز بروز گھلتا چلا جارہا تھا مگر آپ کو سمجھ نہیں آتی تھی کہ میرے ساتھ ہو کیا رہا ہے، خم بہ خم خوشنما زلفیں جھڑ گئی تھیں اور لوگ آپ کی عیادت اور بیمار پرسی کے لئے آنے جانے لگے تھے۔

کیسا دلدوز اور اندوہناک نظارہ تخلیق کیا ہے داستان طرازوں نے---!!!

میرا تو دل کانپتا ہے اور قلم لڑکھڑاتا ہے یہ باتیں لکھتے ہوئے---! مجھے یقین ہے کہ آپ بھی یہ سب کچھ پڑھ کر لرز اٹھے ہوں گے مگر میرے اور آپ کے لرزنے کانپنے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ بات تو جب بنے گی کہ روشن دلائل کے ساتھ ثابت کر دیا جائے کہ سحر و جادو کی یہ تمام کہانیاں من گھڑت اور خود ساختہ ہیں اور محبوب رب العالمین کی شان اس سے بہت بلند و برتر ہے کہ کوئی دو ٹکے کا جادوگر یا جادوگرنی آپ کو اس حال تک پہنچا سکے۔

تو آیئے! کتاب و سنت، اصول حدیث، اصول فقہ، اسماء الرجال اور عقل سلیم کی روشنی میں ان روایات کا جائزہ لیتے ہیں۔

✿✿✿

محدثین و فقہا کے نزدیک یہ طے شدہ قانون ہے کہ جو روایت کتاب اللہ، یعنی قرآن مجید کے خلاف ہو وہ قابل تسلیم نہیں ہوتی۔ چنانچہ ملا علی قاری اپنی معروف کتاب ''موضوعات کبیر'' میں من گھڑت روایتوں کی علامات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''وَمِنھَا مُخَالَفَةُ الْحَدِیْثِ لِصَرِیْحِ الْقُرْآنِ'' (۱)

یعنی من گھڑت ہونے کی ایک علامت یہ ہے کہ وہ روایت قرآن مجید کی تصریح

(۱) موضوعات کبیر، ص ۹۸.

کے خلاف ہو۔ اصول فقہ کے مشہور متن ''اصول الشاشی'' میں ہے۔

''شَرْطُ الْعَمَلِ بِخَبَرِ الْوَاحِدِ اَنْ لَّا یَکُوْنَ مُخَالِفًا لِّلْکِتَابِ '' (خبر واحد (وہ حدیث جو متواتر یا مشہور نہ ہو) پر عمل کرنے کی شرط یہ ہے کہ کتاب اللہ کے مخالف نہ ہو۔)

اس شرط کی وجہ بیان کرتے ہوئے علامہ نظام الدین شاشی نے یہ حدیث پیش کی ہے

'' قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: تَکْثُرُ لَکُمُ الْاَحَادِیْثُ بَعْدِیْ، فَاِذَا رُوِیَ لَکُمْ عَنِّیْ حَدِیْثٌ فَاعْرِضُوْہُ عَلٰی کِتَابِ اللّٰہِ، فَمَا وَافَقَ فَاقْبَلُوْہُ وَمَا خَالَفَ فَرُدُّوْہُ ''(۱)

---

(۱) اصول الشاشی، ص ۷۶۔ اس حدیث پر اگرچہ بعض محدثین نے جرح کی ہے مگر ان کی جرح کا تعلق سند کے ساتھ ہی ہوسکتا ہے کیونکہ اس کا مفہوم و معنی تو تمام محدثین کے نزدیک درست ہے اور ان کے ہاں یہ بات بالاتفاق مسلم ہے کہ جو روایت کتاب اللہ کے خلاف ہو وہ ناقابل تسلیم ہے۔ چنانچہ علامہ ابن جوزی نے حدیث کے خود ساختہ ہونے کی ایک علامت یہ بتائی ہے --- '' اَوْمُبَائِنًا لِنَصِّ الْکِتَابِ''، یعنی جو روایت قرآن مجید کے خلاف ہو۔

علامہ ابن جوزی کی بیان کردہ علامات کو نقل کر کے علامہ شبلی نے حاشیے میں وضاحت کی ہے کہ ''یہ اصول خود ابن جوزی کے قائم کردہ نہیں بلکہ ابن جوزی نے محدثین کے اصول کو نقل کر دیا ہے۔'' (سیرۃ النبی، ج ۱، ص ۴۱)

بہرحال یہ غیر متنازعہ قاعدہ ہے کہ جو حدیث، قرآن کے خلاف ہو وہ مسترد کرنے کے قابل ہے، البتہ اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ صحیح حدیث کبھی قرآن کے خلاف نہیں ہوسکتی --- جانِ دو عالم ﷺ تو قرآن کے اولین داعی و مبلغ ہیں، ان سے بھلا ایسی بات کیوں کر سرزد ہوسکتی ہے جو کتاب اللہ کے خلاف ہو ---! معاذ اللہ ثم معاذ اللہ --- درحقیقت یہ جو کہا جاتا ہے کہ فلاں حدیث قرآن کے خلاف ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس حدیث کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف درست نہیں ہے کیونکہ جو چیز رسول اللہ ﷺ سے قطعی، یقینی اور متواتر طور پر ثابت ہے وہ قرآن ہے اور یہ حدیث اس کے خلاف واقع ہو رہی ہے اس لئے اسکا انتساب رسول اللہ ﷺ کی طرف غلط ہے۔ رہی یہ بات کہ ☜

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا---''میرے بعد تمہارے لئے حدیثیں بہت ہو جائیں گی اس لئے جب تمہارے روبرو میری طرف منسوب کر کے کوئی حدیث بیان کی

بعض چیزیں رسول اللہ ﷺ کی طرف غلط طور پر کیسے منسوب ہو جاتی ہیں تو اس کی وجہ وہ کذاب اور وضاع راوی ہیں جو طرح طرح کی حدیثیں گھڑ کے رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کرتے رہے لیکن ایسی روایتوں کا اسماء الرجال کے ذریعے بآسانی پتہ چلایا جا سکتا ہے، البتہ کچھ روایتیں ایسی ہوتی ہیں جن میں کوئی بھی راوی کذاب نہیں ہوتا اس کے باوجود ان کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف درست نہیں ہوتی اور اس کا سبب باب مدینۃ العلم علی کرم اللہ وجہہ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ حدیثوں کے راوی تین قسم کے ہوا کرتے تھے۔

(ا) وہ مخلص مومن جو رسول اللہ ﷺ کی صحبت میں رہا اور آپ کی گفتگو کے مفہوم کو اچھی طرح سمجھا۔

(ب) وہ اعرابی جو کسی باہر کے قبیلے سے آیا اور رسول اللہ ﷺ سے کچھ سنا مگر اس کا صحیح مطلب نہ سمجھ سکا اور اپنے قبیلے میں واپس جا کر جو کچھ سمجھا تھا اس کو اپنے الفاظ میں بیان کر دیا، جس کی وجہ سے مفہوم میں تبدیلی واقع ہو گئی۔

(ج) وہ منافق جس کا نفاق ظاہر نہیں تھا۔ اس نے جھوٹ اور افتراء کے طور پر بات گھڑی اور اس کو رسول اللہ ﷺ کی طرف (بالواسطہ یا بلاواسطہ) منسوب کر دیا۔ سننے والے نے اس کو سچا مومن سمجھتے ہوئے اس کی بات پر یقین کر لیا اور اس کی روایت کو دوسروں کے سامنے ذکر کر دیا۔ اسطرح وہ جھوٹی روایت پھیل گئی۔ (اصول الشاشی ۷۶)

قسم دوم اور قسم سوم میں یہ فرق ضرور ہے کہ ایک کو غلط فہمی ہوئی اور دوسرے نے جان بوجھ کر شرارت کی لیکن بہرصورت ان کی روایات کو رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کرنا یقیناً غلط ہے، خواہ بعد کے راوی کتنے ہی ثقہ اور مستند کیوں نہ ہوں، اس لئے روایات کو کتاب اللہ پر پیش کرنا ضروری ہے۔ اگر کوئی روایت قرآن کے خلاف ہوئی تو وہ کسی غلط فہمی یا نفاق کا شاخسانہ ہے اور اس کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف باطل ہے اس لئے اس کو مسترد کرنا لازمی ہے۔ حاصل یہ کہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث کبھی بھی قرآن کے خلاف نہیں ہوتی، نہ ہو سکتی ہے، البتہ بعض مفتریات نے احادیث کا روپ دھار رکھا ☜

جائے تو اس کو کتاب اللہ پر پیش کرو، جو کتاب اللہ کے موافق ہو اس کو قبول کرلو اور جو مخالف ہو اس کو رد کردو۔"

جانِ دو عالم ﷺ کے اس واضح ارشاد پر عمل کرتے ہوئے جب ہم روایات سحر کو کتاب اللہ کے سامنے پیش کرتے ہیں تو واضح طور پر قرآن مجید کے خلاف پڑتی ہیں۔

اولاً---اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کفار و مشرکین کا قول نقل کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے

﴿"وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلاً مَّسْحُوْرًا ○ اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلاً ○"﴾ (سورۃ ۲۵ آیات ۸، ۹)

یعنی رسول اللہ ﷺ کے پیروکاروں سے مخاطب ہوکر "ظالم لوگوں نے کہا کہ تم تو ایک ایسے آدمی کی پیروی کررہے ہو جس پر جادو کیا گیا ہے۔ دیکھو تو سہی (اے نبی!) کہ یہ تمہارے لئے کس قسم کی مثالیں بیان کرتے ہیں۔ یہ گمراہ ہوچکے ہیں اور صحیح راستے پر نہیں چل سکتے۔"

ان آیات مبارکہ سے صاف ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو "رجل مسحور" یعنی ایسا آدمی کہنا جس پر جادو کیا گیا ہو، ان ظالموں کا قول ہے جو گمراہ ہوچکے ہیں اور صراط مستقیم پر چلنے کی استطاعت نہیں رکھتے جبکہ روایات سحر میں رسول اللہ ﷺ کو کھلے لفظوں میں جادو زدہ کہا گیا ہے۔

سِحرَ النَّبیُّ ﷺ

اب صورت حال یہ ہے کہ

ان روایات کو تیار کرنے والے کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ پر جادو کیا گیا تھا اور قرآن کریم کہتا ہے کہ جن لوگوں نے یہ کہا کہ رسول اللہ ﷺ پر جادو کیا گیا تھا، وہ ظالم اور گمراہ ہیں۔

ہوتا ہے، ان کو جب قرآن کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے تو ملمع اتر جاتا ہے اور صحیح صورت حال واضح ہو جاتی ہے۔ اصول فقہ کی کتابوں میں اس کی متعدد مثالیں مذکور ہیں۔ تفصیل کے لئے "نورالانوار" اور "توضیح تلویح" وغیرہ کا مطالعہ کیجئے۔ علامہ شبلی نے بھی سیرۃ النبی کے مقدمے میں اس کی خوب وضاحت کی ہے۔

نتیجہ آپ خود ہی نکال لیں---ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی۔

ثانیاً---اس لئے کہ قرآن مجید کی رو سے معجزہ، جادو سے بہت ہی بلند و بالا اور طاقتور شے ہے کیونکہ معجزہ جادو کو فنا کر دیتا ہے جبکہ جادو معجزے پر کسی طرح بھی اثر انداز نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ جب فرعون کے جادوگروں نے لاٹھیوں اور رسیوں کو متحرک کرنے کا کرتب دکھایا تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا

﴿''وَاَلْقِ مَافِيْ يَمِيْنِكَ تَلْقَفْ مَاصَنَعُوْا ط اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ سَاحِرٍ ط وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ اَتٰى''﴾ (سورہ ۲۰، آیت ۶۹)

(تمہارے دائیں ہاتھ میں جو (عصا) ہے اس کو زمین پر ڈال دو، یہ جادوگروں کی تیار کی ہوئی سب چیزوں کو نگل جائے گا کیونکہ انہوں نے جو کچھ بنایا، جادوگر کا مکر ہے اور جادوگر کامیاب نہیں ہوسکتا، خواہ کہیں بھی چلا آئے۔)

جب موسیٰ علیہ السلام کے سامنے اتنے بڑے بڑے شاہی جادوگروں کی اجتماعی کاوش باطل ہوگئی تھی تو سید الانبیاء والرسل ﷺ کے آگے محض تین دینار میں بک جانے والے ایک منافق اور اس کی بے نام و نشان بہنوں کا جادو کیسے کامیاب ہوسکتا تھا---!!

ممکن ہے آپ کو خیال گزرے کہ وہاں معجزے اور سحر کا مقابلہ تھا اس لئے معجزہ غالب ہوگیا، جبکہ لبید کا جادو رسول اللہ ﷺ کے کسی معجزے کے مقابلے میں نہیں تھا، بلکہ آپ کی بشری طاقتوں پر تھا اس لئے اثر انداز ہوگیا، تو جواباً عرض ہے کہ یہ ایک اشتباہ ہے جو جانِ دو عالم ﷺ کی بشری طاقتوں کو عام انسانوں کی طاقتوں پر قیاس کرنے سے پیدا ہوا ہے مگر اس اشتباہ میں چونکہ بڑے بڑے لوگ مبتلا ہوئے ہیں اس لئے ہم اس موضوع پر قدرے تفصیل سے گفتگو کر رہے ہیں۔

''معجزہ'' ہر اس امر خارق (عام عادت اور معمول کے خلاف اور بظاہر ناممکن چیز) کو کہتے ہیں جو کسی نبی سے، اس کو دعوائے نبوت میں سچا ثابت کرنے کے لئے ظاہر ہو۔

اس تعریف پر بظاہر یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے متعدد معجزات ایسے ہیں جن کے ظہور کے وقت نہ تو آپ نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا، نہ وہاں کوئی ایسا شخص تھا

جس کو آپ کی سچائی میں شبہ ہو، مثلاً کھجور کے خشک تنے کا رونا، انگشتان مبارکہ سے پانی کا نکلنا اور دیگر بہت سے معجزات، تو کیا ایسے تمام خوارق کو معجزات کی فہرست سے خارج کر دیا جائے گا---؟

علامہ سہیلی نے اس کا جواب اثبات میں دیا ہے، یعنی ہاں، ایسے تمام خوارق کو معجزات نہیں کہا جائے گا بلکہ ان کو ''علامات نبوت'' میں شمار کیا جائے گا۔

اگرچہ یہ فقط اصطلاح کا فرق ہے؛ تاہم اگر اس کو درست تسلیم کرلیا جائے تو رسول اللہ ﷺ کے معجزات کی تعداد بہت کم رہ جائے گی کیونکہ ایسے واقعات جہاں پہلے آپ نے نبوت کا دعویٰ کیا ہو اور پھر اس کے ثبوت کے لئے کوئی معجزہ ظاہر کیا ہو، آٹھ دس سے زیادہ نہیں ہیں، حالانکہ یہ طے شدہ بات ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے معجزات تمام انبیاء کے معجزات سے زیادہ ہیں!

اس الجھن کی وجہ سے شیخ ابن ہمام (۱) نے علامہ سہیلی سے اتفاق نہیں کیا ہے اور اصل اعتراض کا جواب دیتے ہوئے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ ہر معجزہ

---

(۱) شیخ ابن ہمام کا اصلی نام محمد ابن عبدالاحد ہے۔ ان کے والد ماجد اور نانا جان دونوں قاضی (جج) تھے۔ نانا کا تعلق مالکی مذہب سے تھا جبکہ والد حنفی تھے اور ہمام الدین کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے۔ اس علمی گھرانے میں ۷۸۸ یا ۷۹۰ ھ کو شیخ ابن ہمام کی ولادت ہوئی۔ متعدد علماء سے کسب فیض کیا اور فطری صلاحیت کی بناء پر تھوڑے ہی عرصے میں تمام مروجہ علوم پر دسترس حاصل کر لی۔ تذکرہ نگار، ان کے حالات بیان کرتے ہوئے اتنے علوم کا ذکر کرتے ہیں کہ انسان ان کی جامعیت اور ہمہ گیری پر حیران رہ جاتا ہے۔

علامہ عبدالحی لکھنوی لکھتے ہیں---'' كَانَ اِمَامًا، نَظَّارًا، فَارِسًافِي الْبَحْثِ. فُرُوْعِيٌّ، اُصُوْلِيٌّ، مُحَدِّثٌ، مُفَسِّرٌ، حَافِظٌ، نَحْوِيٌّ، كَلَامِيٌّ، مَنْطِقِيٌّ، جَدَلِيٌّ. ''

علامہ سیوطی لکھتے ہیں---'' كَانَ عَلَّامَةً فِي الْفِقْهِ، وَالْاُصُوْلِ، وَالنَّحْوِ، وَالصَّرْفِ، وَالْمَعَانِي، وَالْبَيَانِ، وَالتَّصَوُّفِ، وَالْمُوْسِيْقِي، مُحَقِّقًا، جَدَلِيًّا، نَظَّارًا''

حاصل ان دونوں عبارتوں کا یہ ہے کہ شیخ ابن ہمام بہت بڑے عالم، باریک بین محقق، ☜

دکھاتے وقت ساتھ نبوت کا بھی دعویٰ کیا جائے؛ بلکہ ایک دفعہ جب دعوائے نبوت کر دیا جائے تو اس کے بعد ظاہر ہونے والے تمام خوارق اسی دعویٰ کا ثبوت ہوں گے اس لئے معجزات میں شامل ہوں گے۔

ملاحظہ فرمایئے ان کی عبارت---متن مع الشرح

(وَقَوْلُ السَّهَيْلِيْ فِيْ بَعْضِ هٰذِهٖ) الْخَوَارِقِ (اِنَّهَا عَلَامَةٌ لِلنُّبُوَّةِ (لَا مُعْجِزَةٌ) اَیْ لَا تُسَمّٰی بِذَالِکَ (بِنَاءً عَلٰی عَدَمِ اِقْتِرَانِهَا بِدَعْوٰی النُّبُوَّةِ' لَيْسَ بِذَالِکَ) اَیْ لَيْسَ بِمَقْبُوْلٍ.....(فَاِنَّه') صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا ادَّعٰی النُّبُوَّةَ اِنْسَحَبَ عَلَيْهِ ذَالِکَ' فَهُوَ (مُنْسَحِب عَلَيْهِ النُّبُوَّةُ مِنْ حِيْنِ اِبْتِدَاءِ هَا) اَیِ الدَّعْوٰی (اِلٰی اَنْ تَوَفَّاهُ اللّٰهُ تَعَالٰی' كَاَنَّه' فِیْ كُلِّ سَاعَةٍ) اَیْ فِیْ كُلِّ وَقْتٍ (يَسْتَانِفُهَا) اَیِ الدَّعْوٰی (فَكُلُّ مَا وَقَعَ لَه') مِنَ الْخَوَارِقِ (كَانَ مُعْجِزَة) لِاقْتِرَانِهٖ بِدَعْوٰی النُّبُوَّةِ حُكْمًا وَ (كَاَنَّه' يَقُوْلُ فِیْ كُلِّ سَاعَةٍ (اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ)

میدان بحث کے شہسوار اور فروع واصول کے ماہر تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، اصول، کلام، تصوف، معانی، بیان، نحو، صرف، منطق، مناظرہ، اور موسیقی میں ان کو مہارت تامہ حاصل تھی۔

علاوہ ازیں ولایت کے مرتبے پر بھی فائز تھے اور صاحب کشف وکرامت بزرگ تھے۔ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ سب سے وقیع اور مبسوط تصنیف ''فتح القدیر'' ہے جو فقہ حنفی کی مشہور کتاب ''ہدایہ'' کی شرح ہے۔ اس کا مطالعہ کرتے ہوئے فی الواقع یوں محسوس ہوتا ہے کہ علوم کا بحرِ زخار موجیں مار رہا ہے۔

متن میں ہم نے جو حوالہ پیش کیا ہے وہ عقائد کے موضوع پر ان کی شہرہ آفاق کتاب ''المسایرہ'' سے ماخوذ ہے، جس کی مختصر شرح ''المسامرہ'' کے نام سے علامہ ابوشریف محمد ابن محمد نے لکھی ہے۔

درس وتدریس اور تصنیف وتالیف سے ایک عالم کو سیراب کرنے کے بعد تقریباً ستر سال کی عمر میں نہایت مبارک مہینہ کے انتہائی بابرکت دن میں خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ یعنی ---۷ رمضان، بروز جمعہ، ۸۶۱ھ (الفوائد البہیہ فی تراجم الحنفیہ ص ۲۴۷۔)

اِلیٰ الْخَلْقِ (وَکَانَّہٗ یَقُوْلُ فِیْ کُلِّ سَاعَۃٍ) اَیْ کُلِّ وَقْتٍ وَقَعَ فِیْہِ خَارِقٌ لِّلْعَادَۃِ (ھٰذَا دَلِیْلُ صِدْقِیْ)(۱)

(ان میں سے بعض خوارق کے بارے میں سہیلی نے کہا ہے کہ ان کو معجزہ نہیں کہا جائے گا؛ بلکہ علامات نبوت قرار دیا جائے گا کیونکہ ان کے ساتھ نبوت کا دعویٰ موجود نہیں ہے لیکن سہیلی کا یہ قول قابل قبول نہیں ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے جب ایک دفعہ نبوت کا دعویٰ کر دیا تو وہ آپ کی نبوت کے ساتھ ساتھ کھنچا چلا آیا اور بعد کی زندگی میں آپ کے وصال تک مسلسل برقرار رہا۔ گویا لحہ بہ لحہ آپ اس کی تجدید کرتے رہے۔ اس لئے دعوائے نبوت کے بعد آپ سے جو بھی امر خارق ظاہر ہوا وہ معجزہ ہوگا کیونکہ اس کے پس منظر میں حکماً نبوت کا دعویٰ موجود ہوتا ہے۔ گویا آپ ہر وقت اعلان کر رہے ہوتے ہیں کہ میں ساری دنیا کی طرف اللہ کا رسول ہوں اور جب بھی آپ سے کسی امر خارق کا ظہور ہوتا ہے تو گویا آپ سب کو بتا رہے ہوتے ہیں کہ یہ میری سچائی کا ثبوت ہے)

غرضیکہ اعلان نبوت کے بعد ظاہر ہونے والا ہر امر خارق درحقیقت معجزہ ہے، خواہ اس کے بعض انواع کا نام کچھ اور رکھ دیا جائے۔ اور یہ سب کے نزدیک مسلم ہے کہ جادو معجزے پر اثر انداز نہیں ہوسکتا کیونکہ معجزہ نبی کی صداقت کا ثبوت ہوتا ہے، اگر وہ جادو سے متاثر ہو جائے تو نبی کی صداقت ہی مشتبہ ہو جائے گی، اس لئے یہ متفقہ بات ہے کہ سحر کا معجزے پر قطعاً کوئی اثر نہیں ہوسکتا۔

اب آیئے دیکھتے ہیں کہ ان روایات کے مطابق رسول اللہ ﷺ کی جو چیزیں سحر سے متاثر ہوئی تھیں، وہ معجزانہ خصوصیات کی حامل تھیں یا اس طرح کی تھیں جیسی عام آدمیوں کی ہوتی ہیں۔

یہ تو سب جانتے ہیں کہ جانِ دو عالم ﷺ اعلم الاولین والآخرین ہیں، یعنی اگلوں پچھلوں میں سب سے زیادہ علم آپ کا ہے اور علم کا دار و مدار حافظے پر ہے۔ یعنی جو چیز

(۱) مسائرہ مع المسامرہ ص ۲۰۶۔

ہمارے حافظے میں محفوظ ہوگی اس کے بارے میں کہا جائے گا کہ ہمیں اس کا علم ہے۔ اگر حافظہ قوی ہوا تو علم بھی وسیع ہوگا اور اگر حافظہ کمزور ہوا تو اسی تناسب سے معلومات بھی کم ہوں گی اور جانِ دوعالم ﷺ کے حافظے کی وسعت اور ہمہ گیری کا یہ عالم تھا کہ اس میں تخلیق کائنات کے آغاز سے اختتام تک تمام واقعات سما سکتے تھے۔

عَنْ عُمَرَ رَضِیَ اللہ عَنهُ قَالَ: قَامَ فِینَا رَسُوْلُ اللہ ﷺ مَقَامًا فَاَخْبَرَنَا عَنْ بَدْءِ الْخَلْقِ حَتّٰی دَخَلَ اَهْلُ الْجَنَّةِ وَ اَهْلُ النَّارِ مَنَازِلَهُمْ، حَفِظَه، مَنْ حَفِظَه، وَ نَسِیَه، مَنْ نَسِیَه. (۱)

(حضرت عمرؓ بیان فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ ہمارے درمیان کھڑے ہوئے اور تخلیق کے آغاز سے جنتیوں اور دوزخیوں کے اپنی اپنی منزلوں میں پہنچ جانے تک کے واقعات بیان کر دیئے---جس نے یاد رکھا، یاد رکھا۔ جس نے بھلا دیا، بھلا دیا۔)

آغاز کائنات سے اختتام حشر تک لاکھوں سال کے واقعات ایک مجلس میں بتا دینا بذاتِ خود ایک معجزہ ہے---جس طرح واقعۂ معراج میں کروڑوں نوری سالوں کے فاصلے طے کر کے ایک ہی رات میں واپس آ جانا معجزہ ہے، لیکن اس سے بھی بڑا معجزہ اس قدر لامتناہی حالات و واقعات کا یاد رہنا اور آپ کے حافظے میں محفوظ ہونا ہے۔

ایک اور حدیث میں ایک پُرکیف روحانی مشاہدے کی روداد بیان کرتے ہوئے جانِ دوعالم ﷺ فرماتے ہیں "---پس اللہ تعالیٰ نے اپنا ہاتھ میرے کندھوں کے درمیان رکھا جس کی ٹھنڈک میں نے اپنے سینے میں محسوس کی فَعَلِمْتُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ تو جو کچھ آسمانوں اور زمین میں تھا، میں نے جان لیا۔" (۲)

ظاہر ہے کہ کسی عام انسان کا حافظہ اتنی ہمہ گیر استعداد کا حامل نہیں ہو سکتا کہ جہان کی ابتداء سے انتہاء تک اور آسمانوں سے زمین تک ہر چیز کا علم اس میں سما جائے۔ ایسی غیر

---

(۱) صحیح بخاری، ج ۱، کتاب بدء الخلق، ص ۴۵۳.

(۲) مشکوۃ، ص ۷۰، بحوالہ ترمذی، طبرانی، شرح السنہ.

معمولی یادداشت یقینی طور پر معجزہ ہے اور وَلَا یُفْلِحُ السَّاحِرُ حَیْثُ اَتیٰ ۝ کے مطابق معجزہ پر جادو اثر انداز نہیں ہو سکتا اس لئے یہ کہنا کہ جادو کے اثر سے آپ کے حافظے کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ ایک کام نہیں کیا ہوتا تھا اور سمجھتے تھے کہ میں کر چکا ہوں، قطعاً غلط ہے (۱)

جانِ دو عالم ﷺ کی تو خیر شان ہی بہت بڑی ہے، جادو تو اصولی طور پر آپ کے دریائے علم سے چند چلو بھرنے والے صحابی حضرت ابو ہریرہؓ کے حافظے پر بھی اثر انداز نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ ان کا ایسا بے مثال حافظہ بارگار نبوت کا اعجاز تھا (۲) اور معجزے کو جادو متاثر نہیں کر سکتا---وَلَا یُفْلِحُ السَّاحِرُ حَیْثُ اَتیٰ ۝

✿✿✿

بعض انبیاء کرام جن میں ہمارے آقا و مولیٰ ﷺ بھی شامل ہیں، اپنی دینی و تبلیغی ضروریات کے لئے متعدد شادیاں کرتے رہے۔ حضرت سلیمانؑ کی کم از کم ساٹھ بیویاں صحیح حدیث سے ثابت ہیں (۳) جانِ دو عالم ﷺ کی بھی نو ازواج مطہرات تھیں۔ اتنی خواتین کے

---

(۱) واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ اگر کوئی چیز جانِ دو عالم ﷺ کے حافظے سے یکسر محو کر دے یا کسی اور طرف متوجہ ہونے کی وجہ سے وقتی طور پر آپ کو از خود ذہول ہو جائے تو یہ ممکن ہے۔ ہمارا مدعا صرف اتنا ہے کہ جادو کے زور سے ایسا نہیں ہو سکتا۔

(۲) ایک دن حضرت ابو ہریرہؓ نے عرض کی---''یارسول اللہ! میں آپ سے احادیث سنتا ہوں مگر بعد میں بہت سی بھول جاتا ہوں۔'' فرمایا---''اپنی چادر بچھاؤ!'' ابو ہریرہؓ نے چادر بچھائی تو آپ ﷺ نے اپنے خالی ہاتھوں سے اوک سی بنا کر اس کو چادر پر انڈیل دیا، پھر فرمایا---''اس چادر کو اپنے سینے سے لگا لو!'' حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے ایسا ہی کیا---''فَمَا نَسِیْتُ شَیْئاً بَعْدُ'' اس کے بعد میں کبھی کوئی چیز نہیں بھولا۔ (صحیح بخاری، ج ۱، ص ۲۲)

جس ہستی کے لحاتی فیضان سے دوسروں کو ایسا حافظہ مل جائے کہ پھر وہ کوئی چیز بھولیں ہی نہ، اس ذات اقدس کا اپنا معجزانہ حافظہ جادو سے اتنا متاثر ہو جائے کہ پورے ایک سال تک نسیان میں مبتلا رہے، یہ بھلا کیسے ممکن ہے---!؟

(۳) صحیح بخاری، ج ۲، باب المشیۃ والارادۃ، ص ۱۱۱۲.

ازدواجی تقاضے پورے کرنے کے لئے غیر معمولی قوت کی ضرورت ہے اور جانِ دو عالم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے یہ قوت بھی معجزانہ طور پر عطا کر رکھی تھی۔ چنانچہ آپ کے خادمِ خاص حضرت انسؓ نے جب یہ بات بیان کی کہ (بعض دفعہ) رات یا دن کے کسی حصے میں رسول اللہ ﷺ اپنی تمام بیویوں کے پاس ہو آتے تھے تو حضرت قتادہ نے حیرت سے پوچھا--- ''اَوَ کَانَ یُطِیْقُ ذَالِکَ---؟'' (کیا آپ اتنی طاقت رکھتے تھے؟) حضرت انسؓ نے جواب دیا--- ''کُنَّا نَتَحَدَّثُ اَنَّہٗ اُعْطِیَ قُوَّۃَ ثَلٰثِیْنَ رَجُلاً .'' (۱) (ہم آپس میں بات کیا کرتے تھے کہ آپ ﷺ کو تیس مردوں جتنی قوت عطا کی گئی ہے۔)

بخاری کے حاشیے میں لکھا ہے کہ صحیح اسماعیلی میں تیس کے بجائے چالیس مردوں کا ذکر ہے اور حلیہ ابی نعیم میں چالیس جنتی آدمیوں کا بیان ہے اور ترمذی میں ہے کہ ایک جنتی کی طاقت دنیا کے سو آدمیوں کے برابر ہے۔ (۲)

چالیس کو سو سے ضرب دیں تو حاصل چار ہزار آئے گا۔ اس لحاظ سے جانِ دو عالم ﷺ کو دنیا کے چار ہزار انسانوں جتنی قوت حاصل تھی۔ ظاہر ہے کہ اتنی فراواں طاقت سر بسر معجزہ ہے--- اگر اسماعیلی اور ابی نعیم والی روایات کو ضعیف سمجھا جائے اور صرف بخاری پر انحصار کیا جائے تو ایک ہستی میں تیس مردوں کی طاقت کا پایا جانا بھی کوئی کم معجزہ نہیں اور معجزہ جادو سے متاثر نہیں ہوتا اس لئے ایسی معجزانہ مردانہ طاقتوں کی حامل ذاتِ اقدس کے بارے میں یہ کہنا کہ آپ عورتوں کے پاس جانا چاہتے تھے مگر جا نہیں پاتے تھے، قطعاً باطل ہے کیونکہ اس طرح معجزانہ طاقتیں ساحرانہ قوتوں کے آگے بے بس ہو جاتی ہیں، حالانکہ سحر معجزہ پر کبھی غالب نہیں ہو سکتا---- وَلَا یُفْلِحُ السَّاحِرُ حَیْثُ اَتٰی○

❋❋❋

جادو کے یہ دو اثرات، یعنی حافظے کی خرابی اور قوتِ مردمی کا فعال نہ ہونا تو

(۱، ۲) صحیح بخاری، ج ۱، باب اذا جامع ثم عاد، ص ۴۱.

روایات بخاری میں پائے جاتے ہیں اور یہ واضح کیا جاچکا ہے کہ وَلَا یُفْلِحُ السَّاحِرُ حَیْثُ اَتیٰ٥ جیسی واضح اور صریح آیت کے ساتھ معارض ہونے کی وجہ سے ان روایتوں کو تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ رہے باقی آثار، تو وہ جن روایتوں میں مذکور ہیں وہ مخالفتِ قرآن سے قطع نظر بذات خود اتنی ضعیف ہیں کہ ان سے استدلال نہیں کیا جاسکتا؛ تاہم ان میں مسند عبدالرزاق اور طبقات ابن سعد کی ایک مرسل و منقطع روایت ایسی ہے جس کو علامہ قاضی عیاض مالکی نے اتنی اہمیت دی ہے کہ بخاری و مسلم کی روایات سحر کو کھینچ تان کر اس پر حمل کردیا ہے۔ (۱) یعنی وہ روایت جس میں جانِ دو عالم ﷺ کی نظر میں التباس پیدا ہوجانے کا ذکر ہے، حالانکہ جانِ دو عالم ﷺ کی بینائی کا کسی جادو سے متاثر ہونا ممکن ہی نہیں کیونکہ چشم مازاغ جس طرح سامنے دیکھتی تھی اسی طرح پسِ پشت چیزوں کا بھی معائنہ کرتی تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ جانِ دو عالم ﷺ نے اپنے مقتدی صحابہ کرام کو رکوع و سجود مکمل کرنے اور خشوع و خضوع ملحوظ رکھنے کی نصیحت کرتے ہوئے سمت قبلہ کی جانب اشارہ کیا اور فرمایا۔

اَتَرَوْنَ قِبْلَتِیْ هٰهُنَا؟---اِنِّیْ لَاَ رَاکُمْ مِنْ وَّرَاءِ ظَهْرِیْ. (۲)

(کیا تم سمجھتے ہو کہ میری توجہ صرف اس طرف ہوتی ہے---؟ میں تو اپنی پیٹھ پیچھے بھی تم کو دیکھ رہا ہوتا ہوں۔)

حاشیے میں لکھا ہے

قِیْلَ: اَلْمُرَادُ بِهِ الْعِلْمُ بِالْوَحْیِ، وَالصَّوَابُ اَنَّه' عَلٰی ظَاهِرِهٖ وَاَنَّه' اِبْصَارٌ خَاصٌّ بِهٖ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمْ خَرْقًا لِلْعَادَةِ، کَذَا فِی التَّوْشِیْحِ، وَفِی الْعُیْنِیْ: نُقِلَ عَنْ مُجَاهِدٍ اَنَّه' کَانَ فِیْ جَمِیْعِ اَحْیَانِهٖ، یَعْنِیْ مَاکَانَتْ مُخْتَصَّةً بِحَالَةِ الصَّلٰوةِ. (۳)

(کہا گیا ہے کہ پیچھے دیکھنے سے مراد یہ ہے کہ وحی کے ذریعے آپ کو پیچھے کا علم ہو

---

(۱) قاضی صاحب کی تشریحات چند صفحات کے بعد آرہی ہیں۔

(۲، ۳) صحیح بخاری، ج ۱، باب فقه الامام الناس ص ۹۵۔

جاتا تھا، لیکن صحیح یہ ہے کہ دیکھنا اپنے ظاہری معنی میں ہے اور پیچھے دیکھنا آپ کی معجزانہ خصوصیات میں سے ہے۔توشیح میں اسی طرح ہے۔اور عینی میں ہے کہ مجاہد سے منقول ہے کہ آپ کا پیچھے دیکھنا تمام اوقات میں تھا، یعنی حالت نماز کے ساتھ مخصوص نہیں تھا)

جو آنکھ بطور معجزہ وخرق عادت ہر وقت آگے پیچھے یکساں دیکھتی ہو، اس کا جادو کے زور سے اگر یہ حال ہو جائے کہ سامنے کی چیز کو بھی نہ پہچان سکے تو لازم آئے گا کہ سحر معجزے پر غالب آجائے اور یہ ناممکن ہے---وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ اَتٰیO

❁❁❁

التباس نظر والی روایت کے علاوہ باقی روایات جن میں کھانے پینے کی بندش اور دیگر اثرات کا ذکر ہے، اسی طرح وہ روایتیں جن میں جادو کی کہانی کو فائنل ٹچ دیا گیا ہے، یعنی گیارہ گرہوں والی تانت اور سوئیوں والے مجسمے کا برآمد ہونا اور جبریل کا سورۂ فلق اور سورۂ ناس لے کر اترنا اور ان کی آیتیں پڑھ کے گانٹھیں کھولنے کا کہنا، تو ان روایات کے نہ صرف یہ کہ راوی انتہا درجے کے ضعیف ہیں بلکہ اکثر میں ارسال، انقطاع اور اعضال کی علتیں بھی پائی جاتی ہیں۔یعنی ان کی سندوں میں ایک یا دو راوی چھوٹے ہوئے ہیں۔گویا ان میں ضعف در ضعف پایا جاتا ہے اس لئے ان پر گفتگو کرنا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہے، البتہ ان میں سے ایک روایت جسے علامہ بیہقی نے ذکر کیا ہے، نسبتاً بہتر ہے کیونکہ اس کی سند متصل ہے اور بیچ میں کوئی راوی چھوٹا ہوا نہیں ہے؛ تاہم ہے وہ بھی ضعیف کیونکہ اس کے دو راوی انتہائی کمزور ہیں۔علامہ قسطلانی اور علامہ زرقانی لکھتے ہیں

وَفِیْ حَدِیْثِ ابْنِ عَبَّاسٍ عِنْدَالْبَیْهَقِیْ فِیْ الدَّلَائِلِ النَّبَوِیَّةِ (بِسَنَدٍ ضَعِیْفٍ) لِاَنَّ فِیْهِ الْکَلْبِیْ عَنْ اَبِیْ صَالِحٍ، وَهُمَا ضَعِیْفَانِ (فِیْ آخِرِ قِصَّةِ السِّحْرِ الَّذِیْ سُحِرَبِهٖ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ:اَنَّهُمْ وَجَدُوْا وِتْرًا فِیْهِ اِحْدٰی عَشْرَةَ عُقْدَةً وَاُنْزِلَتْ سُوْرَةُ الْفَلَقِ وَالنَّاسِ فَجَعَلَ کُلَّمَا قَرَأَ اٰیَةً انْحَلَّتْ عُقْدَةٌ) (۱)

(اور بیہقی نے الدلائل النبویہ میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے، جس کی

(۱) زرقانی علی المواہب، ج۷، ص ۱۲۱۔

سند ضعیف ہے کیونکہ اس میں کلبی اور ابو صالح پائے جاتے ہیں اور یہ دونوں ہی ضعیف ہیں۔ اس روایت میں نبی ﷺ پر جادو کیئے جانے والے قصے کے آخر میں ہے کہ کنویں سے ایک تانت ملی جس میں گیارہ گانٹھیں تھیں اور آپ پر سورۂ فلق اور ناس اتریں تو آپ جونہی کوئی آیت پڑھتے گانٹھ کھل جاتی۔)

جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں اس روایت کو علامہ قسطلانی نے ضعیف قرار دیا ہے اور علامہ زرقانی نے اس کا سبب یہ بیان کیا ہے کہ اس میں کلبی اور ابو صالح، دو ایسے راوی پائے جاتے ہیں جو ضعیف ہیں، لیکن علامہ زرقانی نے یہ نہیں بتایا کہ یہ کس درجے کے ضعیف ہیں تو ہم اس کی وضاحت آپ کے سامنے پیش کر دیتے ہیں، مگر دونوں کے حالات بیان کرنے سے بات بہت لمبی ہو جائے گی اس لئے بڑے میاں، یعنی استاد ابو صالح کا ذکر ترک کر کے صرف چھوٹے میاں، یعنی ابو صالح کے شاگرد کلبی کے بارے میں ائمہ جرح و تعدیل کے اقوال نقل کر دیتے ہیں، جنہیں پڑھ کے آپ خود ہی پکار اٹھیں گے کہ بڑے میاں تو بڑے میاں، چھوٹے میاں سبحان اللہ!

کلبی کا نام محمد ابن سائب ہے۔ ابو النصر کنیت ہے اور کلبی عرفیت۔ کوفہ کا رہنے والا ہے۔ انساب اور تاریخ سے متعلق روایتیں بہت کثرت سے بیان کی ہیں۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب تفسیر کا راوی بھی یہی ہے اس لئے بعض محدثین نے اسکو تفسیر میں پسندیدہ قرار دیا ہے مگر یزید ابن زریع کہتے ہیں کہ میں نے احمد بن حنبل سے پوچھا کہ کیا کلبی کی تفسیر کا مطالعہ جائز ہے؟ انہوں نے کہا کہ نہیں۔

معلوم نہیں کچھ محدثین نے اس کو تفسیر میں کیسے پسندیدہ کہہ دیا حالانکہ یہ تفسیر کو اپنے استاد ابو صالح کے واسطے سے ابن عباسؓ تک پہنچاتا ہے اور سفیان کہتے ہیں کہ کلبی نے مجھے خود بتایا کہ ابو صالح کے توسط سے جو روایت بھی میں بیان کروں وہ جھوٹ ہوتی ہے۔ ابن عدی نے کہا ہے کہ کلبی ثقہ نہیں ہے۔ دارقطنی اور محدثین کی ایک جماعت نے اس کو متروک قرار دیا ہے۔ جوزجانی وغیرہ نے کہا ہے کذاب ہے۔

جھوٹا ہونے کے علاوہ یہ شخص انتہا درجے کا بدعقیدہ رافضی ہے۔ ہمام کہتے ہیں کہ

میں نے خود کلبی کو یہ کہتے سنا ہے کہ میں سبائی ہوں۔ ابن حبان کہتے ہیں کہ کلبی ان سبائیوں میں سے تھا جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضرت علیؓ فوت نہیں ہوئے اور دوبارہ دنیا میں لوٹ کر آئیں گے اور عدل وانصاف قائم کریں گے۔ یہ لوگ جب بادل کا ٹکڑا دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ اس میں ہیں۔ (واہ! کیا عقلمندانہ عقیدہ ہے!) ابوعوانہ کہتے ہیں کہ میں نے کلبی کو یہ کہتے سنا ہے کہ جبریل نبی ﷺ کو وحی املاء کرا رہے ہوتے تھے، جب نبی ﷺ بیت الخلاء کو چلے جاتے تھے تو جبریل، علی کو املاء کرانا شروع کر دیتے تھے (حد ہوگئی جبریل کی سادہ لوحی کی بھی!) ابن حبان کہتے ہیں کہ کلبی کا جو مذہب ہے اور اس کا جھوٹ جتنا واضح ہے اس کے بعد اس کے بارے میں مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس کا تو کتابوں میں ذکر کرنا بھی جائز نہیں ہے، چہ جائیکہ اس کی بیان کردہ روایتوں کو بطور دلیل پیش کیا جائے۔ (۱)

توبہ اللہ! محدثین ومفسرین کے روپ میں کیسے کیسے فنکار پڑے ہوئے ہیں---!!

اللہ بھلا کرے علماء جرح وتعدیل کا، کہ انہوں نے ایسے جعلسازوں کے پول کھول دیئے ہیں ورنہ ہمیں تو یہ عیار لوگ لے ڈوبتے!

قارئین کرام! یہ حال ہے بیہقی کی اس روایت کا، جو متصل ہونے کی وجہ سے نسبتاً بہتر حالت میں ہے۔ پھر سورتیں نازل ہونے اور گرہیں کھولنے والی باقی روایتوں کا آپ خود اندازہ لگا لیجئے!

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

اس موقعہ پر سورتوں کا نازل ہونا اس لئے بھی ناقابل فہم ہے کہ اکثر کے نزدیک یہ سورتیں مکی ہیں۔ جن لوگوں نے انہیں مدنی کہا ہے انہوں نے روایت سحر کی وجہ سے ان کو مدنی کہہ دیا ہے ورنہ سعودی عرب میں چھپنے والے تمام مصحفوں میں، اسی طرح تاج کمپنی کے مطبوعہ تمام قرآنی نسخوں میں ان سورتوں کے بارے میں واضح طور پر لکھا ہوا ہے کہ یہ مکی ہیں، یعنی مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی ہیں اور روایات کے مطابق جادو کا واقعہ صلح حدیبیہ کے

---

(۱) میزان الاعتدال، ج ۳، ص ۶۲، سے ماخوذ۔

بعد پیش آیا تھا۔ اس لحاظ سے یہ سورتیں واقعۂ سحر سے کم از کم سات، آٹھ سال پہلے نازل ہو چکی تھیں، پھر ان کے نزول کو داستان سحر کے ساتھ جوڑنے کی کیا تک ہے---؟!

کہا جاتا ہے کہ اگر یہ سورتیں مکہ میں نازل ہوئی تھیں تو مِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِo یعنی گانٹھوں میں پھونکنے والیوں کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنے کا کیا مطلب ہوگا---! گانٹھوں میں پھونکنے کا عمل تو مدینہ میں ہوا تھا اس لئے سورتوں کا نزول بھی مدینہ میں ہونا چاہئے، جیسا کہ روایت سحر میں آیا ہے۔

سبحان اللہ! ان سورتوں میں تو حاسد کے شر سے اور اندھیرے کے شر سے بھی پناہ مانگی گئی ہے، تو کیا حاسدوں نے حسد ہجرت مدینہ کے بعد شروع کیا تھا---؟ کیا اندھیرا صرف مدینے میں چھایا کرتا تھا، مکہ میں نہیں ہوا کرتا تھا---؟ جس طرح حسد اور اندھیرا شروع سے چلے آتے ہیں اسی طرح گانٹھوں میں پھونکیں مارنے کا عمل بھی قدیم زمانے سے چلا آرہا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے مکہ ہی میں آپ کو اور آپ کے توسط سے آپ کی امت کو یہ استعاذہ (پناہ مانگنا) سکھا دیا تا کہ اس کو پڑھنے والے، حاسدوں، تاریکیوں اور جادو گرنیوں کے شر سے ہمیشہ محفوظ رہیں۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر آپ پر جادو کا اثر ہونا ممکن ہی نہیں تھا تو پھر آپ کو جادو گرنیوں کے شر سے استعاذہ کا حکم کیوں دیا گیا؟

جواباً عرض ہے کہ پناہ مانگنے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ جس چیز سے پناہ مانگی جائے اس کے وقوع پذیر ہونے کا امکان بھی ہو۔ جانِ دو عالم ﷺ تو اور بھی بہت سے استعاذے کیا کرتے تھے، مثلاً---''اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنْ فِتْنَةِ النَّارِ وَ عَذَابِ النَّارِ وَمِنْ فِتْنَةِ الْقَبْرِ وَ عَذَابِ الْقَبْرِ.''(۱)

(اے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں جہنم کی آزمائش سے اور جہنم کے عذاب سے، قبر کی آزمائش سے اور قبر کے عذاب سے۔)

---

(۱) صحیح بخاری، ج ۲، ص ۹۴۳.

کیا ان چار چیزوں میں سے کسی ایک میں بھی آپ کے مبتلا ہونے کا کوئی امکان تھا---؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر جادوگرنیوں کے شر سے پناہ مانگنے سے یہ کیوں فرض کرلیا گیا ہے کہ جادوگرنیوں کے شر سے آپ کا متاثر ہونا ممکن تھا---؟

لبید اور اس کی نامعلوم بہنوں کی تو بساط ہی کیا تھی، واللہ! اگر ساری دنیا کے جادوگر مل کر بھی آپ پر جادو کرتے تو سب کو منہ کی کھانی پڑتی کیونکہ قرآن مجید نے واضح اعلان کر رکھا ہے کہ لَایُفْلِحُ السَّاحِرُ حَیْثُ اَتٰی ٥ اور اللہ سے زیادہ اپنی بات میں کون سچا ہوسکتا ہے! وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰہِ قِیْلًا ٥

✿✿✿

جن فضلاء نے مقام نبوت، شان رسالت اور آیات قرآنیہ کو مدنظر رکھ کر روایات سحر کا جائزہ لیا انہوں نے آج سے ایک ہزار سال پہلے ان روایتوں کو سراسر جعلی اور من گھڑت قرار دے دیا تھا۔

علوم قرآنیہ کے معروف حنفی فاضل علامہ جصاص رازی (۱) کی معرکہ آرا کتاب ''احکام القرآن'' سے چند اقتباسات ملاحظہ فرمایئے!

---

(۱) علامہ جصاص رازی کا نام احمد ابن علی ہے۔ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ سب سے عمدہ اور مشہور تصنیف ''احکام القرآن'' ہے۔ اس کے علاوہ شرح مختصر کرخی، شرح مختصر طحاوی، شرح جامع محمد، شرح اسماء حسنیٰ اور ادب القضاء وغیرہ بھی آپ کی تصنیفات ہیں۔ فضل و کمال کے اعتبار سے اپنے زمانے میں یکتا تھے۔ اہل علم نے آپ کی مدح و ستائش میں جو کچھ کہا ہے اس کی چند جھلکیاں ملاحظہ فرمایئے!

خطیب بغدادی کہتے ہیں---''هُوَاِمَامُ اَصْحَابِ اَبِیْ حَنِیْفَةَ فِیْ وَقْتِهٖ.'' اپنے وقت میں امام ابوحنیفہ کے پیروکاروں کے امام تھے۔

ملاعلی قاری کہتے ہیں ---''اَلْاِمَامُ الْکَبِیْرُالشَّانِ--- وَاِلَیْهِ اِنْتَهَتْ رِیَاسَةُ الْاَصْحَابِ.'' بڑی شان والے امام ہیں۔ حنفی اصحاب کی تاجداری ان پر ختم ہے۔

علامہ زرقانی کہتے ہیں---''اَلْاِمَامُ الْحَافِظُ، مُحَدِّثُ نِیْشَاپُوْر، مِنْ اَئِمَّةِ ☜

''اِنَّھُمْ زَعَمُوْا اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ سُحِرَ وَ اَنَّ السِّحْرَ عَمِلَ فِیْہِ.''
(لوگوں نے گمان کر رکھا ہے کہ نبی ﷺ پر جادو کیا گیا تھا اور جادو نے آپ پر اثر بھی کیا تھا۔)

اس کے بعد ان اثرات کا ذکر کیا ہے جو بخاری کی روایت میں مذکور ہیں، پھر ان کو رد کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟

وَقَدْ قَالَ اللّٰہُ تَعَالیٰ مُکَذِّبًالِلْکُفَّارِ فِیْ مَا ادَّعَوْہُ مِنْ ذَالِکَ لِلنَّبِیِّ ﷺ فَقَالَ جَلَّ مِنْ قَائِلٍ: وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلاً مَّسْحُوْرًا ۝
(حالانکہ جب کفار نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ نبی ﷺ پر جادو کیا گیا ہے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو جھوٹا قرار دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ ظالم یہ کہتے ہیں کہ (اے مومنو!) تم تو ایک جادو زدہ انسان کی پیروی کر رہے ہو۔)

''وَمِثْلُ ھٰذِہِ الْاَخْبَارِ مِنْ وَضْعِ الْمُلْحِدِیْنَ''

اَلْحَنَفِیَّةِ. ''امام، حافظ الحدیث، نیشاپور کے محدث اور احناف کے اماموں میں سے ایک۔

علامہ عبدالحی لکھنوی کہتے ہیں---''کَانَ اِمَامَ الْحَنَفِیَّةِ فِیْ عَصْرِہٖ.'' اپنے زمانے میں حنفیوں کے امام تھے۔

اگر چہ مقلد تھے مگر اتنے وسیع النظر محقق تھے کہ علامہ لکھنوی لکھتے ہیں---''ھُوَاَحَقُّ بِاَنْ یُّجْعَلَ مِنَ الْمُجْتَھِدِیْنَ فِیْ الْمَذْھَبِ.'' اس بات کے حق دار ہیں کہ انہیں مذہب کے اندر اجتہاد کرنے والوں میں شمار کیا جائے۔

علم وفضل کے علاوہ زہد و تقویٰ میں بھی ممتاز تھے۔ حکومت کی طرف سے دو دفعہ عہدۂ قضا کی پیشکش کی گئی مگر آپ نے مسترد کر دی۔

۳۰۵ھ میں پیدا ہوئے۔ عمر کا بیشتر حصہ بغداد میں بسر کیا۔ کچھ عرصہ اہواز اور نیشاپور میں بھی مقیم رہے۔ آخر بغداد ہی میں بتاریخ ۷ر ذی الحجہ ۳۷۰ھ، بعمر پینسٹھ سال داعی اجل کو لبیک کہا---رحمہ اللہ، وجعل الجنة مثواہ. (الفوائد البھیة، مع حاشیة التعلیقات السنیة، للعلامہ عبدالحی اللکھنوی، ص ۱۲)۔

(اس طرح کی تمام روایتیں بے دینوں کی گھڑی ہوئی ہیں۔)

''وَالْعَجَبُ مِمَّنْ يَجْمَعُ بَيْنَ تَصْدِيْقِ الْاَنْبِيَاءِ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ وَ اِثْبَاتِ مُعْجِزَاتِهِمْ وَ بَيْنَ التَّصْدِيْقِ بِمِثْلِ هٰذَا مِنْ فِعْلِ السَّحَرَةِ مَعَ قَوْلِهٖ تَعَالٰى : وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ اَتٰى. ''

(ان لوگوں پر تعجب ہے جو ایک طرف تو انبیاء علیہم السلام کی تصدیق کرتے ہیں اور ان کے معجزات ثابت کرتے ہیں اور دوسری طرف جادوگروں کے ایسے کاموں پر بھی ایمان رکھتے ہیں، باوجودیکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ اَتٰى٥)

''فَصَدَّقَ هٰؤُلَاءِ مَنْ كَذَّبَهٗ اللّٰهُ وَاَخْبَرَ بِبُطْلَانِ دَعْوَاهُ وَانْتِحَالِهٖ. ''(۱)

(یہ لوگ (جو کہتے ہیں کہ نبی ﷺ پر جادو کیا گیا تھا) درحقیقت ان لوگوں کو سچا سمجھتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے جھوٹا کہا ہے اور جن کے دعوائے سحر اور اس کو رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کرنے کو باطل قرار دیا ہے۔)

اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے علامہ جصاص کو --- کیا خوب دفاع کیا ہے انہوں نے مقام رسالت کا--!

❁❁❁

جو لوگ جادو ٹونے کا کاروبار کرتے ہیں یا اس کا توڑ کرنے کے دعویدار بنتے ہیں وہ ان روایات کو تمام تفصیلات کے ساتھ صحیح سمجھتے ہیں اور اپنے گاہک کو پورے دھڑلے سے بتاتے ہیں کہ جادو برحق ہے، یہ تو رسول اللہ ﷺ پر بھی چل گیا تھا اور آپ کا یہ حال ہو گیا تھا کہ --- آگے وہی تفاصیل جو روایات میں مذکور ہیں، مزید مرچ مصالحہ لگا کر بیان کر دیتے ہیں۔ گاہک جب یہ سنتا ہے کہ جادو کے زور سے پورے ایک سال تک رسول اللہ ﷺ کو عجیب و غریب کیفیات سے دوچار کر دیا گیا تھا تو وہ انتہائی خوفزدہ ہو جاتا ہے اور یہی ان عیاروں کا مقصد ہوتا ہے کیونکہ خریدار جتنا زیادہ جادو کے خوف میں مبتلا ہوگا، اتنا ہی اس کا

(۱) احکام القرآن، ج ۱، ص ۴۹.

توڑ کرانے کے لئے بے تاب ہوگا اور منہ مانگی رقم دینے پر تیار ہوگا۔ اس طرح ان کا کاروبار چل پڑتا ہے اور ان پر ہر طرف سے ہن برسنے لگتا ہے۔ آج کل یہ تجارت خوب زوروں پر ہے اور ہر گلی محلہ میں رنگ برنگ بورڈوں پر جلی قلم سے لکھا نظر آتا ہے--- ''بنگال کا جادو'' --- ''افریقہ کا سحر'' --- ''کالا علم'' --- ''سحر سامری'' وغیرہ وغیرہ اور نیچے پروفیسر، عامل، نجومی اور جادوگر وغیرہ کا نام لکھا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے ان لوگوں کو محبوب خدا ﷺ کی عزت وحرمت کی بہ نسبت اپنا کاروبار زیادہ عزیز ہوتا ہے، اس لئے وہ ان روایات کی نشر واشاعت اور تائید وحمایت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔

- --- بے شک رسول اللہ ﷺ کا حافظہ متاثر ہو جائے، ان مکاروں کے کاروبار کو متاثر نہیں ہونا چاہیے۔
- --- بے شک رسول اللہ ﷺ کی ازدواجی قوتیں سلب ہو جائیں، ان کی تسکین ہوس کے اسباب فراہم ہوتے رہنے چاہئیں۔
- --- بے شک رسول اللہ ﷺ کا کھانا پینا بند ہو جائے، ان کے معدے مرغن غذاؤں سے بھرے رہنے چاہئیں۔
- --- بے شک رسول اللہ ﷺ کا بدن گھلتا رہے، ان کے جسموں پر چربی کی تہیں چڑھتی رہنی چاہئیں۔
- --- بے شک رسول اللہ ﷺ کی زلفیں جھڑ جائیں، ان کی جھولتی لٹوں کی آب وتاب ماند نہیں پڑنی چاہیے۔

کاش! کہ یہ لوگ اپنے مکروہ دھندے کو چلانے کے لئے جادو کے سامنے رسول اللہ ﷺ کی بے بسی اور لاچاری کے قصے نہ بیان کریں۔ مگر ان کا بھی کیا قصور---؟ یہ روایات کے انبار جو ان کو سہارا دینے کے لئے موجود ہیں---؟

آہ!

حقیقت خرافات میں کھوگئی
یہ امت روایات میں کھوگئی

معذرت خواہ ہوں کہ کچھ جذباتی ہو گیا ہوں، کہنے کا مقصد یہ ہے کہ کاروباری لوگوں نے تو ان روایات میں مذکور جملہ تفصیلات کو بہر صورت صحیح ماننا ہے کیونکہ یہ ان کے کاروبار کا تقاضا ہے اور اگر اس طبقے کا کوئی نمائندہ ان روایات کی حمایت میں اٹھ کھڑا ہوتا تو ہمیں قطعاً کوئی تعجب نہ ہوتا مگر حیرت کی بات ہے کہ بعض آزاد فکر دانشوروں نے بھی اس کہانی کی وکالت کر دی ہے اور نہ صرف روایات سے؛ بلکہ قرآن سے بھی اس کے ثبوت ڈھونڈھ لائے ہیں۔ چنانچہ ایک معروف محقق لکھتے ہیں۔

''نبی پر جادو کا اثر ہو سکتا ہے، یہ بات قرآن کریم سے بھی ثابت ہے۔ سورۂ اعراف میں فرعون کے جادوگروں کے متعلق بیان ہوا ہے کہ حضرت موسیٰ کے مقابلے میں جب وہ آئے تو انہوں نے ہزارہا آدمیوں کے اس پورے مجمع کی نگاہوں پر جادو کر دیا جو وہاں دونوں کا مقابلہ دیکھنے کیلئے جمع ہوا تھا (سَحَرُوْا اَعْیُنَ النَّاسِ، آیت ۱۱۶) اور سورۂ طٰہٰ میں ہے کہ جو لاٹھیاں اور رسیاں انہوں نے پھینکی تھیں ان کے متعلق عام لوگوں ہی نے نہیں، حضرت موسیٰ نے بھی یہی سمجھا کہ وہ ان سانپوں کی طرح دوڑی چلی آ رہی ہیں اور اس سے موسیٰ علیہ السلام خوفزدہ ہو گئے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر وحی نازل کی کہ خوف نہ کرو، تم ہی غالب رہو گے۔ ذرا اپنا عصا پھینکو---**فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰىo فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰىo قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى o وَاَلْقِ مَافِيْ يَمِيْنِكَ**''

حاصل اس کلام کا یہ ہے کہ چونکہ موسیٰ علیہ السلام نے جادوگروں کی لاٹھیوں اور رسیوں کو متحرک سمجھ لیا تھا اور ان سے خوفزدہ ہو گئے تھے، معلوم ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام پر بھی جادو کا اثر ہو گیا تھا، ورنہ وہ کیوں ان کو حرکت کرتا دیکھ کر خوف میں مبتلا ہوتے---! حالانکہ ساحرانِ فرعون نے ''پورے مجمع کی نگاہوں پر'' جو جادو کیا تھا اس کی حقیقت صرف اتنی تھی کہ ان کی لاٹھیاں اور رسیاں اندر سے کھوکھلی تھیں جن میں پارہ بھر دیا گیا تھا۔ چنانچہ جب ان کو سورج کی گرمی پہنچی تو پارہ اپنی طبعی خاصیت کی بنا پر اڑنے لگا مگر لاٹھیوں اور رسیوں کے وزن کی وجہ سے اوپر نہ اٹھ سکا، تاہم اس کے دباؤ کی وجہ سے لاٹھیاں اور رسیاں زمین پر حرکت کرنے

لگیں۔ دیکھنے والوں کو چونکہ اس تکنیک سے آگاہی نہیں تھی اس لئے موسیٰ علیہ السلام سمیت سب کی نگاہوں نے ان کو متحرک دیکھ کر سمجھا کہ یہ جادوگروں کے جنتر منتر سے از خود متحرک ہوگئی ہیں اس لئے سب کو خوف محسوس ہوا۔(۱)

---

(۱) اہل علم کے لئے چند تفسیری حوالہ جات بغیر اعراب کے پیشِ خدمت ہیں۔

۱--- وذلک انهم او دعوها من الزئبق ما کانت تتحرک بسببه وتضطرب و تميد، بحيث يخيل للناظر انها تسعى باختيارها، وانما کانت حيلة.

(ابن کثير، ج۳، ص ۱۵۸)

۲--- يقال :انهم حشوها بما اذا وقعت الشمس عليه يضطرب و يتحرک. ولماکثرت واتصل بعضها ببعض، فمن رآها کان يظن انها تسعى.

(کبير، ج۶، ص۷۷)

۳--- و ذلک انهم کانو الطخوها بالزئبق، فلما ضربت عليها الشمس اضطربت و اهتزت، فخيل اليه انها تتحرک.

(ابوالسعود بهامش کبير، ج۶، ص۷۶ مدارک بهامش خازن، ج۳،ص ۳۴۳)

۴--- يقال :انهم طلوا تلک الحبال بالزئبق و جعلوا داخل تلک العصى زئبقا ايضا والقوها على الارض، فلما اثر حرالشمس فيها تحرک والتوى بعضها على بعض، حتى تخيل للناس انها حيات،

(روح المعانی، ج۹، ص ۲۵ --- خازن، ج۳، ص ۳۴۳)

دیگر متعدد مفسرین نے بھی یہی کچھ بیان کیا ہے---کسی نے سورہ اعراف کی آیت ۱۱۶ کے تحت اور کسی نے سورہ طٰہٰ کی آیت ۶۹ کے ذیل میں۔ درج بالا عبارات کا ماحصل وہی ہے جو ہم متن میں بیان کر چکے ہیں کہ ساحرانِ فرعون نے کوئی نظر بندی وغیرہ نہیں کی تھی؛ بلکہ اعلیٰ قسم کی شعبدے بازی کا مظاہرہ کیا تھا اور ایسی جادوگری دکھائی تھی کہ موسیٰ علیہ السلام سمیت سب کی آنکھوں نے وہی نظارہ دیکھا جو ان کو جادوگر دکھانا چاہتے تھے، یعنی وہ چیزیں جو درحقیقت طبعی عوامل سے حرکت کر رہی تھیں، ان کو بغیر کسی مادی سبب کے متحرک سمجھ لیا؛ البتہ علامہ وہب اور ان کے اتباع میں چند دوسرے مفسرین نے یہ رائے ☜

گویا یہ ویسا ہی کرتب تھا جیسا کہ آج کل MagicShow میں مختلف مظاہرے کئے جاتے ہیں جنہیں دیکھ کر ناظرین کبھی ہنس پڑتے ہیں، کبھی دہشت زدہ ہو جاتے ہیں اور کبھی حیرت سے دانتوں میں انگلیاں دبا لیتے ہیں۔ ایسے محیر العقول مظاہرے دیکھ کر آدمی کا حیران یا خوفزدہ ہو جانا فطرت انسانی کے عین مطابق ہے۔ اسی وجہ سے موسیٰ اپنے عصا کو سانپ بنتا دیکھ کر اس وقت بھی خوفزدہ ہو گئے تھے جب انہیں پہلی مرتبہ اللہ تعالیٰ نے یہ معجزہ عطا کیا تھا حالانکہ وہاں کوئی جادوگر سرے سے موجود ہی نہیں تھا۔

غرضیکہ غیر متوقع طور پر ایک خوفناک منظر کو دیکھ کر خوف میں مبتلا ہو جانا طبعی اور

ظاہر کی ہے کہ لاٹھیوں اور رسیوں میں کسی قسم کی حرکت پیدا نہیں ہوئی تھی؛ بلکہ موسیٰ علیہ السلام سمیت سب لوگوں کی آنکھوں پر جادو کا اثر ہو گیا تھا جس کی وجہ سے ان کو ساکن چیزیں متحرک نظر آنے لگی تھیں۔ اس رائے کی تردید کرتے ہوئے امام رازی رقمطراز ہیں۔

واما ماروی عن وھب: انھم سحر وااعین الناس و عین موسیٰ علیه السلام حتی تخیل ذلک، مستدلا بقوله تعالیٰ: فَلَمَّا اَلْقَوْ سَحَرُوْا اَعْيُنَ النَّاسِ، وبقوله تعالیٰ: يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى، فھذا غیر جائز، لان ھذا الوقت وقت اظھار المعجزة والادلة، وازالة الشبھة، فلو صار حیث لایمیز الموجود عن الخیال الفاسد، لم یتمکن من اظھار المعجزة، فحینئذ یفسد المقصود۔ (کبیر، ج ۶، ص ۷۷)

(اور وہ جو وہب سے مروی ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے فرمان ''سحروا اعین الناس'' اور ''یخیل الیه من سحرھم انھا تسعی'' سے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے کہ جادوگروں نے لوگوں اور موسیٰ علیہ السلام کی آنکھوں پر جادو کر دیا تھا اس لئے موسیٰ علیہ السلام نے لاٹھیوں اور رسیوں کو متحرک سمجھ لیا، تو یہ بات درست نہیں ہے کیونکہ وہ معجزہ ظاہر کرنے، دلائل پیش کرنے اور شبہات دور کرنے کا وقت تھا۔ اگر ان لمحات میں جادو کے اثر سے موسیٰ علیہ السلام کی یہ حالت ہو جاتی کہ حقیقتاً موجود چیز اور غلط تخیل میں امتیاز نہ کر سکتے تو معجزہ بھی نہ دکھا پاتے اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ اصل مقصد (یعنی غلبۂ حق) فوت ہو جاتا۔)

فطری امر ہے۔ اگر موسیٰ علیہ السلام نے جادوگروں کی لاٹھیوں اور رسیوں کو از خود متحرک سمجھ لیا تھا اور ان سے خوف محسوس کیا تھا تو یہ بلا شبہ ان جادوگروں کے کرتب کا کمال تھا، مگر اس کا اس جادو سے کیا تعلق ہے جس میں گفتگو ہو رہی ہے؟ یعنی گانٹھوں، پھونکوں، تاگوں، بالوں، دندانوں، مجسموں، سوئیوں اور جنتروں منتروں والا جادو جس کے اثر سے آدمی بیمار ہو جائے، اس کا کھانا پینا بند ہو جائے اور بدن گھلنے لگے---!!

کہاں ساحرانہ تکنیک سے تیار کردہ کسی خوفناک چیز کو دیکھ کر وقتی طور پر خوفزدہ ہو جانا، جو ایک فطری تقاضا ہے اور کہاں جادو کے اثر سے پورے ایک سال تک امراض و مصائب میں مبتلا رہنا، جو ایک غیر طبعی اور غیر فطری عمل ہے۔ ہم جس جادو کے اثرات کی جانِ دو عالم ﷺ اور دیگر انبیاء سے نفی کر رہے ہیں وہ یہی ماوراء الطبعیاتی جادو ہے۔ رہا پہلے والا طبعیاتی جادو تو انبیاء جس طرح دیگر طبعی عوامل سے اثر پذیر ہوتے ہیں، مثلاً بیمار ہونا، زخمی ہونا، پریشان ہونا، غمزدہ ہونا، اسی طرح جادو کے ذریعے متحرک کی گئی کسی چیز کو از خود متحرک سمجھ سکتے ہیں اور اگر وہ کوئی خوفناک شے ہو تو اس سے خوفزدہ بھی ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے اور انبیاء بھی کامل درجے کے انسان ہی ہوتے ہیں۔ لیکن اس نوعیت کے جادو سے متاثر ہونے والے انسان کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ مسحور یا جادو زدہ ہے۔ اگر ایسا ہو تو دنیا کے بیشتر افراد جادو کے مارے ہوئے قرار پائیں گے کیونکہ اکثر لوگ زندگی میں کبھی نہ کبھی اس طرح کے شعبدے دیکھ کر خوف یا حیرت سے دوچار ہو چکے ہوتے ہیں۔

۞۞۞

جس آیت میں واضح طور پر رسول اللہ ﷺ کے سحر زدہ ہونے کی نفی کی گئی ہے، یعنی وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلاً مَّسْحُوْرًا ۝

اس کا جواب دیتے ہوئے یہی فاضل رقمطراز ہیں

''رہا یہ اعتراض کہ یہ تو کفارِ مکہ کے اس الزام کی تصدیق ہوگئی کہ نبی ﷺ کو وہ سحر زدہ آدمی کہتے تھے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ کفار آپ کو سحر زدہ آدمی اس معنی میں نہیں کہتے تھے کہ آپ کسی جادو کے اثر سے بیمار ہو گئے ہیں بلکہ اس معنی میں کہتے تھے کہ کسی جادوگر نے

معاذ اللہ آپ کو پاگل کر دیا ہے اور اس پاگل پن میں آپ نبوت کا دعویٰ کر بیٹھے ہیں اور جنت دوزخ کے افسانے سنا رہے ہیں---''

اگر اس جواب کو صحیح مان لیا جائے تو رسول اللہ ﷺ کو ساحر (جادوگر) کہنا بھی جائز ہوگا کیونکہ انتہائی فصیح کلام پر بھی سحر کا اطلاق ہوتا ہے۔ جانِ دو عالم ﷺ نے فرمایا ''اِنَّ مِنَ الْبَیَانِ لَسِحْرًا'' (بعض بیان سحر ہوتے ہیں) اور افصح العرب ﷺ کی فصاحت و بلاغت شک وشبہے سے بالاتر ہے۔ اب اگر کوئی آپ کو ساحر کہنے لگے اور اسے کہا جائے کہ اللہ کے بندے! خدا سے ڈر اور ایسی جسارت نہ کر کیونکہ ساحر رسول اللہ ﷺ کو کفار کہا کرتے تھے وَقَالَ الْکٰفِرُوْنَ ھٰذَا سٰحِرٌ کَذَّابٌ ۝ تو وہ جواب دے کہ ''کفار آپ ﷺ کو ساحر اس معنی میں نہیں کہتے تھے کہ آپ بہت فصیح و بلیغ ہیں، بلکہ اس معنی میں کہتے تھے کہ معاذ اللہ آپ جادوگروں جیسے جنتر منتر کر کے لوگوں کو بہکا رہے ہیں اور خاندانوں میں پھوٹ ڈال رہے ہیں، جبکہ میں آپ کو ساحر، جادو بیان کے معنی میں کہتا ہوں کیونکہ نہایت فصیح اور مؤثر بیان کو خود آپ نے سحر کہا ہے اور تاریخ سے ثابت ہے کہ آپ عرب میں سب سے زیادہ فصیح و بلیغ اور پرتاثیر گفتگو کرنے والے تھے، پھر آپ کے جادوگر، بلکہ سب سے بڑے جادوگر ہونے میں کیا شک رہ جاتا ہے! اگر آپ مسحور کسی اور معنی میں ہوسکتے ہیں تو کسی اور معنی میں ساحر کیوں نہیں ہوسکتے---؟''

آپ ہی بتائیے قارئین کرام! کہ کیا اس استدلال کو درست تسلیم کیا جاسکتا ہے---؟ اس طرح تو آپ کو معاذ اللہ مجنون کہنا بھی صحیح ہوگا اور اگر کوئی اعتراض کرے تو کہا جاسکتا ہے کہ کفار آپ کو مجنون بمعنی پاگل کہتے تھے جبکہ میں آپ کو عشق الٰہی میں دیوانہ ہونے کی وجہ سے مجنون کہتا ہوں؛ بلکہ اس صورت میں آپ کو ''رَاعِنَا'' کہہ کر مخاطب کرنے کی ممانعت بھی بے سود ہو جاتی، کیونکہ صحابہ کرام آپ کو ''رَاعِنَا'' کہتے وقت وہ معنی مراد نہیں لیتے تھے جو منافقین کے ذہن میں ہوتا تھا۔

سیدھی سی بات ہے کہ جب ''رَاعِنَا'' کہنے سے اہل ایمان کو منع کر دیا گیا تو پھر کسی معنی میں بھی آپ کو ''رَاعِنَا'' سے مخاطب کرنا جائز نہیں رہا۔ اسی طرح جب آپ کو رجل

مسحور کہنا اللہ تعالیٰ نے ظالموں اور گمراہوں کا قول قرار دے دیا تو پھر کسی معنی میں بھی آپ کو مسحور کہنا ہمیشہ کے لئے ناجائز ہو گیا۔

اللہ بھلا کرے ایک مصری محقق سید قطب شہید کا، جنہوں نے اصول وقواعد اور شان رسالت و نبوت کو ملحوظ رکھتے ہوئے نہایت عمدہ گفتگو کی ہے اور روایات سحر کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے۔

وَلٰكِنْ هٰذِهِ الرِّوَايَاتُ،تُخَالِفُ اَصْلَ الْعِصْمَةِ النَّبَوِيَّةِ فِيْ الْفِعْلِ وَالتَّبْلِيْغِ، وَلَا تَسْتَقِيْمُ مَعَ الْاِعْتِقَادِ بِاَنَّ كُلَّ فِعْلٍ مِنْ اَفْعَالِهٖ ﷺ وَكُلَّ قَوْلٍ مِنْ اَقْوَالِهٖ سُنَّةٌ وَ شَرِيْعَةٌ، كَمَا اَنَّهَا تَصْطَدِمُ بِنَفْيِ الْقُرْآنِ مِنَ الرَّسُوْلِ ﷺ اَنَّه' مَسْحُوْرٌ وَتَكْذِيْبِ الْمُشْرِكِيْنَ فِيْمَا كَانُوْا يَدْعُوْنَه' مِنَ الْاِفْكِ. وَمِنْ ثَمَّ نَسْتَبْعِدُ هٰذِهِ الرِّوَايَات. وَاَحَادِيْثُ الْآحَادِ لَا يُؤْخَذُ بِهَا فِيْ اَمْرِ الْعَقِيْدَة. وَالْمَرْجِعُ هُوَ الْقُرْآن.وَالتَّوَاتُرُ شَرْطٌ لِلْاَخْذِ بِالْاَحَادِيْثِ فِيْ اُصُوْلِ الْاِعْتِقَاد. وَهٰذِهِ الرِّوَايَاتُ لَيْسَتْ مِنَ الْمُتَوَاتِرِ --- فَضْلاً عَلٰى اَنَّ نُزُوْلَ هَاتَيْنِ السُّوْرَتَيْنِ فِيْ مَكَّةَ هُوَالرَّاجِحُ، مِمَّا يُوْهِنُ اَسَاسَ الرِّوَايَاتِ الْاُخْرٰى.''(۱)

(لیکن یہ تمام روایات اس اصل کے خلاف ہیں کہ نبی ﷺ اپنے ہر کام اور تبلیغ میں معصوم ہیں اور اس عقیدے کے ساتھ بھی مطابقت نہیں رکھتیں کہ آپ کے افعال میں سے ہر فعل اور اقوال میں سے ہر قول سنت اور شریعت ہے۔ نیز قرآن نے جو آپ کے مسحور ہونے کی نفی کی ہے اور کفار کے اس بہتان کی تکذیب کی ہے، یہ روایات اس سے بھی متصادم ہیں۔ اسی وجہ سے ہم ان کو صحت سے دور سمجھتے ہیں۔ (اگر بالفرض صحیح بھی ہوں تو زیادہ سے زیادہ یہ اخبار آحاد ہیں) اور عقیدے کے معاملے میں اخبار آحاد سے استدلال نہیں کیا جا سکتا بلکہ قرآن کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ احادیث کو بنیادی عقائد کے لئے دلیل اسی

(۱) فی ظلال القرآن، ج۸، ص ۷۱۰.

صورت میں بنایا جا سکتا ہے جب وہ متواتر ہوں اور یہ روایتیں متواتر نہیں ہیں۔ مزید یہ کہ ترجیحی اور قوی بات یہی ہے کہ یہ سورتیں مکہ میں نازل ہوئی تھیں۔ اس صورت میں ان دوسری روایات کی بنیاد ہی کمزور پڑ جاتی ہے۔ (جن میں یہ ذکر ہے کہ یہ سورتیں جادو کی گانٹھیں کھولنے کیلئے نازل ہوئی تھیں۔)

سید قطب کی تحقیق کا ماحصل یہ ہے کہ روایات سحر چار وجہوں سے مردود ہیں۔

(۱)---یہ روایات اس بنیادی عقیدے کے خلاف ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنے فعل اور تبلیغ میں معصوم ہیں اور آپ کا ہر فعل اور قول شریعت اور سنت ہے۔

(۲)---اس آیت قرآنیہ سے معارض ہیں جس میں رسول اللہ ﷺ کو مسحور کہنا ظالموں کا قول قرار دیا گیا ہے۔

(۳)---یہ اخبار آحاد ہیں اور رسول اللہ ﷺ کا جادو سے متاثر ہو سکنا یا نہ ہو سکنا، عقیدے کا مسئلہ ہے اور عقائد میں اخبار آحاد کار آمد نہیں ہوتیں۔

(۴)---ترجیحی قول کے مطابق ان سورتوں کا نزول مکہ میں ہوا تھا اس لئے جادو کی گانٹھیں کھولنے کیلئے ان کا نازل ہونا بنیادی طور پر کمزور بات ہے۔

ان وجوہ میں سے نمبر ۲ اور نمبر ۴ کی وضاحت سابقہ صفحات میں بخوبی ہو چکی ہے۔ نمبر ۱، اور نمبر ۳ میں بھی اہل علم کے لئے تو کوئی الجھن نہیں ہے، البتہ عام قاری شاید فی الحال ان کا مفہوم پوری طرح نہ سمجھ سکے مگر آئندہ صفحات میں جب ہم ان روایتوں پر عقل و نقل کی روشنی میں گفتگو کریں گے تو یہ دونوں باتیں بھی انشاءاللہ واضح ہو جائیں گی۔

جو لوگ روایات سحر کو من و عن صحیح سمجھتے ھیں قرآن کریم کے لحاظ سے ان کے نظریات کا اجمالی جائزہ مکمل ھؤا۔

❁❁❁

آج کل اہل علم کا ایک گروہ جس میں اہل حدیث حضرات پیش پیش ہیں یہ نظریہ لے کر اٹھا ہے کہ بخاری و مسلم کی روایات سحر کے علاوہ باقی تمام روایتیں سند کے اعتبار سے ضعیف اور کمزور ہیں اس لئے ہم ان کو نہیں مانتے، البتہ بخاری و مسلم کی روایات کا صحیح ہونا

شک وشبہے سے بالاتر ہے اس لئے ان کو بہر حال تسلیم کرنا پڑے گا۔

اور ان میں

نہ تو رسول اللہ ﷺ کی نظروں میں التباس کا ذکر ہے

نہ کھانا پینا بند ہونے کا

نہ بدن گھلنے کا

نہ زلفیں جھڑنے کا

نہ صحابہ کرام کا آپ کی عیادت کرنے کا

نہ آخری سورتیں نازل ہونے کا

اس لئے یہ سب باتیں غلط ہیں۔ اصل واقعہ اتنا ہی ہے جتنا صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں مذکور ہے اور ہم اسی کو درست مانتے ہیں۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ جن روایتوں میں جادو کے مندرجہ بالا اثرات مذکور ہیں، وہ سب ضعیف اور کمزور ہیں تو اس میں کوئی شبہ نہیں۔ اسی طرح جادو کی گرہیں کھولنے کے موقع پر آخری سورتوں کا نازل ہونا بھی کلبی کا خود ساختہ قصہ ہے۔ البتہ یہ خیال درست نہیں کہ صحیح بخاری کی روایات سحر ہر قسم کے شک وشبہے سے بالاتر ہیں، کیونکہ گذشتہ صفحات میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ ان میں بیان کئے گئے دو اثرات، یعنی حافظے میں کمی اور مردانہ طاقت کا روبعمل نہ ہونا اگر درست تسلیم کر لئے جائیں تو آپ ﷺ کی معجزانہ قوتوں کا تعطل لازم آتا ہے حالانکہ معجزے کے مقابلے میں جادو کامیاب ہو ہی نہیں سکتا جیسا کہ اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ سَاحِرٍ وَّلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ اَتٰی ○ سے واضح ہے۔ نیز دیگر روایات کی طرح یہ روایتیں بھی اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ○ کے منافی ہیں اس لئے قابل تسلیم نہیں ہیں۔ تاہم ان آیات کی اگر کوئی اور توجیہہ وتاویل کر لی جائے اور روایات کو صحیح ماننے پر اصرار کیا جائے تو ہم بصد ادب عرض کریں گے کہ ایسا نہیں ہے، بلکہ ان کی صحت خاصی مشتبہ ہے۔ ان کے متن میں تضادات کی بھرمار ہے اور ان میں جس روایت کو بلحاظ سند سب سے زیادہ قوی تسلیم کیا گیا ہے، اس کی سند درحقیقت سخت مجروح اور ناقابل اعتبار

ہے۔تو آیئے پہلے ایک روایت سند، متن اور ترجمے کے ساتھ ملاحظہ فرمایئے ،اس کے بعد مزید گفتگو ہوگی۔

حَدَّثَنَا عُبَيْدُ ابْنُ اِسْمَاعِيْلَ، قَالَ :حَدَّثَنَا اَبُوْ اُسَامَةَ، حَدَّثَنَا هِشَامٌ، عَنْ اَبِيْهِ عَنْ عَائِشَةَ رَضِىَ اللّٰهُ تَعَالىٰ عَنْهَا قَالَتْ:سُحِرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ حَتّٰى اِنَّه' لَيُخَيَّلُ اِلَيْهِ اَنَّه' فَعَلَ الشَّيْءَ وَمَا فَعَلَه'، حَتّٰى اِذَا كَانَ ذَاتَ يَوْمٍ، وَهُوَ عِنْدِىْ، دَعَا اللّٰهَ وَدَعَاهُ، ثُمَّ قَالَ :اَشَعَرْتِ يَا عَائِشَةُ! اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَفْتَانِىْ فِيْمَا اسْتَفْتَيْتُه' فِيْهِ؟ قُلْتُ:وَمَا ذَاكَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ!؟ قَالَ:جَاءَ نِىْ رَجُلَانِ فَجَلَسَ اَحَدُهُمَا عِنْدَ رَأْسِىْ وَالْاٰخَرُ عِنْدَ رِجْلَىَّ، ثُمَّ قَالَ اَحَدُهُمَا لِصَاحِبِهٖ:مَاوَجْعُ الرَّجُلِ؟قَالَ :مَطْبُوْبٌ. قَالَ: وَمَنْ طَبَّه'؟ قَالَ:لَبِيْدُ ابْنُ الْاَعْصَمِ الْيَهُوْدِىُّ مِنْ بَنِىْ زُرَيْقٍ. قَالَ:فِيْمَاذَا؟ قَالَ :فِىْ مُشْطٍ وَ مُشَاطَةٍ وَجُفِّ طَلْعَةٍ ذَكَرٍ. قَالَ :فَاَيْنَ هُوَ؟ قَالَ:فِىْ بِئْرِ ذِىْ اَرْوَانَ. فَذَهَبَ النَّبِىُّ ﷺ فِىْ اُنَاسٍ مِنْ اَصْحَابِهٖ اِلىٰ الْبِئْرِ فَنظَرَ اِلَيْهَا، وَعَلَيْهَا نَخْلٌ، ثُمَّ رَجَعَ اِلىٰ عَائِشَةَ فَقَالَ:وَاللّٰهِ لَكَاَنَّ مَاءَ هَا نُقَاعَةُ الْحِنَّاءِ وَ لَكَاَنَّ نَخْلَهَا رُؤُوْسُ الشَّيَاطِيْنِ. قَالَتْ قُلْتُ:يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اَفَاَخْرَجْتَه'؟ قَالَ:لَا، اَمَّا اَنَا فَقَدْ عَافَانِىَ اللّٰهُ وَشَفَانِىْ، وَخَشِيْتُ اَنْ اُثَوِّرَ عَلَى النَّاسِ مِنْهُ شَرًّا، وَاَمَرَ بِهَا فَدُفِنَتْ. (۱)

(حدیث بیان کی ہم سے عبید ابن اسماعیل نے ابواسامہ سے،اس نے ہشام سے، ان نے اپنے باپ سے،اس نے عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے

عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ پر جادو کیا گیا ، یہاں تک کہ آپ کو خیال آتا تھا کہ آپ نے یہ کام کرلیا ہے حالانکہ نہیں کیا ہوتا تھا۔آخر ایک دن آپ نے بار بار دعا کی۔پھر فرمانے لگے---''عائشہ! کیا تجھے پتہ ہے کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے جس سلسلے میں جواب چاہا تھا، وہ مجھے مل گیا ہے؟'' میں نے کہا---''وہ کس طرح یا رسول اللہ!؟'' فرمایا---''میرے پاس دو مرد آئے ،ان میں سے ایک میرے سر کی طرف بیٹھ گیا

(۱) صحیح البخاری، مطبوعہ اصح المطالع، ج ۲، کتاب الطب، باب السحر، ص ۸۵۸.

اور دوسرا میرے پاؤں والی جانب۔ پھر ایک نے دوسرے سے کہا---"اس عظیم انسان کو کیا دکھ ہے؟" دوسرے نے کہا---"ان پر جادو کیا گیا ہے" پہلے نے کہا---"کس نے کیا ہے؟" دوسرے نے کہا---"لبید ابن اعصم یہودی نے، جو بنی زریق سے ہے۔" پہلے نے کہا---"کس چیز میں جادو کیا ہے؟" دوسرے نے کہا---"کنگھی میں اور کنگھی سے نکلنے والے بالوں میں اور نر کھجور کے خوشے کے غلاف میں۔" پہلے نے کہا---"اب وہ کہاں ہے؟" دوسرے نے کہا---"ذی اروان نامی کنویں میں۔"

چنانچہ نبی ﷺ اپنے اصحاب میں سے چند افراد کے ساتھ اس کنویں پر گئے اور اس کو دیکھا۔ اس پر کھجوروں کے درخت تھے۔ پھر عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس واپس آئے اور فرمایا---"اللہ کی قسم! اس کا پانی ایسا ہے جیسے اس میں مہندی ڈبوئی گئی ہو اور اس کے اوپر کھجوروں کے درخت یوں دکھائی دیتے ہیں جیسے شیطانوں کے سر ہوں۔"

عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے کہا---"کیا آپ نے اس کو (سامان جادو کو) نکالا ہے؟"

فرمایا---"نہیں، کیونکہ مجھے اللہ تعالیٰ نے شفا اور عافیت نصیب فرما دی ہے اور مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں میں اس وجہ سے لوگوں میں جھگڑا پھیلانے کا سبب نہ بن جاؤں۔" پھر آپ کے حکم سے کنواں پاٹ دیا گیا۔)

امام بخاری نے اس روایت کو اپنی کتاب میں چھ مقامات پر ذکر کیا ہے۔ ایک مقام پر اختصار سے اور پانچ جگہ تفصیل سے۔

(۱) ج ۲، کتاب الطب، باب السحر / ۲، ص ۸۵۸.

(۲) ج ۲، کتاب الجهاد، باب یعفی عن الذمی اذاسحر، ص ۴۵۰ مختصراً

(۳) ج ۱، کتاب الدعوات، باب تکریر الدعاء، ص ۹۴۵.

(۴) ج ۲، کتاب الطب، باب هل یستخرج السحر؟، ص ۸۵۸.

(۵) ج ۱، کتاب بدء الخلق، باب صفة ابلیس و جنوده، ص ۴۶۲.

(۶) ج ۲، کتاب الطب، باب السحر / ۱ ص ۸۵۷.

متن میں جس روایت کا حوالہ دیا گیا ہے وہ نمبر (۱) والی حدیث ہے۔ آئندہ گفتگو میں ہم بغرض اختصار ان روایات کا ذکر مندرجہ بالا نمبروں کے حوالے سے کریں گے۔

ان روایتوں میں دو جگہوں پر شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک جادو کے اثرات بیان کرنے میں، دوسرے سامان جادو کنویں سے نکالنے کے سلسلے میں۔

جادو کے اثرات میں تعارض

روایات نمبر ۱، ۲، ۳، میں اثبات اور نفی دونوں ماضی کے معنی رکھتے ہیں۔ یعنی فَعَلَ الشَّیْئَ وَمَا فَعَلَه' --- صَنَعَ شَیْأً وَلَمْ یَصْنَعْ --- قَدْ صَنَعَ الشَّیْئَ وَمَا صَنَعَه'. تینوں کا مفہوم یہ ہے کہ آپ ﷺ خیال کرتے تھے کہ یہ کام کر چکے ہیں حالانکہ نہیں کیا ہوتا تھا۔

اس صورت میں جادو کا اثر آپ کے حافظے پر ہوگا، یعنی آپ کو یاد نہیں رہتا تھا کہ یہ کام نہیں کیا ہے؛ بلکہ اس کو کیا ہوا خیال کرتے تھے۔

روایات نمبر ۴، اور ۵ میں اثبات و نفی دونوں بصیغۂ مضارع مذکور ہیں لیکن نمبر ۴ میں صرف عورتوں والے مسئلے کا ذکر ہے؛ جبکہ نمبر ۵ عام کاموں کے بارے میں ہے۔

نمبر ۴ کے الفاظ یہ ہیں --- یَأْتِیُ النِّسَاءَ وَلَا یَاتِیْهِنَّ. (آپ خیال کرتے تھے) کہ عورتوں کے پاس آ سکتے ہیں مگر نہیں آ سکتے تھے۔

نمبر ۵ کی عبارت یوں ہے --- یَفْعَلُ الشَّیْئَ وَمَا یَفْعَلُه'. (آپ ﷺ خیال کرتے تھے کہ یہ کام کر سکتے ہیں مگر نہیں کر سکتے تھے۔)

ان دونوں صورتوں میں جادو کا اثر آپ کی قوت کار پر ہوگا۔ یعنی آپ کی کارکردگی کی طاقت کمزور پڑ گئی تھی مگر نمبر ۴ کے مطابق کارکردگی کا یہ ضعف عورتوں والے معاملے کے ساتھ مخصوص تھا، یعنی آپ کی مخصوص قوت بوقت ضرورت روبعمل نہیں ہوتی تھی جبکہ نمبر ۵ کا مفہوم یہ ہے کہ ہر کام میں یہی صورت حال ہوتی تھی۔

نمبر ۶ میں راوی نے اثبات میں مضارع کا صیغہ استعمال کیا ہے اور نفی میں ماضی کا --- یَفْعَلُ الشَّیْئَ وَمَا فَعَلَه'. جس کا ترجمہ کچھ اس طرح ہوگا کہ آپ خیال کرتے

تھے کہ یہ کام کر سکتے ہیں حالانکہ نہیں کیا ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک بے معنی بات ہے۔ اس کو بامعنی بنانے کے لئے یا تو مضارع کو ماضی کے معنی میں کرنا پڑے گا یا ماضی کو مضارع کے معنی میں۔ پہلی صورت میں یہ عبارت، نمبر ۱، نمبر ۲، نمبر ۳، کے ہم معنی ہو جائے گی اور دوسری صورت میں نمبر ۵ کے ہم معنی ہوگی۔

بہرحال مجموعی طور پر ان روایات سے جادو کے تین اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔

(۱)--- حافظے پر اثر (۲)--- مخصوص قوت کا روبکار نہ ہونا (۳)--- عام کارکردگی میں کمی۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ ساری باتیں ہوئی تھیں یا ان میں سے کوئی ایک واقع ہوئی تھی؟ ساری باتیں ہونا اس لئے ناقابل فہم ہے کہ واقعہ ایک ہی ہے اور روایت بھی بنیادی طور پر ایک ہی ہے کیونکہ ان تمام روایتوں کے پہلے تین راوی مشترک ہیں۔ یعنی عائشہؓ سے ان کے بھانجے عروہ روایت کرتے ہیں اور عروہ سے ان کے بیٹے ہشام۔ آگے ہشام کے بہت سے شاگرد ہیں اس لئے یہ روایتیں متعدد نظر آتی ہیں۔ اب یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک ہی واقعہ میں ایک ہی راوی، یعنی ہشام کسی شاگرد کو ایک بات بتائیں، کسی کو دوسری اور کسی کو تیسری!

اگر عائشہؓ نے یہ تینوں اثرات بیان کئے تھے تو ہشام کو بھی ہر روایت میں تینوں کا ذکر کرنا چاہئے تھا اور اگر عائشہؓ نے ان میں سے کسی ایک کا ذکر کیا تھا تو ہشام کو بھی اسی پر انحصار کرنا چاہئے تھا۔ یا کم از کم کسی ایک روایت میں تینوں کا ذکر کر دینا چاہئے تھا۔ اس کے بعد اگر باقی روایتوں میں کوئی ایک ہی اثر بیان کرتے تو کہا جا سکتا تھا کہ یہاں ہشام نے اختصار ملحوظ رکھا ہے۔ مگر تینوں کو یکجا ذکر کرنا تو کجا، انہوں نے دو اثرات بھی کسی روایت میں ایک جگہ بیان نہیں کئے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ عائشہؓ نے ان میں سے کوئی ایک اثر ہی بیان کیا تھا، آگے ہشام کبھی اس کو ماضی سے تعبیر کر دیتے ہیں، کبھی مضارع سے۔ کہیں اس کو عام کر دیتے ہیں اور کہیں عورتوں والے معاملے کے ساتھ مخصوص۔ ہشام کو بڑھاپے میں نسیان ہو گیا تھا۔ اگرچہ علامہ ذہبی کے بقول اتنا زیادہ نہیں ہوا تھا کہ ان کو تغیر اور

اختلاط (۱) کا مریض سمجھا جائے، تاہم کچھ نہ کچھ فرق ضرور پڑ گیا تھا۔ ابوالحسن ابن قطان تو ان کو اختلاط و تغیر میں مبتلا قرار دیتے ہیں مگر علامہ ذہبی ان کا بھرپور دفاع کرتے ہوئے لکھتے ہیں

اَحَدُ الْاَعْلَامِ، حُجَّةٌ اِمَامٌ، لٰكِنْ فِیْ الْكِبَرِ تَنَاقَصَ حِفْظُه، وَلَمْ يَخْتَلِطْ اَبَدًا، وَلَا عِبْرَةَ بِمَا قَالَه اَبُوالْحَسَنِ ابْنُ الْقَطَّانِ مِنْ: اَنَّه هُوَ وَ سُهَيْلُ ابْنُ اَبِیْ صَالِحٍ اِخْتَلَطَا. وَ تَغَيَّرَ اَلرَّجُلُ تَغَيَّرًا قَلِيْلاً وَلَمْ يَبْقَ حِفْظُه كَهُوَ فِیْ حَالِ الشَّبَابِ، فَنَسِیَ بَعْضَ مَحْفُوْظِهٖ اَوْ وَهَمَ، فَكَانَ مَاذَا---! اَهُوَ مَعْصُوْمٌ عَنِ النِّسْيَانِ؟ (۲)

(بڑے علماء میں سے ایک ہیں، حجت اور امام ہیں لیکن بڑھاپے میں ان کا حافظہ کم ہو گیا تھا، تاہم اختلاط میں کبھی مبتلا نہیں ہوئے اور ابوالحسن ابن القطان کی اس بات کا کوئی اعتبار نہیں ہے کہ ہشام اور سہیل ابن ابی صالح دونوں کو اختلاط ہو گیا تھا؛ البتہ یہ ضرور ہے کہ ہشام میں تھوڑی سی تبدیلی آ گئی تھی اور ان کا حافظہ ویسا نہیں رہا تھا جیسا کہ جوانی میں ہوا کرتا تھا، اس لئے اپنی یادداشت میں محفوظ بعض چیزوں کو بھول جاتے تھے یا ان کو وہم ہو جاتا تھا، مگر اس سے کیا ہوتا ہے، کیا وہ نسیان سے معصوم تھے!؟)

ہمارا مقصد بھی ان کو اختلاط کا مریض ثابت کرنا نہیں، ہم صرف یہ کہتے ہیں کہ آخر عمر میں ان کو تھوڑا بہت نسیان اور وہم ہو گیا تھا۔ ہو سکتا ہے انہوں نے اپنے والد سے حضرت عائشہؓ کے جو الفاظ سنے ہوں وہ بھول گئے ہوں، اس لئے کبھی ماضی، کبھی مضارع، کبھی خاص اور کبھی عام لفظوں سے تعبیر کر دیتے ہوں۔ (۳)

---

(۱) اگر نسیان اتنا بڑھ جائے کہ روایات میں غلطیاں اور درستیاں مساوی ہو جائیں یا درستیوں سے غلطیاں زیادہ ہو جائیں تو محدثین کی اصطلاح میں اس کو اختلاط کہتے ہیں اور جس راوی میں یہ خامی پائی جاتی ہے اس کو 'مُخْتَلَطْ' کہا جاتا ہے۔ (۲) میزان الاعتدال ج ۳، ص ۲۵۵۔ (۳) یہ امکانات واحتمالات اس صورت میں ہیں جب یہ فرض کرلیا جائے کہ جادو کے یہ اثرات عائشہ رضی اللہ عنہا نے عروہ ☜

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ خود کوئی ایک ہی اثر بیان کرتے ہوں، آگے شاگردوں نے تعبیرات مختلف کردی ہوں۔ بہرحال یہ کام خود ہشام نے کیا ہو یا ان کے تلامذہ نے، اب یہ جاننے کی کوئی صورت نہیں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے اصل الفاظ کیا تھے اور رسول اللہ ﷺ پر سحر کا درحقیقت کیا اثر مرتب ہوا تھا---! حافظہ متاثر ہوا تھا، مخصوص قوت میں فرق واضح ہوا تھا، عمومی کارکردگی پر اثر پڑا تھا، یا یہ ساری باتیں ہوگئی تھیں؟

اگر کہا جائے کہ عربی میں ماضی اور مضارع ایک دوسرے کے معنی میں آتے رہتے ہیں اس لئے کسی ایک کو دوسرے کے معنی میں کرکے یہ اختلاف دور کیا جاسکتا ہے، تو جواباً عرض ہے کہ بے شک ایسا ہوسکتا ہے مگر اس کے لئے کسی قرینے کا ہونا ضروری ہے، جبکہ یہاں ایسا کوئی قرینہ نہیں ہے جس کی بنا پر ہم فیصلہ کرسکیں کہ ماضی کو مضارع کے معنی میں کرنا ہے یا مضارع کو ماضی کے معنی میں۔ ایسی صورت میں ہم جو طریقہ بھی اختیار کریں گے وہ ظن وگمان پر مبنی ہوگا اور گمان پر حقائق کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی۔ تاہم بعض علماء نے محض اپنے تخیل کے سہارے ایسی کوششیں کی ضرور ہیں۔ مثلاً ایک گروہ نے عورتوں والے معاملے سمیت سب عبارات کو ماضی کے معنی میں لیا ہے۔ ان کے نزدیک یَفْعَلُ الشَّیْئَ وَمَا یَفْعَلُه' بھی ماضی کے معنی میں ہوگا، یعنی آپ خیال کرتے تھے کہ یہ کام کرچکے ہیں حالانکہ نہیں کیا ہوتا تھا اور یَأْتِیْ النِّسَاءَ وَلَا یَأْتِیْهِنَّ کا مفہوم بھی یہ ہوگا کہ آپ خیال کرتے تھے کہ بیویوں کے پاس ہو آئے ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہوتا تھا۔ مودودی صاحب نے بھی ماضی والے ترجمے کو ترجیح دی ہے اور لکھا ہے۔

''کسی کام کے متعلق خیال فرماتے تھے کہ وہ کرلیا ہے مگر نہیں کیا ہوتا تھا، اپنی ازواج کے متعلق خیال فرماتے تھے کہ آپ ان کے پاس گئے ہیں مگر نہیں گئے ہوتے تھے۔'' (۱)

یَفْعَلُ کو فَعَلَ اور یَاتِی کو اَتٰی کے معنی میں لے جانے کے لئے اگرچہ کوئی دلیل یا

کو اور عروہ نے ہشام کو بتائے ہیں، حالانکہ یہی بات مشتبہ ہے مگر اس کی وضاحت کے لئے آپ کو کچھ انتظار کرنا پڑے گا۔ (۱) تفہیم القرآن، ج ۶، تفسیر سورۂ فلق، ناس۔

قرینہ موجود نہیں ہے، تاہم اس کا یہ فائدہ ضرور ہے کہ اس طرح روایات سے اختلاف رفع ہو جاتا ہے اور تمام روایتوں کا مفہوم ایک ہی ہو جاتا ہے کہ بیویوں کے پاس جانے سمیت ہر معاملے میں آپ کا حافظہ متاثر ہو گیا تھا اور آپ نے جو کام نہیں کیا ہوتا تھا اس کے بارے میں یہ سمجھتے رہتے تھے کہ میں یہ کام کر چکا ہوں۔

لیکن

اس صورت میں نہ تو آپ کی تبلیغ کا مکمل ہونا یقینی رہتا ہے، نہ آپ کے ہر قول و فعل کو شریعت اور اسوہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ حافظے کی خرابی دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ آدمی کوئی کام کر چکا ہو اور سمجھتا رہے کہ میں نے یہ کام نہیں کیا، مثلاً نماز پڑھ چکا ہو اور یہ سمجھے کہ نہیں پڑھی ہے۔ اس طرح کی خرابی دینی اعتبار سے کوئی بڑا نقصان نہیں پہنچاتی، زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ نماز دوبارہ پڑھ لے گا۔ دوسری قسم یہ ہے کہ کوئی کام نہ کیا ہو اور سمجھے کہ کر چکا ہوں، مثلاً نماز نہ پڑھی ہو اور خیال کرے کہ پڑھ چکا ہوں۔ اس صورت میں اس کو گناہ تو کوئی نہیں ہوگا کیونکہ نسیان معاف ہے مگر نماز بہر حال رہ جائیگی۔

روایات سحر میں رسول اللہ ﷺ کے لئے جو نسیان ثابت کیا جا رہا ہے وہ دوسرے قسم کا ہے۔ یعنی آپ نے ایک کام نہیں کیا ہوتا تھا اور یہ خیال کرتے تھے کہ کر چکا ہوں۔ اب آپ خود ہی سوچئے کہ یہ بات کتنے ہولناک امکانات کو جنم دیتی ہے---! مثلاً ہو سکتا ہے کہ آپ پر کوئی وحی نازل ہو اور آپ یہ سمجھتے رہیں کہ لوگوں تک اس کو پہنچا چکا ہوں حالانکہ نہ پہنچائی ہو---! نہ جانے مسحوریت کے طویل دور میں کتنی دفعہ وحی اتری ہو اور آپ نے لوگوں تک نہ پہنچائی ہو اور سحر کی وجہ سے یہی سمجھتے رہے ہوں کہ میں پہنچا چکا ہوں---! معاذ اللہ ثم معاذ اللہ!!

اس کے جواب میں یہ کہنا کہ جادو کا اثر صرف آپ کی ذات پر ہوا تھا، نبوت سے متعلقہ معاملات اس سے محفوظ رہے تھے، خوش عقیدگی کی حد تک تو درست ہے لیکن اگر کوئی غیر مسلم ہم سے سوال کرے کہ تمہارے پیغمبر تو کچھ عرصہ تک جادو کے زیر اثر رہے تھے جس کی

وجہ سے نہ کئے ہوئے کام کو کیا ہوا خیال کرتے تھے، پھر تم لوگ کس بنا پر دعویٰ کرتے ہو کہ تمہاری کتاب کامل و مکمل ہے؟ ہوسکتا ہے کہ مسحوریت کے زمانے میں جو وحی تمہارے پیغمبر پر اتری ہو وہ انہوں نے لوگوں کے سامنے بیان ہی نہ کی ہو اور یہ سمجھتے رہے ہوں کہ میں بیان کر چکا ہوں ---تو بتایئے اس کا کیا جواب ہوگا؟ محض یہ کہہ دینے سے کہ توبہ توبہ یہ کیسے ہوسکتا ہے، یا ایسا ہرگز نہیں ہوا تھا، تو مسئلہ حل نہیں ہوسکتا، جب تک یہ ثابت نہ کر دیا جائے کہ ایسا ہونا ممکن ہی نہیں، اور ان روایات کو درست مان کر یہ ثابت کرنا نہ صرف مشکل بلکہ قطعی محال ہے۔

مختلف روایات میں تطبیق دینا اچھی بات ہے لیکن اس شوق میں اگر آدمی اپنے دین کی بنیاد ہی کو مشکوک کر بیٹھے تو اس کو عقلمندی ہرگز نہیں کہا جا سکتا---!

محدثین نے اس الجھن سے نکلنے کی متعدد کوششیں کی ہیں اور کئی طرح کی توجیہیں اور تاویلیں بیان کی ہیں مگر کوئی بھی قابل اطمینان حل پیش نہیں کر سکے، اس لئے علامہ قاضی عیاض نے ان سے ہلکا گریز کرتے ہوئے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ آپ ﷺ کے حافظے اور دماغ پر جادو کا کوئی اثر نہیں پڑا تھا بلکہ صرف جسم متاثر ہوا تھا، جس طرح دوسری روایت میں آیا ہے کہ آپ کی نظر میں التباس پیدا ہو گیا تھا۔

قاضی صاحب کی توجیہات کے مطابق مضارع اور ماضی دونوں اپنے اپنے معنی میں رہتے ہیں، البتہ یَفْعَلُ کو یَأْتِیُ النِّسَاءَ کے ساتھ خاص کرنا پڑتا ہے۔یعنی---''آپ خیال کرتے تھے کہ یہ کام کر سکتے ہیں مگر نہیں کر سکتے تھے''---میں ''کام'' سے مراد عورتوں کے پاس جانا ہے اور دونوں عبارتوں کا مفہوم یہ ہے کہ آپ خواہش کے باوجود بیویوں کے پاس جانے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔ اس کی مزید وضاحت کرنے کے لئے قاضی صاحب اور ان کے شارحین نے جو تفصیلات بیان کی ہیں، ان کو پڑھئے اور سر دھنئے!

(ویکون معنی قوله:انه یاتی اهله ولا یاتیهن، ای یظهر له من نشاطه) --- فی الاساس:رجل نشیط، طیب النفس للعمل (ومتقدم عادته) ای ما اعتاده ﷺ قبل السحر (القدرة علی النساء) --- ای قدرته و قوته علی جماعهن (فاذادنی منهن) ای قرب منهن لیجا معهن

(اصابته اخذة السحر) --- وهی امر یتخذه السحرة یحبس المرء عن انتشار آلة الجماع ---(فلم یقدر علی اتیانهن ---الخ (۱)

اس عبارت کا ترجمہ کرنے سے حیا مانع ہے۔ نہ جانے اتنے بڑے بڑے محدثین کس طرح جانِ دو عالم ﷺ کی زندگی کے انتہائی خفیہ گوشوں اور خالص پرائیوٹ معاملات کو سرِ عام زیرِ بحث لے آئے ---اور وہ بھی ایسی فاش تشریحات اور واشگاف تعبیرات کے ساتھ کہ **الامان والحفیظ!!!**

بہرحال مضارع والے صیغوں کو تو قاضی صاحب نے مندرجہ بالا طریقے سے جسمانی تکلیف پر حمل کر دیا ہے مگر ماضی والے صیغوں کی الجھن پھر بھی باقی رہ گئی کیونکہ ان میں تو واضح طور پر آپ ﷺ کا حافظہ متاثر ہونے کا ذکر ہے۔ یعنی ---''خیال کرتے تھے کہ یہ کام کیا ہے حالانکہ نہیں کیا ہوتا تھا۔''اس کا جواب قاضی صاحب نے یہ دیا ہے کہ حافظے پر اثر والی روایات کو التباس نظر والی روایت پر منطبق کیا جائے گا اور فعل سے عام فعل نہیں، بلکہ فعل رؤیت مراد ہوگا۔ قاضی صاحب لکھتے ہیں۔

وَیَکُوْنُ قَوْلُ عَائِشَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالیٰ عَنْهَا فِیْ الرِّوَایَةِ الْاُخْریٰ: اِنَّه' یُخَیَّلُ اِلَیْهِ اَنَّه' فَعَلَ الشَّیْئَی وَمَا فَعَلَه'، مِنْ بَابِ مَا اخْتَلَّ مِنْ بَصَرِہٖ، فَیَظُنُّ اَنَّه' رَاٰی شَخْصًا مِّنْ اَزْوَاجِہٖ اَوْ شَاهَدَ فِعْلًا مِّنْ غَیْرِہٖ، وَلَمْ یَکُنْ عَلٰی مَایُخَیَّلُ اِلَیْهِ، لِمَا اَصَابَه' فِیْ بَصَرِہٖ وَضُعْفِ نَظَرِہٖ، لَالِشَیْئِی طَرُءَ عَلَیْهِ فِیْ مَیْزِہٖ.

(اور دوسری روایت میں عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا یہ کہنا کہ آپ خیال کرتے تھے کہ یہ کام کیا ہے حالانکہ نہیں کیا ہوتا تھا، اس قسم سے ہوگا جو آپ کی بصارت میں خلل سے تعلق رکھتی ہے۔ یعنی آپ گمان کرتے تھے کہ اپنی کسی بیوی کو دیکھا ہے یا کسی اور کو کوئی کام کرتے دیکھا ہے، حالانکہ ہوتا اس طرح نہیں تھا جیسے آپ خیال کرتے تھے اور یہ اس لئے ہوتا تھا کہ آپ کی بصارت متاثر ہوگئی تھی اور نظر کمزور پڑ گئی تھی، نہ اس وجہ سے کہ آپ کی

(۱) شرح شفاء للخفاجی، ج ۴، ص ۲۵۴.

قوت عقلیہ کسی عارضے میں مبتلا ہوگئی تھی۔)

قاضی صاحب کا مطلب یہ ہے کہ فَعَلَ الشَّیْئَ وَمَا فَعَلَه' سے مراد یہ ہوگی کہ رَأَی الشَّیْئَی وَمَارَآہ. (آپ خیال کرتے تھے کہ میں نے اس چیز کو دیکھا ہے حالانکہ نہیں دیکھا ہوتا تھا) یعنی جادو کی وجہ سے آپ کی نظر اس قدر کمزور ہوگئی تھی کہ اپنے پرائے میں تمیز نہیں کر سکتے تھے اور کسی خاتون کو دیکھ کر خیال کرتے تھے کہ اپنی فلاں زوجہ کو دیکھا ہے حالانکہ اس زوجہ کو نہیں دیکھا ہوتا تھا؛ بلکہ کسی اور زوجہ یا اجنبی عورت کو دیکھا ہوتا تھا۔ اسی طرح کسی آدمی کو کوئی کام کرتا ہوا دیکھتے تھے تو ضعف بصارت کی وجہ سے اسے کسی اور کام میں مشغول سمجھ لیتے تھے۔ مثلاً کسی شخص کے بارے میں خیال کرتے تھے کہ میں نے اسے شمشیر زنی کرتے ہوئے دیکھا ہے حالانکہ شمشیر زنی کرتے ہوئے نہیں دیکھا ہوتا تھا بلکہ کوئی اور کام کرتے ہوئے دیکھا ہوتا تھا۔

اس توجیہ کو قاضی صاحب نے اگرچہ بہت عمدہ قرار دیا ہے مگر ایک عام عربی دان بھی سمجھ سکتا ہے کہ یہ کس قدر بعید اور دور از کار تعبیر ہے۔ علاوہ ازیں رسول اللہ ﷺ کی نظر کو اتنا کمزور قرار دینا کہ ازواج مطہرات اور اجنبی عورتوں میں امتیاز نہ کر سکیں، کسی طور بھی شایان شان رسالت نہیں ہے۔(۱)

---

(۱) جس منقطع روایت سے آپ ﷺ کی نظر کو کمزور ثابت کیا جارہا ہے اس کا اپنا مفہوم تو یہ ہے کہ نظر بالکل ہی چلی گئی تھی مگر ایک دوسری روایت کو ساتھ ملا کر بصارت کو مکمل طور پر ضائع ہونے سے بچا لیا گیا ہے، تاہم ختم ہونے کے قریب بہر حال پہنچ گئی تھی۔ چنانچہ علامہ خفاجی ''اَنکَرَ بَصَرُہ'' کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں---یَعْنِیْ تَغَیَّرَتْ قُوَّتُه' الْبَاصِرَۃُ عَمَّا کَانَتْ عَلَیْهِ قَبْلَ اَنْ یُّسْحَرَ، لَا اَنَّه' فَقَدَہ' بِالْکُلِّیَّةِ، لِمَا فِیْ بَعْضِ رِوَایَاتِ الْحَدِیْثِ السَّابِقَةِ: حَتّٰی کَادَیَنْکَرُ بَصَرُہ'، اَیْ قَارَبَ فَقْدَہ' وَلَمْ یَفْقِدْہُ. نسیم الریاض ج ۴، ص ۲۵۳ (یعنی آپ کی بصارت ایسی نہیں رہی تھی جیسی سحر سے پہلے تھی، یہ مراد نہیں کہ بالکل ہی ختم ہوگئی تھی کیونکہ بعض روایات میں حَتّٰی کَادَیَنْکَرُ بَصَرُہ' کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی ختم ہونے کے قریب پہنچ گئی تھی، اگرچہ بالکل زائل نہیں ہوئی تھی۔)

اللہ اکبر! کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں روایات سحر کا مفہوم متعین کرنے کے لئے---!!!

قاضی صاحب کے عشق رسول ﷺ پر ان کی یہی کتاب ''الشفاء'' شاہد ہے اور ہم ان کی عظمت کے تہہ دل سے قائل ہیں، مگر روایات سحر کے لئے محمل کی تلاش میں وہ اتنے دور نکل گئے ہیں کہ ہم ان کا ساتھ نہیں دے سکتے۔

پھر یہ ساری کاوش اس تصور پر مبنی ہے کہ سحر کا اثر صرف رسول اللہ ﷺ کے جسم پر ہوا تھا، حالانکہ یہ محض ایک مفروضہ ہے جس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ یہ کہنا کہ چونکہ سحر کی دوسری روایات میں مختلف قسم کے جسمانی عوارض کا بیان ہے اس لئے **فَعَلَ الشَّيْئَ وَمَا فَعَلَه**' سے بھی جسمانی عارضہ مراد لینا چاہئے، تو کوئی دلیل نہ ہوئی کیونکہ سحر کے اثرات متعدد ہو سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ آپ کے جسم پر بھی اثر ہوا ہو جیسا کہ باقی روایات میں ہے اور دماغ بھی متاثر ہوا ہو جیسا کہ **فَعَلَ الشَّيْئَ وَمَا فَعَلَه**' والی روایت سے ظاہر ہے۔ اگر کچھ روایات میں بدنی تکالیف کا ذکر ہے تو اس کا یہ مطلب کہاں سے نکل آیا کہ بدنی تکالیف کے علاوہ اور کوئی تکلیف ہوئی ہی نہیں تھی---!!

بہرحال یہ ناقابل حل مسائل ہیں کہ سحر کے اثر سے رسول اللہ ﷺ کا حافظہ متاثر ہوا تھا، عام کارکردگی پر اثر پڑا تھا، مخصوص قوت میں کمی واقع ہوئی تھی، یا یہ ساری باتیں ہوگئی تھیں؟ ماضی کے صیغوں کو مضارع کے معنی میں کریں گے، مضارع کے الفاظ کو ماضی کے مفہوم میں لے جائیں گے یا دونوں کو اپنے اپنے معنی پر رکھیں گے؟ اگر اپنے معنی پر رکھیں گے تو حقیقی معنی پر یا مجازی پر یا بعض کو حقیقی اور بعض کو مجازی پر؟ الغرض جو صورت بھی اختیار کریں گے وہ ایک نئی الجھن پر منتج ہوگی، اس لئے ان تہہ در تہہ الجھنوں کو ان لوگوں کے لئے چھوڑ دیجئے جو رسول اللہ ﷺ کو جادو زدہ مانتے ہیں اور آیئے ان روایات میں پائے جانے والے ایک اور واضح تضاد اور کھلے تعارض کا تماشا دیکھئے!

یہ اختلاف جادو کو کنویں سے نکالنے یا نہ نکالنے کے بارے میں ہے۔(۱)

گزشتہ چھ روایات میں سے نمبر ۲ میں تو یہ حصہ مذکور ہی نہیں، بقیہ پانچ میں سے

---

(۱) واضح رہے کہ یہاں جادو سے مراد وہ سامان ہے جس پر جادو کر کے کنویں میں دفن کر دیا گیا تھا۔

چار روایات کے مطابق جادو نہیں نکالا گیا۔ نمبر ۱، اور نمبر ۵، میں تو خود رسول اللہ ﷺ نے صاف لفظوں میں جادو نکالے جانے سے انکار فرمایا ہے اور نمبر ۳، ۶ میں حضرت عائشہؓ کے سوال میں نفی موجود ہے۔

نمبر ۱ میں حضرت عائشہؓ اور رسول اللہ ﷺ کا سوال جواب یوں بیان ہوا ہے۔

قُلْتُ: یَارَسُوْلَ اللّٰهِ! اَفَاَخْرَجْتَه؟ قَالَ: لَا اَمَّا اَنَا فَقَدْ عَافَانِیَ اللّٰهُ وَشَفَانِیْ. (میں نے پوچھا---''یارسول اللہ! کیا آپ نے اس کو نکالا ہے؟'' آپ نے جواب دیا---''نہیں، کیوں کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے عافیت اور شفا دے دی ہے۔'')

نمبر ۵ کے الفاظ اس طرح ہیں

قُلْتُ: اِسْتَخْرَجْتَه؟ قَالَ: لَا، اَمَّا اَنَا فَقَدْ شَفَانِیَ اللّٰه.

(میں نے پوچھا---''کیا آپ نے اس کو نکلوایا ہے؟'' فرمایا---''نہیں، کیوں کہ مجھے اللہ نے شفا دے دی ہے۔'')

نمبر ۳ میں یوں ہے

فَقُلْتُ: یَارَسُوْلَ اللّٰه! فَهَلَّا اَخْرَجْتَه؟ فَقَالَ: اَمَّا اَنَا فَقَدْ شَفَانِیَ اللّٰه.

(تو میں نے کہا---''یارسول اللہ! آپ نے اس کو نکالا کیوں نہیں؟'' جواب ملا---''کیونکہ مجھے اللہ نے شفا دے دی ہے۔'')

نمبر ۶ میں اس طرح ہے

فَقُلْتُ: یَارَسُوْلَ اللّٰهِ! فَهَلَّا اِسْتَخْرَجْتَه؟ قَالَ: قَدْعَافَانِیَ اللّٰه.

(میں نے سوال کیا---''یارسول اللہ! تو آپ نے اس کو نکلوایا کیوں نہیں؟'' آپ نے فرمایا---''مجھے اللہ نے عافیت دے دی ہے۔'')

ان چاروں روایتوں سے صاف واضح ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نہ خود جادو نکالا نہ کسی اور سے نکلوایا۔ لیکن ایک روایت یعنی نمبر ۴ میں دو جگہ صراحتاً مذکور ہے کہ جادو نکلوایا گیا تھا۔ الفاظ اس طرح ہیں۔

فَاَتَى الْبِئْرَ فَاسْتَخْرَجَه'--- فَاسْتُخْرِجَ.

(رسول اللہ ﷺ کنویں پر تشریف لائے تو اس کو نکلوایا--- پس وہ نکلوایا گیا۔)

اس کے بعد حضرت عائشہؓ اور رسول اللہ ﷺ کا مکالمہ یوں بیان کیا گیا ہے۔

فَقُلْتُ: اَفَلَا تَنَشَّرْتَ ؟ فَقَالَ: اَمَّا اللهُ فَقَدْ شَفَانِیْ.

(میں نے پوچھا--- ''تو کیا آپ نے نشرہ (۱) نہیں کیا؟'' آپ نے فرمایا--- ''اللہ تعالیٰ نے مجھے تو شفا دے دی ہے۔'')

اب اس کا کیا حل ہو کہ

(ا)--- چار روایتوں میں جادو کے نکالے جانے کی نفی کی گئی ہے جبکہ ایک روایت میں اس کو ثابت کیا گیا ہے۔

(ب)--- چار روایتوں میں حضرت عائشہؓ کا سوال جادو نکالنے کے بارے میں ہے؛ جبکہ ایک روایت کے مطابق حضرت عائشہؓ نے نکالنے کے متعلق کوئی بات ہی نہیں کی۔

(ج)--- چار روایتوں میں نشرہ کا کوئی ذکر ہی نہیں، جبکہ ایک روایت کے مطابق حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا سوال ہی نشرہ کے بارے میں تھا۔ (۲)

---

(۱) جادو کے اثرات زائل کرنے کے لئے عرب میں ایک ٹونا مروج تھا جس کو ''نشرہ'' کہا جاتا تھا۔

(۲) ہم چونکہ صرف صحیح بخاری کی روایات پر گفتگو کر رہے ہیں اس لئے متن میں مزید تعارضات کا ذکر نہیں کیا۔ تاہم آپ کو دلچسپ بات بتاتے چلیں کہ صحیح مسلم میں رسول اللہ ﷺ اور حضرت عائشہؓ کا مکالمہ اس طرح درج ہے

قُلْتُ: اَفَلَا اَحْرَقْتَه' ؟ قَالَ : لَا ، اَمَّا اَنَا فَقَدْ عَافَانِیَ اللهُ. (صحیح مسلم، ج ۲، ص ۲۲۱)

(میں نے پوچھا--- ''تو کیا آپ نے اس کو جلایا نہیں؟'' آپ نے جواب دیا--- ''نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے عافیت دے دی ہے۔'') ☜

ظاہر ہے کہ اس شدید تعارض کو دور کرنے کی امکانی صورت کوئی نہیں اس لئے اس کا آسان جواب یہ تھا کہ چونکہ زیادہ روایات میں جادو نکالنے اور نکلوانے کی نفی کی گئی ہے اور وہ بھی خود رسول اللہ ﷺ اور حضرت عائشہؓ کی زبان سے، اس لئے اس کو ترجیح حاصل ہوگی اور جس روایت میں جادو نکالنے اور نشرہ کا ذکر ہے اس کو راوی کی غلطی پر محمول کیا جائے گا۔ لیکن آپ حیران ہوں گے کہ شارحین نے اس کے برعکس جواب دیا ہے، یعنی انہوں نے جادو نکالنے والی اکلوتی روایت کو ترجیح دی ہے اور چار روایتوں کو راویوں کی غلطی پر مبنی قرار دے دیا ہے۔

دراصل جب تک جادو نکالا نہ جائے، کہانی کا مزہ ہی نہیں آتا۔ بھلا یہ کیا بات ہوئی کہ رسول اللہ ﷺ کنویں پر گئے بھی اور واپس بھی تشریف لے آئے مگر جادو نکالنے میں کوئی دلچسپی نہ لی اور وہ وہیں کا وہیں دھرا رہا---!

اللہ بھلا کرے علامہ مہلب کا کہ انہوں نے نہ صرف جادو نکالنے والی روایت کو ترجیح دے دی بلکہ ترجیح کی وجہ بھی بیان کر دی اور وہ یہ کہ جادو نکالنے والی روایت کے راوی چونکہ سفیان ابن عیینہ ہیں اور وہ ہشام کے شاگردوں میں سب سے زیادہ ثقہ اور مضبوط ہیں اس لئے ان اکیلے کا بیان چار پر بھاری ہے، خصوصاً اس صورت میں کہ انہوں نے نکالنے کا ذکر خصوصی اہتمام سے دو دفعہ کیا ہے۔ یعنی فَاسْتَخْرَجَه' اور فَاسْتُخْرِجَ

"ذَكَرَ الْمُهَلَّبُ اَنَّ الرُّوَاةَ اِخْتَلَفُوْا عَلٰى هِشَامٍ فِىْ اِخْرَاجِ السِّحْرِ--- وَالنَّظْرُ يَقْتَضِىْ تَرْجِيْحَ رِوَايَةِ سُفْيٰنَ لِتَقَدُّمِهٖ فِى الضَّبْطِ،

لیجئے! ایں گل دیگر شگفت، ایک راوی بیان کرتا ہے کہ سوال جادو نکالنے کے بارے میں تھا، دوسرا بتاتا ہے کہ نشرہ کے بارے میں تھا اور تیسرا کہتا ہے کہ جلانے کے بارے میں تھا اور مزید تماشے کی بات یہ ہے کہ علامہ قرطبی نے احرقتہ کی ضمیر لبید کی طرف راجع کی ہے اور حضرت عائشہؓ کے سوال کا مطلب یہ لیا ہے کہ کیا آپ نے لبید کو جلایا نہیں؟ واقعی، ایسے خبیث کو تو جلا کر بالکل راکھ کر دینا چاہئے تھا۔!!

وَيُؤَيِّدُه، اَنَّ النُّشْرَةَ لَمْ تَقَعْ فِيْ رِوَايَةِ اُسَامَةَ وَالزِّيَادَةُ مِنْ سُفْيٰنَ مَقْبُوْلَةٌ لِاَنَّه، اَثْبَتُهُمْ، وَلَا سِيَّمَا اَنَّه، كَرَّرَ اِسْتِخْرَاجَ السِّحْرِ فِيْ رِوَايَتِهٖ مَرَّتَيْنِ فَيَبْعُدُ مِنَ الْوَهْمِ---"(۱)

حاصل اس عبارت کا وہی ہے جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ سفیان کی یاداشت ہشام کے سب شاگردوں سے زیادہ ہے اس لئے جو سفیان نے بیان کیا ہے وہی درست ہے اور وہم و غلطی سے مبرا ہے۔

اب صورت حال یہ ہے کہ

سحر کی تمام روایتوں میں سب سے زیادہ صحیح روایات وہ سمجھی جاتی ہیں جو صحیح بخاری میں ہیں اور صحیح بخاری کی جملہ روایات سحر کے راوی صرف اور صرف ہشام ہیں اور ہشام کے شاگردوں میں سب سے معتبر، معتمد اور مستند سفیان ابن عیینہ ہیں۔ اب اگر ثابت کر دیا جائے کہ سفیان اتنے بھی مستند نہیں ہیں جتنے کہ سمجھے جاتے ہیں تو سحر کی سب سے قوی روایت نا قابل اعتبار ہو جاتی ہے اور اگر سحر کی تمام روایات کے مدار المہام راوی ہشام کے بارے میں بھی حقائق بیان کر دیئے جائیں تو جادو کی یہ ساری نگری ہی منہدم ہو جاتی ہے۔ اس لئے آیئے پہلے سفیان ابن عیینہ کے بارے میں بات کرتے ہیں۔ لیکن یہ واضح کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ ہر غلطی اور لغزش سے منزہ اور پاک صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ انسان خواہ کتنا ہی سچا اور مستند کیوں نہ ہو، اس سے کہیں نہ کہیں غلطی اور بھول چوک ہو ہی جاتی ہے۔ ثقہ اور معتبر راوی بھی انسان ہی ہوتے ہیں اس لئے ان کو غلطی لگ جانا نہ صرف ممکن ہے بلکہ اکثر ایسا ہوتا رہتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ راوی سرے سے نا قابل اعتبار ہے اور اس کی ہر روایت مردود اور غلط ہے۔ ہاں، اگر کوئی راوی وضاع اور کذاب ہو تو اسکی ہر روایت باطل ہوتی ہے مگر وضع اور کذب سے کم درجے کی غلطیاں قابل معافی ہوتی ہیں اور محدثین بعض غلطیوں کو تسلیم کرنے کے باوجود اس راوی کو ثقہ اور معتبر قرار دیتے ہیں؛ البتہ جہاں صورت

---

(۱) فتح الباری، ج ۱۲، ص ۳۶۷۔

حال ایسی ہو کہ ثقہ راوی کی روایت کو تسلیم کرنے سے شانِ رسالت پر حرف آتا ہو تو پھر تحفظ شانِ رسالت کو مقدم سمجھنا چاہیئے اور اس راویت کو سر بسر من گھڑت قرار دینے میں تامل نہیں کرنا چاہیئے۔ اسی بنا پر امام رازی نے صحیح بخاری کی اس حدیث کو مسترد کر دیا ہے جس میں یہ ذکر ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے صرف تین جھوٹ بولے تھے۔ (۱)

امام رازی کہتے ہیں کہ اس روایت کے راویوں کو سچا ماننے کی صورت میں ایک نبی کو جھوٹا تسلیم کرنا پڑتا ہے، تو کیا اس سے یہ بہتر نہیں ہے کہ ہم پیغمبروں کو سچا قرار دیں اور اس روایت کے راویوں کو جھوٹا کہہ دیں --- فَلَاَنْ یُّضَافَ الْکَذِبُ اِلٰی رُوَاتِہٖ، اَوْلٰی مِنْ اَنْ یُّضَافَ اِلَی الْاَنْبِیَاءِ عَلَیْھِمُ السَّلَام. (۲)

اس اصولی بات کے بعد ہم اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہیں۔

حضرت سفیان ابن عیینہ بہت ہی جلیل القدر ہستی ہیں۔ ثقہ ہیں، ثبت ہیں، حجت ہیں، حافظ ہیں، امام ہیں --- غرضیکہ ایک مستند اور معتمد راوی کے لئے جتنے بھی الفاظ کتب اسماء الرجال میں مستعمل ہیں وہ سب ان کے لئے استعمال ہوئے ہیں۔ بڑی بڑی مقتدا و راہنما ہستیاں ان کے شاگردوں میں شامل ہیں اور ان کے فضائل و مناقب کے بارے میں اسماء الرجال والے کہتے ہیں کہ "کَثِیْرَۃٌ جِدًّا" یعنی بہت ہی زیادہ ہیں۔ علم حدیث کا ایک بحر ذخار تھے جس سے ایک دنیا سیراب و فیض یاب ہوئی، تاہم روایت حدیث میں ان سے خطائیں بھی سرزد ہوتی رہتی تھیں۔ اس سلسلے میں علامہ ذہبی نے جو کچھ لکھا ہے اس کا ترجمہ ہم اعلیٰ حضرت بریلویؒ کے حوالے سے پیش کرتے ہیں

اعلیٰ حضرت لکھتے ہیں

"یہ ہیں تمام محدثین کے امام الائمہ سفیان ابن عیینہ، جنہوں نے زہری سے روایت میں بیس سے زیادہ حدیثوں میں خطا کی۔ امام احمد فرماتے ہیں --- "مجھ میں اور علی

---

(۱) لَمْ یَکْذِبْ اِبْرَاھِیْمُ اِلَّا ثَلٰثَ کَذِبَاتٍ، صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، باب قول اللہ عزوجل، وَاتَّخَذَ اللّٰہُ اِبْرَاھِیْمَ خَلِیْلاً، ج۱، ص۴۷۴۔ (۲) تفسیر کبیر، ج۶، ص۱۶۴۔

ابن مدینی میں مذاکرہ ہوا کہ زہری سے روایت میں ثابت تر کون ہے؟ علی نے کہا---
''سفیان ابن عیینہ۔'' میں نے کہا---''امام مالک، کہ ان کی خطا سفیان کی خطاؤں سے کم ہے۔قریب بیس حدیثوں کے ہیں جن میں سفیان نے خطا کی۔'' پھر میں نے اٹھارہ گنا دیں اور ان سے کہا---''آپ مالک کی خطائیں بتائیں؟'' وہ دو تین حدیثیں لائے۔ پھر جو میں نے خیال کیا تو سفیان نے بیس سے زیادہ حدیثوں میں خطا کی ہے۔'' ذَکَرَہ' فِیْ الْمِیْزَانِ. بااین ہمہ امام سفیان کے ثقہ، حجت ہونے پر علمائے امت کا اجماع ہے۔''(۱)

ہمیں اس میں کوئی نزاع نہیں کہ سفیان علمائے امت کے نزدیک ثقہ، ثبت اور حجت ہیں، ہم قارئین کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ ان کی خطاؤں کا تناسب کچھ زیادہ ہی ہے کیونکہ زہری سے انہوں نے کل تین سو کے لگ بھگ روایتیں لی ہیں (۲) اور ان میں انہوں نے بیس سے زیادہ خطائیں کی ہیں، اس طرح ان کی خطاؤں کا تناسب سات فیصد کے قریب بنتا ہے، حالانکہ یہ زہری کی روایتوں کے پختہ حافظ مانے جاتے ہیں (۳) جبکہ ہشام کی روایتوں میں ان کا اثبت اور احفظ ہونا اسماء الرجال والوں نے کہیں بیان نہیں کیا۔تو اپنے جس استاد کی روایتوں کے یہ انتہائی پختہ حافظ ہیں، اگر اس کی روایات میں ان کی خطاؤں کا تناسب سات فیصد ہے تو جن اساتذہ کی روایات میں ان کا پختہ حافظ ہونا کہیں مذکور نہیں--- مثلاً ہشام--- ان کی روایات میں ان کی خطاؤں کا تناسب نہ جانے کیا ہوگا---!

چلئے مجموعی تناسب سات فیصد ہی فرض کر لیتے ہیں، بلکہ اٹھارہ غلطیوں کے حساب سے چھ فیصد مان لیتے ہیں اور مختلف اساتذہ سے انہوں نے جو روایتیں لی ہیں ان کی کل

---

(۱) فتاوٰی رضویہ ''مطبوعہ رضا فونڈیشن لاہور، ج۵، ص۱۸۴۔ (۲) وَکَذَا عِنْدَ اِبْنِ عُیَیْنَۃَ عَنْہُ (اَیْ عَنِ الزُّھْرِی) نَحْوَ الثَّلاثِمِائَۃِ. میزان الاعتدال، ج۱،ص ۳۹۷۔ (۳) سَمِعْتُ عَنْ اِبْنِ الْمَدِیْنِیْ یَقُوْلُ:مَافِیْ اَصْحَابِ الزُّھْرِیْ اَتْقَنُ مِنْ اِبْنِ عُیَیْنَہ۔تاریخ الخطیب، ج۹، ص ۱۷۸۔

تعداد سات ہزار کے لگ بھگ ہے۔(۱) اگر ان میں چھ فیصد غلطیوں کا امکان ہی تسلیم کرلیا جائے تو ان کی مجموعی خطاؤں کی تعداد چار سو سے زیادہ ہو جاتی ہے۔ پھر ایسی کثیر الخطا ہستی کی روایت عقائد میں کس طرح قبول کی جاسکتی ہے اور اس بنا پر رسول اللہ ﷺ کے بارے میں یہ عقیدہ کیسے رکھا جاسکتا ہے کہ جادو کے اثر سے آپ کی معجزانہ قوت خاصہ معطل ہو کر رہ گئی تھی اور آپ بیویوں کے پاس جانا چاہتے تھے مگر نہیں جا پاتے تھے---!!

چلیں، چار سو کی تعداد کو چھوڑیں، بلکہ اٹھارہ والی بات کو بھی ترک کر دیں اور فرض کرلیں کہ سات ہزار حدیثوں میں ان سے صرف سات روایتوں میں خطا سرزد ہوئی، تو کیا یہ ممکن نہیں کہ یہ روایت بھی انہیں سات میں سے ایک ہو؟ یہ عجیب بات ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف ایسی نامناسب باتیں منسوب کرنا تو گوارا کرلیا جائے جن کی توجیہات و تاویلات میں شارحین کو صفحوں کے صفحے سیاہ کرنے پڑیں مگر یہ نہ کہا جائے کہ سفیان سے غلطی ہوگئی ہے، الٹا ان کی روایت کو سب سے درست مانا جائے اور باقی روایتیں، جن میں بیویوں والے معاملے اور نشرہ کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں اور جادو کے بارے میں بزبان رسالت یہ اعتراف موجود ہے کہ نہیں نکالا گیا، ان کو راویوں کی غلط فہمی قرار دے دیا جائے---!!

بہرحال ہمارا مقصد اس بحث وتمحیص سے یہ ہے کہ سفیان سے روایت میں خطائیں سرزد ہوتی رہتی تھیں اور وہ اتنے احفظ و اثبت نہیں تھے جتنے کہ سمجھے جاتے ہیں اس لئے اس روایت کو بھی ان کی غلطیوں کا حصہ سمجھ کر ترک کر دینا ہی مناسب ہے۔

ہوسکتا ہے آپ یہ اعتراض کریں کہ روایت میں تھوڑی بہت غلطیوں کا ہونا اور بات ہے اور سر بسر روایت کا غلط ہونا دوسری بات ہے۔ ایسا تو تب ممکن ہے جب سند میں کوئی راوی وضاع ہو، یعنی اپنی طرف سے باتیں گھڑ کے ان کو حدیث رسول اللہ ﷺ کے طور پر پیش کرتا ہو؛ جبکہ سفیان کے بارے میں کسی نے اشارۃً بھی یہ بات نہیں کہی کہ وہ حدیث وضع کیا کرتے تھے؛ بلکہ وہ جس مقام و مرتبے کے آدمی ہیں اس کے پیش نظر تو ان کے بارے

(۱) وَكَانَ حَدِيثُه، نَحْوًا مِنْ سَبْعَةِ آلَافٍ. تاریخ الخطیب، ج۹، ص۱۷۸۔

میں یہ تصور بھی محال ہے۔

جواباً عرض ہے کہ بلاشبہ علماء اسماء الرجال ان کی مدح وثنا میں رطب اللسان اور یک زبان ہیں اور کسی نے ان کی اس خامی کا ذکر نہیں کیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ بیشک سفیان پوری حدیث وضع نہیں کرتے تھے مگر حدیث میں دل پسند اضافے کرنے میں کوئی قباحت نہیں سمجھتے تھے۔

اتنے بڑے آدمی کے بارے میں ایسا دعویٰ کرنا، ہوسکتا ہے آپ کو دیوانے کی بڑ نظر آئے مگر مجھے اپنے دعوے کی صحت پر اصرار ہے کیونکہ میرے پاس اس کا یقینی ثبوت موجود ہے---یعنی ان کا اپنا اعتراف---اور وہ بھی صحیح بخاری میں---!!

۞۞۞
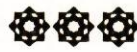
امام بخاری کتاب الدعوات میں ایک حدیث اس سند کے ساتھ لائے ہیں

حَدَّثَنَا عَلِیُّ ابْنُ عَبْدِاللهِ، قَالَ: حَدَّثَنَا سُفْیٰنُ قَالَ: حَدَّثَنا سُمَیٌّ، عَنْ اَبِیْ صَالِحٍ، عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: کَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ یَتعَوَّذُ مِنْ جَهْدِ الْبَلاءِ وَدَرْکِ الشِّقَاءِ وَسُوْءِ الْقَضَاءِ، وَشَمَاتَةِ الْاَعْدَاءِ (۱)

(حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ (چار چیزوں سے) پناہ مانگا کرتے تھے---سخت مصیبت سے، بدبختی لاحق ہونے سے، بری تقدیر سے اور دشمنوں کی شماتت سے۔)

اس حدیث کے راوی یہی سفیان ابن عیینہ ہیں اور وہ اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد نہایت معصومیت سے اعتراف کرتے ہیں

قَالَ سُفْیٰنُ: اَلْحَدِیْثُ ثَلٰثٌ، زِدْتُ اَنَا وَاحِدَةً، لَا اَدْرِیْ اَیَّتُهُنَّ هِیَ.

(سفیان نے کہا---"حدیث میں صرف تین چیزوں کا ذکر ہے۔ایک میں نے بڑھادی ہے، میں نہیں جانتا کہ وہ کون سی ہے۔")

(۱) صحیح بخاری، ج ۲، کتاب الدعوات، باب التعوذ من جهد البلاء، ص ۹۳۹.

یعنی سفیان کہتے ہیں کہ مندرجہ بالا روایت میں جن چار چیزوں سے پناہ مانگنے کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے حدیث کے اندر صرف تین مذکور ہیں، ایک کا میں نے اضافہ کیا ہے لیکن مجھے معلوم نہیں کہ وہ کون سی ہے۔

سبحان اللہ! کوئی پوچھے کہ چلیں مان لیا، زمانہ گزر جانے کے بعد آپ کو یاد نہیں رہا کہ آپ نے کون سا اضافہ کیا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ پہلے اضافہ کیا ہی کیوں تھا؟

اس سوال کا جواب علامہ کرمانی دیتے ہیں۔ سوال و جواب انہی کی زبانی سنئے!

''اِنْ قُلْتَ: كَيْفَ جَازَلَه' اَنْ يَّخْلِطَ، كَلَامَه' بِكَلَامِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ بِحَيْثُ لاَ يُفْرَقُ بَيْنَهُمَا؟

قُلْتُ: مَا خَلَطَ، اِشْتَبَهَ عَلَيْهِ تِلْكَ الثَّلاَثَةُ بِعَيْنِهَا وَ عَرَفَ اَنَّهَا كَانَتْ ثَلٰثَةً مِنْ هٰذِهِ الْاَرْبَعَةِ، فَذَكَرَالْاَرْبَعَةَ تَحْقِيْقًا لِرِوَايَةِ تِلْكَ الثَّلاَثَةِ قَطْعًا، اِذْلَا مَخْرَجَ مِنْهَا.''(۱)

(اگر تم اعتراض کرو کہ سفیان کے لئے یہ بات کیسے جائز ہوگئی کہ وہ اپنے کلام کو رسول اللہ کے کلام میں اس طرح خلط ملط کر دیں کہ دونوں میں فرق ہی نہ کیا جا سکے؟

تو میں جواب دوں گا کہ انہوں نے خلط ملط نہیں کیا؛ بلکہ ان پر ان تینوں کی تعیین مشتبہ ہوگئی تھی لیکن وہ جانتے تھے کہ وہ تین انہی چار میں سے تھیں اس لئے انہوں نے چار کو ذکر کر دیا تا کہ تین چیزیں یقینی طور پر ان میں آ جائیں، کیونکہ اس سے نکلنے کی اور کوئی صورت ہی نہیں تھی۔)

یعنی سفیان کے ذہن میں چار چیزیں آ رہی تھیں، جبکہ ان کو یہ بھی پتہ تھا کہ حدیث میں صرف تین مذکور ہیں لیکن ان پر واضح نہیں ہو رہا تھا کہ ان چار میں سے کون کون سی حدیث میں بیان ہوئی ہیں اور کون سی میری طرف سے زیادہ ہوگئی ہے۔ اس لئے وہ چاروں کو بیان کر دیتے تھے کیونکہ اس مخمصے سے نکلنے کی اور کوئی صورت ہی نہیں تھی۔

---

(۱) حاشیہ صحیح بخاری، حدیث مذکور۔

یہ جواب چل جاتا، اگر سفیان کو یہ پتہ نہ ہوتا کہ میں نے کون سی چیز کا اضافہ کیا ہے مگر مصیبت یہ ہے کہ صحیح اسماعیلی میں سفیان کی جو روایت مذکور ہے اس میں وضاحت موجود ہے کہ اضافی چیز ''شماتة الاعداء'' ہے---!

''وَقَدْ اَخْرَجَ الْاِسْمَاعِیْلِیُّ الْحَدِیْثَ مِنْ طَرِیْقِ عَمْرٍو عَنْ سُفْیٰنَ، فَبَیَّنَ فِیْهِ اَنَّ الْخَصْلَةَ الْمَزِیْدَةَ هِیَ شَمَاتَةُ الْاَعْدَاءِ.''

(اور اسماعیلی نے اس حدیث کو عمرو کے واسطے سے سفیان سے روایت کیا ہے اور اس میں وضاحت کی ہے کہ جس صفت کا اضافہ کیا گیا ہے، وہ شماتت الاعداء ہے)

اب اس الجھن کا کیا حل ہو کہ ایک روایت میں اضافہ شدہ چیز کی تعیین موجود ہے، جبکہ صحیح بخاری کی روایت کے مطابق سفیان کہتے ہیں ''میں نہیں جانتا کہ وہ کون سی ہے۔''

اس کا جواب علامہ قسطلانی نے یہ دیا ہے

''وَلَعَلَّ سُفْیٰنَ کَانَ اِذَا حَدَّثَ مَیَّزَهَا، ثُمَّ طَالَ عَلَیْهِ الْاَمْرُ، فَطَرُءَ عَلَیْهِ النِّسْیَانُ، فَحَفِظَ بَعْضُ مَنْ سَمِعَ تَعْیِیْنَهَا مِنْهُ قَبْلَ اَنْ یَّطْرُءَ عَلَیْهِ النِّسْیَانُ، ثُمَّ کَانَ بَعْدَاَنْ خَفِیَ عَلَیْهِ تَعْیِیْنُهَا، یَذْکُرُ کَوْنَهَا مَزِیْدَةً مَعَ اِبْهَامِهَا.''(۱)

(ہوسکتا ہے کہ سفیان پہلے جب یہ حدیث بیان کرتے ہوں تو اپنے اضافے کو واضح کر دیتے ہوں، پھر لمبے عرصے بعد ان پر نسیان طاری ہوگیا، تو جن لوگوں نے نسیان طاری ہونے سے پہلے ان کی زبان سے اضافے کی تعیین سنی تھی انہوں نے اس کو یاد رکھا، مگر بعد میں سفیان پر وہ تعیین مخفی ہوگئی اس لئے وہ کسی غیر معین چیز کا اضافہ بیان کرنے لگے)

حاصل یہ کہ پہلے ان کو اپنے اضافے کا پتہ تھا اس لئے اسماعیلی کی روایت میں اس کی تعیین موجود ہے، بعد میں نسیان کی وجہ سے ان کے ذہن میں اضافہ معین نہ رہا اس لئے بخاری کی روایت میں کسی ایک مبہم اضافے کا ذکر ہے۔

اس طرح تعیین اور ابہام کا تعارض تو رفع ہوگیا مگر ہمارا سوال مزید مستحکم ہوگیا کہ

---

(۱) ارشاد الساری شرح صحیح البخاری، ج ۹، ص ۱۹۱.

جس زمانے میں ان کو معلوم تھا کہ یہ میرا اضافہ ہے اسی وقت اس کو انہوں نے نکال کیوں نہ دیا---؟

اگر یہ بات یہیں تک رہتی تو پھر بھی خیر تھی مگر انہوں نے مزید ظلم یہ کیا کہ کچھ عرصے بعد اضافے کے بارے میں بتائے بغیر ان چاروں چیزوں کو یقینی طور پر رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کرنا شروع کر دیا۔ اس بات کا اعتراف علامہ کرمانی کو بھی ہے مگر ان کے پاس اس کا جواب کوئی نہیں ہے۔

''رَوٰی الْبُخَارِیُ عَنْهُ فِیْ کِتَابِ الْقَدْرِ الْحَدِیْث، وَ ذَکَرَ فِیْهِ الْاَرْبَعَةَ مُسْنَدًا اِلٰی رَسُوْلِ اللهِ ﷺ جَزْمًا بِلَا تَرَدُّدٍ وَّ شَکٍّ وَلَا قَوْلٍ بِزِیَادَةٍ.''(۱)

(بخاری نے کتاب القدر میں سفیان ہی سے اس حدیث کو روایت کیا ہے اور وہاں ان چاروں چیزوں کو یقینی طور پر رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کیا ہے۔ وہاں سفیان نے نہ تو کسی تردد اور شک کا اظہار کیا ہے، نہ یہ بتایا ہے کہ ایک میں نے زیادہ کی ہے۔)

علامہ کرمانی نے جس روایت کی طرف اشارہ کیا ہے وہ یہی حدیث ہے اور اسی سند کے ساتھ اس کو سفیان نے بیان کیا ہے، البتہ اس کے ابتدائی الفاظ میں تھوڑا سا تغیر کر دیا ہے، یعنی ''رسول اللہ ﷺ پناہ مانگا کرتے تھے'' کو ''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پناہ مانگا کرو!'' سے بدل دیا ہے۔ باقی تمام الفاظ وہی ہیں۔ حدیث مع السند ملاحظہ فرمایئے!

حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ، قَالَ: حَدَّثَنَا سُفْیَانُ، عَنْ سُمَیٍّ، عَنْ اَبِیْ صَالِحٍ، عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: تَعَوَّذُوْا بِاللهِ مِنْ جَهْدِ الْبَلَاءِ، وَدَرْکِ الشِّقَاءِ، وَسُوْءِ الْقَضَاءِ، وَشَمَاتَةِ الْاَعْدَاءِ. (۲)

اس حدیث میں سفیان نے پورے دھڑلے سے چاروں باتیں رسول اللہ ﷺ کی

---

(۱) صحیح بخاری، ج ۲، ص ۹۳۹، حاشیہ نمبر ۱۰. (۲) صحیح بخاری، ج ۲، کتاب القدر، باب من تعوذ باللہ من درک الشقاء، ص ۹۷۹.

طرف منسوب کر دی ہیں، جن میں سے ایک بالیقین ان کی اپنی تیار کردہ ہے۔(۱) اس لئے ہم نے کہا ہے کہ سفیان حدیث میں من پسند اضافے کرنے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ اور جب رسول اللہ ﷺ کے بیان کردہ الفاظ میں وہ جان بوجھ کر یا بھول کر اضافہ کر سکتے ہیں تو سحر کا واقعہ جو عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی زبانی مروی ہے اس میں انہوں نے نہ جانے کیا کیا ٹکڑے لگائے ہوں---! اس لئے ایسی روایتوں پر اعتماد کر کے رسول اللہ ﷺ کو سحر کی قوت سے عجیب وغریب کیفیات میں مبتلا دکھانا ہرگز مناسب نہیں ہے۔

اب آخر میں بخاری و مسلم کے اندر پائی جانے والی تمام روایات سحر کے مرکزی اور اصلی راوی ہشام پر ایک نظر ڈالتے چلیے!

سفیان ابن عیینہ کے بارے مین تو زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے باقی چار راویوں سے اختلاف کرتے ہوئے روایت سحر میں کچھ من پسند اضافے کر دیئے ہیں

---

(۱) اللہ بدگمانی سے بچائے، مگر مختلف روایات کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سفیان کو اس اضافے کے سلسلے میں چار مراحل سے گزرنا پڑا۔

(الف)--- پہلے مرحلے میں ان کو اپنا اضافہ معلوم تھا اور شاگردوں کو بتایا بھی کرتے تھے، جیسا کہ اسماعیلی کی روایت سے ظاہر ہے۔

(ب)--- دوسرے مرحلے میں وہ یہ تو پورے تیقن سے کہا کرتے تھے کہ ایک میرا اضافہ ہے مگر اس کا تعین نہیں کر پاتے تھے۔ جیسا کہ بخاری کی کتاب الدعوات والی روایت میں ہے۔

(ج)--- تیسرے مرحلے میں وہ یہ بات یقین سے نہیں کہتے تھے کہ ایک میرا اضافہ ہے بلکہ اس کو بطور شک ذکر کرتے تھے۔ جیسا کہ صحیح مسلم کی روایت میں ہے۔ ''قَالَ سُفْيَانُ: اَشُكُّ اَنِّىْ زِدْتُ وَاحِدَةً.'' (سفیان نے کہا---''مجھے شک ہے کہ ایک میں نے بڑھا دی ہے۔'')

(د)--- چوتھے مرحلے میں وہ بغیر کسی شک وشبہے اور تردد کے چاروں باتیں رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کر دیتے تھے۔ جیسا کہ بخاری کی کتاب القدر والی روایت میں ہے۔

رحمہ اللہ و عفا عنہ و غفرلہ

مثلاً جانِ دو عالم ﷺ کا بیویوں کے پاس نہ جاسکنا، جادو کا کنویں سے نکالا جانا اور ام المؤمنین کا نشرہ کے بارے میں سوال کرنا---لیکن اس روایت کو پھیلانے اور حدیث کی صحیح ترین کتابوں تک پہنچانے کا سہرا بلاشبہ حضرت ہشام کے سر ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ انہوں نے بھی خود اس کو وضع نہیں کیا؛ بلکہ اس کا بنیادی ڈھانچہ کسی ماہرِ فن وضاع و کذاب نے تیار کیا ہے۔ ہشام سے صرف یہ کوتاہی ہوئی کہ اس کو درست سمجھ کر آگے بیان کرنا شروع کر دیا اور یوں یہ روایت احادیث کے معتبر مجموعوں میں داخل ہو کر اکثریت کے عقائد کا حصہ بن گئی۔

اس حقیقت تک رسائی کے لئے ہمیں بہت محنت کرنی پڑی ہے اس لئے اہل علم سے مؤدبانہ گزارش ہے کہ درج ذیل بحث کا نہایت باریک بینی اور دقت نظر سے مطالعہ فرمائیں۔شکریہ!

❁❁❁

ہشام کے والد کا نام عروہ ہے جو ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کے بھانجے ہیں اور بہت نامور فقیہ و محدث ہیں۔۶۱ ہجری کے دوران مدینہ منورہ میں ہشام کی ولادت ہوئی اور ۱۴۶ ہجری کو بغداد میں وفات پائی۔ زندگی کا ابتدائی حصہ مدینہ منورہ میں گزارا۔اپنے والد کے علاوہ دیگر اساتذہ سے بھی فیض حاصل کیا اور علم حدیث میں مرتبہ کمال کو پہنچے۔ان کی روایتیں حدیث کی تقریباً ہر کتاب میں پائی جاتی ہیں اور محدثین کی اصطلاح میں ثقہ ہیں، ثبت ہیں، حجت ہیں اور امام ہیں۔یعنی نہایت اعلیٰ درجے کے راویوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ جب تک مدینہ منورہ میں مستقل طور پر سکونت پذیر رہے، ان کی روایتیں ہر قسم کی آمیزش سے پاک رہیں مگر منصور عباسی کے عہد میں جب انہوں نے عراق آنا جانا شروع کیا تو ان کی روایتوں میں گڑ بڑ ہونے لگی، کیونکہ اس سے پہلے وہ اپنے والد کے حوالے سے صرف انہی روایتوں کو بیان کیا کرتے تھے جو انہوں نے اپنے والد سے سنی ہوتی تھیں مگر عراق میں آمدورفت کے بعد انہوں نے یہ کام شروع کر دیا کہ اگر کوئی شخص ان کے والد کی طرف منسوب کر کے کوئی روایت سناتا تھا تو ہشام اس سے وہ روایت اخذ کر لیتے تھے۔ پھر اس شخص کا ذکر بیچ سے حذف کر کے اس روایت کو اپنی طرف سے اپنے والد کی جانب منسوب

کر دیتے تھے (۱) اور --- ''اَبِیْ عَنْ عَائِشَۃَ.'' (میرے والد نے عائشہ صدیقہ سے روایت کی ہے) کہہ کر اس روایت کو بیان کرنے لگتے تھے۔ (۲)

اس طرح وہ راوی جس سے درحقیقت ہشام نے وہ روایت سنی ہوتی تھی، سرے سے غائب ہو جاتا تھا اور سامعین اس روایت کو نہایت مستند سمجھ کر نقل اور یاد کرنے لگتے تھے حالانکہ محذوف راوی کا کچھ پتہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ کون تھا؟ کیسا تھا؟ ثقہ اور قابل اعتبار تھا یا محدث کے روپ میں کوئی فنکار تھا جو خود حدیث گھڑ کر ہشام کے والد عروہ کی طرف منسوب کر دیتا تھا---؟

ہشام کی اس بے احتیاطی کی وجہ سے نہ جانے کتنی بے اعتبار روایتیں معتبر ٹھہری ہوں گی اور مستند ترین کتابوں میں گھس آئی ہوں گی---!!! (۳)

---

(۱) اِنَّ هِشَامًا كَانَ يَتَسَهَّلُ لِاَهْلِ الْعِرَاقِ، اَنَّهٗ كَانَ لَا يُحَدِّثُ عَنْ اَبِيْهِ اِلَّا بِمَا سَمِعَهٗ مِنْهُ، فَكَانَ تَسَهُّلُهٗ اَنْ اَرْسَلَ عَنْ اَبِيْهِ مِمَّا كَانَ يَسْمَعُهٗ مِنْ غَيْرِ اَبِيْهِ عَنْ اَبِيْهِ.

(۲) وَقَدِمَ الثَّالِثَةَ فَكَانَ يَقُوْلُ اَبِيْ عَنْ عَائِشَةَ.

(تاریخ الخطیب، ج ۱۴، ص ۴۰ --- سیر اعلام النبلاء، ج ۶، ص ۳۵)

(۳) اسی لئے امام مالک اور کچھ دوسرے محدثین نے ہشام پر اعتراض کیا ہے--- ''تَكَلَّمَ فِيْهِ مَالِكٌ وَغَيْرُهٗ.'' (خلاصۃ تذہیب، ص ۴۱۰)

اعتراض اور ناپسندیدگی کا سبب ان کی یہی عراقی حدیثیں تھیں--- ''اِنَّ مَالِكًا نَقَمَ عَلٰى هِشَامِ ابْنِ عُرْوَةَ حَدِيْثَهٗ لِاَهْلِ الْعِرَاقِ وَكَانَ لَا يَرْضَاهُ.'' (سیر اعلام النبلاء ج ۶، ص ۵۳)

انہی عراقی مرویات کی وجہ سے امام مالکؒ نے ان کو کذاب قرار دیا ہے۔

''هِشَامُ ابْنُ عُرْوَةَ كَذَّابٌ.'' (تاریخ الخطیب، ج ۱، ص ۲۲۳۔)

ہشام کی جائے پیدائش مدینہ منورہ ہے اور اہل مدینہ ان کو نہایت ثقہ و معتبر سمجھتے تھے مگر جب انہوں نے عراق جا کر اپنے دائرہ روایت کو وسیع کر لیا (یعنی ان حدیثوں کو بھی اپنے والد کی مرویات میں شمار کر لیا جو خود انہوں نے اپنے والد سے نہیں سنی تھیں) تو امام مالک کے علاوہ مدینہ منورہ کے دیگر اہل علم بھی ان کو ناپسند کرنے لگے--- ''هِشَامٌ ثِقَةٌ، ثَبْتٌ، لَمْ يُنْكِرْ عَلَيْهِ شَيْئٌ اِلَّا بَعْدَمَا صَارَ اِلَى الْعِرَاقِ، فَاِنَّهٗ اِنْبَسَطَ فِي الرِّوَايَةِ فَاَنْكَرَ ذٰلِكَ اَهْلُ بَلَدِهٖ عَلَيْهِ.'' (تاریخ الخطیب، ج ۱۴، ص ۴۰) ☜

جانِ دو عالم ﷺ پر جادو کئے جانے والی روایت بھی انہی میں سے ایک ہے جو عراق میں کسی وضاع وکذاب جعلساز نے تیار کی اور ہشام کو یہ کہہ کر سنا دی کہ یہ میں نے آپ کے والد سے سنی ہے۔ ہشام نے اپنی عادت کے مطابق اس کو اپنے والد کی جانب منسوب کر کے بیان کرنا شروع کر دیا (۱) اور یوں یہ روایت بخاری و مسلم جیسی بلند پایہ کتابوں میں بار پا کر نہایت مستند ہوگئی۔

عراق جانے کے بعد ان میں کچھ اور خامیاں بھی پیدا ہوگئی تھیں مگر ہم چونکہ ان کی محدثانہ حیثیت پر گفتگو کر رہے ہیں اس لئے باقی کوتاہیوں سے صرف نظر کرنا ہی مناسب ہے۔ رحمہ اللہ و عفا عنہ.

(۱) جو راوی اس قسم کی حرکت کرتا ہو، یعنی کسی کی روایت کسی اور کے حوالے سے بیان کرتا ہو، محدثین کی اصطلاح میں ''مُدَلِّس'' کہلاتا ہے اور اسکی اس حرکت کو ''تدلیس'' کہا جاتا ہے اور تدلیس کے بارے میں حاشیہ نزہۃ النظر میں صراحتاً لکھا ہے کہ فَاعِلُه' مَذْمُوْمٌ جِدًّا عِنْدَ اَكْثَرِ الْعُلَمَاءِ، ص۵۲۰ (تدلیس کرنے والا اکثر علماء کے نزدیک نہایت ہی قابل مذمت ہے)۔

اسی لئے محدثین وفقہاء کا ایک گروہ مدلس کی ہر روایت کو مردود قرار دیتا ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں ''فَذَهَبَ فَرِيْقٌ مِنْ اَهْلِ الْحَدِيْثِ وَالْفِقْهِ اِلٰى اَنَّ مَنْ عُرِفَ بِهٖ لَا يُقْبَلُ حَدِيْثُه' مُطْلَقًا'' مقدمہ مشکوۃ ص ۷۴ (محدثین اور فقہاء میں سے ایک فریق کی رائے یہ ہے کہ جو راوی تدلیس کرنے میں معروف ہو اس کی حدیث سرے سے قبول نہیں کی جائے گی۔)

لیکن جمہور کے نزدیک مدلس اگر کسی سے روایت نقل کرتے وقت ایسے الفاظ لائے جن سے ظاہر ہوتا ہو کہ اس نے یہ روایت خود سنی ہے--- مثلاً سَمِعْتُ یا حَدَّثَنَا وغیرہ کہہ کر روایت بیان کرے تو ایسی روایت قبول کی جائے گی اور اگر ایسے الفاظ استعمال کرے جن سے یہ واضح نہ ہوتا ہو کہ یہ روایت اس نے خود سنی ہے--- مثلاً قَالَ یا عَنْ فُلَانٍ کہے تو اس صورت میں اس کی روایت مردود ہوگی۔ (حاشیہ نزہۃ النظر ص ۵۲۔) لیکن واضح رہے کہ جمہور محدثین مدلس کی جن روایات کو مقبول قرار دیتے ہیں ان سے صرف فقہی احکام ثابت کیے جاسکتے ہیں۔ رہے قطعی عقائد تو ان کے ثبوت کیلئے بالکل صحیح اخبار آحاد بھی کافی نہیں ہوتیں جیسا کہ آگے آرہا ہے، پھر تدلیس جیسے مذموم فعل کے مرتکب راوی کی روایات کیونکر قبول کی جاسکتی ہیں جن کا قابل قبول ہونا ہی محدثین وفقہاء کے نزدیک متنازعہ ہو!!

ہمارا دعویٰ ہے کہ

یہ روایت ہشام نے اپنے والد عروہ سے ہرگز نہیں سنی، نہ عروہ نے کبھی بیان کی؛ بلکہ یہ روایت خالصتاً سرزمین عراق کی پیداوار ہے اور وہیں سے اس کی نشرواشاعت کا آغاز ہوا۔

اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ عروہ کے بیسیوں شاگرد ہیں مگر ہشام کے بغیر کسی نے بھی یہ روایت بیان نہیں کی۔ باقی شاگردوں کو تو چھوڑیئے کہ وہ باہر کے لوگ تھے، خود خاندان عروہ میں عروہ کے کم از کم چھ شاگرد ایسے ہیں جو اعلیٰ پائے کے محدثین میں شمار ہوتے ہیں اور ان کی روایات صحاح ستہ میں پائی جاتی ہیں مگر ان میں سے کسی ایک نے بھی عروہ کے حوالے سے یہ روایت قطعاً بیان نہیں کی--- درج ذیل نقشے کا ذرا بغور مطالعہ فرمایئے!

(یہ نقشہ متعدد کتب اسماء الرجال کی ورق گردانی کے بعد مرتب کیا گیا ہے۔ اگر اہل علم اس میں کوئی خامی یا کمی بیشی محسوس کریں تو براہ مہربانی ضرور آگاہ کریں۔)

خاندان عروہ میں، عروہ کے شاگرد راویان حدیث

نمبر شمار	نام راوی	عروہ سے رشتہ	صحاح ستہ میں سے کس کس کتاب کا راوی ہے	روایت سحر کا راوی ہے یا نہیں؟
۱	ہشام	بیٹا	بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابنِ ماجہ	ہے
۲	عبداللہ	"	بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی، ابنِ ماجہ	نہیں
۳	عثمان	"	بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی، ابنِ ماجہ	"
۴	محمد	"	مراسیل ابی داؤد، ترمذی	"
۵	یحییٰ	"	بخاری، مسلم، ابوداؤد	"
۶	محمد	بھتیجا	بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابنِ ماجہ	"
۷	عمر	پوتا	بخاری، مسلم، نسائی	"

اللہ اکبر! کیا خوش نصیب خاندان تھا حضرت عروہ کا---جس کے سات افراد نے اپنی زندگیاں خدمت حدیث کے لئے وقف کر رکھی تھیں---!!

ان میں سے پانچ تو ان کے اپنے صاحبزادے ہیں۔ چھٹے محمد، عروہ کے بھائی جعفر ابن زبیر کے بیٹے ہیں اور ساتویں عمر، عروہ کے بیٹے عبداللہ ابن عروہ کے فرزند ہیں۔ یہ سب علم حدیث میں عروہ کے شاگرد ہیں اور اتنے اعلیٰ درجے کے محدث ہیں کہ ان کی روایات صحاح ستہ میں

پائی جاتی ہیں مگر ان میں سے ہشام کے سوا کوئی بھی روایت سحر کا راوی نہیں ہے۔ خاندان والوں کے علاوہ عروہ کے باقی شاگردوں میں سے بھی کسی نے یہ روایت بیان نہیں کی۔

اب آپ ہی بتایئے قارئین کرام! کہ یہ کیسی پر اسرار روایت ہے، جو منسوب تو عروہ کی طرف ہے مگر عروہ کے تمام شاگردوں میں سے سوائے ہشام کے کسی کو کانوں کان اس کی خبر نہ ہو سکی، حتیٰ کہ ہشام کے چاروں بھائی بھی اس سے ناواقف رہے--- بلکہ تاریخ اسلام کی ساری کتابوں میں--- بلکہ دنیا بھر میں چھپنے والے تمام مذہبی لٹریچر میں، کوئی ایسی صحیح یا ضعیف حدیث سحر موجود نہیں جس کو عروہ سے ہشام کے علاوہ کسی اور نے روایت کیا ہو---!(۱)

کیا عروہ نے صرف ہشام سے سرگوشی کی تھی---؟ یا تنہائی میں بیٹھ کر یہ خفیہ حدیث املاء کرائی تھی---؟ اور اگر یہ کوئی ایسا ہی سربستہ راز تھا تو پھر ہشام نے آگے سب کو کیوں بتا دیا---؟

یہ اس بات کا قطعی اور یقینی ثبوت ہے کہ عروہ نے ہرگز ہرگز یہ روایت بیان نہیں کی؛ بلکہ یہ ہشام کے اسی شوق انبساط فی الروایہ کا شاخسانہ ہے جو انہیں عراق جانے کے بعد لاحق ہو گیا تھا اور امام مالک و دیگر اہل مدینہ نے اس پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔

اس روایت کے عراقی الاصل ہونے کی مزید تائید اس حقیقت سے بھی ہوتی ہے کہ صحیحین میں ہشام کے جتنے شاگرد بھی اس قصے کو بیان کرتے ہیں وہ یا تو خالصتاً عراقی ہیں یا ایسے مصری اور مدنی ہیں جن کا عراق میں آنا جانا لگا رہتا تھا۔

بخاری و مسلم میں ہشام سے واقعہ سحر نقل کرنے والوں کے اسماء گرامی درج ذیل ہیں

---

(۱) اس طرح کا دعویٰ کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے، مگر اس موضوع پر جس قدر میں نے تحقیق کی ہے اس کے پیش نظر مجھے سو فیصد یقین ہے کہ میرے اس دعویٰ کو چیلنج نہیں کیا جا سکے گا، انشاء اللہ۔ تاہم اگر کوئی فاضل ایسی حدیث سحر تلاش کر لیں جو عروہ سے ہشام کے بغیر کسی نے روایت کی ہو تو مجھے ضرور مطلع فرمائیں۔ شکریہ

[۱] حماد ابن اسامہ، المعروف ابواسامہ [۲] عیسیٰ ابن یونس [۳] سفیان ابن عیینہ [۴] عبداللہ ابن نمیر [۵] الیث ابن سعد [۶] انس ابن عیاض [۷] یحییٰ ابن سعید۔ (رحمہم اللہ تعالیٰ)

ان میں سے پہلے چار تو ہیں ہی کوفی، یعنی خالص عراقی۔ لیث ابن سعد مصری ہیں مگر کافی عرصہ بغداد میں مقیم رہے۔ انس اور یحییٰ مدنی ہیں مگر ان کی بھی عراق میں آمد و رفت جاری رہتی تھی اور ہشام بھی اس زمانے میں زیادہ وقت بغداد ہی میں گزارتے تھے۔

اتنے عظیم اور جلیل القدر ائمہ حدیث کے ساتھ ساتھ اس دور میں بڑے بڑے کذاب اور حدیثیں گھڑنے کے ماہر بھی شام اور عراق میں ڈیرے ڈالے بیٹھے تھے۔ اس لئے غالب امکان یہی ہے کہ سحر کی یہ داستان بھی حدیث گھڑنے والے کسی عراقی فنکار نے تیار کی اور عروہ کے حوالے سے ہشام کے کان میں ڈال دی۔ بدقسمتی سے ہشام کو عراق میں اپنی روایات بڑھانے کا شوق لاحق ہو گیا تھا اس لئے انہوں نے اس روایت کو بھی حسب عادت اپنی طرف سے عروہ کی طرف منسوب کر کے بیان کرنا شروع کر دیا۔ عراق میں ان سے علم حدیث حاصل کرنے والوں نے یہ سمجھ کر کہ یہ روایت ہشام نے خود اپنے والد سے سنی ہوگی، اس کو نہایت مستند سمجھ لیا اور آگے پہنچا دیا۔ اس طرح یہ روایت پھیل گئی اور بخاری و مسلم جیسی کتابوں میں نفوذ کر گئی۔ اِنَّالِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رٰاجِعُوۡن ۝

اگر بات اسی حد تک رہتی تو پھر بھی یہ کہانی اتنی مشہور نہ ہوتی مگر جب کلبی جیسے داستان طرازوں نے اس پر مزید ردّے چڑھا دیئے اور اس کو حضرت ابن عباس ؓ کی طرف منسوب کر کے آخری سورتوں کے شانِ نزول کے ساتھ جوڑ دیا تو یہ روایت تفسیروں میں بھی پوری شان و شوکت کے ساتھ جلوہ گر ہو گئی۔ بعد میں جادو ٹونے کا کاروبار کرنے والوں نے اس کو مفید مطلب پا کر ہاتھوں ہاتھ لیا اور اتنی شہرت دی کہ عام آدمی کو خواہ سورۂ فاتحہ کا ترجمہ تک نہ آتا ہو، یہ کہانی اس کو ضرور یاد ہوتی ہے۔ چاہے سیرت کا کوئی اور واقعہ اسے معلوم نہ ہو، یہ داستان لازماً از بر ہوتی ہے۔ حالانکہ اس روایت کو ایک نظر دیکھ کر ہی یقین ہو جاتا ہے کہ اس کا بنیادی ڈھانچہ تیار کرنے میں یہودی ذہنیت کارفرما ہے اور اس قصے کا اصل مقصد محمد ﷺ سے موسیٰ علیہ السلام کو برتر ثابت کرنا ہے۔

جانِ دو عالم ﷺ پر جادو کئے جانے کی کہانی تو آپ پڑھ چکے ہیں۔ تقابلی مطالعے کے لئے مصری جادوگروں کے واقعہ سے متعلق چند آیات کا رواں ترجمہ پیش خدمت ہے۔

جب موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو ید بیضا اور عصا کے سانپ بننے کا معجزہ دکھایا تو [فرعون نے درباریوں کے اس گروہ سے جو اس کے گرد بیٹھا ہوا تھا، کہا---"یہ ایک ماہر جادوگر ہے جو اپنے جادو کے زور سے تم کو تمہاری سرزمین سے نکال باہر کرنا چاہتا ہے۔ اب تم کیا مشورہ دیتے ہو؟"

درباریوں نے کہا---"اسے اور اس کے بھائی (ہارون) کو کچھ مہلت دیں اور شہروں میں ہرکارے بھیج دیں جو ماہرِ فن جادوگروں کو اکٹھا کر کے آپ کے پاس لے آئیں"

چنانچہ ایک معین دن کے مقرر کردہ وقت میں جادوگر جمع کر دیئے گئے اور لوگوں سے بھی کہہ دیا گیا کہ تم اکٹھے ہو جاؤ تا کہ اگر جادوگر غالب آ جائیں تو ہم انہی کی راہ پر چلتے رہیں۔

جب جادوگر آئے تو انہوں نے فرعون سے پوچھا---"اگر ہم غالب رہے تو کیا ہمیں کوئی انعام بھی ملے گا؟"

فرعون نے کہا---"ضرور، اس صورت میں تم میرے مقربین میں شامل ہو جاؤ گے۔" سورہ ۲۶، آیات ۳۳، ۴۲۔

جادوگروں نے موسیٰ سے کہا---"یا تم اپنا عصا ڈالو یا ہم ڈالنے والے بنیں۔" سورہ ۷، آیت ۱۱۵۔

موسیٰ نے کہا---"تم جو کچھ ڈالنا چاہتے ہو، ڈال دو!"

چنانچہ انہوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں ڈال دیں اور کہا کہ فرعون کی عزت و جاہ کی قسم ہم ضرور غالب آ کر رہیں گے۔ سورہ ۲۶، آیات ۴۳، ۴۴۔

انہوں نے لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا، انہیں خوفزدہ کر دیا اور بڑا جادو لے کر آئے۔ سورہ ۷، آیت ۱۱۶۔

ان کے جادو کے زور سے ان کی رسیوں اور لاٹھیوں کے بارے میں موسیٰ نے خیال کیا کہ وہ دوڑ رہی ہیں۔ اس سے موسیٰ نے اپنے دل میں کچھ اندیشہ محسوس کیا۔ ہم نے

کہا---" مت ڈرو، غالب یقیناً تم ہی رہو گے۔ یہ تمہارے دائیں ہاتھ میں جو عصا ہے اس کو ڈال دو، یہ ان تمام اشیاء کو نگل جائے گا جو انہوں نے بنائی ہیں کیونکہ یہ سب جادوگر کا مکر ہے اور جادوگر کامیاب نہیں ہو سکتا، خواہ کہیں بھی چلا آئے۔" سورہ ۲۰، آیت ۶۹،۶۶۔

چنانچہ جب موسیٰ نے اپنا عصا ڈالا تو وہ ان سب چیزوں کو نگلنے لگ گیا جو جادوگروں نے جھوٹ کے طور پر بنائی تھیں۔ یہ دیکھ کر جادوگر سجدے میں گر گئے اور پکار اٹھے کہ ہم ایمان لے آئے رب العالمین پر---موسیٰ اور ہارون کے رب پر۔ سورہ ۲۶، آیات ۴۶،۴۵۔

سبحان اللہ! کیا ایمان افروز واقعہ ہے اور کیا ہی پاکیزہ اور پرشکوہ انداز بیان ہے اللہ رب العالمین کا---!

قارئین کرام! اب آپ رسول اللہ ﷺ پر جادو کئے جانے والی داستان کی تفصیلات ذہن میں تازہ کیجئے اور ملاحظہ فرمایئے کہ کسی ہنرمند نے کس چابکدستی سے موسیٰ علیہ السلام کو رسول اللہ ﷺ سے برتر ثابت کر دیا ہے۔

کیونکہ

(الف)---موسیٰ علیہ السلام سے مقابلے کے لئے پورے ملک سے متعدد نامی گرامی جادوگر ڈھونڈھ کر لائے گئے، جبکہ رسول اللہ ﷺ پر جادو کرنے کے لئے اکیلے لبید کو کافی سمجھا گیا۔(۱)

---

(۱) واضح رہے کہ بخاری و مسلم کی روایات میں صرف لبید کا ذکر ہے۔ لبید کی نامعلوم بہنوں کا اضافہ اس وقت کیا گیا جب اس کہانی کو آخری سورتوں کے شان نزول کے ساتھ جوڑا گیا اور اس اضافے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ سورۂ فلق میں "نَفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ" جمع مؤنث کا صیغہ ہے جس کا اطلاق لبید پر نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ واحد مذکر ہے۔ وہ "پھونکیں مارنے والا" تو ہو سکتا ہے "پھونکیں مارنے والیاں" نہیں ہو سکتا۔ اس لئے لبید کی مفروضہ بہنوں کو ساتھ شامل کر لیا گیا تاکہ گانٹھوں میں پھونکیں مارنے والیاں دستیاب ہو سکیں۔

اللہ میری توبہ! کیا تہہ در تہہ فنکاریاں اور عیاریاں ہیں---!!! اگر عشقِ مصطفیٰ ﷺ رہنما نہ ہو تو آدمی ان بھول بھلیوں میں کھو کر رہ جائے۔

(ب)---مصری جادوگروں کو کامیابی کی صورت میں قرب شاہی کی نوید سنائی گئی، جبکہ خستہ حال لبید کے ساتھ صرف تین دینار پر سودا طے ہوگیا۔

(ج)---اطراف واکناف سے اکٹھے کئے گئے متعدد بڑے بڑے جادوگروں نے اپنی پوری توانائیاں صرف کردیں مگر اول تو موسیٰ علیہ السلام پر کوئی اثر ہی نہیں ہوا---اور اگر فرض کرلیا جائے کہ کچھ اثر ہوا بھی تھا تو وہ بہرحال وقتی تھا، جبکہ رسول اللہ ﷺ کو صرف ایک جادوگر نے پورے ایک سال تک جادو کے جال میں جکڑے رکھا۔

(د)---موسیٰ علیہ السلام نے صرف اندیشہ محسوس کیا، جبکہ رسول اللہ ﷺ کئی طرح کے ذہنی اور جسمانی عوارض میں مبتلا ہوگئے۔

(ھ)---موسیٰ علیہ السلام نے جونہی خوف محسوس کیا، بغیر کسی دعا کے ازخود وحی نازل ہوگئی، جبکہ رسول اللہ ﷺ کو باربار دعا کرنی پڑی۔

(ذ)---موسیٰ علیہ السلام جادوگروں کے کرتب دیکھ کر ذرا سا خوفزدہ ہوئے تو اسی وقت ان کو تسلی دے دی گئی، جبکہ رسول اللہ ﷺ کو سحر کے اثرات سے نجات پانے کیلئے کامل ایک برس تک انتظار کرنا پڑا۔

(ز)---موسیٰ علیہ السلام کی تشفی کے لئے اللہ تعالیٰ خود ان سے مخاطب ہوا، جبکہ رسول اللہ ﷺ کو خواب میں فرشتوں کے ذریعے آگاہ کیا گیا۔

(ح)---موسیٰ علیہ السلام کے عصا نے چند لمحوں میں ہر قسم کے جادو کو فنا کردیا، جبکہ رسول اللہ ﷺ کو پہلے کنویں سے پانی نکلوانا پڑا، پھر پتھر کے نیچے سے سامان جادو برآمد کرنے کا مرحلہ پیش آیا، پھر گانٹھیں کھولنے اور مجسمے سے سوئیاں نکالنے کی ضرورت پڑی اور اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی مسئلہ حل نہ ہوا تو اللہ تعالیٰ کو گرہیں کھلوانے کے لئے دو مستقل سورتیں اتارنی پڑگئیں۔

(ط)---موسیٰ علیہ السلام کا کمال دیکھ کر جادوگروں کے دل کی دنیا میں انقلاب برپا ہوگیا اور وہ سرِ عام ربّ العالمین پر ایمان لاتے ہوئے سجدہ ریز ہوگئے، جبکہ لبید پر اس کا کوئی اثر مرتب نہیں ہوا اور صدق دل سے ایمان لانا تو درکنار، اس نے اپنی اس حرکت پر

کسی قسم کی ندامت اور پشیمانی کا اظہار بھی نہیں کیا۔

اب آپ ہی بتائیے محترم قارئین! کہ اس پس منظر کو ملحوظ رکھتے ہوئے کون افضل و برتر ثابت ہوتا ہے؟

حبیب اللہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

--- یا ---

کلیم اللہ حضرت موسیٰ علیہ السلام؟؟

سچ کہا ہے علامہ جصاص رازی نے

وَمِثْلُ هٰذِهِ الْاَخْبَارِ مِنْ وَضْعِ الْمُلْحِدِیْنَ --- اس طرح کی تمام روایتیں ملحدین (بے دینوں) کی گھڑی ہوئی ہیں۔

یوں تو ملحدین نے بے شمار روایتیں گھڑی ہیں مگر جس ملحد نے اس کہانی کا تانا بانا بُنا ہے اس کی بے مثال ذہانت و فطانت کی داد دینی پڑتی ہے کہ اس نے موسیٰ علیہ السلام اور جادوگروں کے مقابلے سے متعلق تمام آیات کو ذہن میں رکھ کر رسول اللہ ﷺ پر جادو کئے جانے کی ایسی داستان تخلیق کی ہے جس کے لفظ لفظ سے رسول اللہ ﷺ پر موسیٰ علیہ السلام کی فوقیت و برتری ظاہر ہوتی ہے مگر یہ کام اتنی مہارت اور صفائی سے کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو افضل الرسل ماننے والی امت کے بہت سے افراد بھی اس دام ہم رنگ زمین کا شکار ہو گئے اور ایسی فرضی کہانی پر یقین کر بیٹھے کہ اگر اس کو درست تسلیم کر لیا جائے تو رسول اللہ ﷺ کا باقی انبیاء --- خصوصاً حضرت موسیٰ علیہ السلام --- سے افضل ہونے کا عقیدہ از خود ختم اور کالعدم ہو جاتا ہے کیونکہ اس طرح صرف ایک واقعہ سحر میں نو وجوہات سے موسیٰ علیہ السلام کی برتری ثابت ہو جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے علامہ جصاص رازی جیسے فضلاء کو جنہوں نے بروقت اس حقیقت کا ادراک کر لیا اور غیر محسوس طور پر شانِ رسالت گھٹانے والی ایسی تمام کہانیوں کو صاف لفظوں میں یکسر جعلی، خود ساختہ اور من گھڑت قرار دے دیا۔

اب ایک اور پہلو سے ان روایات کا جائزہ لیتے ہیں۔

فرض کر لیجئے کہ ان روایات کا اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا٥ سے کوئی تعارض نہیں ہے۔

فرض کر لیجئے کہ یہ روایتیں لَا یُفْلِحُ السَّاحِرُ حَیْثُ اَتٰی٥ کے خلاف بھی نہیں پڑتی ہیں۔

فرض کر لیجئے کہ ان کے متن میں قطعاً کوئی تضاد نہیں ہے۔

فرض کر لیجئے کہ ان کی سندیں بھی ہر قسم کی خامی سے مکمل طور پر پاک ہیں۔

فرض کر لیجئے کہ سفیان ابن عیینہ نے اپنی طرف سے ان میں ذرا برابر کوئی اضافہ نہیں کیا۔

فرض کر لیجئے کہ ان روایتوں کا ایک ایک لفظ ہشام نے خود اپنے کانوں سے عروہ سے سنا ہے۔

مختصر یہ کہ فرض کر لیجئے کہ یہ روایتیں اعلیٰ پائے کی صحیح اور انتہا درجے کی قوی اور مضبوط ہیں۔

اس کے باوجود

زیرِ بحث مسئلۂ سحر میں ان سے استدلال نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ ''اخبار آحاد'' (۱) ہیں اور اخبار آحاد خواہ کتنی ہی قوی اور صحیح کیوں نہ ہوں، ان کو قطعی اور یقینی اعتقادیات کے لئے دلیل نہیں بنایا جا سکتا، جبکہ رسول اور نبی کا جادو سے متاثر ہو سکنا یا نہ ہو سکنا عقیدے کا مسئلہ ہے اور عقائد ثابت کرنے کے لئے یا تو قرآن کریم سے دلیل پیش کی جا سکتی ہے یا حدیث متواتر سے۔ اخبار آحاد کے ساتھ ہرگز کوئی یقینی عقیدہ ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

علامہ تفتازانی لکھتے ہیں

---

(۱) وہ حدیث جس کو روایت کرنے والے ہر دور میں اتنے زیادہ ہوں کہ ان سب کا جھوٹ اور غلطی پر متفق و مجتمع ہونا ناممکن ہو ''حدیث متواتر'' کہلاتی ہے۔ اس کے علاوہ باقی سب اخبار آحاد ہیں۔

''خَبَرُ الْوَاحِدِ، عَلٰی تَقْدِیْرِ اِشْتِمَالِهٖ عَلٰی جَمِیْعِ الشَّرَائِطِ الْمَذْکُوْرَةِ فِیْ اُصُوْلِ الْفِقْهِ، لَا یُفِیْدُ اِلَّا الظَّنَّ، وَلاَ عِبْرَةَ بِالظَّنِّ فِیْ بَابِ الْاِعْتِقَادِ.''(۱)

(خبر واحد میں اگر صحت کی وہ تمام شرائط پائی جائیں جو اصولِ فقہ میں مذکور ہیں، تب بھی وہ صرف ظن وگمان کا فائدہ دیتی ہے (نہ کہ یقین کا) اور گمان کا اعتقادی مسائل میں کوئی اعتبار نہیں۔)

یہ تمام امت کا متفقہ عقیدہ ہے کہ معجزے پر جادو اثر انداز نہیں ہوسکتا اور یہ روایات اس یقینی اور اجماعی عقیدے کے خلاف ہیں کیونکہ ان کو درست تسلیم کرنے کی صورت میں رسول اللہ ﷺ کی معجزانہ قوتوں کا، ساحرانہ قوتوں سے مغلوب ہونا لازم آتا ہے، جیسا کہ سابقہ صفحات میں ہم وضاحت سے بیان کر آئے ہیں اور یہ طے شدہ حقیقت ہے کہ محض ظن و گمان کی بنیاد پر قطعی یقینی اور اجماعی عقائد کو ترک نہیں کیا جاسکتا---اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا ٥

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صحیح صورت حال کیا ہے---؟ کیا سرورِ عالم ﷺ پر جادو کیۓ جانے کا واقعہ سرے سے پیش ہی نہیں آیا یا کچھ نہ کچھ ہوا تھا اور بعد میں بات کا بتنگڑ بنا دیا گیا؟

جواباً عرض ہے کہ ہمارا مدعا صرف اتنا ہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر جادو اثر انداز نہیں ہوسکتا اور ایک لبید ہی کیا، اگر انسانوں اور جنات کے سارے شیاطین مل کر بھی جادو کرتے تب بھی آپ پر ذرہ برابر اثر نہ ہوتا کیونکہ وہ سب کچھ جادوگروں کا مکر ہوتا اور ہمارے کانوں میں یہ آیت رس گھول رہی ہے۔

اِنَّمَا صَنَعُوْا کَیْدُ سَاحِرٍ وَّلَا یُفْلِحُ السَّاحِرُ حَیْثُ اَتٰی ٥

(انہوں نے جو کچھ بنایا وہ جادوگر کا مکر ہے اور جادوگر کامیاب نہیں ہوسکتا، خواہ

(۱) شرح عقائد نسفی، بحث تعداد الانبیاء ص ۱۰۱.

کہیں بھی چلا آئے۔)

رہی یہ بات کہ آپ پر جادو کیا گیا تھا یا نہیں؟ تو اس سلسلے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ روایات سحر کی جو حالت ہے وہ سابقہ اوراق میں بخوبی واضح ہو چکی ہے، تاہم روایات کی کثرت کے پیشِ نظر غالب امکان یہی ہے کہ جادو تو کیا گیا تھا، مگر اس کا آپ پر اثر ہرگز نہیں ہوا تھا، نہ ہو سکتا تھا۔ اسی امکان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے علامہ جصاص رازی لکھتے ہیں۔

وَجَائِزٌ اَنْ تَكُوْنَ الْمَرْأَةُ الْيَهُوْدِيَةُ بِجَهْلِهَا فَعَلَتْ ذٰالِكَ ظَنًّا مِنْهَا بِاَنَّ ذَالِكَ يَعْمَلُ فِيْ الْاَجْسَادِ، وَ قَصَدَتْ بِهِ النَّبِيَّ ﷺ فَاطَّلَعَ اللّٰهُ نَبِيَّه' مَوْضِعَ سِرِّهَا وَاَظْهَرَ جَهْلَهَا فِيْمَا ارْتَكَبَتْ وَظَنَّتْ، لِيَكُوْنَ ذٰالِكَ مِنْ دَلَائِلِ نُبُوَّتِهٖ، لَا اَنَّ ذَالِكَ ضَرَّه' وَ خَلَّطَ عَلَيْهِ اَمْرَه'. (۱)

(ہو سکتا ہے کہ کسی یہودی عورت (یا مرد) نے جہالت کی وجہ سے یہ کام کیا ہو اور اس کا خیال ہو کہ جادو جسم پر اثر انداز ہوتا ہے اس لئے نبی ﷺ پر جادو کر ڈالا، تو اللہ نے اپنے نبی کو اس جگہ سے آگاہ کر دیا ہو جہاں اس نے جادو چھپایا تھا اور واضح کر دیا ہو کہ اس نے جو کچھ سوچا اور کیا تھا وہ محض اس کی جہالت تھی۔ یہ آگاہی آپ کو اس لئے بخشی گئی تا کہ یہ آپ کی نبوت کے دلائل میں سے ہو، نہ یہ کہ جادو نے آپ پر اثر کیا تھا اور آپ کی یاد داشت کا معاملہ خلط ملط کر دیا تھا۔)

علامہ جصاص کی بیان کردہ اس امکانی صورت کو پیش نظر رکھیں تو صورت حال کا ذہن میں جو خاکہ بنتا ہے اس کے مطابق اگر بخاری کی روایت سے جادو کے اثرات والا حصہ حذف کر دیا جائے تو باقی روایت بحیثیت مجموعی درست ہو جاتی ہے؛ البتہ رسول اللہ ﷺ کے بار بار دعا کرنے کا پس منظر وہ نہیں رہے گا جو روایت میں مذکور ہے؛ بلکہ واقعہ یوں پیش آیا ہوگا کہ جب یہودی منافقین نے لبید کے پاس آ کر اس کو جادو کرنے پر آمادہ کیا

(۱) احکام القرآن، ج ۱، ص ۴۹.

ہوگا تو جانِ دوعالم ﷺ کو بھی اطلاع ہوگئی ہوگی کہ منافقین کچھ گٹھ جوڑ کررہے ہیں لیکن یہ پتہ نہ چل سکا ہوگا کہ انہوں نے کیا سازش تیار کی ہے اور لبید کا اس میں کیا کردار ہے۔ اس لئے آپ نے حقیقت سے آگاہی کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کی ہوگی اور اللہ تعالیٰ نے دوفرشتوں کے مکالمے کے ذریعے آپ کو مطلع کردیا ہوگا کہ لبید نے جادو کیا ہے اور فلاں کنویں میں دفن کیا ہے۔ رہا جادو کو کنویں سے نکالنے کا مسئلہ، تو اس بارے میں نہ فرشتوں نے کچھ کہا، نہ آپ نے نکلوایا، نہ نکلوانے کی ضرورت تھی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسی عافیت عطا فرما رکھی تھی کہ جادوٹونے آپ پر اثر انداز نہیں ہوسکتے تھے۔

اگر یہ واقعہ صرف اتنا ہی پیش آیا ہو تو اس سے شانِ نبوت پر کوئی حرف نہیں آتا اس لئے اس حد تک مان لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس کے علاوہ باقی سب کہانیاں ہیں جو مختلف داستان طرازوں نے اپنے اپنے مفادات اور تخیلات کے مطابق تیار کی ہیں اور کہانیاں تو دوستو! کہانیاں ہی ہوتی ہیں۔ ان پر عقائد کی بنیاد بہرحال نہیں رکھی جاسکتی۔

هٰذَا مَاعِنْدِیْ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَاب، وَاِلَیْهِ الْمَرْجِعُ وَالْمَآب.

آخر میں اہل علم سے گزارش ہے کہ اس تحقیق میں اگر کوئی غلطی، خامی یا جھول محسوس فرمائیں تو اپنے قیمتی اوقات میں سے تھوڑا سا وقت نکال کر راقم کو ضرور آگاہ کریں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو اجر اور جزائے خیر دے گا۔ والسلام

اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِکْ عَلیٰ سَیِّدِنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّدٍ بِعَدَدِ کُلِّ ذَرَّۃٍ اَلْفَ مَرَّۃٍ وَ عَلیٰ آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْن، بِرَحْمَتِکَ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْن.

ہم غریبوں کے آقا پہ بے حد درود
ہم فقیروں کی ثروت پہ لاکھوں سلام

❂❂❂

نعت

نعیم صدیقی

تو رسولِ حق ، تو قبولِ حق ، ترا تذکرہ ہے فلک فلک
تو ہے مصطفیٰ ، تو ہے مجتبیٰ ، ترا نعت خواں ہے مَلک مَلک
نہ زمیں ہی میری قرارگہ ، نہ فلک ہی منزلِ جذبِ دل
بڑی دیر سے ہے مرا سفر تری یاد سے تری یاد تک
یہ طبق ترا ، وہ طبق ترا ، یہ افق اِدھر ، وہ افق اُدھر
تری جلوہ گاہیں ہزار ہیں ، کبھی یاں چمک ، کبھی واں جھلک
ترے سب زماں ، ترا کل مکاں ، ترے مہر و مہ ، تری کہکشاں
تو اِدھر سے اٹھ ، تو اُدھر سے آ ، تو یہاں چمک ، تو وہاں دمک
ابھی غار میں ، ابھی بدر میں ، ابھی فرش پر ، ابھی عرش پر
کبھی وہ ادا ، کبھی یہ ادا ، کبھی وہ جھلک ، کبھی یہ جھلک
مری پیاس ہے کئی قسم کی ، مری پیاس ہے نئی قسم کی
کبھی بن کے ایک گھٹا برس ، کبھی چاندنی کی طرح چھٹک
وہ جو تونے خُم سے مرے لئے ، کوئی چاندنی سی انڈیل دی
ہے کئی صدی کا یہ واقعہ ، مرے جام میں ہے ابھی چمک
ادب ، انکسار ، غنا ، حیا ، غمِ حشر ، صدق و صفا ، دعا
جو یہ سات رنگ ہوئے بہم ، تری شخصیت کی بنی دھنک
ترے غم کی جس کو مِلی کسک ، نہ رہا اسے کوئی اور غم
اسے اور کچھ نہیں چاہئے ، ترے غم کی جس کو ملی کسک

❁❁❁

باب ۱۲

انبیاء کے سرتاج کا سفرِ معراج

از

﴿سُبحَانَ الَّذِیٓ اَسرٰی﴾

تا

﴿فَکَانَ قَابَ قَوسَینِ اَو اَدنیٰ﴾

اللہ اللہ! یہ علوِ خاص عبدیت رضاؔ!
بندہ ملنے کو قریبِ حضرتِ قادر گیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(قارئینِ کرام! ہم نے "سیدالورٰی" جلد اول میں وعدہ کیا تھا کہ جب جانِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل و معجزات کا ذکر آئے گا، تو واقعۂ معراج بھی تفصیل سے بیان کر دیا جائے گا۔ آج بحمد اللہ اس وعدے کے ایفا کا دن ہے، مگر اس مبارک سرگذشت کے آغاز سے پہلے چند معراجیہ اشعار گنگنا لیجئے، تاکہ لُطف دوبالا ہوجائے۔ یوں تو معراج کے موضوع پر متعدد نعتیہ نظمیں کھی گئی ہیں مگر "میلاد اکبر" سے ماخوذ یہ اشعار منظر کشی و محاکات، سلاست و روانی اور پُر تاثیر و عام فہم ہونے کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہیں۔)

آج کی رات

محمد اکبر وارثی (مرحوم)

دونوں عالم ہیں نورٌ علیٰ نور کیوں ؟ کیسی رونق فزا آج کی رات ہے
یہ مسرت ہے کس سے ملاقات کی ؟ عید کا دن ہے، یا آج کی رات ہے
وہ حبیب خدا ، سیدالمرسلیں ، خاتم الانبیاء شاہِ دنیا و دیں
بزمِ قوسین میں ہوں گے مسند نشیں، جشن معراج کا آج کی رات ہے
خواب راحت میں تھے اُمِ ہانی کے گھر، آ کے جبریل نے یہ سنائی خبر
چلئے چلئے شہنشاہِ والا گہر ، حق کو شوقِ لقا آج کی رات ہے
باغِ عالم میں بادِ بہاری چلی ، سرورِ انبیاء کی سواری چلی
یہ سواری سوئے ذاتِ باری چلی ، ابرِ رحمت اٹھا آج کی رات ہے
ہر طرف نور و رحمت کی برسات ہے، دائیں بائیں فرشتوں کی بارات ہے
سر پہ نورانی سہرے کی کیا بات ہے ، شاہ دولھا بنا آج کی رات ہے
کون جاتا ہے؟ سلطانِ دنیا و دیں! کس طرف؟ عرش پر ذاتِ حق کے قریں!
لینے آئے ہیں یہ کون؟ روح الامیں! کب ہے وصل خدا؟ آج کی رات ہے
عطرِ رحمت فرشتے چھڑکتے چلے ، جس کی خوشبو سے رستے مہکتے چلے
چاند تارے جلو میں چمکتے چلے ، کہکشاں زیرِ پا آج کی رات ہے
اور نبیوں کا یہ مرتبہ ہی نہیں ، عرشِ اعظم پہ کوئی گیا ہی نہیں
ایسا رتبہ کسی کو ملا ہی نہیں ، جیسا رتبہ ترا آج کی رات ہے
خلوتِ خاص میں یہ حضوری ہوئی ، قرب ہی قرب تھا ، دُور دُوری ہوئی
تھی جو دل میں تمنا وہ پوری ہوئی ، دیدۂ شوق وا آج کی رات ہے
ہر مرادِ دلی حق سے ملتی رہی ، واپس آئے ، کلی دل کی کھلتی رہی
بستر ا گرم ، زنجیر ہلتی رہی ، یہ عجب معجزا آج کی رات ہے

زمعراجش چه مے پرسی که سُبحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی

قارئین کرام! سفر معراج جانِ دو عالم ﷺ کے ان خصوصی فضائل میں سے ہے جن میں آپ کا کوئی سہیم و شریک نہیں ہے۔ اعلیٰ حضرتؒ نے اللہ تعالیٰ کو مخاطب کرتے ہوئے کیا خوبصورت شعر کہا ہے---!

تَبَارَکَ اللہ ہے شان تیری، تجھی کو زیبا ہے بے نیازی
کہیں تو وہ جوشِ لَنْ تَرَانِیْ، کہیں تقاضے وصال کے تھے

یہ واقعہ ایسے محیر العقول مشاہدات پر مشتمل ہے کہ کوئی دوسری آنکھ ان کو دیکھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ صرف جانِ دو عالم ﷺ کی چشمانِ مقدسہ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے رب کی بڑی نشانیوں کو دیکھا اور اس شان سے دیکھا کہ ان کی قوتِ برداشت کی داد خود رب العالمین نے ان پُرشکوہ الفاظ میں دی

﴿مَازَاغَ الْبَصَرُ وَ مَاطَغٰیo لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیَاتِ رَبِّہِ الْکُبْرٰیo﴾

(نہ وہ آنکھ درماندہ ہوئی، نہ حد سے متجاوز ہوئی۔ بلاشبہ اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔)

قدیم زمانے میں یہ بحثیں چلتی رہی ہیں کہ معراج جسمانی تھی یا روحانی---؟ اگر روحانی تھی تو یہ خواب کی کوئی قسم تھی جو نیند کے دوران نظر آئی، یا کشفی مشاہدہ تھا جو حالتِ بیداری میں آپ نے دیکھا---؟

ان بحثوں کا ایک سبب تو الفاظِ روایات کا اختلاف تھا؛ لیکن اصل وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں کرۂ ہوا، کرۂ نار اور افلاک وغیرہ کے بارے میں یونانی فلسفیوں کے بے حقیقت اور باطل نظریات لوگوں کے ذہنوں پر چھائے ہوئے تھے اور ان کو جسمانی معراج ایک ناقابلِ یقین سی بات لگتی تھی مگر آج کل سائنسی دور میں ان پژمردہ اور فرسودہ خیالات میں کون سر کھپائے اور کیوں سر کھپائے---؟!

چاند پر اترنے کی بات پرانی ہو چکی، اب تو انسانوں کے بھیجے ہوئے راکٹ دیگر

جہانوں کی تلاش میں فضا کی لامتناہی پہنائیوں کو چیرتے ہوئے مسلسل محوِ سفر ہیں اور لاکھوں میل کے فاصلے طے کرتے ہوئے آگے ہی آگے بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔

یہ سب کچھ ہم آئے دن اخبارات میں پڑھتے ہیں اور نہ کسی کو اس پر حیرت ہوتی ہے، نہ کوئی اس کا انکار کرتا ہے؛ بلکہ اب تو سائنسدانوں نے ایک ایسا نظریہ پیش کیا ہے جس نے معراج کے بارے میں جو تھوڑا بہت الجھاؤ ہو سکتا تھا، اس کو بھی یکسر رفع کر دیا ہے اور اس کی حقانیت کو آفتاب نیمروز کی طرح واضح کر دیا ہے۔

سائنسدان یہ کہہ رہے ہیں کہ

''اگر کسی چیز کی رفتار روشنی کی رفتار سے زیادہ ہو جائے تو وہ چیز ''زمانے'' کی قید سے آزاد ہو جاتی ہے۔''

یعنی اگر کوئی ایسا طیارہ فرض کیا جائے جس کی سپیڈ ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ سے زیادہ ہو اور اس پر بیٹھ کر کوئی شخص سفر شروع کرے تو وہ زمانے کی حد بندیوں سے آزاد ہو جائے گا اور اس رفتار سے سفر کرتے ہوئے خواہ اس کو سو سال لگ جائیں، جب وہ واپس آئے گا تو یہاں زمین پر ٹھیک وہی وقت ہو گا جس میں وہ روانہ ہوا تھا۔

سائنسدانوں کے لئے تو ابھی تک یہ ایک مفروضہ ہی ہے؛ لیکن مسلمانوں کے نزدیک یہ امرِ واقعہ ہے جو آج سے چودہ سو سال قبل ظہور پذیر ہو چکا ہے۔ یعنی جب جانِ دو عالم ﷺ کی سواری کے لئے براق لایا گیا کیونکہ حدیث کے مطابق اس کی رفتار کا یہ عالم تھا کہ جہاں تک اس کی نگاہ کام کرتی تھی وہاں تک اس کا ایک قدم ہوتا تھا۔

رات کو آسمان کی طرف دیکھیں تو کروڑوں میل کی دوری پر واقع ستاروں تک آدمی کی نگاہ اٹھنے کے ساتھ ہی پہنچ جاتی ہے۔ یہ تو ہماری نگاہ کی بات ہے، براق کی نگاہ اللہ جانے کہاں تک پہنچتی ہو گی---! اور اس قدر طویل فاصلے اگر براق ایک قدم میں طے کر لیتا ہے تو اس کی مجموعی رفتار کا آپ خود ہی اندازہ کر لیجئے---! یہ تو کرڑوں میل فی سیکنڈ بن جاتی ہے۔ اسی لئے جب جانِ دو عالم ﷺ وہاں نہ جانے کتنا وقت صرف کر کے واپس تشریف لائے تو یہاں ٹھیک وہی وقت تھا، جب آپ نے سفر کا آغاز کیا تھا۔

کنڈی ہلتی رہی ، گرم بستر رہا
عرش تک جاکے آ بھی گئے مصطفٰے

غرضیکہ سائنس کی ترقی وفروغ نے معراج جسمانی جیسے ایمانی حقائق کواس طرح واضح اور مبرہن کردیا کہ اب جسمانی وروحانی کی بحثیں بچگانہ سی نظر آتی ہیں۔لیکن اتنا بتادینا فائدے سے خالی نہیں ہوگا کہ صحابہ کرام کی عظیم اکثریت اور جمہور امت اگرچہ معراج جسمانی کے قائل ہیں؛ تاہم بعض صحابہ اور بزرگانِ دین سے معراج روحانی کی روایات بھی منقول ہیں۔ ہمارے نزدیک نہ تو معراجِ جسمانی ماننے سے کوئی الجھن واشکال پیدا ہوتا ہے، نہ روحانی تسلیم کرنے سے جانِ دوعالم ﷺ کی شانِ رفیع میں کوئی کمی واقع ہوتی ہے، کیونکہ اس صورت میں یہ ایک قسم کا روحانی مشاہدہ ہوگا جس میں ہر چیز اپنی اصلی حالت میں نظر آتی ہے۔نہ کہ اس طرح کا خواب جس میں دکھائی کچھ اور دیتا ہے اور تعبیر کچھ اور ہوتی ہے، اور چند لمحوں میں عرش سے فرش تک پوری کائنات کا ایسا صحیح درست اور عین الیقین مشاہدہ کرلینا بھی کچھ کم رفعت وعظمت نہیں ہے؛ تاہم یہ نظریہ اجماعِ امت کے خلاف ہے۔

بہرحال ہم ایسی تمام بحثوں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اصل واقعے کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

واضح رہے کہ سفر معراج کی سرگذشت کو اس انداز سے ترتیب دینے میں ہم علامہ زرقانی کے ممنون ہیں جنہوں نے شرح مواہب کے مقصد خامس میں معراج کی روایات کو انتہائی خوبصورتی سے جمع کردیا ہے۔

اَللّٰھُمَّ اھدنا سبیل الرشاد و وفقنا للسداد بحرمة سیدا لعباد صلی اللہ علیه وعلیٰ اله واصحابه الاخیار الامجاد.

وہ ایک رات تھی (۱) ایسی رات کہ جب سے طلوع وغروب کا نظام قائم ہوا ہے،

---

(۱) کس دن کی رات تھی---؟ مہینہ کونسا تھا---؟ سال کونسا تھا---؟ ان باتوں کا صحیح روایات میں کوئی ذکر نہیں ہے۔اسی لئے مؤرخین کا ان کے تعین میں شدید اختلاف ہے۔عام طور پر مشہور یہی ہے کہ ہجرت سے کچھ پہلے ماہِ رجب کی ستائیس تاریخ اور سوموار کی رات تھی۔

اس طرح کی جلوہ بار رات کوئی نہیں آئی تھی۔(۱) جانِ دو عالم ﷺ بیت اللہ کے ایک حصے میں جس کو حطیم کہا جاتا ہے، لیٹے ہوئے تھے۔آپ کے چچا حضرت حمزہؓ اور آپ کے چچا زاد حضرت جعفر طیارؓ بھی آپ کے دائیں بائیں محوِ خواب تھے۔(۲)

جب آپ کی آنکھوں میں بھی نیند کی حلاوت گھلنے لگی اور چشمہائے نرگسیں بند ہونے لگیں تو اچانک آسمان سے تین فرشتے اُتر آئے۔(۳) ان میں سے ایک نے ان تینوں حضرات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دوسرے سے پوچھا

''ہماری مطلوبہ ہستی کون سی ہے؟''

دوسرے نے جواب دیا---''وہ جو دونوں کے درمیان محوِ استراحت ہے اور وہی سب سے بہتر ہے۔''

تیسرے نے کہا---''اسی بہتر ہستی کو ہم نے لے کر جانا ہے۔''

اس گفتگو کے بعد فرشتے واپس چلے گئے۔دوسری رات پھر آئے اور اسی طرح باتیں کر کے چلے گئے۔(۴)

---

(۱) علماء کرام میں اختلاف رہا ہے کہ لیلۃ القدر افضل ہے یا لیلۃ المعراج؟ شیخ ابو امامہؒ نے اس مسئلہ میں بہت عمدہ تصفیہ کیا ہے۔انہوں نے فرمایا کہ جہاں تک امت کا تعلق ہے تو اس کے لئے لیلۃ القدر افضل ہے کیونکہ وہ ہر سال آتی ہے اور اس میں عبادت ہزار مہینوں کی عبادت سے بہتر ہے؛ جب کہ لیلۃ المعراج کی ایسی کوئی فضیلت قرآن وسنت سے ثابت نہیں ہے؛ البتہ جہاں تک جانِ دو عالم ﷺ کا تعلق ہے تو آپ کے لئے لیلۃ المعراج بلاشبہ لیلۃ القدر سے افضل تھی کیونکہ اس رات آپ پر ایسے ایسے انعامات کئے گئے جو نہ کسی مقرب فرشتے پر ہوئے نہ کسی نبی ورسول پر۔

(۲) یہ قریش کا معمول تھا کہ وہ کعبہ کے گرد رات کو آرام کیا کرتے تھے اور روایت معراج سے معلوم ہوتا ہے کہ جانِ دو عالم ﷺ کے دائیں بائیں عموماً حضرت حمزہؓ اور حضرت جعفرؓ ہی لیٹا کرتے تھے۔

(۳) ایک جبرائیل اور دوسرے دو اسرافیل ومیکائیل تھے علیہم السلام۔

(۴) دو دن آنے جانے اور جانِ دو عالم ﷺ کے روبرو اس طرح کی باتیں کرنے سے غرض یہ تھی کہ آپ کو ذہنی طور پر اس سفر کے لئے پہلے سے تیار کر دیا جائے۔

تیسری رات جانِ دوعالم ﷺ اپنی چچازاد اُم ہانیؓ کے گھر ٹھہرے ہوئے تھے اور ایک کمرے میں آرام فرمارہے تھے کہ اچانک اوپر سے چھت کُھل گئی اور جبریل امین اندر اُتر آئے۔ جبریل کی آمد سے آپ اُٹھ گئے تو جبریل آپ کو مسجد حرام لے آئے۔(۱)

نیند کا اثر ابھی تک مزاج عالی پر باقی تھا اس لئے مسجد میں پہنچ کر وہیں لیٹ گئے جہاں عموماً استراحت فرمایا کرتے تھے۔

تھوڑی دیر بعد آپ نے پھر وہی منظر دیکھا جو گذشتہ دو دنوں سے دیکھتے آئے تھے مگر اب کی بار فرشتے واپس نہیں گئے ؛ بلکہ آپ کو اُٹھا کر چاہ زمزم کے پاس لے آئے۔ جبریل امین نے آپ کا سینہ مبارک کھول کر دل کو باہر نکالا اور آبِ زمزم سے دھویا(۲) پھر سونے کا ایک تھال لایا گیا جو ایمان وحکمت سے بھرا ہوا تھا، جبریل نے اس کو آپ کے دل

---

(۱) مسجد میں لانے کا مقصد یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ سے مُلاقات کے اس عظیم سفر کا آغاز اللہ تعالیٰ ہی کے گھر سے ہو، نہ کہ اُمِ ہانی کے گھر سے۔

(۲) اسی بنا پر علماء میں اختلاف رہا ہے کہ کائنات میں سب سے افضل پانی کونسا ہے؟ آبِ زمزم یا آبِ کوثر---؟ بعض کہتے ہیں کہ آبِ زمزم افضل ہے کیونکہ شبِ معراج رسول اللہ ﷺ کا دل اسی سے دھویا گیا تھا۔ اگر آبِ کوثر افضل ہوتا تو فرشتے وہ لے کر آتے کیونکہ فرشتوں کے لئے تو دونوں پانی مہیا کرنا یکساں تھا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ آبِ کوثر افضل ہے کیونکہ وہ رسول اللہ ﷺ پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہے؛ جبکہ آبِ زمزم اسمٰعیل علیہ السلام کو عطا ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو عطا کردہ تحفہ اسمٰعیل علیہ السلام کو دیئے گئے عطیے سے بدرجہا افضل ہوگا۔

فریقین کے دلائل اپنی جگہ مگر ایک اہل دل عالم نے یہ کہہ کر بات ختم کردی کہ کائنات میں سب سے افضل پانی نہ آبِ زمزم ہے، نہ آبِ کوثر ؛ بلکہ وہ پانی ہے جو رسول اللہ ﷺ کی انگشتانِ مبارکہ سے رواں ہوا تھا اور سینکڑوں خوش نصیبوں نے اسے جی بھر کر پیا تھا۔ زہے نصیب!

انگلیاں ہیں فیض پر ٹوٹے ہیں پیاسے جھوم کر

ندیاں پنجابِ رحمت کی ہیں جاری، واہ، واہ!

میں انڈیل دیا اور دل کو دوبارہ اپنی جگہ پر رکھ کر سینہ بند کر دیا۔ (۱)

سفر کی ابتدائی تیاریاں مکمل ہوگئیں تو جانِ دو عالم ﷺ کے روبرو سواری کے لئے براق (۲) پیش کیا گیا جو زین اور لگام سے آراستہ تھا۔ آپ اس پر سوار ہونے لگے تو اس نے کچھ شوخی دکھائی اور اچھلنے کودنے لگا۔ جبریل امین کو براق کی یہ حرکت آدابِ نبوت کے خلاف نظر آئی، اس لئے انہوں نے اس کی ایال پر ہاتھ رکھ کر زوردار تنبیہہ فرمائی۔

---

(۱) اس سے پہلے بچپن میں بھی آپ کا سینہ مبارک چاک کیا گیا تھا جس کی تفصیلات صفحہ ۱۲۰ پر جلد اوّل میں گزر چکی ہیں مگر اس وقت شقِ صدر کا اصل مقصد آپ کے دل سے اس حصے کو نکالنا تھا جس کے ذریعے شیطان، انسان پر اثر انداز ہوتا ہے اور شبِ معراج، شقِ صدر اس لئے کیا گیا تھا تاکہ آپ کے قلبِ انور میں اس سفر کے حیرتناک مشاہدات اور رب کریم کی تجلیات برداشت کرنے کی بھرپور قوت پیدا ہو جائے۔

رہا یہ سوال کہ ایمان و حکمت کوئی مجسم چیزیں تھوڑی ہی ہیں کہ انہیں سونے کے تھال میں رکھ کر لایا جائے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ملائکہ اس تھال کو عالم غیب سے لائے تھے اور اس جہان میں وہ چیزیں بھی مجسم ہو جاتی ہیں جو دنیا میں جسمانی وجود نہیں رکھتیں، جس طرح قیامت میں اعمال کا وزن ہوگا؛ حالانکہ دنیا میں نماز روزے کو ترازو کے پلڑے میں رکھنا اور تولنا ممکن نہیں ہے، مگر اس جہاں میں نہ صرف ممکن ہے؛ بلکہ بالیقین واقع ہونے والا ہے --- وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِنِ الْحَقّ.

(۲) یہ تو علام الغیوب ہی کو معلوم ہے یا مصطفیٰ و جبریل جانتے ہوں گے کہ براق کی حقیقت کیا تھی اور وہ مخلوقاتِ خداوندی کے کس نوع سے تعلق رکھتا تھا؛ تاہم بظاہر اس کی صورت چوپائے سے ملتی جلتی تھی۔ گدھے سے ذرا بڑا اور خچر سے قدرے چھوٹا تھا۔ رنگ چمکدار اور سفید تھا اور پہلوؤں میں دو پَر تھے۔ تیز اس قدر تھا کہ جہاں تک اس کی نگاہ کام کرتی تھی، وہاں تک ایک گام میں پہنچ جاتا تھا۔ شاید اسی لئے اس کو "براق" کا نام دیا گیا ہے۔ کیونکہ 'براق' 'برق' سے مشتق ہے۔ برق، بجلی کو کہتے ہیں اور علماء عربیت نے یہ قاعدہ بیان کیا ہے کہ حروف کا اضافہ کبھی مبالغے کا فائدہ دیتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ 'برق' میں ایک الف کا اضافہ یہی بتانے کے لئے کیا گیا ہو کہ اس کی رفتار برق سے بدرجہا زیادہ تھی۔ وَاللهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.

''شرم نہیں آتی تجھے براق!؟ یہ کیا حرکت کی ہے تو نے اور تجھے اس کی جرأت کیسے ہوئی ---؟ اللہ کی قسم! جب سے تیری تخلیق ہوئی ہے، تجھے کسی ایسی ہستی کی سواری بننے کی سعادت حاصل نہیں ہوئی جو اللہ کے نزدیک محمد ﷺ سے زیادہ مکرم ہو۔''

یہ سن کر براق ندامت سے پسینے پسینے ہوگیا، خوف سے کانپنے لگا اور فی الفور اپنے پیٹ کو زمین سے لگا دیا، تاکہ جانِ دوعالم ﷺ بآسانی سوار ہوجائیں۔(۱)

جانِ دوعالم ﷺ اس پر بیٹھ گئے تو بصد عزت واحترام ایک طرف سے جبریل نے رکاب تھام لی اور دوسری جانب سے میکائیل نے مگر تھوڑی سی مشایعت کے بعد جبریل خود بھی براق پر بیٹھ گئے اور گائیڈ کے فرائض انجام دینے لگے۔(۲)

---

(۱) یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے --- کیا براق جانِ دوعالم ﷺ کو نہیں پہچانتا تھا کہ جب آپ اس پر سوار ہونے کے لئے آگے بڑھے تو اس نے اچھلنا کودنا شروع کردیا ---؟

جواباً عرض ہے کہ براق آپ کو یقیناً جانتا تھا اور آپ کی عظمتوں سے بھی بخوبی آگاہ تھا، مگر اس کی اچھل کود اور شوخیاں دکھانا اس لئے نہیں تھا کہ وہ آپ کی سواری بننے سے ہچکچا رہا تھا؛ بلکہ اصل وجہ یہ تھی کہ وہ جانِ دوعالم ﷺ کو اپنی طرف آتے دیکھ کر خوشی سے بے قابو ہوگیا تھا اور فرطِ مسرت وابتہاج سے جھوم اٹھا تھا اور ناچ اٹھا تھا، مگر جبریل کی باریک بین نگاہوں نے اس طرح وارفتۂ ہوش ہو جانے کو بھی آدابِ بارگاہ رسالت کے منافی سمجھا اور براق کو سختی سے ڈانٹ دیا۔ براق کو بھی اپنی کوتاہی کا فوراً احساس ہوگیا اور اس کا خوبصورت جسم عرقِ انفعال میں ڈوب گیا۔

(۲) اس سفر کی باگ ڈور بظاہر جبریل کے ہاتھ میں تھی مگر درحقیقت اللہ تعالیٰ کے دستِ قدرت میں تھی کیونکہ جبریل ازخود کوئی کام نہیں کرتے؛ بلکہ ان کا ہر عمل حکمِ الٰہی کے ماتحت ہوتا ہے۔ وہ لازماً اللہ تعالیٰ سے پوری ہدایات لے کر آئے ہوں گے کہ کس راستے سے جانا ہے؟ کہاں ٹھہرنا ہے اور کہاں نہیں ٹھہرنا؟ کس جگہ تنہا نماز پڑھنی ہے اور کس جگہ باجماعت؟ کون سے مشاہدات حقیقی طور پر کرانے ہیں اور کون سے تمثیلی انداز میں؟

غرضیکہ اس مقدس سفر کے تمام لائحہ عمل سے جبریل ہی صحیح طور پر آگاہ تھے، اس لئے محبوب رب العلمین کے لئے گائیڈ کی خدمات انجام دینا بھی انہی کے ذمے لگایا گیا۔

روانگی کے بعد سب سے پہلے جانِ دو عالم ﷺ کی نگاہ ایک ایسی سرزمین پر پڑی جس میں کھجوریں بکثرت تھیں۔ جبریل نے کہا۔

''یہاں اتر کر کچھ نماز پڑھ لیجئے!''

آپ نماز پڑھ کر سوار ہوئے تو جبریل نے پوچھا۔

''کیا آپ جانتے ہیں کہ آپ نے کہاں نماز پڑھی ہے---؟ یہ یثرب ہے، یہ طیبہ ہے۔ ایک دن ہجرت کر کے آپ نے یہیں آنا ہے۔''

اسی طرح تین مزید مقامات پر جبریل نے آپ کو نماز پڑھنے کا کہا اور بعد میں ان جگہوں کی اہمیت بتاتے ہوئے پہلی جگہ کے بارے میں بتایا کہ یہاں وہ درخت ہے جس کی طرف سے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو آواز دی تھی کہ اے موسیٰ! میں اللہ ہوں، سارے جہانوں کا پروردگار--- ﴿یٰمُوْسٰىٓ اِنِّیْٓ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ.﴾

دوسرے مقام کے متعلق بتایا کہ یہ طورِ سینا ہے اور تیسری جگہ کے بارے میں وضاحت کی کہ یہ بیت اللحم ہے، وہ مقام جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی تھی (۱)

مزید آگے بڑھے تو اچانک دائیں طرف سے ایک آواز آئی۔

''یا محمد! میری طرف دیکھئے، میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔''

مگر جانِ دو عالم ﷺ نے کوئی توجہ نہ دی۔ پھر بائیں جانب سے یہی ندا آئی۔ آپ نے اس کی طرف بھی کوئی التفات نہ کیا۔ پھر ایک انتہائی زیب و زینت سے آراستہ عورت نے آپ کو اسی طرح پکارا مگر آپ نے سُنی اَن سُنی کر دی۔ بعد میں جبریل

---

(۱) اس سے علماء کرام نے یہ استنباط کیا ہے کہ جہاں اللہ تعالیٰ کے کسی مقرب بندے پر کوئی خاص انعام ہوا ہو، جیسے درخت کے پاس کوہ طور پر موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہمکلام ہونے کا شرف ملا تھا، یا کسی جگہ کو کسی مقدس ہستی سے کوئی خاص نسبت ہو، جیسے بیت اللحم کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جائے ولادت ہونے کا اعزاز حاصل تھا تو ایسی تمام جگہوں پر جانا، وہاں ٹھہرنا اور نماز پڑھنا جانِ دو عالم ﷺ کی سنت ہے۔

نے آپ کے اس طرزِ عمل پر پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے عرض کی کہ یارسول اللہ! پہلی پکار یہودیت کی طرف سے تھی اور دوسری نصرانیت کی جانب سے۔ اگر آپ ان کی طرف متوجہ ہو جاتے تو آپ کی امت یہودیت و نصرانیت اختیار کرلیتی۔ آراستہ عورت کے بارے میں بتایا کہ یہ دنیا تھی۔ اگر آپ اس کی طرف التفات کر لیتے تو آپ کی امت ہمہ تن دنیا میں کھو جاتی۔

ایک اور جگہ جانِ دو عالم ﷺ کو دنیا ایک سالخوردہ بُوھیا کی شکل میں نظر آئی۔ جبریل نے کہا کہ اس تمثیل کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی بھی اتنی ہی عمر باقی رہ گئی ہے جتنی اس بڑھیا کی۔

ایک سرخ ٹیلے کے قریب سے جانِ دو عالم ﷺ کا گزر ہوا۔ وہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قبر تھی۔ جانِ دو عالم ﷺ فرماتے ہیں---"میں نے موسیٰ کو دیکھا، وہ اپنی قبر میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔"(۱)

---

(۱) یہ حدیث شریف صحیح مسلم کی ہے اور علماء نے اس سے یہ استدلال کیا ہے کہ انبیاء کرام کو اپنی قبروں میں جسمانی حیات حاصل ہوتی ہے کیونکہ نماز پڑھنے کے لئے بہر حال جسم کی ضرورت پڑتی ہے؛ محض روح تو ایک لطیف شئے ہے۔ اس سے رکوع سجود متصور نہیں ہو سکتے مگر میرے خیال میں یہ دلیل ضعیف ہے کیونکہ روح اگرچہ اپنی اصلی حالت میں رکوع سجود نہیں کر سکتی؛ تاہم اس کو یہ قدرت حاصل ہے کہ جس شکل میں چاہے متمثل ہو سکتی ہے، جس طرح روح الامین بوقتِ ضرورت انسانی شکل اختیار کر لیتے ہیں، اس لئے محض نماز پڑھنے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ان کی حیات جسمانی ہو۔

بعض ذہنوں میں یہ الجھن پیدا ہوتی ہے کہ دنیا دار العمل ہے اس لئے یہاں تو نماز پڑھنا سمجھ میں آتا ہے، مگر دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد تو عمل کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ جانِ دو عالم ﷺ کا ارشاد ہے---"اِذَا مَاتَ ابْنُ اٰدَمَ، اِنقَطَعَ عَمَلُهٗ۔" (جب ابن آدم مر جاتا ہے تو اس کا عمل منقطع ہو جاتا ہے) پھر موسیٰ علیہ السلام کے قبر میں نماز پڑھنے کا کیا مطلب ہوا---؟

اس کا حل یہ ہے کہ ایک وہ عمل ہے جس پر جزا و سزا مرتب ہو، ایسے تمام اعمال تو ☜

اس عظیم مشاہداتی اور مطالعاتی سفر کے دوران جانِ دو عالم ﷺ کو انعامات الٰہیہ کی کچھ دلآویز تمثیلیں اور عذابِ الٰہی کی چند ہولناک شکلیں بھی مختلف مقامات پر دکھائی گئیں۔ کچھ زمین پر، کچھ آسمانوں کی سیر کرتے ہوئے۔ ان میں بعض مشاہدات حقیقی نوعیت کے تھے اور کچھ تمثیلی طرز کے۔

ان سب میں یہ بات مشترک ہے کہ جانِ دو عالم ﷺ جب بھی ثواب وعذاب کی کسی قسم کا مشاہدہ کرتے تھے تو پوچھتے تھے کہ جبریل! یہ کون لوگ ہیں؟ اور جبریل جواب دیتے تھے کہ یارسول اللہ! یہ وہ لوگ ہیں جو زندگی میں فلاں اچھا یا بُرا کام کرتے رہے ہیں۔

ہم نے بغرضِ اختصار صرف عذاب وثواب کے بعض انواع اور ان کے اسباب بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ نیز مختلف مقامات پر ہونے والے مشاہدات کو قارئین کی سہولت کے لئے ایک ہی جگہ پر اکٹھا کر دیا ہے۔

پہلے چند تمثیلات ملاحظہ فرمائیے!

۱---ایک جگہ بیج بوئے جا رہے تھے۔ بونے کے ساتھ ہی کونپلیں پھوٹ آتی تھیں اور لمحوں میں فصل پک کر تیار ہو جاتی تھی پھر اسی وقت کاٹ لی جاتی تھی۔

جبریل نے بتایا کہ یہ راہِ خدا میں جدوجہد کرنے والوں کے انفاق فی سبیل اللہ کی تمثیل ہے۔ یعنی جس طرح ان کھیتوں میں کاٹنے سے کوئی کمی واقع نہیں ہوتی؛ بلکہ پھر سے فصل پک کر تیار ہو جاتی ہے، اسی طرح راہ خدا میں خرچ کرنے والوں کا کچھ نقصان نہیں

مرنے کے ساتھ ہی بے شک ختم ہو جاتے ہیں؛ لیکن وہ عمل جس کا جزا و سزا کے ساتھ کوئی تعلق نہ ہو؛ بلکہ کرنے والا محض شوق والتذاذ کے لئے کرے تو ایسے اعمال ختم نہیں ہوتے؛ بلکہ جنت میں بھی جاری رہتے ہیں، جیسا کہ صحیح حدیث میں ہے کہ اہل جنت اللہ کی یاد میں مصروف رہیں گے۔ یہی صورت انبیاء کرام کی ہے کہ وہ دنیا سے انتقال کر جانے کے بعد صرف لطف اور حظ حاصل کرنے کے لئے عبادات کرتے رہتے ہیں۔ اس سے ان کو بے پایاں کیف اور مزا ملتا ہے۔

ہوتا؛ کیونکہ انہیں سات سو گنا، بلکہ اس سے بھی دگنا ثواب مل جاتا ہے۔(۱)

۲---کچھ مرد اور عورتیں دیکھیں جن کے سامنے دستر خوان بچھا تھا اور اس پر نہایت ہی عمدہ قسم کا بھنا ہوا گوشت رکھا تھا؛ جبکہ دستر خوان کے آس پاس انتہائی بدبودار اور سڑا ہوا گوشت پڑا تھا۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ وہ مرد اور عورتیں دستر خوان والا خوش ذائقہ، خوشبودار اور لذیذ گوشت نہیں کھا رہے تھے اور ارد گرد بکھرے ہوئے بدذائقہ، بدبودار اور بے مزہ گوشت کو بڑی رغبت سے نگل رہے تھے۔

جبریل نے کہا کہ یہ ایسے مرد ہیں جو اپنی حلال اور پاکیزہ بیویوں کو چھوڑ کر غیر عورتوں سے دادِ عیش دیا کرتے تھے، اور یہ ایسی عورتیں ہیں جو اپنے خاوندوں سے بے وفائی کر کے دوسروں کے پہلو گرم کیا کرتی تھیں۔

۳---ایک آدمی نے لکڑیوں کا اتنا بڑا اگٹھا جمع کر رکھا تھا کہ اس کو اٹھانا اس کے بس میں نہیں تھا، مگر ابھی وہ اور لکڑیاں اٹھا اٹھا کر لا رہا تھا اور اس میں اضافہ کر رہا تھا۔

جبریل نے بتایا کہ یہ اس شخص کی حالت ہے جس کے پاس لوگوں کی اتنی امانتیں جمع ہوگئی ہوں کہ وہ انہیں واپس کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو مگر اس کے باوجود مزید امانتیں اکٹھی کرنے میں لگا ہو۔

۴---ایک تنگ سوراخ سے توانا بیل کو نکلتے دیکھا۔ وہ بیل نکل تو آیا مگر انتہائی کوشش کے باوجود دوبارہ اس سوراخ سے نہ گزر سکا۔

جبریل نے وضاحت کی کہ یہ مثال ہے اس ناپسندیدہ اور دل آزار بات

---

(۱) قرآن کریم میں ہے ﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِىْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ۝﴾

(جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں، ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ ہو، جس سے سات سٹے اگیں اور ہر سٹے میں سو دانے ہوں اور اللہ جس کو چاہے، اس کا بھی دگنا دے دے۔ اللہ وسعت والا اور علم والا ہے۔) جانِ دو عالم ﷺ کو جو تمثیل دکھائی گئی، اس میں اسی آیت کی جانب تلمیح ہے۔

کی، جو آدمی کے منہ سے نکل جاتی ہے، پھر آدمی پشیمان ہو جاتا ہے اور چاہتا ہے کہ میں کسی طرح اس بات کو لوٹا لوں، مگر منہ سے نکلی ہوئی بات کہاں لوٹائی جا سکتی ہے۔

اب عذابِ الٰہی کے چند ہولناک انواع ملاحظہ کیجئے!(۱)

۱---کچھ لوگوں کے سر بھاری پتھروں سے کچلے جا رہے تھے۔ کچلے جانے کے ساتھ ہی وہ دوبارہ اصلی حالت میں آ جاتے اور پھر کچلے جاتے تھے۔

جبریل نے بتایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کے سر فرض نماز کی ادائیگی کے لئے نہیں اٹھتے تھے اور بوجھل ہو جاتے تھے۔

۲---کچھ لوگ چوپایوں کی طرح ہاتھوں اور پاؤں سے چل رہے تھے۔ ان کی شرمگاہوں پر آگے پیچھے چیتھڑے لٹکے ہوئے تھے اور وہ جہنم کے کانٹے دار اور بدبو دار درخت ''ضریع'' اور ''زقوم'' کھا رہے تھے اور انگارے چبا رہے تھے۔

جبریل نے بتایا کہ یہ لوگ زکوٰۃ نہیں ادا کیا کرتے تھے۔

۳---بعض افراد کے ہونٹ اور زبانیں کاٹی جا رہی تھیں، جو کٹنے کے بعد پھر اسی طرح بن جاتی تھیں۔

جبریل نے وضاحت کی کہ یہ ایسے خطیب ہیں جو فتنے اٹھایا کرتے تھے۔(۲)

۴---کچھ لوگوں کے پیٹ اس قدر بڑھے ہوئے تھے جیسے کمرے ہوتے ہیں

---

(۱) بعض علماء نے ان انواع کو بھی تمثیلات ہی قرار دیا ہے کیونکہ درحقیقت تو اس طرح کے عذاب اہل جہنم کو اس وقت دیئے جائیں گے، جب وہ قیام قیامت کے بعد جہنم میں داخل ہو جائیں گے۔ جانِ دو عالم ﷺ کو یہ سب کچھ تمثیلی طور پر پیشگی دکھا دیا گیا، تاکہ آپ اپنی امت کو ان اعمالِ بد سے صحیح طور پر ڈرا سکیں جن کی پاداش میں گنہگاروں کو ایسے لرزہ خیز عذاب جھیلنے پڑیں گے۔

(۲) آہ! کہ آج کل پسندیدہ خطیب وہی ہے جو اپنی آتش فشانی سے مجمع میں آگ لگا دے اور لوگوں کو آپس میں لڑا دے۔ بقول دائمؔ۔

گھڑی بھر کی شعلہ نوائی سے، جو لڑا دے بھائی کو بھائی سے

ہے پسند اسی کا بیاں بہت، وہی کامیاب خطیب ہے

اور ان میں بڑے بڑے سانپ پھرتے باہر سے نظر آ رہے تھے۔ وہ اٹھنا چاہتے تھے تو اٹھ نہیں پاتے تھے اور گر پڑتے تھے۔

جبریل نے بتایا کہ یہ سود خور ہیں۔

۵---اونٹوں کی طرح بڑے بڑے ہونٹوں والے انسان دیکھے جو انگارے نگل رہے تھے۔ جبریل نے کہا کہ یہ وہ ظالم ہیں جو یتیموں کا مال کھا جایا کرتے تھے۔

۶--- ایک جگہ عورتیں دیکھیں جو پاؤں سے بندھی ہوئی، الٹی لٹکی تھیں۔ کچھ پستانوں سے لٹکی تھیں۔

جبریل نے بتایا کہ یہ حرامکاری کرنے والی اور اپنی بچیوں کو قتل کرنے والی عورتیں ہیں۔

۷---بعض افراد کے پہلوؤں سے گوشت کاٹا جا رہا تھا اور انہی کو یہ کہہ کر کھلایا جا رہا تھا کہ تم دنیا میں اپنے بھائیوں کا گوشت کھایا کرتے تھے، اب اپنا گوشت کھاؤ۔

جبریل نے واضح کیا کہ یہ دوسروں کو طعنے مارا کرتے تھے اور ان کو بے عزت کیا کرتے تھے۔

جنت و دوزخ کی گفتگو سننا

ایک وادی سے گزرتے ہوئے ٹھنڈی ہوا کے ایسے معطر جھونکے محسوس کئے جن میں کستوری جیسی خوشبو رچی ہوئی تھی اور ایک خوشگوار آواز سنی۔

جبریل نے کہا کہ یہ خوشبودار ہوائیں جنت کی ہیں۔ آواز بھی اسی کی ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ سے کہہ رہی ہے---''الٰہی! اب بھیجئے نا، میرے اندر ان نیکوکار لوگوں کو جن کے بارے میں میرے ساتھ وعدہ کیا گیا ہے، کیونکہ اب تو میرے محلات، قیمتی ملبوسات، خوش ذائقہ مطعومات اور لذیذ مشروبات وغیرہ بہت بڑھ چکے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ کی جانب سے جواب آتا ہے---''ہاں! ضرور، عنقریب ہر وہ شخص تیرے اندر داخل ہوگا---خواہ مرد ہو یا عورت--- جو مجھ پر اور میرے رسولوں پر ایمان رکھتا ہو، میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتا ہو، نیک عمل کرتا ہو اور مجھ سے ڈرتا ہو۔ جو شخص مجھ سے مانگے میں اس کو عطا کرتا ہوں، جو میری راہ میں خرچ کرے میں اس کو صلہ دیتا ہوں

اور جو مجھ پر توکل کرے میں اس کے لئے کافی ہو جاتا ہوں۔ میں اللہ ہوں، وحدہٗ لاشریک ہوں، میں کبھی اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔"

ایک اور وادی سے گزرے تو بدبودار ہوا کا بھبکا آیا اور ایک ناخوشگوار آواز سنائی دی۔

جبریل نے کہا کہ یہ جہنم کی ہوائیں ہیں اور آواز بھی اسی کی ہے، جو اپنے رب سے کہہ رہا ہے۔

"الٰہی! جن بدکار لوگوں کے بارے میں مجھ سے وعدہ کیا گیا ہے، انہیں اب میرے اندر بھیجئے نا! کیونکہ میرے انواع واقسام کے عذاب، میری گہرائی اور میری گرمی بہت زیادہ ہو چکی ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے جواب دیا---"ہاں، یقیناً، جلد ہی تیرے اندر ہر اس شخص کو بھیجا جائے گا---خواہ مرد ہو یا عورت---جو میرا انکار کرتا ہو، میرے ساتھ شریک ٹھہراتا ہو، لوگوں پر ظلم وستم کرتا ہو اور روزِ جزا پر ایمان نہ رکھتا ہو۔"

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے فضل وکرم سے ہر قسم کے عذاب سے محفوظ رکھے اور جنت الفردوس کی آسائش بھری زندگی نصیب فرمائے۔ بِحُرْمَةِ النَّبِيِّ وَاٰلِهٖ.

مسجدِ اقصیٰ میں

بیت المقدس کے پاس پہنچ کر جبریل امین نے براق کو اس پتھر سے باندھا جس کے ساتھ انبیاء کرام اپنی سواریاں باندھا کرتے تھے۔ پھر جانِ دو عالم ﷺ کی معیت میں مسجد کے اندر داخل ہوئے۔ وہاں کافی تعداد میں انبیاء اور ملائکہ جمع تھے اور علیحدہ علیحدہ نوافل پڑھ رہے تھے۔ کچھ حالتِ قیام میں تھے، کچھ رکوع میں جھکے تھے اور کچھ سجدہ ریز تھے۔

جانِ دو عالم ﷺ اور جبریل نے بھی تحیۃ المسجد کی دو رکعتیں پڑھیں اور بیٹھ گئے۔ اس دوران مزید انبیاء و ملائکہ کی آمد کا سلسلہ جاری رہا۔ جب تمام نبی اور رسول آ گئے تو اعلان ہؤا کہ اب جماعت کھڑی ہونے والی ہے۔ اس کے ساتھ ہی صفیں بندھنی شروع ہو گئیں۔ جانِ دو عالم ﷺ بھی اپنی فطری انکساری اور تواضع کی بنا پر ایک صف میں کھڑے

ہو گئے۔ اچانک، جبریل آئے۔ آپ کا ہاتھ تھاما اور آگے لے جا کر امامت کے لئے کھڑا کر دیا۔

نماز سے فراغت کے بعد جبریل نے پوچھا---''کیا آپ جانتے ہیں کہ آپ کے پیچھے کس کس نے نماز پڑھی ہے؟''

فرمایا---''نہیں!''

جبریل نے عرض کی۔

''آج تک جتنے بھی انبیاء و رسول، اللہ تعالیٰ نے بھیجے ہیں، وہ سب حاضر ہوئے ہیں اور آپ کی اقتداء سے مشرف ہوئے ہیں۔''(۱)

اس کے بعد انبیاء کرام نے جبریل امین سے آپ کے بارے میں پوچھا کہ یہ کون ہستی ہیں۔(۲)

''یہ محمد ﷺ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے رسول اور خاتم النبیین۔'' جبریل نے بتایا۔

انبیاء نے کہا---''اچھا، آپ انہی کو لینے گئے تھے؟''

جبریل نے کہا---''جی ہاں۔''

---

(۱) اعلیٰ حضرت قصیدہ معراجیہ میں فرماتے ہیں۔

نمازِ اقصیٰ میں تھا یہی سِر، عیاں ہوں معنیٰ اوّل و آخر

کہ دست بستہ ہیں پیچھے حاضر، جو سلطنت آگے کر گئے تھے

جانِ دو عالم ﷺ کی دو صفات، اول اور آخر بھی ہیں۔ اعلیٰ حضرت کہتے ہیں کہ نماز اقصیٰ میں یہی راز تھا کہ اول و آخر کے معنیٰ ظاہر ہو جائیں۔ یعنی دنیا میں آنے کے اعتبار سے باقی انبیاء اول ہیں اور جانِ دو عالم آخر ہیں مگر مرتبے کے لحاظ سے جانِ دو عالم اول ہیں اور دیگر انبیاء آخر ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے---کہ دست بستہ ہیں پیچھے حاضر، جو سلطنت آگے کر گئے تھے۔

(۲) یہ سوال اس لئے نہیں تھا کہ انبیاء آپ سے واقف نہیں تھے؛ بلکہ اس کا مقصد جبریل کی زبانی آپ کی عظمتیں سن کر لطف اندوز ہونا تھا، جیسا کہ ان کے بعد والے کلام سے عیاں ہے۔

یہ سن کر انبیاء کرام نے آپ کو خوش آمدید کہا اور دعائیں دیں --- حَيَّاهُ اللّٰهُ، مِنْ اَخٍ وَ خَلِيْفَةٍ. فَنِعْمَ الْاَخُ وَنِعْمَ الْخَلِيْفَةُ.

(اللہ ان کو سلامت رکھے، یہ ہمارے نہایت ہی معزز و مکرم بھائی اور اللہ کے خلیفہ ہیں --- کیا خوب بھائی ہیں اور کیسے اچھے خلیفہ ہیں !!(۱)

تعارف کے بعد چند اہم انبیاء کرام نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کی اور ان نعمتوں کا ذکر کیا جو اللہ تعالیٰ نے ان میں ہر ایک کو خصوصی طور پر عطا کی تھیں۔ اس نورانی محفل کا آغاز جانِ دو عالم ﷺ کے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیا اور اختتامی کلمات بھی انہوں نے ادا کئے۔

اس مجلس میں انبیاء کرام نے جن انعامات کا تذکرہ کیا ہے ان کی تائید آیاتِ قرآنیہ سے بھی ہوتی ہے اس لئے حاشیے میں ہم نے متعلقہ آیات لکھ دی ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بزمِ حمد وثنا کا افتتاح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا

''سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کی ہیں جس نے مجھے اپنا خلیل بنایا۔ (۲) بڑی بادشاہی عطا کی۔ (۳)

---

(۱) تمام انبیاء نبوت کے اعتبار سے آپس میں بھائی بھائی ہیں اور اللہ کے خلیفے ہیں۔ خلافتِ ارضی کا تاج اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے ابوالبشر حضرتِ آدم علیہ السلام کے سر پر سجایا تھا اور انہیں غیر معمولی علوم سے نواز کر مسجودِ ملائکہ بنایا تھا مگر وہ خلافتِ الٰہیہ کا نقطۂ آغاز تھا، جبکہ جانِ دو عالم ﷺ پر اس خلافت کی تکمیل اور انتہا ہوئی تھی۔

انبیاء کو زیادہ خوشی اس بات پر ہو رہی تھی کہ خلافتِ الٰہیہ کی آخری رفعتوں تک پہنچنے والا عظیم انسان انہی کی برادری سے تعلق رکھتا تھا اور نبوت کے لحاظ سے ان کا بھائی تھا۔ اس لئے وہ فرطِ مسرت سے اس کی سلامتی کی دعائیں کر رہے تھے --- حَيَّاهُ اللّٰهُ اور اس کی عظمتوں کے گن گا کر اپنی بے پایاں فرحت کا اظہار کر رہے تھے --- فَنِعْمَ الْاَخُ وَنِعْمَ الْخَلِيْفَةُ.

(۲) وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرَاهِيْمَ خَلِيْلاً. (۳) حضرت ابراہیم علیہ السلام خود تو بادشاہ نہیں ہوئے ہیں ☜

مجھ اکیلے کو ایک مطیع و فرمانبردار امت کے برابر قرار دیا۔ (۱) اور لوگوں کے لئے رہبر و رہنما بنایا۔ (۲) آتشِ نمرود سے مجھ کو نجات دی اور اس کو میرے لئے ٹھنڈک اور سلامتی بنایا (۳) حضرت موسیٰ علیہ السلام یوں لب کشا ہوئے۔

''سب تعریفیں اللہ کی ہیں جس نے میرے ساتھ بلا واسطہ گفتگو فرمائی۔ (۴) مجھے منتخب کیا۔ (۵) مجھ پر تورات نازل فرمائی، میرے ذریعے فرعون کو ہلاک کر کے اس کی غلامی سے بنی اسرائیل کو نجات دی۔ (۶) اور میری امت سے ایسے لوگ بنائے جو حق کی طرف رہنمائی کرتے ہیں اور خود بھی حق کے مطابق فیصلے کرتے ہیں۔ (۷)

حضرت داؤد علیہ السلام نے اس طرح اظہارِ تشکر کیا۔

''سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے مجھے بڑی سلطنت بخشی۔ (۸) زبور عطا کی۔ (۹) لوہا میرے لئے نرم کیا۔ (۱۰) پہاڑوں کو میرے لئے مسخر کیا کہ میرے ساتھ تسبیح کہیں اور پرندوں کو۔ (۱۱) مجھے حکمت سکھائی اور واضح و عام فہم خطاب کرنے کی قوت عطا کی۔ (۱۲)

؛ البتہ داؤد و سلیمان علیہما السلام جیسے ہمہ گیر سلاطین انہی کی آل اولاد سے ہوئے ہیں، اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کی بادشاہیوں کو اپنی بادشاہی قرار دیا اور اللہ کا شکر بجا لائے۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا اٰلَ اِبْرَاهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰا هُمْ مُلْكًا عَظِيْمًا. (۱) اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ. (۲) اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ط. (۳) قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِىْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ٥ (۴) وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ٥ (۵) يٰمُوْسٰى اِنِّىْ اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ (۶) وَلَقَدْ نَجَّيْنَا بَنِىْ اِسْرَاۗءِيْلَ مِنَ الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ٥ مِنْ فِرْعَوْنَ.......... (۷) وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ٥ (۸) وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ (۹) وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا٥ (۱۰) وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ٥ (۱۱) وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ ط (۱۲) وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ٥

پھر حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے رب کی ثنا بیان کی۔

''سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے ہواؤں کو میرے لئے مسخر کیا اور سرکش جنات کو میرے تابع کیا۔ (۱) جو کچھ میں چاہتا تھا، وہ بناتے رہتے تھے۔ بالا خانے، مجسمے، حوضوں کی طرح بڑے بڑے لگن اور نصب کردہ دیگیں۔ (۲) مجھے پرندوں کی بولی سکھائی۔ (۳) جنوں، انسانوں اور پرندوں کے لشکر میرے ماتحت کئے۔ (۴) بہت سے مومن بندوں پر مجھے فضیلت بخشی۔ (۵) اور ایسی بادشاہی سے نوازا جو میرے بعد کسی کے لئے نہ ہوگی۔ (۶) اور ایسی پاکیزہ سلطنت عطا کی کہ اس کے سلسلے میں مجھ سے کچھ باز پرس نہ ہوگی۔ (۷)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے احسانات کا یوں تذکرہ کیا۔

''سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں، جس نے مجھے کتاب وحکمت اور تورات وانجیل سکھائی۔ (۸) میں مٹی سے پرندے کی شکل بنا کر اس میں پھونک مارتا تھا تو وہ پرندہ بن کر اڑنے لگتا تھا۔ میں مادرزاد اندھوں اور برص کے مریضوں کو ٹھیک کر دیتا تھا اور مردوں کو زندہ کر دیتا تھا۔ یہ سب کچھ اللہ کے حکم سے ہوتا تھا۔ (۹) مجھے دنیا سے اٹھایا (۱۰) اور مجھے میری ماں سمیت شیطان رجیم سے پناہ دی۔ (۱۱)

---

(۱) فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيحَ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ رُخَآءً حَيْثُ اَصَابَ ۝ وَالشَّيَاطِيْنَ كُلَّ بَنَّآءٍ وَّغَوَّاصٍ ۝ وَّاٰخَرِيْنَ مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ۝ (۲) يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَايَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَ قُدُوْرٍ رَّاسِيَاتٍ ۝ (۳) وَعُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ (۴) وَحُشِرَ لِسُلَيْمَانَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ (۵) وَفَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (۶) وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّايَنْبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْ بَعْدِيْ. (۷) هٰذَا عَطَآءُ نَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ (۸) وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَاةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۚ (۹) اَنِّيْ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ (۱۰) اِنِّيْ رَافِعُكَ اِلَيَّ وَ مُطَهِّرُكَ (۱۱) وَاِنِّيْ اُعِيْذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۝

آخر میں اس محفل کے مہمانِ خصوصی، سرورِ سروراں، شہِ مرسلاں ﷺ نے خطاب کیا اور حمدِ الٰہی کے ضمن میں اللہ تعالیٰ کے ان انعامات کا ذکر کیا جو صرف آپ پر کئے گئے تھے۔ آپ نے گروہ انبیاء کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''آپ سب نے اپنے رب کی ثنا بیان کرلی، اب میں بھی اس کی حمد کرتے ہوئے کہتا ہوں کہ سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے مجھے سارے جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا(۱) اور تمام انسانوں کے لئے بشیر ونذیر بنایا۔(۲) مجھ پر فرقان نازل کیا(۳) جس میں ہر چیز کا مفصل بیان ہے۔(۴) میری امت کو بہترین امت قرار دیا جو لوگوں کے سامنے پیش کی گئی۔(۵) میری ہی امت کو امتِ وسط بنایا۔(۶) اور اسی کو اَوَّلُوْنَ اور اٰخِرُوْنَ ہونے کا اعزاز بخشا۔(۷) میرا سینہ کھول دیا۔ میرا بوجھ اتار دیا۔ میرا ذکر بلند کردیا۔(۸) اور مجھے شروع کرنے والا بھی بنایا اور ختم کرنے والا بھی۔(۹)

یہ فضائل ومناقب سن کر حضرت ابراہیم علیہ السلام اٹھے اور انبیاء کرام سے یہ کہتے ہوئے محفل برخاست کردی کہ---''بِهٰذَا فَضَّلَكُمْ مُحَمَّد'' (انہی کمالات کی وجہ سے محمد تم سب سے افضل قرار پائے ہیں۔) ﷺ

سُوئے آسماں

بیت المقدس کی مصروفیات سے فراغت کے بعد جانِ دو عالم ﷺ آسمانوں کی طرف جانے لگے تو اوپر سے ایک چمکتی دمکتی خودکار سیڑھی اتری جو تابدار موتیوں سے آراستہ

---

(۱) وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَo (۲) اِنَّا اَرْسَلْنٰكَ كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًاo (۳) نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ (۴) تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ(۵) كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (۶) وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا (۷) ''اٰخِرُوْنَ'' اس وجہ سے کہ سب سے آخر میں ہیں اور ''اَوَّلُوْنَ'' اس لئے کہ جنت میں سب سے پہلے داخل ہوں گے۔(۸) اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَo وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَo وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ. (۹) آپ ﷺ نے فرمایا كُنْتُ نَبِيًّا وَّ اٰدَمُ بَيْنَ الرُّوْحِ وَالْجَسَدِo اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ خَاتَمَ النَّبِيِّيْن۔

تھی اور اس پر دائیں بائیں دورویہ بے شمار ملائکہ ایستادہ تھے۔(۱)

جانِ دو عالم ﷺ جبریل امین کی معیت میں سیڑھی پر چڑھے۔ قدم رکھنے کی دیر تھی کہ آپ پہلے آسمان تک جا پہنچے۔

جبریل امین نے آسمان کا ایک دروازہ کھٹکھٹایا اور کہا۔

''دروازہ کھولو!''

''کون ہے؟'' اوپر سے پوچھا گیا۔

---

(۱) عربی میں سیڑھی کو معراج کہتے ہیں۔ جانِ دو عالم ﷺ کے اسراء کو معراج اسی لئے کہا جاتا ہے کہ عالم بالا کی طرف آپ کا سفر ''معراج'' یعنی سیڑھی کے ذریعے ہوا تھا۔ یہ سیڑھی اس قدر حسین و جمیل تھی کہ ابنِ اسحاق کی روایت کے مطابق جانِ دو عالم ﷺ فرماتے ہیں---''لَمْ اَرَقَطُّ شَیْئاً اَحْسَنَ مِنْهُ'' (میں نے اس سے زیادہ خوبصورت چیز کوئی نہیں دیکھی۔)

اس سیڑھی کی حقیقت کو جاننا تو ہمارے بس سے باہر ہے۔ شاید یہ اس طرح کی کوئی چیز ہوگی، جیسی آج کل بجلی کی قوت سے رواں اور متحرک سیڑھیاں پائی جاتی ہیں (Escalator)۔ اگرچہ ان سیڑھیوں کو اس سیڑھی کے ساتھ نہ رفتار میں کوئی مناسبت ہو سکتی ہے، نہ ساخت اور جمال میں۔

بعض روایات میں ہے کہ جب آدمی مرتا ہے تو اس کی روح کو اسی سیڑھی کے ذریعے اوپر لے جایا جاتا ہے۔ اس وقت چونکہ مرنے والے کے سامنے سے حجابات اٹھا دیئے جاتے ہیں اس لئے وہ سیڑھی کے بے مثال حسن و جمال کا مشاہدہ کر رہا ہوتا ہے اور یہ منظر اس کو اس قدر بھاتا ہے کہ وہ اس کو ٹکٹکی لگا کر دیکھنے لگتا ہے اور جب تک روح کی کوئی رمق بدن میں باقی ہوتی ہے، وہ اسی کو دیکھتا رہتا ہے۔ اسی لئے جب آدمی مر جاتا ہے تو اس کی آنکھیں کھلی رہ جاتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہماری روحوں کو بھی اس تابندہ و درخشاں سیڑھی پر چڑھ کر عالم بالا کی طرف جانا نصیب فرمائے۔ بِحُرْمَةِ مَنْ صَعِدَ عَلَيْهِ بِجِسْمِهٖ، ﷺ.

کسی قابل اعتماد روایت سے یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ بیت القدس پہنچنے کے بعد براق کا کیا ہوا؟ کیا اسے وہیں چھوڑ دیا گیا تھا، یا آپ اس پر سوار ہو کر سیڑھی پر چڑھے تھے؟ دونوں صورتیں ممکن ہیں۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ ط

''جبریل ہوں۔''

''آپ کے ساتھ کون ہیں؟''

''محمد ہیں۔'' (ﷺ)

''کیا آپ انہیں لینے کے لئے بھیجے گئے تھے؟''

''ہاں!''

اس کے ساتھ ہی دروازہ کھل گیا اور آپ اندر داخل ہو گئے۔(۱)

وہاں پر موجود لاکھوں ملائکہ نے آپ کو دیکھ کر بے حد خوشی کا اظہار کیا اور آپ کو مَرْحَبَا، اَهْلاً وَّسَهْلاً کہا۔

جانِ دوعالم ﷺ فرماتے ہیں:-

''اچانک میں نے ایک بزرگ کو بیٹھے دیکھا جن کے دائیں طرف بھی بہت سے اشخاص تھے اور بائیں طرف بھی۔ جب ان کی نگاہ دائیں طرف اٹھتی تھی تو خوش ہو کر ہنس

---

(۱) اس سوال و جواب کی کیا حکمت تھی---؟ اور دروازہ بند کیوں تھا، کھلا ہوا کیوں نہیں تھا---؟

پہلے سوال کا جواب علماء نے یہ دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ پر یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ آپ کا نامِ نامی جس طرح زمین میں معروف ہے، اسی طرح آسمانوں پر بھی مشہور ہے۔ اسی لئے جب جبریل نے آپ کا نام لیا تو آگے سے یہ نہیں پوچھا گیا کہ محمد کون ہیں؟ بلکہ یہ کہا گیا کہ کیا آپ ان کی طرف بھیجے گئے تھے؟ اس سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ ملائکہ کو اس بات کا پہلے سے علم تھا کہ ایک دن اللہ کے محبوب آسمانوں پر تشریف لائیں گے اور انہیں لینے کے لئے جبریل کو بھیجا جائے گا؛ البتہ یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ دن کب آئے گا۔ سوالات کر کے وہ یہ یقین کرنا چاہتے تھے کہ وہ ساعتِ ہمایوں آ پہنچی ہے جس کا مدتوں سے انتظار تھا، یا یہ کوئی اور معاملہ ہے۔

دوسرے سوال کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اگر دروازہ کھلا ملتا تو آپ یہی سمجھتے کہ معمول کے مطابق کھلا ہے؛ جبکہ اللہ تعالیٰ یہ واضح کرنا چاہتا تھا کہ دروازہ اس ہستی کے اعزاز و اکرام میں کھل رہا ہے، جن کا اسمِ گرامی محمد ہے اور جبریل جن کا ہم رکاب ہے۔

پڑتے تھے اور جب بائیں طرف دیکھتے تھے تو افسردہ واشکبار ہو جاتے تھے۔ میں نے جبریل سے پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ تو جبریل نے بتایا کہ یہ آپ کے جدِ اعلیٰ حضرت آدم علیہ السلام ہیں، آگے بڑھیے اور انہیں سلام کہیے! میں نے سلام کیا تو انہوں نے سلام کا جواب دیا اور کہا

''خوش آمدید، میرے اس بیٹے کو جو صالح نبی ہیں اور صالح اولاد ہیں --- بہت ہی اچھے بیٹے ہیں آپ!''

میں نے جبریل سے پوچھا کہ ان کے دائیں بائیں جو مخلوق نظر آ رہی ہے، یہ کون لوگ ہیں؟ جبریل نے بتایا کہ دائیں طرف اہل جنت کی روحیں ہیں اور بائیں طرف اہل دوزخ کی۔ یہ دونوں چونکہ ان کی اولاد ہیں، اس لئے دائیں طرف دیکھتے ہیں تو انہیں آرام و آسائش میں دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور بائیں طرف دیکھتے ہیں تو انہیں عذاب میں دیکھ کر غمگین ہو جاتے ہیں۔ (۱)

اسی طرح آسمانوں کی سیر کرتے ہوئے اور مختلف انبیاء کرام سے ملتے ہوئے جانِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ سفر بلندیوں کی طرف جاری رہا۔ چنانچہ پہلے آسمان پر حضرت آدم علیہ السلام

---

(۱) علماء کو یہ الجھن درپیش رہی ہے کہ جنتیوں اور دوزخیوں کی روحیں یا تو جنت و دوزخ میں ہو سکتی ہیں یا برزخ میں اپنے اپنے مقام پر۔ آدم علیہ السلام کے دائیں بائیں وہ کیسے جا پہنچیں؟ خصوصاً کفار کی روحیں تو آسمان پر جا ہی نہیں سکتی ہیں۔ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ ط﴾

علماء نے اس کے متعدد جواب دیئے ہیں جن میں سے بعض تو دور از کار توجیہات کے زمرے میں آتے ہیں؛ تاہم کچھ عمدہ جوابات بھی ہیں۔ آسان اور عام فہم بات یہ ہے کہ روحیں درحقیقت اپنے اپنے مقامات پر ہی موجود تھیں مگر اس کے باوجود آدم علیہ السلام کے لئے یوں منکشف تھیں کہ گویا ان کے روبرو تھیں۔ چنانچہ جب وہ دائیں بائیں دیکھتے تھے تو اہل جنت وجہنم کی تمام ارواح ان کو دکھائی دینے لگتی تھیں، خواہ انسانی بدنوں سے جدا ہو چکی تھیں، یا ابدان کے اندر تھیں، یا ابھی جسموں میں پڑی ہی نہیں تھیں اور وہ ان کی اچھی یا بری حالت کو دیکھ کر مسرور یا غمگین ہو جاتے تھے۔

کتنی محبت ہے ابوالبشر کو اپنی اولاد کے ساتھ اور کتنے بدنصیب ہیں وہ لوگ جو ان کو رلانے کا سبب بنتے ہیں!!

سے، دوسرے پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت یحییٰ علیہ السلام، تیسرے پر حضرت یوسف علیہ السلام سے، چوتھے پر حضرت ادریس علیہ السلام سے، پانچویں پر حضرت ہارون علیہ السلام سے، چھٹے پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اور ساتویں پر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملاقاتیں ہوئیں۔(۱)
عَلٰی نَبِیِّنَا وَعَلَیْھِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ.

---

(۱) کس آسمان پر کس نبی سے ملاقات ہوئی؟ اس سلسلے میں روایات سخت متعارض ہیں؛ حتی کہ صحیح بخاری کی روایات میں بھی تعارض پایا جاتا ہے؛ تاہم اکثر روایتوں میں یہی ترتیب بیان کی گئی ہے۔ اس لئے ہم نے اس کو اختیار کیا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انبیاء کرام کے ساتھ اجتماعی ملاقات تو بیت المقدس میں ہوچکی تھی۔ پھر آسمانوں پر بعض انبیاء سے خصوصی طور پر ملانے میں کیا حکمت تھی؟

علماء کرام فرماتے ہیں کہ حقیقی مصلحت تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے، مگر بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جن انبیاء کرام کے حالاتِ زندگی میں جانِ دو عالم ﷺ کے ساتھ آئندہ پیش آنے والے احوال سے کوئی مناسبت پائی جاتی تھی، انہی کے ساتھ آسمانوں میں دوبارہ ملاقات کرائی گئی اور اس طرح اشارتاً واضح کیا گیا کہ آپ کو بھی انہی مراحل سے گزرنا پڑے گا جن سے یہ تمام مقربین بارگاہ گزر چکے ہیں۔ چند مشابہتیں ملاحظہ فرمائیے!

❁---حضرت آدم علیہ السلام کو جنت میں ٹھہرایا گیا جو امن و عافیت اور اللہ تعالیٰ کی ہمسائیگی کی جگہ ہے، پھر شیطان کی وسوسہ اندازی سے آپ کو وہاں سے نکلنا پڑا۔ دنیا میں آکر آپ نے اسے آباد کیا، اپنی اولاد کو دین کی تعلیم دی اور اپنی عمر گذار کر دوبارہ جنت کے مکین ہوگئے۔

اسی سے ملتے جلتے حالات جانِ دو عالم ﷺ کے ساتھ بھی پیش آئے۔ زندگی کا ابتدائی حصہ آپ نے مکہ مکرمہ میں گذارا جو بلد امین ہے، یعنی شہر امن و امان ہے اور وہاں کے باسی اللہ تعالیٰ کے ہمسائے قرار دیئے گئے ہیں۔ پھر شیطان صفت مخالفین کی ریشہ دوانیوں کی بناء پر آپ کو وہاں سے نکل کر مدینہ منورہ آنا پڑا۔ یہاں آکر آپ نے مکمل اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی، اسے پروان چڑھایا، لوگوں کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرایا اور بالآخر ایک دن فاتحانہ شان سے دوبارہ اس شہر میں لوٹ آئے جسے چھوڑ کر جانا پڑا تھا۔ ☜

سب نے آپ کو مرحبا و خوش آمدید کہا اور آپ سے ملاقات پر خوشی کا اظہار کیا۔
حضرت عیسیٰ علیہ السلام، حضرت یحییٰ علیہ السلام اور حضرت ادریس علیہ السلام سے

❁ ---حضرت عیسیٰ و یحییٰ علیہما السلام دونوں ایک دوسرے کے قریبی رشتہ دار ہیں۔اس لئے دونوں نے مشترکہ ملاقات کی۔ان دونوں کو یہودیوں کے ہاتھوں سخت اذیتیں سہنی پڑیں۔آخر ان جفا کاروں نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو شہید کر دیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی بزعم خویش صلیب پر لٹکا دیا، مگر اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ان کی دستبرد سے بچالیا۔

انہی مراحل سے جانِ دو عالم ﷺ کو بھی گزرنا پڑا۔آپ کے اعداء میں اللہ تعالیٰ نے سر فہرست یہودیوں کا ذکر کیا ہے۔﴿لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوا الْیَهُوْدَ.........﴾

یہودیوں نے آپ کو بہت دکھ دیئے۔ایک مرتبہ بھاری پتھر گرا کر آپ کو کچلنا چاہا۔ایک بار بکری کے گوشت میں زہر ملا کر آپ کو کھلانا چاہا۔اگرچہ منہ میں لقمہ رکھتے ہی آپ نے یہ کہتے ہوئے ہاتھ کھینچ لیا تھا کہ اس بکری نے مجھے بتایا ہے کہ یہ زہر آلود ہے؛ تاہم اتنی سی دیر میں بھی اس سریع الاثر زہر نے اتنا اثر کیا کہ آپ عمر بھر آنتوں میں تکلیف محسوس کرتے رہے اور آخر اسی کی وجہ سے آپ کا وصال ہوا۔ یوں اللہ تعالیٰ نے آپ کو شہادت کا رتبہ بھی عطا کر دیا۔

گویا وقتی طور پر یہودیوں کی سازش سے بچ جانے میں آپ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے مشابہ تھے اور بالآخر انہی کے دیئے ہوئے زہر سے شہید ہو جانے میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کے ساتھ مشابہت رکھتے تھے۔اس لئے ان دونوں کو آپ سے ملوایا گیا۔

❁ ---حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ جانِ دو عالم ﷺ کی متعدد مماثلتیں تھیں۔ان کو بغیر کسی جرم کے زندان مصر میں قید کیا گیا، آپ کو بھی بیگناہ شعب ابی طالب میں محصور رکھا گیا۔ان کو اپنے بھائیوں نے گھر سے نکالا اور مار ڈالنے کی کوشش کی مگر اللہ تعالیٰ نے ان کو محفوظ رکھا، آپ کو بھی اپنی قوم نے مکہ سے نکلنے پر مجبور کیا اور شب ہجرت آپ کے قتل کرنے کے درپے ہوئی مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو بچالیا۔ ان کو بھی مصر میں اقتدار مل گیا، آپ بھی مدینہ کے حکمران بن گئے۔ایک دن آیا کہ وہی بھائی جنہوں نے یوسف علیہ السلام کو قتل کرنے کی کوشش کی تھی، ان کے سامنے دست بستہ کھڑے تھے، اسی طرح ☜

ملاقاتوں کی کوئی تفصیل جانِ دوعالم ﷺ نے بیان نہیں فرمائی۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں صرف اتنا بتایا کہ آدھا حُسن ان کو ملا تھا اور

ایک روز وہ لوگ جنہوں نے جانِ دوعالم ﷺ کو مکہ سے نکالا تھا، فتح مکہ کے بعد ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے بھی اپنے بھائیوں کو معاف کر دیا تھا اور کہا تھا---لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمْ (تم پر کوئی گرفت نہیں ہے۔) جانِ دوعالم ﷺ نے بھی اہل مکہ کو عام معافی دے دی تھی اور فرمایا تھا---

''اس موقعہ پر میں وہی کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسف نے کہا تھا، لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ.......''

❁---حضرت ادریس علیہ السلام کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے قلم کے ساتھ کتابت شروع کی اور تحریر کو اظہارِ مافی الضمیر کا ذریعہ بنایا؛ جبکہ جانِ دوعالم ﷺ کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے قلم کو وہ حرمت وعزت بخشی کہ خود وَالْقَلَمِ کہہ کے اس کی قسم اٹھائی اور آپ پر جو پہلی وحی نازل فرمائی، اس میں اپنی عظمت کو یوں بیان کیا کہ وہ ربِّ اکرم جس نے قلم کے ذریعے سے تعلیم دی۔ معاہدوں کو تحریری شکل میں لانے کا حکم دیا، فَاكْتُبُوْهُ۔ اسی بناء پر جانِ دوعالم ﷺ نے متعدد معاہدے قلمبند کرائے۔ وحی لکھنے کے لئے آپ نے خاص طور پر پڑھے لکھے لوگوں کو مامور کیا، جنہیں کاتبین وحی کہا جاتا ہے۔ بادشاہوں اور سرداروں کو خطوط لکھے اور انہیں اتباعِ حق کی دعوت دی۔ غرضیکہ حضرت ادریس علیہ السلام نے قلم سے جس کام کا آغاز کیا تھا، جانِ دوعالم ﷺ نے اس کو کمال تک پہنچا دیا۔

❁---حضرت ہارون علیہ السلام کے ساتھ جو مماثلتیں علماء نے بیان کی ہیں، وہ بعید از فہم ہیں۔ آسان بات یہ ہے کہ جس طرح ہارون، موسیٰ کے بھائی تھے اور ان کی زندگی میں ان کی غیر موجودگی کے وقت ان کے قائم مقام ہوا کرتے تھے، اسی طرح جانِ دوعالم ﷺ کو بھی اللہ تعالیٰ نے ایک بھائی عطا کیا تھا جو غزوۂ تبوک کے لئے جانِ دوعالم ﷺ کی روانگی کے بعد مدینہ میں آپ کے نائب بنے تھے، یعنی حضرت علی کرم اللہ وجہہ۔ اور جب انہوں نے شکوہ کیا تھا کہ یارسول اللہ! مجھے آپ عورتوں اور بچوں میں چھوڑے جارہے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا تھا اَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰی تو میرے لئے ویسا ہی ہے، جیسے موسیٰ کے لئے ہارون تھے۔ اِلَّا اَنَّهٗ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ۔ البتہ یہ فرق ضرور ہے کہ ہارون نبی تھے، جب کہ مجھ پر نبوت ختم ہو چکی ہے۔ اب کسی اور کو نہیں مل سکتی۔ ☜

وہ چودھویں کے چاند کی طرح دمک رہے تھے۔(۱)

علاوہ ازیں حضرت ہارون علیہ السلام کی پیروکاری کے دعویداروں نے جس طرح انُ کے احکام کی خلاف ورزی کی تھی، اسی طرح منافقین مدینہ جانِ دوعالم ﷺ کے احکام کی پرواہ نہیں کیا کرتے تھے اور حیلوں بہانوں سے ٹال جایا کرتے تھے۔

❁---حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ تو قرآنِ کریم میں بھی بہت کثرت سے آیا ہے اور اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کے حالاتِ زندگی جانِ دوعالم ﷺ کے حالات سے غیر معمولی مماثلت رکھتے ہیں۔ دونوں کو ایسی قوموں سے پالا پڑا جن کی اصلاح بظاہر ناممکن تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم صدیوں غلام رہنے کی وجہ سے ذلت، بزدلی اور کم ہمتی کے اس مقام پر پہنچی ہوئی تھی کہ اس کے لئے فرعون جیسے باجبروت بادشاہ کے سامنے سر اٹھا کر چلنا محال نظر آتا تھا؛ جبکہ جانِ دوعالم ﷺ کی قوم برسہابرس آزاد رہنے کی بناء پر رعونت، سرکشی اور خودسری کی اس انتہا تک جا پہنچی تھی کہ اس کو آمادۂ اطاعت کرنا ازبس دشوار تھا، مگر دونوں اولوالعزم پیغمبروں نے یہ مشکل ترین کام کر دکھائے۔ دونوں کو سخت قسم کے فرعونوں سے مقابلہ کرنا پڑا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فرعون رامسیس تھا اور جانِ دوعالم ﷺ کا ابوجہل۔ دونوں کے فرعون ہلاک ہوئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دریا میں غرق ہو کر اور جانِ دوعالم ﷺ کا میدانِ بدر میں قتل ہو کر۔ دونوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ فرشتے کے واسطے کے بغیر ہمکلام ہوا۔ دونوں کو آخر کار کامیابی حاصل ہوئی۔ بنی اسرائیل مصر کے وارث بنے اور اہل ایمان جزیرہ نمائے عرب پر حکمران ہوئے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی مناسبتیں پائی جاتی ہیں۔

❁---حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ مشابہتیں اتنی واضح ہیں کہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ حج کے ارکان اور مقامات سب کے سب حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آلِ ابراہیم علیہ السلام کی یادگاریں ہیں۔ تمام عالم اسلام میں سال بسال قربانی کر کے حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کی یاد تازہ کی جاتی ہے۔ جانِ دوعالم ﷺ نے حج وقربانی میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں کی اور سوائے مشرکین کی اضافہ کردہ چند رسوم کو ختم کرنے کے، حج کو اسی نہج پر باقی رکھا اور ہر صاحب استطاعت کو قربانی کا بھی حکم دیا۔

(۱) حضرت یوسف علیہ السلام کے حسن بے مثال پر قرآن کریم شاہد ہے مگر ہم شمائل ☜

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بتایا کہ جب میں ان کے پاس گزرا تو وہ رو رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے پوچھا کہ کیوں رو رہے ہو؟ تو میری جانب اشارہ کر کے گویا ہوئے۔

''یارب! یہ نوعمر پیغمبر میرے بعد نبی بنا کر بھیجے گئے مگر جنت میں ان کی امت کے افراد زیادہ ہوں گے اور میری امت کے کم۔ (۱)

ایک روایت میں ہے کہ اس موضوع پر اللہ تعالیٰ سے گفتگو کرتے ہوئے ان کا لہجہ غصے والا تھا اور آواز خاصی بلند تھی۔ جانِ دو عالم ﷺ کو ان کے اس ناز اور دلار پر حیرت

کے آغاز میں واضح کر چکے ہیں کہ جانِ دو عالم ﷺ ان سے بدرجہا زیادہ حسین تھے۔ رہا آپ کا یہ فرمانا کہ ان کو آدھا حسن دیا گیا تھا تو اس کا مطلب شارحین حدیث نے یہ بیان کیا ہے کہ ان کا حسن اس حسن کا نصف تھا جو جانِ دو عالم ﷺ کو عطا ہوا تھا۔

یہ توجیہہ بھی کی جا سکتی ہے کہ یہ اس حسن کی بات ہے جو جانِ دو عالم ﷺ کے علاوہ باقی مخلوقات کو عطا ہوا، جہاں تک آپ کے حسن کا تعلق ہے تو وہ اس سے مستثنیٰ ہے کیونکہ آپ کے حسن کی نوعیت ایسی تھی کہ اس میں کوئی بھی آپ کا سہیم و شریک نہیں تھا جیسا کہ شمائل کے آغاز میں گزر چکا ہے۔

(۱) یہ بات معاذ اللہ، حسد کے طور پر نہیں کہی گئی تھی۔ حسد سے تو عام جنتی بھی پاک ہوتے ہیں، پھر انبیاء کرام جن کے اتباع کے طفیل لوگوں کو جنت ملتی ہے، کیسے اس ناپسندیدہ صفت سے متصف ہو سکتے ہیں؛ البتہ چونکہ انبیاء اپنی امت پر بے حد رحیم و شفیق ہوتے ہیں، اس لئے انہیں ہر وہ بات آزردہ و غمگین کر دیتی ہے جس میں ان کی امت کے گھاٹے اور خسارے کا ذکر ہو۔ یہ ان کی طبیعت کا غیر اختیاری تقاضا ہوتا ہے اور اس کی بنیاد چونکہ امت پر رحمت و شفقت ہوتی ہے اس لئے ممدوح و پسندیدہ ہوتا ہے۔

اس کی نظیر حضرت یعقوب علیہ السلام کا بیٹے کی جدائی پر اور جانِ دو عالم ﷺ کا صاحبزادے کے وصال پر اشک ریز ہونا ہے۔ یہ اشکباری اس لئے نہ تھی کہ معاذ اللہ ان کو اللہ تعالیٰ کا فیصلہ پسند نہیں تھا؛ بلکہ یہ اولاد کے ساتھ محبت و شفقت کا غیر اختیاری تقاضا تھا اور انسانی جذبات و احساسات کا فطری مظاہرہ تھا۔ یہ معیوب نہیں، مرغوب ہے۔ ☜

ہوئی اور جبریل امین سے پوچھا۔

''یہ کس سے ہم کلام ہیں؟''

''اپنے رب سے۔'' جبریل نے جواب دیا۔

''رب کے سامنے اتنی اونچی آواز میں بولتے ہیں---!؟'' جانِ دو عالم ﷺ کو سخت تعجب ہوا۔

''جی ہاں، اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ ان کا مزاج تیز ہے۔''(۱) جبریل نے جواب دیا۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آزردگی و معاتبت کا اس طرح اظہار، محض جانِ دو عالم ﷺ کو خوش کرنے کے لئے کیا تھا، ورنہ جانِ دو عالم ﷺ کی امت کا زیادہ مقدار میں جنت کے اندر داخل ہونا کوئی ایسی بات نہ تھی جس کا انکشاف حضرت موسیٰ علیہ السلام پر عین اس گھڑی ہوا ہو۔ یہ تو پہلے سے طے شدہ معاملہ تھا۔ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فی الواقع غصے اور ناراضگی کا اظہار کرنا ہوتا تو اس وقت کرتے جب پہلے پہل ان کے علم میں یہ بات آئی تھی!

درحقیقت وہ نہ تو غصے میں تھے، نہ ناراض۔ ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ جانِ دو عالم ﷺ میرے پاس سے گزرتے ہوئے جب میرا اور میرے رب کا مکالمہ سنیں گے تو یہ سوچ کر بہت مسرور ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اتنا بڑا اعزاز بخشا ہے کہ اس کو نہ پانے کی وجہ سے موسیٰ کلیم اللہ جیسا رسول مصروفِ آہ وفغاں ہے۔

ایک یہ وجہ بھی بیان کی گئی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا رونا رحمتِ الٰہیہ کو منعطف کرنے کے لئے تھا، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ آج رب کریم زیادہ مائل بہ عطا ہے، اس لئے اشک بہا کر اپنی امت کے لئے زیادہ سے زیادہ فائدے سمیٹنا چاہتے تھے۔

(۱) اس واقعے میں دو نہایت ہی ایمان افروز نکتے پائے جاتے ہیں۔

ایک تو یہ کہ محبوبانِ بارگاہ، نازِ محبوبیت کی بنا پر کبھی کبھی اللہ تعالیٰ سے دلبرانہ تکرار بھی کر لیتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام تو خیر، تھے ہی جلالی مزاج، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے---''يُجَادِلُنَا فِي قَوْمِ لُوطٍ'' (قوم لوط کے بارے میں ابراہیم ہمارے ساتھ جدال کرنے لگا۔) ☜

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں جانِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا، کہ ان کے بال سفید تھے اور وہ بیت المعمور (۱) سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ایک روایت میں ہے کہ وہ جنت کے دروازے کے پاس کرسی پر تشریف فرما تھے۔انہوں نے بھی آپ کو خوش آمدید کہا اور فرمایا کہ اپنی امت کو میری طرف سے سلام کہئے اور اسے میرا یہ پیغام پہنچا دیجئے کہ جنت کی مٹی انتہائی خوشبودار ہے اور پانی نہایت میٹھا ہے۔اسلئے آپ کی امت کو چاہئے کہ جنت میں زیادہ سے زیادہ شجر کاری کی کوشش کرے۔

جانِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا---''جنت میں شجر کاری کیسے کی جاتی ہے؟''

فرمایا---''سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ ط وَلَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ--- یہ کلمات کثرت سے پڑھے جائیں،

دوسرا قابلِ توجہ نکتہ یہ ہے کہ جانِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اندازِ معاتبت، بندگی کے اعلیٰ ترین ذوق کے مطابق نہیں لگا۔اسی لئے انتہائی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا''رب کے سامنے اتنی اونچی آواز میں بولتے ہیں!؟''

یعنی آپ کے خیال میں ایسا نہیں ہونا چاہئے۔اسی لئے خود آپ نے کبھی یہ انداز اختیار نہیں فرمایا، حالانکہ آپ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بدرجہا زیادہ قرب و محبوبیت رکھتے تھے۔بندگی کا یہی وہ ذوقِ بلند ہے جو عَبْدًا نَّبِيًّا میں ہویدا ہے اور عبدیت کا یہی وہ کمال وعروج ہے جو اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ سے فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِهٖ تک جلوہ نما ہے۔اسی حقیقت کی طرف متوجہ کرتے ہوئے اعلیٰ حضرت بریلویؒ نے یہ خوبصورت شعر کہا

اللہ اللہ! یہ علوِ خاص عبدیت رضاؔ
بندہ ملنے کو قریب حضرتِ قادر گیا

(۱) بیت المعمور کی عالمِ بالا میں وہی حیثیت ہے جو زمین پر کعبہ شریف کی ہے۔یعنی ملاءِ اعلیٰ کے لئے اللہ کا گھر ہے۔روایات میں آیا ہے کہ روزانہ ستر ہزار ملائکہ اس کا طواف کرتے ہیں، پھر قیامت تک ان کو دوبارہ موقع نہیں ملتا۔

پڑھنے والے کے لئے جنّت میں باغ بن جائیں گے۔''

یہاں جانِ دو عالم ﷺ کو ایک تمثیلی مشاہدہ کرایا گیا۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی امت کے کچھ لوگوں کو دیکھا کہ ان کے چہرے بہت روشن تھے اور لباس بھی نہایت اجلے تھے، جبکہ کچھ لوگوں کے چہرے اتنے مصفیٰ نہیں تھے اور لباس بھی میلے تھے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے غیر مصفیٰ اور میلے کپڑوں والا گروہ اٹھ کر ایک طرف گیا، جہاں نہریں بہہ رہی تھیں۔ وہاں انہوں نے غسل کیا تو ان کے چہرے بھی سفید ہو گئے اور سارا میل کچیل دھل گیا۔ میں نے جبریل سے ان دونوں گروہوں کے بارے میں پوچھا تو جبریل نے بتایا کہ سفید چہروں والے آپ کے وہ امتی ہیں جنہوں نے صرف نیکیاں کمائیں اور ہر قسم کی برائیوں سے بچتے رہے، اور میلے چہروں والے وہ لوگ ہیں جو نیکیوں کے ساتھ برائیاں بھی کرتے رہے، مگر بعد میں ان کو اپنی غلطیوں کا احساس ہو گیا اور نادم ہو کر تائب ہو گئے۔ توبہ کے ساتھ ان کے گناہ دھل گئے اور ان کے چہرے بھی دمکنے لگے۔ جن نہروں میں انہوں نے غسل کیا ہے وہ رحمت و نعمت اور طہارت کی نہریں ہیں۔

اس کے بعد آپ کو سدرۃ المنتہیٰ کے پاس لے جایا گیا۔ سدرہ بیری کے درخت کو کہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے اس کی ظاہری ساخت کا مجموعی تأثر بیری سے ملتا جلتا ہو اس لئے اس کو سدرۃ المنتہیٰ کا نام دیا گیا ہو۔ جانِ دو عالم ﷺ نے بتایا کہ اس کے پتے ہاتھیوں کے کانوں سے مشابہ تھے اور اتنے بڑے بڑے تھے کہ ہر پتہ پوری مخلوقات کو ڈھانپ لے۔ اس کے ساتھ جو بیر لگے تھے، وہ ہجر (۱) کے مٹکوں سے ملتے جلتے تھے۔ انتہائی خوبصورت سنہری تتلیاں اس کے گرد چمٹی ہوئی تھیں اور اس پر گوناگوں تجلیاتِ الٰہیہ پڑ رہی تھیں۔ مختلف النوع تجلیات کے انعکاس سے اس کے رنگ بدلتے رہتے تھے اور اس قدر حسین و جمیل اور دلنواز و دلفریب مناظر ابھرتے تھے کہ ان کی کیفیت بیان کرنے کے لئے کسی بھی زبان میں الفاظ موجود نہیں ہیں۔ خود جانِ دو عالم ﷺ نے اس کی بے حد و حساب خوبصورتی اور

(۱) ''ہجر'' ایک شہر کا نام ہے جہاں بہت بڑے بڑے مٹکے بنتے تھے۔

دیدہ زیبی کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ---''فَمَا یَسۡتَطِیۡعُ اَحَدٌ مِّنۡ خَلۡقِ اللّٰہِ اَنۡ یَّنۡعَتَہَا مِنۡ حُسۡنِہَا.'' اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوقات میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو اس کے حسن و جمال کو بیان کر سکے۔

تجلیاتِ الٰہیہ کے حسن بے محابا کو بیان کر بھی کون سکتا ہے---! عام انسانوں کے فہم وادراک سے ماوراء ہونے کی بنا پر ہی اللہ تعالیٰ نے بھی اس منظر کی تفصیل نہیں بیان کی اور فقط اتنا فرمایا--- ﴿اِذۡ یَغۡشَی السِّدۡرَۃَ مَا یَغۡشٰی o﴾ (جب چھا رہا تھا سدرہ پر جو کچھ کہ چھا رہا تھا۔) تاہم یہ مناظر اتنے حیران کن تھے کہ اور کوئی دیکھتا تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتیں، یا تاب نظارہ نہ لاسکتیں اور چندھیا جاتیں مگر چشم مصطفیٰ کو اللہ تعالیٰ نے اتنی قوت دی تھی کہ اس نے یہ سارے نظارے بے تکلف کر لئے۔ ﴿مَازَاغَ الۡبَصَرُ وَمَا طَغٰی.﴾

سدرۃ المنتہیٰ کی جڑ سے چار نہریں بہہ رہی تھیں۔ دو سطح کے اوپر اور دو زیر زمین۔ جانِ دو عالم ﷺ نے جبریل امین سے ان کے بارے میں پوچھا تو جبریل نے بتایا کہ سامنے نظر آنے والی دو نہریں نیل اور فرات ہیں اور پوشیدہ بہنے والی سیحان اور جیحان ہیں۔(۱)

---

(۱) بہت سے علماء نے نیل و فرات اور سیحان و جیحان کو کرۂ ارض پر بہنے والے دریا سمجھا ہے۔ نیل مصر میں ہے اور فرات کوفہ کے پاس، سیحان مصیصہ کے قریب اور جیحان بلخ میں۔ لیکن یہ بات ناقابلِ فہم ہے کہ ان چار دریاؤں کا منبع سات آسمانوں کے اوپر سدرۃ المنتہیٰ کی جڑ سے نکلنے والی نہریں ہوں اور وہاں سے کسی ناممکن الادراک طریقے سے زمین پر اتر آتے ہوں۔ اس لئے بعض علماء نے اس کی یہ توجیہہ کی ہے کہ یہاں تشبیہہ مقصود ہے۔ یعنی جس طرح زمین پر بہنے والے دریاؤں نیل، فرات، سیحان اور جیحان کا پانی میٹھا اور خوشگوار ہے، اسی طرح سدرۃ المنتہیٰ سے نکلنے والی چاروں نہروں کا پانی بھی انتہائی لذیذ اور خوش ذائقہ ہے۔ لیکن یہ توجیہہ بھی تکلف سے خالی نہیں۔

ہمارے خیال میں قرین قیاس بات یہ ہے کہ یہ چاروں نام انہی نہروں کے ہیں جو سدرۃ ☜

جانِ دو عالم ﷺ کو ان چاروں دریاؤں سے ایک ایک پیالہ پیش کیا گیا مگر آپ نے صرف شہد اور دودھ تھوڑا سا نوش فرمایا، پھر بیت المعمور میں تشریف لے گئے اور وہاں نماز پڑھی۔ سدرۃ المنتہیٰ کے پاس ہی جنت المأویٰ واقع ہے۔ ﴿عِنۡدَهَا جَنَّةُ الۡمَاۡوٰى ۝﴾ اس لئے آپ کو جنت کی سیر بھی کرائی گئی۔ چند مناظر جانِ دو عالم ﷺ نے امت کے لئے بھی بیان فرمائے ہیں۔

فرمایا--- جنت کی زمین کستوری سے بنی ہوئی ہے اور اس میں موتیوں کے بنے ہوئے بڑے بڑے مکان ہیں۔ درخت میووں سے لدے ہوئے ہیں۔ انار اتنے بڑے ہیں، جیسے کنویں سے پانی نکالنے والے ڈول ہوں اور پرندے اتنے عظیم الجثہ ہیں جیسے قد آور اونٹ ہوں۔

المنتہیٰ سے نکلتی ہیں اور جنت میں بہتی ہیں۔ زمینی دریاؤں کے ساتھ ان کے ناموں کی مطابقت محض اتفاقی ہے۔ جس طرح ''سدرۃ المنتہیٰ'' میں لفظ سدرہ کا دُنیاوی سدرہ، یعنی بیری کا ہمنام ہونا اتفاقی ہے۔

یہ بات ہماری خودساختہ نہیں؛ بلکہ کعب احبار کا ارشاد ہے

قرانِ کریم میں ہے کہ جنت میں چار قسم کی نہریں ہوں گی۔

﴿فِيۡهَاۤ اَنۡهٰرٌ مِّنۡ مَّآءٍ غَيۡرِ اٰسِنٍ‌ۚ وَاَنۡهٰرٌ مِّنۡ لَّبَنٍ لَّمۡ يَتَغَيَّرۡ طَعۡمُهٗ‌ۚ وَاَنۡهٰرٌ مِّنۡ خَمۡرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيۡنَ وَاَنۡهٰرٌ مِّنۡ عَسَلٍ مُّصَفًّى‌.﴾

۱--- پانی کی نہریں جن کا پانی کبھی بدبودار نہیں ہوتا۔

۲--- دودھ کی نہریں جن کا ذائقہ کبھی خراب نہیں ہوتا۔

۳--- شراب کی نہریں جو پینے والوں کو بہت لذیذ معلوم ہوتی ہیں۔

۴--- شہد کی نہریں جو ہر قسم کی آلودگی سے پاک وصاف ہیں۔

کعب احبار کہتے ہیں کہ پانی کی نہر کا نام سیحان، دودھ کی نہر کا جیحان، شراب کی نہر کا فرات اور شہد کی نہر کا نیل ہے۔

اس صورت میں کوئی الجھن اور پیچیدگی باقی نہیں رہتی۔

یہ سن کر حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے عرض کی---''یارسول اللہ! وہ پرندے بہت اچھے لگتے ہوں گے!''

جواباً فرمایا---''ہاں، دیکھنے میں تو اچھے لگتے ہی ہیں، کھانے میں اس سے بھی زیادہ اچھے لگیں گے اور مجھے امید ہے کہ تم ان کا گوشت ضرور کھاؤ گے۔''

فرمایا--- میں نے ایک نہر دیکھی جس کے دونوں کناروں پر ایسے مکان تھے جنہیں موتیوں کو اندر سے کرید کر تیار کیا گیا تھا۔ یعنی ہر مکان ایک ہی موتی کا بناہوا تھا۔ اس نہر کی مٹی مشک کی طرح خوشبودار تھی اور پانی انتہائی لذیذ۔ جبریل نے بتایا کہ یہ نہر کوثر ہے۔(۱)

فرمایا--- جنت کی سیر کے دوران ایک نہایت نوعمر کنیز دیکھی۔ میں نے اس سے پوچھا---''تجھے اللہ تعالیٰ نے کس کے لئے مختص کیا ہے---؟''

اس نے کہا---''زید بن حارثہ کے لئے۔''(۲)

جنت کے علاوہ آپ کو جہنم کی جھلک بھی دکھائی گئی۔ جانِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے غضب و ناراضگی اور انتقام کی جگہ ہے۔ اس کی حرارت کا یہ عالم ہے کہ پتھر اور لوہا اگر اس میں ڈالا جائے تو ایک لمحے میں پگھل کر نیست و نابود ہو جائے۔ جہنم کے داروغے کا نام مالک ہے۔ اس کی تیوریاں چڑھی ہوئی اور چہرہ انتہائی پُر غضب ہے۔

آخر میں جانِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک ایسے بلند ٹیلے پر لے جایا گیا جہاں سے کارکنانِ قضاوقدر کے قلم چلنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ یہ جگہ سدرۃ المنتہیٰ سے کچھ آگے ہے۔ سدرۃ المنتہیٰ کے بارے میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ اس پر دم بدم تجلیات الٰہیہ کا ورودونزول ہوتا رہتا ہے، مگر تجلیات کا نزول کہاں اور صاحبِ تجلیات ذی الجلال والاکرام کا دیدار کہاں!

جانِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات والا صفات کا دیدار نصیب فرمایا اور

---

(۱) واضح رہے کہ حوضِ کوثر کی طرح نہر کوثر بھی اللہ تعالیٰ نے خصوصی طور پر جانِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمائی ہے۔

(۲) حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ، جانِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے متبنّیٰ (منہ بولے بیٹے) تھے۔ ان کا مفصل تذکرہ جلد اول، صفحہ ۱۷۵، پر گزر چکا ہے۔

وہ بھی انتہائی قریب آ کر۔

بخاری شریف کی روایت کے الفاظ ملاحظہ فرمایئے!

وَدَنَا الْجَبَّارُ رَبُّ الْعِزَّةِ فَتَدَلّٰی، فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰی فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰی.

(قریب آیا، انتہائی باجبروت، عزتوں والا رب، پھر مزید نزدیک ہوا، یہاں تک کہ دو کمانوں کا فاصلہ رہ گیا، یا اس سے بھی کم۔ پھر وحی بھیجی اپنے بندے پر، جو وحی بھیجی۔)

ہم اس قرب اور نزدیکی کی کیفیات جاننے سے قاصر ہیں۔ جسم و جسمانیات سے یکسر منزہ اور حدود و جہات سے مکمل طور پر پاک رب کیسے اتنا قریب ہوا کہ دو کمانوں سے بھی کم فاصلہ رہ گیا---!! اس کو یا تو قریب ہونے والا جان سکتا ہے، یا وہ ذات جس کو یہ قرب نصیب ہوا۔ ان دو ہستیوں کے علاوہ باقی کائنات ان معاملات کے فہم و ادراک سے یکسر عاجز و قاصر ہے--- ایہہ جانیں او بولن دی--- اور چونکہ یہ بولنے کی جگہ نہیں ہے اس لئے ہم بھی اعلیٰ حضرت کی بیان کردہ محاکات پر اکتفا کر رہے ہیں۔ قصیدہ معراجیہ کے ان اشعار میں وہ سب کچھ ہے جو آپ جاننا چاہتے ہیں۔ انہیں غور سے پڑھئے اور حقیقت و عقیدت کے پرکیف امتزاج سے لطف اٹھایئے!

وہ سرورِ کشورِ رسالت جو عرش پر جلوہ گر ہوئے تھے
نئے نرالے طرب کے ساماں عرب کے مہمان کے لئے تھے
خدا ہی دے صبر جان پر غم، دکھاؤں کیونکر تجھے وہ عالم
جب ان کو جھرمٹ میں لے کے قدسی جِناں کا دولہا بنا رہے تھے
تجلیِ حق کا سہرا سر پر، صلوٰۃ و تسلیم کی نچھاور
دو رُویہ قدسی پرے جما کر، کھڑے سلامی کے واسطے تھے
چلا وہ سروِ چماں، خراماں، نہ رک سکا سدرہ سے بھی داماں
پلک جھپکتی رہی، وہ کب کے سب این و آں سے گزر چکے تھے

تھکے تھے روح الامیں کے بازو ، چھٹا وہ دامن ، کہاں وہ پہلو
رکاب چھوٹی ، امید ٹوٹی ، نگاہِ حسرت کے ولولے تھے
سُرَاغِ اَیُن و مَتیٰ کہاں تھا ، نشانِ کیف و الیٰ کہاں تھا
نہ کوئی راہی ، نہ کوئی ساتھی ، نہ کوئی منزل ، نہ مرحلے تھے
اُدھر سے پیہم تقاضے ''آنا'' اِدھر تھا مشکل قدم بڑھانا
جلال و ہیبت کا سامنا تھا ، جمال و رحمت اُبھارتے تھے
بڑھے تو ، لیکن جھجکتے ڈرتے ، حیا سے جُھکتے ، ادب سے رُکتے
جو قرب انہی کی روش پہ رکھتے تو لاکھوں منزل کے فاصلے تھے
پر ان کا بڑھنا تو نام کو تھا ، حقیقۃً فعل تھا اُدھر کا
تنزلوں میں ترقی افزا دَنیٰ تَدَلیٰ کے سلسلے تھے
اٹھے جو قصرِ دَنیٰ کے پردے ، کوئی خبر دے تو کیا خبر دے
وہاں تو جا ہی نہیں دوئی کی ، نہ کہہ کہ وہ ہی نہ تھے ، ارے! تھے
وہی ہے اول ، وہی ہے آخر ، وہی ہے ظاہر ، وہی ہے باطن
اسی کے جلوے ، اسی سے ملنے ، اسی سے ، اس کی طرف گئے تھے

استدراک

معارج النبوۃ میں بسلسلۂ معراج عجیب وغریب کہانیاں اورمحیر العقول داستانیں مرقوم ہیں جن میں سے ایک یہ لغو اور بیہودہ کہانی بھی ہے کہ جانِ دوعالم ﷺ جوتوں سمیت عرش پر گئے تھے۔ اس پر اپنی طرف سے کوئی تبصرہ کرنے کے بجائے ہم آپ کے سامنے علامہ زرقانیؒ اور علامہ خفاجیؒ کی عبارات پیش کر دیتے ہیں۔

وَفِیُ سَبُعِیَاتِ الُهَمُدَانِیُ: ثَبَتَ فِیُ الُحَدِیُثِ اَنَّه‘ ﷺ قَالَ هَمَمُتُ لَیُلَةَ الُمِعُرَاجِ اَنُ اَخُلَعَ نَعُلِیُ فَسَمِعُتُ النِّدَاءَ مِنُ قِبَلِ اللهِ، ''یَا مُحَمَّدُ! لَا تَخُلَعُ نَعُلَیُکَ لِتَشُرُفَ السَّمَآءُ بِهَا. فَقُلُتُ یَارَبِّ! اِنَّکَ قُلُتَ لِمُوُسیٰ:اِخُلَعُ نَعُلَیُکَ، اِنَّکَ بِالُوَادِ الُمُقَدَّسِ، فَقَالَ یَا اَبَاالُقَاسِمِ! اُدُنُ

مِنِّیْ، لَسْتَ عِنْدِیْ کَمُوْسٰی؛ فَاِنَّہٗ کَلِیْمِیْ وَاَنْتَ حَبِیْبِیْ. اِنْتَھٰی. وَتُعُقِّبَ بِاَنَّ ھٰذَا بَاطِلٌ لَمْ یُذْکَرفِیْ شَیْءٍ مِنَ الْاَحَادِیْثِ بَعْدَ الْاِسْتِقْرَاءِ التَّامِ.
(زرقانی علی المواہب ج ۶ ص ۱۲۵)

(سبعیات ہمدانی میں ہے کہ حدیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، معراج کی رات میں نے جوتے اتارنے کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ندا سنائی دی کہ اے محمد! اپنے جوتے مت اتارو، تا کہ آسمانوں کو بھی ان کے ذریعے شرف حاصل ہو جائے۔ میں نے کہا کہ اے میرے رب! تو نے موسیٰ کو تو کہا تھا کہ اپنے جوتے اتار دو کیونکہ تم وادیٔ مقدس میں ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے ابوالقاسم! میرے نزدیک ہو جاؤ۔ تم میرے نزدیک موسیٰ کی طرح نہیں ہو وہ تو میرا کلیم تھا اور تم میرے حبیب ہو۔ (ہمدانی کی بات ختم ہوئی) اور ہمدانی کا تعاقب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ یہ باطل ہے کیونکہ مکمل تلاش و تحقیق کے باوجود ایسی کوئی حدیث دستیاب نہیں ہو سکی جس میں مندرجہ بالا واقعہ مذکور ہو۔)
(زرقانی ج ۶ ص ۱۲۷)

وَقَدْسُئِلَ الْاِمَامُ الْقَزْوِیْنِیْ عَنْ وَّطْیِٔ النَّبِیْ ﷺ الْعَرْشَ بِنِعَالِہٖ وَقَوْلِ الرَّبِّ جَلَّ جَلَالُہٗ لَقَدْ شَرُفَ الْعَرْشُ بِنَعْلِکَ یَامُحَمَّدُ! ھَلْ ثَبَتَ ذٰلِکَ اَمْ لَا؟ فَاَجَابَ بِاَنَّ ذٰلِکَ لَیْسَ بِصَحِیْحٍ وَلَا ثَابِتٍ (شرح شفا للخفاجی ج ۲ ص ۲۵۵)

(اور امام قزوینی سے سوال کیا گیا کہ کیا یہ بات ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جوتوں سمیت عرش پر گئے تھے اور اللہ تعالیٰ نے کہا تھا کہ اے محمد! تمہارے جوتوں سے عرش کو شرف حاصل ہوا ہے؟ قزوینی نے جواب دیا کہ یہ روایت نہ تو صحیح ہے، نہ ثابت ہے۔)

قَالَ بَعْضُ الْمُحَدِّثِیْنَ قَاتَلَ اللّٰہُ مَنْ وَضَعَ اَنَّہٗ رَقٰی الْعَرْشَ بِنَعْلِہٖ. مَا اَعْدَمَ حَیَاءَہٗ، وَمَا اَجْرَاَہٗ عَلٰی سَیِّدِ الْمُتَاَدِّبِیْنَ وَرَأْسِ الْعَارِفِیْنَ ﷺ.

قَالَ: وَجَوَابُ الرَّضِیِّ الْقَزْوِیْنِیْ ھُوَالصَّوَابُ؛ فَقَدْ وَرَدَتْ قِصَّۃُ الْاِسْرَآءِ مُطَوَّلَۃً وَّ مُخْتَصَرَۃً عَنْ نَحْوِ اَرْبَعِیْنَ صَحَابِیًا وَلَیْسَ فِیْ حَدِیْثِ اَحَدٍ مِّنْھُمْ اَنَّہٗ ﷺ کَانَ تِلْکَ اللَّیْلَۃَ فِیْ رِجْلَیْہِ نَعْلٌ، وَاِنَّمَا وَقَعَ ذٰلِکَ فِیْ نَظْمِ

بَعْضِ قُصَّاصِ جَهَلَةٍ وَلَمْ يَذْكُرِ الْعَرْشَ؛ بَلْ قَالَ: وَاَتَى الْبِسَاطَ، فَهَمَّ بِخَلْعِ نَعْلِهٖ، فَنُوْدِيَ لَاتَخْلَعْ، وَهٰذَا بَاطِلٌ لَمْ يُذْكَرْ فِيْ شَيْءٍ مِّنَ الْاَحَادِيْثِ بَعْدَ الْاِسْتِقْرَاءِ التَّامِ. (زرقانی ج۶ ص ۲۲۷)

(بعض محدثین نے کہا ہے کہ اللہ ہلاک کرے اس شخص کو جس نے یہ روایت گھڑی ہے کہ آپ جوتوں سمیت عرش پر چڑھے تھے۔ تمام باادب لوگوں کے سردار اور جملہ عارفین کے سربراہ ﷺ کے بارے میں ایسی بات گھڑ کے اس نے کیسی بے حیائی اور بے باکی کا مظاہرہ کیا ہے---!

انہی بعض محدثین نے کہا ہے کہ امام قزوینی کا جواب بالکل صحیح ہے کیونکہ معراج کا واقعہ کہیں تفصیل سے، کہیں اختصار سے، تقریباً چالیس صحابہ کرام سے مروی ہے اور ان میں سے کسی کی روایت میں یہ نہیں ہے کہ اس رات آپ کے پاؤں میں جوتے تھے۔ یہ بات بعض قصہ گو جاہلوں نے اپنی نظم میں بیان کی ہے اور اس میں بھی عرش کا ذکر نہیں ہے؛ بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ آپ بساط کے پاس تشریف لائے اور جوتے اتارنے چاہے تو ندا آئی کہ مت اتاریئے۔ اور یہ بھی باطل ہے، انتہائی تلاش کے باوجود اس کا کسی حدیث میں سراغ نہیں مل سکا۔)

حاصل ان عبارات کا یہ ہے کہ جوتوں سمیت عرش پر چڑھنے کا قصہ یکسر جھوٹ اور افتراء ہے اور جس نے بھی یہ کہانی گھڑی ہے اس نے ناروا جسارت اور سخت بے حیائی کا ارتکاب کیا ہے۔

اعلیٰ حضرت بریلویؒ کی خدمت میں کسی نے عرض کی---''یہ صحیح ہے کہ شبِ معراجِ مبارک جو حضور اقدس ﷺ عرشِ بریں پر پہنچے، نعلین پاک اُتارنا چاہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وادی ایمن میں نعلین شریف اُتارنے کا حکم ہوا تھا، فوراً غیب سے ندا آئی، اے حبیب! تمہارے مع نعلین شریف رونق افروز ہونے سے عرش کی زینت وعزت زیادہ ہوگی۔''

جواباً ارشاد فرمایا---''یہ روایت محض باطل وموضوع ہے۔''(۱)

افسوس کہ آج کل ہماری محافلِ معراج کی زینت ایسی ہی بے سروپا کہانیاں اور باطل ومن گھڑت روایتیں ہیں۔ اَللّٰهُمَّ ارْحَمْ!

---

(۱) ملفوظات اعلیٰ حضرت، حصہ دوم، ص ۲۲۰، ۲۲۱.

تحفۂ معراج

شبِ معراج جانِ دو عالم ﷺ کو جو سب سے عظیم تحفہ عنایت ہوا، وہ نماز ہے۔ اس کی اہمیت کا آپ اسی سے اندازہ کر لیجئے کہ باقی تمام فرائض زمین پر بواسطہ جبریل امین فرض کئے گئے اور نماز کے لئے اپنے محبوب کو اپنے پاس بلایا اور یہ خاص تحفہ عنایت فرمایا۔

جانِ دو عالم ﷺ فرماتے ہیں کہ واپسی پر میری ملاقات موسیٰ سے ہوئی تو انہوں نے پوچھا۔

''آپ کی امت پر کیا فرض کیا گیا ہے؟''

''میں نے کہا---''رات دن میں پچاس نمازیں۔''

انہوں نے کہا---''آپ اپنے رب کے پاس واپس جایئے اور تخفیف کا سوال کیجئے کیونکہ اتنی نمازیں آپ کی امت کی استطاعت سے باہر ہیں۔ مجھے بنی اسرائیل کا اچھی طرح تجربہ ہے۔ان پر صرف دو نمازیں فرض کی گئی تھیں، مگر انہوں نے ان کی پابندی بھی نہیں کی تھی۔''

چنانچہ میں دوبارہ گیا تو پانچ کم کر دی گئیں۔ واپس آیا تو موسیٰ نے کہا کہ یہ بھی زیادہ ہیں، مزید کم کرایئے۔ میں پھر گیا تو مزید پانچ گھٹا دی گئیں۔اسی طرح موسیٰ مجھے بار بار لوٹاتے رہے اور میں تخفیف کراتا رہا، یہاں تک کہ صرف پانچ رہ گئیں۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے فرمایا---''یا محمد! یہ پانچ نمازیں ہیں لیکن ہر نماز کا ثواب دس نمازوں کے برابر ہے۔اس طرح یہ پچاس ہی رہیں۔ میری بات نا قابلِ تبدیل ہوتی ہے اور ثواب کا یہ اضافہ نماز ہی کے ساتھ مختص نہیں؛ بلکہ جو بھی نیکی کا کام ہو اس کا محض ارادہ کرنے پر ایک نیکی لکھی جائے گی اور عمل کرنے پر دس نیکیاں جبکہ برائی کا ارادہ کرنے پر کچھ نہیں لکھا جائے گا اور اس پر عمل کرنے کی صورت میں صرف ایک برائی لکھی جائے گی۔''

یہ سن کر میں واپس آیا تو موسیٰ نے مجھے مزید تخفیف کرانے کا کہا مگر میں نے کہا کہ میں اتنی بار آ جا چکا ہوں کہ اب جاتے ہوئے حیا آتی ہے۔(۱)

---

(۱) بعض عقلیت زدہ لوگوں کو اس حدیث پر یہ اعتراض ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پچاس نمازیں کیسے فرض کر دیں؟ کیا اسے پتہ نہیں تھا کہ امت محمدیہ اس کی استطاعت نہیں رکھتی؟ اور رسول اللہ ﷺ ☜

جب آپ ملکوت السمٰوٰت والارض کا معائنہ کرنے کے بعد مکہ مکرمہ واپس تشریف لائے تو صبح صبح ابوجہل سے ملاقات ہوگئی۔اس نے پوچھا۔

نے اسی وقت کیوں نہ عرض کی کہ مولیٰ! میری امت یہ بوجھ نہیں اٹھا سکتی؟ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ نہ اللہ تعالیٰ کو اس بات کا پتہ تھا کہ پچاس نمازیں پڑھنا ازبس مشکل ہے، نہ رسول اللہ کو۔ یہ عقدہ واہوا تو صرف موسیٰ پر۔ خدانخواستہ وہ راستے میں نہ ملتے تو رسول اللہ ﷺ پچاس نمازیں لے کر چلے آتے۔ گویا حضرت موسیٰ علیہ السلام نہ صرف رسول اللہ ﷺ سے زائد سمجھدار نکلے؛ بلکہ اللہ تعالیٰ سے بھی زیادہ باخبر ثابت ہوئے---!

معترضین کہتے ہیں کہ یہ روایت کسی یہودی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فضیلت و برتری ظاہر کرنے کے لئے گھڑی ہے۔ ہمارے محدثین نے اس کو خواہ مخواہ گلے لگالیا ہے۔

ہمیں یہ اعتراض سربسر احمقانہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ جہاں تک اللہ تعالیٰ کا تعلق ہے تو وہ احکامات دے کر ان کو بعض مصالح کے تحت منسوخ کرتا رہتا ہے۔اس میں کون سی تعجب کی بات ہے---!

مثلاً اللہ تعالیٰ نے پہلے یہ حکم دیا کہ اہل ایمان دشمنوں کے مقابلے میں ایک اور دس کے تناسب سے لڑا کریں۔ کچھ عرصہ اس پر عمل ہوتا رہا پھر یہ حکم منسوخ کر دیا گیا اور ایک بمقابلہ دو کا تناسب مقرر کیا گیا۔فرمایا۔

﴿اَلْاٰنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا.﴾ (اب اللہ نے تم سے تخفیف کر دی ہے اور جان لیا ہے کہ تمہارے اندر ضعف پایا جاتا ہے۔)

کیا ضعف پائے جانے کا اس کو پہلے علم نہیں تھا---؟ تھا اور یقیناً تھا، مگر وہ اس بات کا اظہار کرنا چاہتا تھا کہ مجھے اہل ایمان سے اتنی محبت ہے اور ان پر میں اس قدر شفیق ہوں کہ محض ان کی کمزوری کی وجہ سے میں نے پہلا حکم منسوخ کر دیا ہے۔

کتنی خوشی ہوئی ہوگی ایمان والوں کو اس بے پایاں شفقت و محبت پر---! وہ تو جذبۂ سپاس و تشکر میں ڈوب ڈوب گئے ہوں گے---!

اگر شروع سے ایک بمقابلہ دو کا معیار مقرر کر دیا جاتا تو یہ دلنواز کیفیات کہاں حاصل ہو سکتی تھیں۔

پچاس نمازیں فرض کرنے کا مقصد بھی یہی تھا کہ اس طرح اللہ تعالیٰ اپنے محبوب کا مقام و مرتبہ واضح کرنا چاہتا تھا اور بتانا چاہتا تھا کہ دیکھو، میں اس کے مطالبے کی کتنی لاج رکھتا ہوں اور اس کی خواہش کی تکمیل کا کیسا خیال رکھتا ہوں کہ پچاس نمازیں فرض کر دینے کے باوجود جب اس نے تخفیف کا ☜

''کوئی نئی تازہ خبر تو نہیں ہے---؟''

آپ نے فرمایا---''نئی بات یہ ہوئی ہے کہ مجھے آج رات سیر کرائی گئی ہے اور میں نے بیت المقدس کو دیکھا ہے۔''

مطالبہ کیا تو میں اس وقت تک کمی کرتا چلا گیا جب تک وہ یہ تمنا لے کر میرے پاس آتا رہا۔

اگر پہلی دفعہ ہی پانچ نمازیں فرض کر دی جاتیں تو محبوب رب کی یہ عظمتیں کیسے اجاگر ہوتیں---!

رہا یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے اسی وقت کیوں نہ کہہ دیا کہ میری امت اتنی نمازیں نہیں پڑھ سکے گی تو اس کا سبب آپ کا کمال عبدیت ہے، نہ کہ سوجھ بوجھ کی کمی۔ عبدیت جس قدر کامل ہوگی، تسلیم و رضا بھی اسی مناسبت سے ہوگی۔ آپ کی تو یہ کیفیت تھی کہ جب کبھی جبریل امین اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ پیغام لے کر آتے تھے کہ فلاں فلاں دو صورتوں میں سے جو بھی آپ کو پسند ہو، اس کا انتخاب کر لیں تو آپ جبریل کی طرف دیکھنے لگتے تھے کہ تم ہی بتاؤ میں کیا جواب دوں؟ پھر جو مشورہ جبریل دیتے تھے اسی کو اختیار کر لیتے تھے۔

اس کی یہ وجہ نہیں ہوتی تھی کہ معاذ اللہ خود آپ کسی تجویز کا انتخاب کر لینے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے؛ بلکہ یہ بھی تسلیم و رضا کا ایک پیارا انداز تھا کہ چونکہ دونوں تجویزیں میرے رب کی طرف سے ہیں۔ اس لئے میری نگاہ میں دونوں ہی یکساں پسندیدہ اور مرغوب ہیں۔ اب تم ہی بتاؤ جبریل! کہ میں ان میں سے کس کو اختیار کروں؟

تو جو ہستی عام حالات میں عبدیت کے اس درجے تک پہنچی ہوئی ہو، اس سے یہ کیسے توقع رکھی جاسکتی ہے کہ وہ ایسے وقت میں از خود نمازوں میں تخفیف کا مطالبہ کرے، جب عبدیت کی آخری معراج اس کو حاصل ہو رہی ہو---! ہاں، جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مشورہ شامل ہو گیا تو پھر وہ بات آپ کی اپنی نہ رہی بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ترجمانی ہو گئی۔ اس طرح مقصد بھی پورا ہو گیا اور عبدیت کے ذوقِ بلند پر حرف بھی نہ آیا۔ فَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ بِعَدَدِ کُلِّ ذَرَّۃٍ اَلْفَ اَلْفِ مَرَّۃٍ. ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ واپسی کے سفر میں آپ کی ملاقات کے لئے تمام انبیاء میں سے صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کیوں تشریف لائے تھے؟ ☜

''بیت المقدس سے ہوکر ایک رات میں واپس بھی آ گئے---!؟'' اس نے حیرت سے کہا۔

''ہاں، اسی طرح ہوا ہے۔'' آپ نے جواب دیا۔

''اگر میں لوگوں کو جمع کروں تو کیا سب کے سامنے یہی بات کہو گے---؟''

''ہاں، کیوں نہیں---!''

یہ سن کر ابوجہل نے ہانک لگائی---''او کعب کے بیٹو! اِدھر آ ؤ!''

لوگ اِدھر اُدھر سے اکٹھے ہونے لگے۔ جب خاصے آدمی جمع ہو گئے تو ابوجہل نے جانِ دوعالم ﷺ سے کہا---''وہی باتیں جو میرے ساتھ کر رہے تھے، ان کو بھی سناؤ!''

جب جانِ دوعالم ﷺ نے ان کے سامنے بیت المقدس تک جانے کا ذکر کیا تو کچھ بدبخت بطور تمسخر تالیاں پیٹنے لگے اور کچھ اظہار حیرت کے لئے سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ چند افراد صدیقِ اکبرؓ کی طرف دوڑ پڑے۔ ان کا خیال تھا کہ ابوبکر، محمد (ﷺ) کی ہر بات پر یقین کر لیتا ہے، مگر بیت المقدس جا کر راتوں رات واپس آ جانا تو ایسا ناممکن کام ہے کہ ابوبکر بھی اس کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے صدیقِ اکبرؓ کو دیکھتے ہی کہا۔

''ذرا جا کر سنو تو سہی، تمہارا دوست آج کیسی باتیں کر رہا ہے۔''

''کیا کہا ہے انہوں نے---؟'' صدیقِ اکبرؓ نے پوچھا۔

''کہتا ہے کہ میں ایک ہی رات میں بیت المقدس تک گیا اور واپس بھی آ گیا---!''

''کیا واقعی انہوں نے یہ بات کہی ہے---؟ کہیں تم جھوٹ نہ بول رہے ہو---!''

اس کا جواب علماء نے یہ دیا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے دیدار کی خواہش ظاہر کی تھی تو جواب آیا تھا کہ لَنْ تَرَانِی یعنی تم مجھے نہیں دیکھ سکتے۔ انہوں نے سوچا کہ میں تو اس ذاتِ بے ہمتا کو نہیں دیکھ سکا لیکن جس ہستی نے اس کو دیکھا ہے، اس کے دیدار سے تو کم از کم آنکھیں ٹھنڈی کر لوں اور کسی حد تک اپنے شوق کی پیاس بجھا لوں۔

اس جذبے کے تحت وہ ایک بار پھر کشاں کشاں چلے آئے اور آپ کی راہ میں سراپا انتظار بن کر کھڑے ہو گئے۔

''نہیں، یہ بالکل سچ ہے، خود جا کر دیکھ لو، وہ مسجد میں سب کے سامنے یہ واقعہ بیان کر رہا ہے۔''

جب صدیق اکبرؓ کو یقین ہو گیا کہ واقعی آپ نے کوئی ایسی بات کہی ہے تو بصد اعتماد و وثوق گویا ہوئے---''اگر انہوں نے یہ کہا ہے تو یقیناً سچ ہے۔''

''کیا تم اس کی یہ بات سچ سمجھتے ہو کہ وہ راتوں رات بیت المقدس سے واپس آ گیا ہے---!؟'' انہوں نے سخت حیرت ظاہر کی۔

''ہاں، بلکہ میں تو اس سے بھی زیادہ حیران کن بات پر ایمان رکھتا ہوں اور وہ یہ کہ ان پر آسمانوں سے صبح و شام وحی نازل ہوتی ہے۔''

یعنی جب حامل وحی فرشتہ آسمانوں سے صبح و شام آ جا سکتا ہے تو بیت المقدس تو اس کے مقابلے میں بہت تھوڑا فاصلہ ہے، اگر خود آپ وہاں سے ایک رات میں ہو آئے ہوں تو اس میں اتنے تعجب کی کیا بات ہے---!

روایات میں آیا ہے کہ اسی بے تامل تصدیق کی وجہ سے آپ کو ''صدیق'' کا لقب عطا کیا گیا۔

اہل مکہ کے سامنے آپ نے صرف بیت المقدس تک جانے کا ذکر اس لئے کیا تھا کہ آگے کے معاملات تو خالص ایمانیات کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں، جبکہ بیت المقدس بہت سے اہل مکہ کی دیکھی بھالی تھی کیونکہ وہ تجارت کے لئے شام جاتے رہتے تھے، اس لئے اس کے بارے میں سوالات کر کے وہ اپنی تسلی کر سکتے تھے اور انہوں نے ایسا ہی کیا۔ آپ سے پوچھنے لگے کہ اچھا بتاؤ، اس مسجد کی فلاں چیز کیسی ہے اور فلاں کیسی؟

جانِ دو عالم ﷺ فرماتے ہیں کہ میں ان کے سوالات سن کر پریشان ہو گیا کیونکہ وہ جس قسم کی تفصیلات پوچھ رہے تھے، وہ مجھے مستحضر نہیں تھیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس کو میرے روبرو کر دیا۔ میں اس کو دیکھتا جاتا تھا اور ان کے سوالات کے جوابات دیتا جاتا تھا۔ اس طرح میں نے ان کے ہر سوال کا تسلی بخش جواب دے دیا۔

بعض روایات میں ہے کہ آپ واپسی کے سفر میں قریش کے تین قافلوں کے پاس

سے بھی گزرے تھے۔ ان کے بارے میں آپ نے مشرکین مکہ کو بتایا کہ فلاں قبیلے کے ایک کاروان کا فلاں جگہ پر اونٹ گم ہوگیا تھا اور وہ اس کی تلاش میں گئے ہوئے تھے۔ ان کی جائے قیام پر پانی کا ایک پیالہ بھرا ہوا رکھا تھا۔ مجھے پیاس محسوس ہوئی تو میں نے اس سے پی لیا۔ اس کے علاوہ ایک اور قافلہ ملا جس میں ایک سرخ اونٹ کے ساتھ دو تھیلے لٹکے ہوئے تھے۔ ایک سفید رنگ کا اور ایک سیاہ رنگ کا۔ مجھے دیکھ کر وہ اونٹ بدک کر بھاگا تو گر پڑا اور بری طرح زخمی ہوگیا۔ ایک تیسرا قافلہ یہاں بالکل قریب تنعیم کے پاس دیکھا۔ ایک مٹیالے رنگ کا اونٹ سب سے آگے چل رہا تھا۔ اس پر سیاہ کپڑا پڑا ہوا تھا اور اس کے کجاوے کے ساتھ دو سیاہ رنگ کے تھیلے لٹکے ہوئے تھے۔ عنقریب یہ تینوں قافلے پہنچنے والے ہیں، تم انہیں دیکھ کر میری بتائی ہوئی علامات کی تصدیق کر سکتے ہو۔ چنانچہ جب قافلے نمودار ہونے شروع ہوئے تو کفار جلدی سے ان کے استقبال کے لئے بڑھے۔ دیکھا تو واقعی ایک قافلے کے آگے آگے دو تھیلوں والا مٹیالا اونٹ چل رہا تھا۔ دوسرے قافلے سے پوچھا کہ تمہارا کوئی سرخ اونٹ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہاں۔ تیسرے قافلہ والوں سے پوچھا کہ تمہارے پیالے سے کسی نامعلوم آدمی نے پانی پیا ہے؟ ایک شخص نے کہا کہ ہاں، میں نے پیالہ بھر کے رکھا تھا، مگر میں حیران ہوں کہ کسی نے ہم میں سے نہ اس کا پانی پیا، نہ زمین پر گرایا، اس کے باوجود وہ خالی ہوگیا۔

جانِ دو عالم ﷺ کی بیان کردہ ساری علامات حرف بحرف درست ثابت ہوئیں۔ چاہئے تو یہ تھا کہ ایسا حیرت انگیز معجزہ دیکھ کر سب ایمان لے آتے مگر دل کی آنکھیں اندھی ہوں تو کوئی چیز فائدہ نہیں دیتی۔ چنانچہ ہر طرح تسلی کر لینے کے بعد جب ان کو یقین ہوگیا کہ آپ فی الواقع بیت المقدس سے ہو آئے ہیں تو انہوں نے کہا۔

''واقعی، محمد بہت بڑا جادوگر ہے۔'' (العیاذ باللہ)

باب ۱۳

جانِ دوعالم ﷺ کے ایمان افروز تصرفات اور حیرت انگیز

معجزات

﴿اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ۝﴾

(قیامت نزدیک آگئی اور چاند پھٹ گیا۔)

حُسنِ یوسف ، دمِ عیسیٰ ، یدِ بیضا داری
آنچہ خُوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

متعدد معجزات کے ذکر پر مشتمل

نعت شریف

اعلحضرت مولینٰا احمد رضا خان بریلویؒ

اس خوبصورت نعت میں اور اشعار بھی پائے جاتے ہیں۔ ہم نے صرف معجزات والے شعروں کا انتخاب کیا ہے۔ اس پوری نعت میں یہ ادبی کمال ہے کہ اس کے ہر شعر کے چار حصے ہیں، جن میں سے پہلے تین آپس میں مسجع (ہم قافیہ) ہیں اور آخری حصہ دیگر اشعار کے ساتھ ہم قافیہ ہے۔ پڑھیئے اور لطف اٹھائیے۔

وَصفِ رخ ان کا کیا کرتے ہیں، شرحِ والشّمس وضحیٰ کرتے ہیں
ان کی ہم مدح و ثنا کرتے ہیں، جن کو محمود کہا کرتے ہیں
تو ہے خورشید رسالت پیارے! چھپ گئے تیری ضیاء میں تارے
انبیاء اور ہیں سب مہ پارے، تجھ سے ہی نور لیا کرتے ہیں
ماہِ شق گشتہ کی صورت دیکھو! کانپ کر مہر کی رجعت دیکھو!
مصطفےٰ پیارے کی قدرت دیکھو! کیسے اعجاز ہُوا کرتے ہیں
اے بلائے بے خردیِ کفار، رکھتے ہیں ایسے کے حق میں انکار
کہ گواہی ہو گر اس کو درکار، بے زباں بول اٹھا کرتے ہیں

اپنے مولیٰ کی ہے بس شانِ عظیم ، جانور بھی کریں جن کی تعظیم
سنگ کرتے ہیں ادب سے تسلیم ، پیڑ سجدے میں گرا کرتے ہیں
انگلیاں پائیں وہ پیاری پیاری ، جن سے دریائے کرم ہیں جاری
جوش پر آتی ہے جب غم خواری ، تشنے سیراب ہوا کرتے ہیں
ہاں یہاں کرتی ہیں چڑیاں فریاد ، یہیں سے چاہتی ہے ہرنی داد
اسی در پہ شترانِ ناشاد ، گلۂ رنج و عنا کرتے ہیں
ٹوٹ پڑتی ہیں بلائیں جن پر ، جن کو ملتا نہیں کوئی یاور
ہر طرف سے وہ پُر ارماں پھر کر ، ان کے دامن میں چھپا کرتے ہیں
لب پر آ جاتا ہے نام جناب ، منہ میں گھل جاتا ہے شہدِ ناب
وجد میں ہو کے ہم اے جانِ بیتاب ، اپنے لب چوم لیا کرتے ہیں
اپنے دل کا ہے انہیں سے آرام ، سونپے ہیں اپنے انہیں کو سب کام
لو لگی ہے کہ اس کے در کے غلام ، چارۂ دردِ رضؔا کرتے ہیں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معجزہ کی حقیقت

جو چیز عام قوانین فطرت سے ہٹ کر ہو اور بظاہر اس کا ظہور ناممکن و محال نظر آتا ہو، اس کو ''امرِ خارق'' کہا جاتا ہے۔ یعنی عام معمول کو توڑ دینے والی چیز۔

اس طرح کی کوئی چیز اگر انسانی مداخلت کے بغیر ظاہر ہو تو اس کو قدرت الٰہیہ کا کرشمہ سمجھا جاتا ہے۔ (۱) اور اگر اس کے ظہور میں کسی انسان کا عمل دخل پایا جاتا ہو تو وہ انسان نبی ہوگا، یا غیر نبی---؟ اگر نبی ہو تو دیکھا جائے گا کہ امرِ خارق کا ظہور دعوائے نبوت سے پہلے ہوا ہے یا بعد میں---؟ اگر قبل النبوۃ ہوا ہے تو اس کو ''ارہاص'' کہا جاتا ہے (۲) اور اگر بعد النبوۃ ہوا ہے تو اس کو ''معجزہ'' کہا جاتا ہے۔

اگر امرِ خارق کا صدور غیر نبی سے ہو تو وہ شخص مؤمن ہوگا یا کافر---؟ اگر مؤمن ہو تو عام مؤمن ہوگا یا اللہ کا ولی---؟ اگر عام مؤمن سے کوئی ایسی چیز ظاہر ہو تو اس کو ''معونت'' کہا جاتا ہے (۳) اور اگر ولی سے صادر ہو تو اس کو ''کرامت'' کہا جاتا ہے (۴) اور اگر امرِ خارق کا اظہار کسی کافر سے ہو تو اس کے دعویٰ کے مطابق ہوگا یا مخالف---؟

---

(۱) ایسے واقعات آئے دن اخبارات و رسائل میں چھپتے رہتے ہیں۔

(۲) جانِ دو عالم ﷺ کی ولادت، رضاعت اور سفرِ شام وغیرہ کے دوران ظاہر ہونے والے محیر العقول واقعات سب ارہاصات کے زمرے میں آتے ہیں۔ ارہاص کے لغوی معنی ہیں دیوار کی بنیاد کو پختہ اور مضبوط کرنا۔ چونکہ ایسے واقعات بعد میں ثبوت نبوت کے لئے مضبوط بنیادیں فراہم کرتے ہیں، اس لئے ان کو ارہاصات کہا جاتا ہے۔

(۳) مثلاً کوئی مومن کسی ایسے مرتبے اور مقام کا خواہشمند ہو کہ بظاہر وہاں تک اس کی رسائی ممکن نہ ہو مگر اس کی دعا و التجا پر اللہ اس کو وہ مرتبہ و مقام عنایت کر دے تو اس کو معونت کہا جائے گا۔ یعنی اللہ کی امداد۔

(۴) کرامت کا معنی اعزاز و اکرام ہے اور جس ولی اللہ سے امر خارق کا صدور ہو اس کے اعزاز و

اگر مطابقِ دعوی ہوتو ''استدراج''(۱) اور اگر مخالف دعوی ہوتو ''اہانت'' ہے(۲)

(درج ذیل نقشہ سے ان اقسام کو بآسانی سمجھا جاسکتا ہے۔)
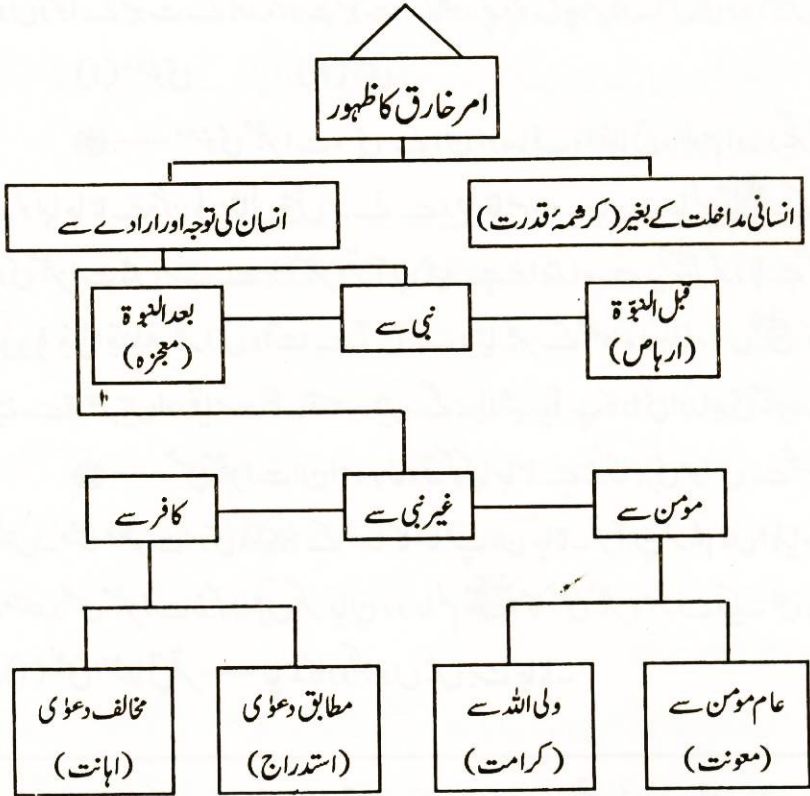
(''امر خارق'' یعنی بظاہر ناممکن ومحال چیز کے وقوع پذیر ہونے کے ممکن اقسام۔)

اکرام میں کیا شک ہوسکتا ہے۔

(۱) جیسے ہندو جوگیوں سے ظاہر ہونے والے تصرفات۔ اہل باطل کے ہاتھوں جب کسی امر خارق کا ظہور ہوتا ہے تو وہ اپنے غلط عقائد میں مزید پختہ ہوجاتے ہیں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ درجہ بدرجہ ان کی گمراہی میں اضافہ کرتا رہتا ہے اور یہی معنی ہے استدراج کا، یعنی درجہ بدرجہ آگے بڑھانا۔

(۲) جیسے مسیلمہ کذاب کے بارے میں مشہور ہے کہ اس نے ایک کانے کے لئے دعا کی کہ اس کی خراب آنکھ ٹھیک ہوجائے تو اس کی صحیح آنکھ کی بینائی بھی جاتی رہی۔ ظاہر ہے کہ دعا کا ایسا نتیجہ برآمد ہونے سے بہت زیادہ رسوائی ہوتی ہے اس لئے اس کو اہانت کہا جاتا ہے، یعنی رسوا کرنا۔

ہم یہاں مذکورہ اقسام میں سے صرف تیسری قسم، یعنی معجزہ پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ تفصیل سابق سے واضح ہے کہ معجزہ اس امرِ خارق کو کہا جاتا ہے جو کسی سچے نبی کے ہاتھوں دعوائے نبوت کے بعد، ثبوتِ نبوت کے طور پر وقوع پذیر ہو۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) معنوی (۲) حِسّی

❁--- معنوی معجزات، نبی کے ان اوصاف، اخلاق، علوم اور دیگر کمالاتِ باطنہ کو کہا جاتا ہے جن کی مثال پیش کرنے سے دنیا قاصر ہو۔ جانِ دو عالم ﷺ کے بے شمار معنوی معجزات میں سب سے بڑا معجزہ قرآنِ مجید ہے جو ابتداء سے یہ چیلنج کر رہا ہے کہ فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ مگر اس وقت سے آج تک دنیا بھر کے فصحاء و بلغاء اس چیلنج کا جواب دینے سے قاصر ہیں اور قیامت تک قاصر رہیں گے۔ بلاشبہ یہ آپ کا دائمی اور ابدی معجزہ ہے۔

❁--- حسی معجزات ان امورِ خارقہ کو کہا جاتا ہے جو ظاہری حواس سے محسوس کئے جا سکیں۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا کا سانپ بن جانا۔ قرآنِ کریم مین انبیاء سابقین کے متعدد حسی معجزات مذکور ہیں مگر جانِ دو عالم ﷺ کا حسی معجزہ صرف ایک ہی بیان ہوا ہے (۱) یعنی انشقاقِ قمر--- چاند کا دو ٹکڑوں میں بٹ جانا۔

---

(۱) اس کی وجہ یہ ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت انبیاء سابقین خود موجود نہیں تھے اس لئے ان کے حالات بیان کرنے کے ضمن میں ان کے معجزات کا ذکر بھی قرآنِ کریم میں آ گیا؛ جب کہ جانِ دو عالم ﷺ بنفسِ نفیس اس وقت موجود تھے اور آپ سے دم بدم ظاہر ہونے والے معجزات کو لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ اس لئے ان کے ذکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ شق القمر کو بھی قرآنِ کریم میں بطور معجزہ نہیں؛ بلکہ وقوعِ قیامت کی دلیل کے طور پر بیان کیا گیا ہے اور منکرین قیامت کو تلمیحاً بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارادے سے اگر چاند پھٹ سکتا ہے تو آسمان بھی پھٹ سکتا ہے، اگر چاند دو ٹکڑوں میں بٹ سکتا ہے تو ستارے بھی جھڑ سکتے ہیں، اگر چاند کی تقسیم ہو سکتی ہے تو سورج کی بھی تکویر ہو سکتی ہے کیونکہ چاند بھی آسمانی کروں میں سے ایک کرہ ہے۔ اگر آج اس کی شکست و ریخت ہو سکتی ہے تو کل اس سمیت دوسرے کُروں کی بھی ہو سکتی ہے۔ اس لئے انکارِ قیامت کی کوئی معقول وجہ نہیں پائی جاتی۔

ارشادِ ربانی ہے

﴿اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ۝﴾

(قیامت قریب آ گئی اور چاند پھٹ گیا۔)

جمہور مفسرین کے نزدیک اس سے مراد وہی انشقاقِ قمر ہے جو جانِ دو عالم ﷺ کے عہد میں بطور معجزہ رونما ہوا تھا۔(۱)

---

(۱) بعض مفسرین کی رائے کے مطابق اس انشقاق سے مراد وہ انشقاق ہے جو قیامت قائم ہونے کے وقت رونما ہوگا۔ کیونکہ آیتِ کریمہ میں اس سے پہلے قیامت کے قریب ہونے کا ذکر ہے۔اس لئے ظاہر ہے کہ انشقاق بھی وہی مراد ہوگا جو قربِ قیامت کی نشانی ہے۔

اس رائے پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ قیامت کے نزدیک جو انشقاق ہوگا وہ تو مستقبل میں ہوگا، اگر وہ مراد ہوتا تو مستقبل پر دلالت کرنے والا کوئی صیغہ لایا جاتا یعنی چاند پھٹ جائے گا، جبکہ قرآنِ مجید میں اس انشقاق کا ذکر صیغۂ ماضی سے کیا گیا ہے۔یعنی چاند پھٹ گیا۔اس لئے اس سے مراد قربِ قیامت والا انشقاق نہیں ہوسکتا۔

اس کا جواب ان مفسرین نے یہ دیا ہے کہ مستقبل میں جس چیز کا وقوع یقینی ہو، اس کو اللہ تعالیٰ کبھی کبھی بصیغۂ ماضی ذکر کر دیتا ہے اور اس سے مقصود یہ بتانا ہوتا ہے کہ اس چیز کا واقع ہونا اتنا متیقن ہے کہ گویا واقع ہو چکی ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ قیامت کو ''اَمْرُ اللہِ'' سے تعبیر کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے۔ اَتٰی اَمْرُ اللہِ ط اللہ کا حکم، یعنی قیامت آ گئی ہے۔حالانکہ قیامت مستقبل میں آئے گی، مگر متیقن الوقوع ہونے کی وجہ سے صیغۂ ماضی کے ساتھ اس کا ذکر کیا گیا ہے۔یہی صورت --- چاند پھٹ گیا --- میں بھی ہے۔

یہ جواب نہایت معقول ہے اور اگر مسئلہ صرف اسی آیت کا ہوتا تو یہی تفسیر درست ہوتی، مگر درحقیقت اس آیت کا مفہوم متعین کرنے والی اس سے اگلی آیت ہے۔ ﴿وَاِنْ یَّرَوْا اٰیَةً یُّعْرِضُوْا وَیَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ۝﴾ (اور اگر دیکھتے ہیں کوئی آیت تو اعراض کر جاتے ہیں اور کہتے ہیں یہ تو زبردست جادو ہے۔)

ظاہر ہے کہ یہ بات اسی انشقاق کے بارے میں ہوسکتی ہے جو بطور معجزہ رونما ہوا تھا اور ☜

انشقاقِ قمر

تیری اُنگلی اُٹھ گئی ، مَہ کا کلیجہ چِر گیا

یہ اس زمانے کا قصہ ہے جب جانِ دو عالم ﷺ مکہ مکرمہ میں مقیم تھے اور ابھی مدینہ منورہ کی طرف ہجرت نہیں فرمائی تھی۔ ایک دن آپ مکہ مکرمہ سے باہر منیٰ کی حدود میں رونق افروز تھے۔ متعدد صحابہ بھی ساتھ تھے۔ رات کا وقت تھا اور چودھویں کا چاند پوری تابانی سے آسمان پر چمک رہا تھا، کہ اچانک آپ کے چند شدید دشمن ابوجہل اور ولید ابنِ مغیرہ وغیرہ بھی وہاں آ گئے اور کہنے لگے۔

''محمد! اگر تم دعوائے نبوت میں سچے ہو تو ہمیں چاند کے دو ٹکڑے کر کے دکھاؤ!''

''اگر میں نے ایسا کر دیا تو کیا تم ایمان لے آؤ گے؟'' جانِ دو عالم ﷺ نے ان سے پوچھا۔

''ہاں، یقیناً۔'' سب نے کہا۔

آپ نے دعا فرمائی اور اللہ تعالیٰ سے یہ نشانی دکھانے کا سوال کیا۔

کفار و مشرکین نے اس کو سحر مستمر قرار دیا تھا۔ قیامت کے قریب جو انشقاق ہوگا، اس وقت تو مکے والے کافر موجود ہی نہیں ہوں گے کہ اس کو سحر کہہ سکیں، جبکہ روئے سخن کفارِ مکہ کی طرف ہے۔ اور اگر سیاق کلام کے برعکس کفار مکہ کی تخصیص نہ کی جائے؛ بلکہ بعد میں آنے والے کافروں کو بھی اس میں شامل سمجھا جائے تو پھر سوال یہ پیدا ہوگا کہ قیامت کے قریب جو کافر موجود ہوں گے وہ اس وقت واقع ہونے والے انشقاق کو کیوں سحر قرار دیں گے---؟ ساحر کس کو کہیں گے اور وجہِ سحر کیا بیان کریں گے---؟ نیز علاماتِ قیامت ظاہر ہونے کے بعد اعراض بھی ممکن نہیں ہوگا کیونکہ اس سے نظامِ کائنات درہم برہم ہو رہا ہوگا اور ایک خوف و دہشت کے عالم میں لوگ سب کچھ دیکھ رہے ہوں گے۔ اس گھڑی بھلا وہ کیونکر اعراض کر سکیں گے؟

غرضیکہ اس آیت نے روزِ روشن کی طرح واضح کر دیا ہے کہ سابقہ آیت میں وہی انشقاق مراد ہے جو بطور معجزہ ہوا تھا، نہ کہ قربِ قیامت والا انشقاق۔

ناگاہ چاند دو ٹکڑوں میں بٹ گیا اور دونوں ٹکڑے ایک دوسرے سے اتنے فاصلے پر چلے گئے کہ ایک کوہِ حرا کی دائیں طرف نظر آنے لگا اور دوسرا بائیں طرف۔ آپ نے ان سب کے نام لے لے کر ان کو مخاطب کیا اور فرمایا کہ دیکھو اور گواہ رہو۔ (کہ میں نے تمہارا مطالبہ پورا کر دیا ہے۔)

مگر افسوس کہ ان کی قسمت میں ہدایت نہیں تھی۔ اتنا روشن اور نمایاں معجزہ دیکھنے کے باوجود اپنے قول سے منحرف ہو گئے اور ایمان نہ لائے۔ کہنے لگے۔

''محمد نے ہم پر جادو کر دیا ہے۔''

ابو جہل نے کہا---''اگر یہ جادو ہے تو صرف ہم پر ہو سکتا ہے، ساری دنیا پر تو نہیں ہو سکتا، اس لئے ہم باہر سے آنے والوں سے پوچھیں گے۔ اگر انہوں نے تصدیق کر دی تو پھر یہ سحر نہیں ہو سکتا۔''

ابو جہل کا خیال ہوگا کہ باہر سے آنے والے اس بات کی تردید کریں گے مگر جب اِدھر اُدھر سے آنے والے قافلوں سے پوچھا گیا تو سب نے تصدیق کی کہ ہم نے بھی چاند کو دو حصوں میں منقسم ہوتے دیکھا ہے۔

یہ تحقیق ہو جانے کے بعد چاہئے تو یہ تھا کہ ابو جہل اور اس کے ہمنوا بلاتوقف ایمان لے آتے مگر جن کے دِلوں پر مہریں لگ چکی ہوں، وہ بھلا کب اس نعمت سے فیضیاب ہو سکتے ہیں---! چنانچہ اب کی بار انہوں نے سحر کے ساتھ مستمر کا بھی اضافہ کر دیا اور کہا ---سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ---(یہ تو زبردست جادو ہے۔)(۱)

---

(۱) انشقاقِ قمر کا یہ واقعہ بخاری و مسلم سمیت حدیث و سیرت کی تقریباً ہر کتاب میں موجود ہے۔ کسی میں اختصار کے ساتھ اور کسی میں تفصیل کے ساتھ۔ اس لئے اس کے واقع ہونے میں کسی مؤمن کو تو شک نہیں ہو سکتا؛ البتہ پہلے زمانے میں یونانی فلسفے کے زیر اثر بعض ملحدین نے اس کا انکار کیا ہے۔ کیونکہ اس دور میں مشاہدے کے بجائے محض اٹکل پچو باتوں سے یہ ثابت کیا گیا تھا کہ آسمان اور اس کے ساتھ وابستہ کرات میں خرق والتیام اور شکست وریخت ناممکن ہے۔ مگر آج کل ایسی باتیں کرنا اپنے آپ کو تماشا بنانے ☜

رَدِّ شمس---سُورج کا پلٹ آنا

فتح خیبر کے بعد جانِ دو عالم ﷺ خیبر کے قریب ''صہباء'' نامی جگہ میں فروکش تھے۔ نماز ظہر کے بعد آپ نے حضرت علیؓ کو مالِ غنیمت تقسیم کرنے کے لئے بھیج دیا۔ بعد

والی بات ہے کیونکہ جدید تحقیقات و مشاہدات کی رو سے اس فضائے بیکراں میں کتنے ہی ستارے بنتے بگڑتے اور ٹوٹتے پھوٹتے رہتے ہیں، اگر چاند بھی بطور معجزہ دو ٹکڑوں میں بٹ گیا ہو تو اس میں کون سی نا قابل فہم بات ہے!

بعض لوگوں کو یہ الجھن محسوس ہوتی ہے کہ اگر ایسا کوئی واقعہ ہوا ہوتا تو سارے عالم میں اس کا چرچا ہوتا اور دنیا بھر کی رصدگاہیں اس کا ریکارڈ رکھتیں حالانکہ اسلامی روایات کے علاوہ کسی ملک کی حکایات میں اس کا تذکرہ نہیں ملتا۔

ہمیں یہ الجھن بے معنی معلوم ہوتی ہے کیونکہ جب یہ واقعہ پیش آیا، اس وقت کرۂ ارض پر کہیں رات کا پچھلا پہر ہوگا اور لوگ محو خواب ہوں گے، کہیں دن ہوگا اور لوگ اپنے کام کاج میں مشغول ہوں گے۔ اس لئے ان لوگوں کے مطلع ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور جہاں پر تقریباً وہی وقت ہوگا جو شقِ قمر کے وقت مکہ میں تھا تو وہاں کے رہنے والوں میں سے بھی ہر آدمی اس گھڑی چاند کو تو نہیں دیکھ رہا ہوگا کہ اس کو چاند میں یہ تغیر فوراً محسوس ہو جاتا۔ عام لوگوں کو تو چاند گرہن کا بھی پتہ نہیں چلتا کہ کب لگا اور کب ختم ہوا؛ حالانکہ گرہن بعض دفعہ کئی گھنٹوں تک جاری رہتا ہے، جبکہ شقِ قمر تو چند لمحوں کی بات تھی۔ اس کا خصوصی توجہ کے بغیر کسی کو کیسے پتہ چل سکتا تھا؟

ہاں جو قافلے رات کو چاند کے رخ پر سفر کر رہے تھے اور چاند ان کو سامنے نظر آ رہا تھا انہوں نے یقیناً یہ منظر دیکھا ہوگا اور بعد میں باہر سے آنے والے قافلوں نے اس کی تصدیق بھی کر دی تھی۔

رہی رصدگاہوں کی بات تو اس زمانے میں اتنی ترقی یافتہ رصدگاہیں کہاں پائی جاتی تھیں جو فلکیاتی اسباب وعلل کے بغیر اچانک چند لمحوں کے لئے پیش آ جانے والے واقعہ کا ادراک کرتیں اور ریکارڈ رکھتیں---! نیز یہ کیسے ثابت ہوا کہ یہ واقعہ دنیا بھر کی کسی رصدگاہ میں نہیں دیکھا گیا؟ کیا اس وقت کی تمام رصدگاہوں کا ریکارڈ اب تک محفوظ ہے؟

غرضیکہ یہ الجھن ہر لحاظ سے بے سر و پا خیالات کا مجموعہ ہے۔

میں عصر کا وقت ہوگیا تو آپ نے عصر کی نماز پڑھ لی۔ اتنے میں حضرت علیؓ بھی اپنے کام سے فارغ ہوکر تشریف لے آئے مگر انہوں نے ابھی تک عصر کی نماز نہیں پڑھی تھی۔

جانِ دو عالم ﷺ کبھی کبھی اپنے مخصوص احباب کی گود میں سر رکھ کر آرام فرما لیا کرتے تھے۔ اس دن بھی ایسا ہی ہوا۔ آپ نے حضرت علیؓ کی آغوش میں سرِ انور رکھا اور محوِ استراحت ہوگئے۔

بعض روایات کے مطابق آپ سو گئے اور بعض کے مطابق آپ پر وحی کا نزول شروع ہوگیا۔ اتنے میں سورج ڈوبنے کے قریب ہوگیا۔ اگرچہ حضرت علیؓ سے عصر جیسی اہم نماز جارہی تھی مگر انہوں نے جانِ دو عالم ﷺ کے آرام میں خلل ڈالنا مناسب نہ سمجھا۔ یہاں تک کہ سورج بالکل غروب ہوگیا۔ جب جانِ دو عالم ﷺ بیدار ہوئے تو حضرت علیؓ سے پوچھا۔

''کیا تم نے عصر کی نماز پڑھ لی تھی؟''

''نہیں، یارسول اللہ!'' حضرت علیؓ نے جواب دیا۔

جانِ دو عالم ﷺ کا دریائے کرم جوش میں آیا اور آپ نے دعا فرمائی۔

اَللّٰھُمَّ! اِنَّہ' کَانَ فِیْ طَاعَتِکَ وَطَاعَۃِ رَسُوْلِکَ فَارْدُدْ عَلَیْہِ الشَّمْسَ.

(اے اللہ! علی تیری اور تیرے رسول ہی کی اطاعت میں مصروف تھا، اس لئے اس کے واسطے سورج لوٹا دے۔)

دعا کرنے کی دیر تھی کہ ڈوبا ہوا سورج پھر پلٹ آیا اور دوبارہ عصر ہوگئی۔ چنانچہ حضرت علیؓ نے وضو کیا اور عصر کی نماز ادا کرلی۔(۱)

---

(۱) معروف فاضل جناب وارث سرہندی صاحب (جو، اب مرحوم ہوچکے ہیں۔) نے راقم کے نام اپنے ایک خط میں لکھا کہ یہ حدیث موضوع ہے اور ملا علی قاریؒ نے موضوعات کبیر میں اس کو من گھڑت ثابت کیا ہے۔ میں نے اپنی بساط کے مطابق ان کو جو جواب دیا۔ فاضل موصوف کو وہ ☜

اس طرح ان کی نماز قضا ہو جانے سے بچ گئی۔

اعلیٰ حضرتؒ نے اس واقعہ کو ذکر کرنے کے بعد بہت خوبصورت نتیجہ نکالا ہے۔ فرماتے ہیں۔

مولیٰ علیؓ نے واری تری نیند پر نماز
اور وہ بھی عصر، سب سے جو اعلیٰ خطر کی ہے
ثابت ہوا کہ جملہ فرائض فروع ہیں
اصل الاصول بندگی اس تاجور کی ہے

بہت پسند آیا اور انہوں نے لکھا۔

''اس حدیث کی صحت کے متعلق جو تردد تھا وہ دور ہو گیا---اس سلسلہ میں آپ کی رہنمائی کے لئے ہدیہ تشکر پیش کرتا ہوں۔''

بہت سے علمی نکات پر مشتمل ہونے کی وجہ سے قارئین سیدالوریٰ کے لئے ذیل میں وہ جوابی خط پیش کیا جا رہا ہے۔ اس خط میں جن سوالات کے جوابات دیئے گئے ہیں وہ خط کے مطالعہ سے خود ہی واضح ہو جاتے ہیں، اس لئے سوالات شامل اشاعت نہیں کیے گئے۔ واضح رہے کہ سرہندی صاحب نے چونکہ صرف ملا علی قاریؒ کے حوالے سے بات کی تھی، اس لئے میں نے بھی اپنی گفتگو کو ملا علی قاریؒ تک ہی محدود رکھا ہے۔ (دائم)

مکرمی!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا عالمانہ مکتوب گرامی ملا۔ اصل حقیقت تک پہنچنے کے لئے آپ کی بے قراری و بیتابی سے دل مسرور ہوا۔ چند سطور تحریر ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں نافع بنائے اور آپ کی تشفی وطمانیت کا سبب بنائے۔

مکرمی! جہاں تک ردِ شمس کے امکان کا تعلق ہے تو وہ خارج از بحث ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر شئے پر قادر ہے۔ چاہے تو نبی علیہ السلام کی دعا سے لوٹا دے، چاہے تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی دعا ☜

حیوانات، نباتات اور جمادات کی اطاعت

حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ انصار کے ایک گھرانے نے کھجوروں کا باغ لگا رکھا تھا، جس کی آبیاری کنویں کے پانی سے کی جاتی تھی اور پانی اونٹ کے ذریعے نکالا جاتا

سے لوٹا دے، چاہے تو کسی عام آدمی کی دعا سے لوٹا دے، چاہے تو بغیر کسی کی دعا کے لوٹا دے اور چاہے تو ساری دنیا دعائیں کرتی رہے، تب بھی نہ لوٹائے، مَالِکُ الْمُلْکِ ہے۔ یَفْعَلُ مَایَشَآءُ وَیَحْکُمُ مَایُرِیْدُ.

اس لئے جن لوگوں نے اس حدیث کا اثبات کیا ہے، انہوں نے امکان کا اثبات نہیں کیا، بلکہ وقوع کا اثبات کیا ہے اور جنہوں نے نفی کی ہے، انہوں نے بھی وقوع ہی کی نفی کی ہے۔ چونکہ یہ دونوں باتیں متعارض تھیں اس لئے ملا علی قاری نے کوشش کی ہے کہ یہ تعارض رفع ہو جائے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے ایک ایسی توجیہہ نکالی کہ اثبات اور نفی دونوں درست ہو جائیں۔ چنانچہ حدیث ''اِنَّ الشَّمْسَ'' کے تحت لکھتے ہیں۔

''یہ حدیث کہ سورج حضرت علیؓ کے لئے لوٹ آیا، اس کے بارے میں امام احمد نے کہا ہے کہ اس کی کوئی اصل نہیں ہے اور ابن جوزی نے دعویٰ کیا ہے کہ یہ موضوع ہے۔ لیکن سیوطی نے کہا ہے کہ اس حدیث کو ابن مندہ، ابن شاہین ابن مردویہ نے سند کے ساتھ ذکر کیا ہے اور طحاوی اور قاضی عیاض نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔''

اس کے بعد ملا علی قاری نے محاکمہ کرتے ہوئے کہا۔

اَقُوْلُ: وَلَعَلَّ الْمَنفِیَّ رَدُّھَا بَاَمْرِ عَلِیٍّ وَالْمُثْبَتَ بِدُعَآءِ النَّبِیِّ ﷺ (موضوعاتِ کبیر ص ۴۴)

یعنی میں یہ کہتا ہوں کہ جن لوگوں نے ردشمس کی نفی کی ہے، انہوں نے شاید حضرت علیؓ کے حکم پر لوٹنے کی نفی کی ہے اور جنہوں نے اس کو ثابت کیا ہے، انہوں نے رسول ﷺ کی دعا سے لوٹنا ثابت کیا ہے۔

گویا ملا علی قاری کے نزدیک جس حدیث کو امام احمد اور ابن جوزی بے اصل اور ☜

تھا۔ ایک دن ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھے تھے کہ اچانک انصار کے اسی گھرانے کے چند افراد حاضرِ خدمت ہوئے اور عرض کی ---''یارسول اللہ! ہمارا ایک اونٹ ہے، جس سے ہم باغ کو پانی دینے کا کام لیتے ہیں، مگر چند روز سے وہ سرکش ہوگیا ہے اور پانی کھینچنا تو

موضوع کہہ رہے ہیں وہ دوسری حدیث ہے، جس میں حضرت علیؓ کے حکم سے سورج لوٹنے کا ذکر ہے، نہ کہ وہ حدیث جس میں رسول اللہ ﷺ کی دعا سے لوٹنے کا تذکرہ ہے۔ اس طرح محدثین کے متعارض اقوال میں تطبیق ہوجاتی ہے۔ یعنی۔

(۱)---اِثْبَاتُ رَدِّالشَّمْسِ بِدُعَاءِ النَّبِيِّ ﷺ ۔

(۲)---نَفْیُ رَدِّالشَّمْسِ بِاَمْرِ عَلِيٍّ كَرَّمَ اللّٰهُ وَجْهَهُ الْكَرِيْمَ.

اس سے واضح ہے کہ ملاعلی قاری کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کی دعا سے ردشمس بہر حال ثابت ہے اور نا قابلِ انکار ہے۔ حضرت علیؓ کے حکم سے لوٹنے کا البتہ انکار کیا جاسکتا ہے اور امام احمد وابن جوزی کا انکار اسی پر محمول کیا جائے گا۔

واضح رہے کہ ملاعلی قاری نے اس حدیث کو موضوعات کبیر میں تین مقامات پر ذکر کیا ہے۔

(۱) حرف الہمزہ (الف)---حدیث اِنَّ الشَّمْسَ رُدَّتْ عَلٰى عَلِيٍّ.

(۲) حرف الراء---حدیث رَدُّ الشَّمْسِ.

(۳) حرف الیاء کے بعد جو فصلیں ہیں، ان میں سے دوسری فصل میں۔

مندرجہ بالا عبارت پہلے مقام کی ہے۔ دوسرے مقام میں ملاعلی قاری نے امام احمد اور ابن جوزی کی رائے ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے۔

''---لیکن اس حدیث کو علامہ طحاوی اور قاضی عیاض نے صحیح قرار دیا ہے اور ابن مندہ، ابن شاہین اور طبرانی نے معجم کبیر اور اوسط میں اس کو عمدہ اسناد کے ساتھ روایت کیا ہے بِاِسْنَادٍ حَسَنٍ.''

تیسرے مقام پر اس حدیث کا مکمل متن ذکر کرنے کے بعد، پہلے رِيَاضِ النَّضْرَة کی عبارت نقل کی ہے کہ علماء نے کہا ہے، یہ حدیث موضوع ہے اور سورج کسی کے لئے بھی نہیں لوٹایا گیا۔ حضرت یوشع علیہ السلام کے لئے بھی صرف روکا گیا تھا۔ ☜

درکنار، کسی کو قریب بھی نہیں پھٹکنے دیتا، جبکہ باغ اور کھیتوں کو پانی کی سخت ضرورت ہے۔''

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے ہم سے فرمایا، کہ اٹھو، چل کر دیکھتے ہیں۔ چنانچہ اس باغ کے پاس پہنچے تو اونٹ ایک کونے میں کھڑا تھا۔ رسول اللہ ﷺ اس کی طرف بڑھنے لگے تو انصار نے عرض کی۔

اس کے بعد لکھتے ہیں---''مگر یہ حدیث شفا میں بروایت طحاوی موجود ہے اور اس کی وجہ میں نے شرح شفاء میں بیان کردی ہے۔''

اور شرح شفاء میں ملاعلی قاری نے تقریباً وہی کچھ بیان کیا ہے، جو مقام نمبر۲ میں بیان کرچکے ہیں۔ یعنی یہ حدیث اسنادِ حسن کے ساتھ مروی ہے اور فلاں فلاں محدث نے اس کی تخریج کی ہے۔

غرضیکہ ملاعلی قاری کسی طرح بھی اس حدیث کو موضوع ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

رہا یہ سوال کہ پھر انہوں نے اس حدیث کو موضوعاتِ کبیر میں درج ہی کیوں کیا---؟ تو اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ موضوعاتِ کبیر میں صرف موضوع روایات ہی مذکور نہیں ہیں، بلکہ ایسی صحیح احادیث بھی موجود ہیں جن کو بعض محدثین نے غلطی سے موضوع قرار دے دیا تھا۔ ملاعلی قاری ایسی احادیث ذکر کرکے ان محدثین کی غلطی واضح کرتے ہیں--- مثلاً حرف الحاء میں حدیث حُبُّکَ الشَّیْءَ یُعْمِیُ وَیُصِمُّ ابوداؤد کی روایت ہے۔ مگر علامہ صغانی نے اس کو موضوع قرار دے دیا۔ ملاعلی قاری نے مفصل حوالوں سے واضح کیا کہ صغانی کی رائے صحیح نہیں ہے۔

حرف الحاء ہی میں ایک اور روایت ''حذف السلام سنة'' کے بارے میں ابن قطان نے کہہ دیا کہ یہ روایت نہ مرفوعاً صحیح ہے، نہ موقوفاً۔ ملاعلی قاری نے بتایا کہ یہ روایت تو ابوداؤد، ترمذی، ابن خزیمہ اور حاکم کے ہاں موجود ہے۔ حاکم اور ترمذی دونوں نے اسے مرفوعاً بیان کیا ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے۔

غرضیکہ ایسی بیسیوں مثالیں ہیں۔

رہ گئی یہ بات کہ آخر ایک ہی حدیث کے بارے میں یہ اختلاف کیسے واقع ہوجاتا ہے کہ کوئی اسے صحیح قرار دیتا ہے اور کوئی ضعیف وموضوع---؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ کبھی ایک ہی روایت متعدد سندوں کے ساتھ مروی ہوتی ہے جن میں بعض صحیح ہوتی ہیں، بعض ضعیف اور بعض موضوع۔ ☜

''یارسول اللہ! وہ تو پاگل کتے کی طرح دیوانہ ہو رہا ہے، ہمیں ڈر لگتا ہے کہ کہیں آپ کو نقصان نہ پہنچا دے۔''

آپ نے فرمایا---''مجھے اس سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔''

اور واقعی آپ کو اس سے کوئی خطرہ نہیں تھا، بلکہ لوگوں نے یہ حیران کن منظر دیکھا کہ اونٹ کی جونہی آپ پر نظر پڑی، بے تابانہ آپ کی طرف بڑھا اور اپنے اگلے گھٹنے زمین پر ٹیکتے ہوئے گردن ڈال دی اور آپ کے سامنے سجدہ ریز ہو گیا۔ جانِ دو عالم ﷺ نے اس کے سر پر اپنا دستِ شفقت رکھا اور پیشانی کے بالوں سے پکڑ کر اوپر اٹھایا تو وہ بے چون و چرا اٹھ کھڑا ہوا۔ آپ اس کو اسی طرح پکڑے کنویں کے پاس تشریف لائے اور اس کو رہٹ میں جوت دیا۔ اونٹ نے ذرا برابر بھی مزاحمت نہ کی اور حسبِ معمول خوشی خوشی پانی کھینچنا شروع کر دیا۔ وہاں پر موجود صحابہ کرام اس ایمان افروز مظاہرے سے بے حد متاثر ہوئے اور عرض کی---''یارسول اللہ! جب یہ جانور بے عقل ہونے کے باوجود آپ کو سجدہ کرتا ہے تو ہم صاحبِ عقل لوگوں کو تو بطریق اولیٰ یہ کام کرنا چاہئے!''

جانِ دو عالم ﷺ نے فرمایا---''نہیں، کسی انسان کے لئے جائز نہیں کہ وہ دوسرے انسان کو سجدہ کرے۔ اگر اس چیز کی اجازت ہوتی تو میں عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے

جس محدث کو جس قسم کی سند سے روایت پہنچتی ہے، اسی کے مطابق وہ فیصلہ دے دیتا ہے۔ مگر یہ فیصلہ حرفِ آخر نہیں ہوتا، جب تک تمام سندوں کا مطالعہ اور پھر موازنہ نہ کر لیا جائے۔ مزید تحقیق کے لئے حرف الہمزہ (الف) سے پہلے جو مختصر سی فصل ہے اس کا بھی مطالعہ کر لیجئے! اس میں ملا علی قاری نے تصریح کی ہے کہ ہو سکتا ہے، کوئی روایت ایک لحاظ سے صحیح ہو اور دوسرے اعتبار سے موضوع۔ کیونکہ یہ فیصلے محدثین ان سندوں کو مدنظر رکھ کر کرتے ہیں جو ان تک پہنچی ہوتی ہیں۔ لِاِحْتِمَالِ اَنْ یَّکُوْنَ صَحِیْحًا مِنْ وَّجْہٍ وَمَوْضُوْعاً مِنْ وَّجْہٍ آخَرَ--- الخ

ھٰذَا مَا عِنْدِیْ وَاللہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ ط

(اس حدیث پر سایۂ رسول کی بحث میں ضمناً کافی گفتگو ہو چکی ہے، اس کا بھی مطالعہ فرما لیجئے۔)

خاوند کو سجدہ کیا کرے کیونکہ خاوند کا حق بہت بڑا ہے۔" (نسائی)

اس واقعہ میں تو مالکان نے اونٹ کی شکایت کی تھی، کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ اونٹ مالکوں کا شکوہ کر کے طالب رحم ہوتے تھے۔

حضرت یعلیٰؓ راوی ہیں کہ ایک دفعہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہمسفر تھے کہ ناگاہ ہمارا گزر ایک اونٹ پر ہوا جو پانی کھینچ رہا تھا۔ اس نے جونہی رسول اللہ ﷺ کو دیکھا، اپنی گردن زمین پر رکھ دی اور اپنی مخصوص آواز نکالنے لگا۔ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا

"اس کا مالک کہاں ہے؟"

ایک شخص حاضر ہوا اور کہا---"یہ اونٹ میرا ہے۔"

فرمایا---"مجھ پر بیچ دو!"

عرض کی---"یارسول اللہ! ہماری کھیتی باڑی کا یہی ایک ذریعہ ہے؛ تاہم اگر آپ لینا چاہتے ہیں تو میری طرف سے بلا قیمت قبول فرمالیجئے!"

آپ نے فرمایا---"اگر اس کے بغیر تمہارا کام نہیں چل سکتا تو میں اس کو نہیں لیتا؛ البتہ اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا کرو، کیونکہ اس نے میرے روبرو شکایت کی ہے کہ تم لوگ اس کو چارہ کم ڈالتے ہو اور کام بہت لیتے ہو۔" (مستدرک)

حضرت یعلیٰؓ ہی روایت کرتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ ایک باغ میں داخل ہوئے تو ایک اونٹ آپ کے پاس دردناک آواز میں فریاد کرتا ہوا آیا اور بے اختیار اس کی دونوں آنکھوں سے ٹپاٹپ آنسو بہنے لگے۔ آپ نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو وہ خاموش اور پرسکون ہوگیا۔ پھر آپ نے پوچھا کہ یہ اونٹ کس کا ہے؟ ایک انصاری جوان نے عرض کی کہ میرا ہے۔

آپ نے اس کو ڈانٹتے ہوئے فرمایا---"کیا تو اس بے زبان کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتا، جس نے تجھے اس کا مالک بنایا ہے---؟ یہ شکوہ کررہا ہے کہ تو اسے بھوکا رکھتا ہے اور تھکا مارتا ہے۔" (مسند احمد)

اچھا چارہ کھلانا اور مناسب کام لینا تو اونٹوں کا حق تھا جو انہوں نے پاسبانِ حقوق

عالم ﷺ کے روبرو فریاد کر کے حاصل کر لیا، مگر حسبِ ضرورت اپنے ملکیتی جانور کو ذبح کرنا تو مالک کا حق ہے، لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ بعض دفعہ اونٹ جانِ دو عالم ﷺ کے سامنے رو پیٹ کر اپنی جان بخشی بھی کرا لیتے تھے اور ذبح ہونے سے اپنے آپ کو بچا لیتے تھے۔

ایک اونٹ حاضرِ خدمت ہوا اور سجدہ ریز ہو کر رونے لگا۔ آپ نے فرمایا کہ پتہ کرو کہ یہ اونٹ کس کا ہے کیونکہ یہ بہت غمزدہ ہے۔

ایک صحابی اٹھ کر گئے اور اس کے مالک کو ڈھونڈ لائے۔ جانِ دو عالم ﷺ نے اس سے پوچھا---''اونٹ کا کیا قصہ ہے---؟ یہ شکوہ کناں ہے کہ جب تک یہ جوان اور صحتمند رہا، تم اس سے کام لیتے رہے، اب بوڑھا ہو گیا ہے تو تم اسے ذبح کرنے کے درپے ہو---!!''

اونٹ کے مالک نے عرض کی---''اس ذات کی قسم، جس نے آپ کو رسول بنایا ہے، آپ بالکل سچ فرما رہے ہیں۔ واقعی ہم اسے ذبح کرنا چاہتے تھے مگر اب ایسا نہیں کریں گے۔'' (مسند احمد)

کسی اور کے ہاتھوں ذبح ہونا تو اونٹوں کو گراں گزرتا تھا، لیکن اگر ذبح کرنے والے جانِ دو عالم ﷺ ہوتے تو پھر اور ہی نظارا ہوتا تھا۔

حجۃ الوداع میں جانِ دو عالم ﷺ نے تریسٹھ [۶۳] اونٹوں کی قربانی اپنے دستِ مبارک سے کی۔ بظاہر آدمی کو حیرت ہوتی ہے کہ ایک اونٹ بھی ذبح کرنا انتہائی دقت طلب کام ہے؛ چہ جائیکہ اکٹھے تریسٹھ اونٹ ذبح کر دیئے جائیں---! مگر اصل بات یہ ہے کہ دقت تو اس وقت ہوتی ہے جب جانور خود ذبح کرانے پر آمادہ نہ ہو اور پکڑ دھکڑ کر بزور اس کے گلے پر چھری چلانی پڑے؛ جب کہ وہاں صورتِ حال یہ تھی کہ جونہی جانِ دو عالم ﷺ ہاتھ میں چھری لئے اونٹوں کے سامنے آئے، اونٹ بے ساختہ لپکے اور زمین پر گردنیں رکھ کر آپ کے زیادہ سے زیادہ قریب ہونے کی کوشش کرنے لگے۔ ہر اونٹ کی خواہش اور تمنا تھی کہ محبوب رب العالمین ﷺ کے ہاتھوں ذبح ہونے کی سعادت سب سے پہلے مجھے حاصل ہو۔ (ابوداؤد)

جب عشاق خود ہی گلے کٹوانے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لئے بیتاب ہوں تو محبوب کو ان کے گلے کاٹنے میں کیا دقت ہوسکتی ہے۔۔۔!!!

اطاعت و ادب کے یہ مظاہرے کچھ اونٹوں کے ساتھ ہی مختص نہ تھے؛ بلکہ دیگر حیوانات بھی حسب موقع اس سعادت سے مشرف ہو جایا کرتے تھے۔

حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ ابوبکرؓ اور عمرؓ کی معیت میں ایک باغیچے میں داخل ہوئے تو وہاں پر موجود ایک بکری رسول اللہ ﷺ کے آگے سجدہ ریز ہوگئی۔ یہ دیکھ کر ابوبکرؓ نے کہا

''بکری کی نسبت تو ہم سجدہ کرنے کے زیادہ حق دار ہیں۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔۔۔''نہیں، کسی انسان کے لئے جائز نہیں کہ وہ کسی کو سجدہ کرے۔'' (مسند احمد)

ام المومنین عائشہ صدیقہؓ بیان کرتی ہیں کہ ہمارے گھر میں ایک پالتو بکری تھی۔ جب رسول اللہ ﷺ گھر میں نہیں ہوتے تھے تو وہ اِدھر اُدھر آتی جاتی رہتی تھی مگر جیسے ہی رسول اللہ ﷺ گھر میں داخل ہوتے تھے وہ پھرنا چھوڑ دیتی تھی اور کسی ایک جگہ ٹھہر جاتی تھی۔''

اس روایت کو بعض محدثین نے بکری کے ادب پر محمول کیا ہے۔ یعنی آپ کی غیر موجودگی میں وہ گھر میں چلتی پھرتی اور اچھلتی کودتی رہتی تھی مگر جب آپ گھر تشریف لاتے تھے تو ادب واحترام کے پیش نظر ایک طرف ہو کے کھڑی ہو جاتی تھی۔

اور بعض محدثین نے اس کو بکری کی محبت کا مظاہرہ قرار دیا ہے اور حدیث کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ آپ کی عدم موجودگی میں بکری بے قرار ہو جاتی تھی اور کبھی ایک طرف آتی تھی، کبھی دوسری طرف جاتی تھی مگر جونہی آپ گھر میں تشریف لاتے تھے اس کی بیتابی ختم ہو جاتی تھی اور وہ پرسکون ہو جاتی تھی۔

بہرحال یہ ادب کا مظاہرہ ہو یا محبت کا۔۔۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں لازم وملزوم ہیں؛ بلکہ بقول علامہ اقبال

ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں

اونٹ بکریاں تو پالتو جانور ہیں؛ جبکہ جانِ دو عالم ﷺ کی فریاد رسی سے جنگلی جانور بھی فیضیاب ہوئے۔

ایک دن جانِ دو عالم ﷺ مدینہ منورہ سے باہر نکلے تو ایک خیمے کے ستون کے ساتھ ہرنی کو بندھا دیکھا، جسے کچھ لوگ پکڑ لائے تھے۔ اس ہرنی نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! مجھے ان لوگوں نے پکڑ لیا ہے اور میرے چھوٹے چھوٹے دو بچے ہیں، جو بھوکے ہوں گے۔ آپ مجھے اجازت دلوا دیجئے کہ میں اپنے بچوں کو دودھ پلا آؤں۔

جانِ دو عالم ﷺ نے خیمے والوں سے کہا کہ اس کو چھوڑ دو، یہ اپنے بچوں کو دودھ پلا کر واپس آ جائے گی۔ انہوں نے کہا کہ اس کی واپسی کی کیا ضمانت ہے؟ آپ نے فرمایا، کہ میں اس کا ضامن ہوں۔ چنانچہ انہوں نے ہرنی کو آزاد کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد آپ کا دوبارہ وہاں سے گزر ہوا تو آپ نے دیکھا کہ ہرنی واپس آ گئی ہے اور ان لوگوں نے اس کو باندھ لیا ہے۔ آپ ان کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا

''کیا ہرنی بیچتے نہیں ہو؟''

انہوں نے کہا---''ہم نے بغیر قیمت کے آپ کو دے دی۔''

آپ نے فرمایا---''تو پھر اس کو آزاد کر دو!''

انہوں نے حسب ارشاد اس کی بندشیں کھول دیں تو وہ انتہائی مسرور ہوئی اور خوشی سے زمین پر زور زور سے پاؤں مارتی ہوئی اور توحید و رسالت کی گواہی دیتی ہوئی دور نکل گئی۔ (۱)

---

(۱) اس روایت کو بعض محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔ مگر قاضی عیاض، بیہقی، طبرانی اور ابو نعیم جیسے محدثین نے مختلف سندوں کے ساتھ اس کو بیان کیا ہے اور علامہ قسطلانی و علامہ زرقانی لکھتے ہیں۔

''(---لَه، طُرُقٌ يُقَوِّىْ بَعْضُهَا بَعْضًا) لِاَنَّ الطُّرُق اِذَا تَعَدَّدَتْ وَ تَبَايَنَتْ مَخَارِجُهَا دَلَّ ذٰلِكَ عَلٰى اَنَّ لِلْحَدِيْثِ اَصْلًا، فَيَكُوْنُ حَسَنًا لِغَيْرِهٖ لَا لِذَاتِهٖ.'' (زرقانی ج ۵ ص ۱۷۹)

(اس کی بہت سی سندیں ہیں جو مل کر ایک دوسرے کو قوی کر دیتی ہیں کیونکہ جب سندیں متعدد ہوں اور واقعہ مختلف لوگوں سے مروی ہو تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حدیث کی اصل موجود ہے۔

جانوروں کے علاوہ پرندے بھی اپنے دکھ درد بارگاہ رسالت میں پیش کر کے طالبِ امداد ہوتے تھے۔

ایک سفر میں صحابہ کرامؓ میں سے کسی نوجوان نے چڑیا کے گھونسلے سے اس کے بچے اتار لئے۔ چڑیا فریاد کرتی ہوئی آئی اور جانِ دو عالم ﷺ کے بالکل قریب چیخنے اور پر مارنے لگی۔ آپ نے صحابہ کرام سے پوچھا

''مَنْ اَفْجَعَ هٰذِهٖ بِوَلَدِهَا؟'' (کس نے اس چڑیا کے بچے اٹھا کر اس کو دکھیا کیا ہے؟)

ایک نوجوان نے عرض کی---''یارسول اللہ! میں نے اس کے بچے اتارے تھے۔''

فرمایا---''ابھی جاؤ اور ان کو اپنی جگہ پر رکھ کر آؤ!'' (ابوداؤد)

قارئین کرام! انہی مذکورہ بالا واقعات کو مدنظر رکھتے ہوئے اعلیٰ حضرتؒ نے یہ جامع شعر کہا ہے

ہاں، یہاں کرتی ہیں چڑیاں فریاد، یہیں سے چاہتی ہے ہرنی داد
اسی در پہ شترانِ ناشاد، گلۂ رنج و عنا کرتے ہیں

یہ تو ان جانداروں کی مختصر روداد ہے جو مکہ اور مدینہ کے اندر یا گرد و نواح میں پائے جاتے تھے اور بے ضرر تھے۔ رہے جنگلی اور صحرائی درندے، مثلاً بھیڑیئے وغیرہ تو وہ جان کے خوف سے شہروں کے قریب نہیں آسکتے تھے اس لئے بارگاہ نبوی میں حاضری سے مشرف نہیں ہو پاتے تھے؛ تاہم جہاں بھی ہوتے تھے، جانِ دو عالم ﷺ کی عظمتوں کا نہ صرف خود اعتراف کرتے رہتے تھے؛ بلکہ انسانوں کو بھی آپ کی پیروی کی تلقین کرتے رہتے

اس لحاظ سے یہ حدیث حسن لذاتہ تو نہیں ہوتی ہے؛ البتہ حسن لغیرہ ضرور ہو جائے گی۔)

بہر حال محققین کے نزدیک اس کو ضعیف کہنا بھی صحیح نہیں ہے؛ چہ جائیکہ موضوع ہی قرار دے دیا جائے، جیسا کہ بعض متشددین کا وطیرہ ہے۔ ہاں، گوہ کی شہادت اور دراز گوش کی ہمکلامی والی روایات انتہائی ضعیف ہیں اور فضائل و مناقب میں اگرچہ بعض محدثین کے نزدیک ایسی روایتیں بھی قابلِ قبول ہوتی ہیں، مگر ہم چونکہ سیدالورٰی میں اس طرح کی ضعیف حدیثیں پیش نہیں کرتے، اس لئے ان دونوں واقعات کو ذکر نہیں کیا۔

تھے۔ ہاں، یہ فرق ضرور ہوتا تھا کہ جو جانور دربارِ رسالت میں حاضر ہو جاتے تھے، ان کی زبان چونکہ جانِ دو عالم ﷺ سمجھتے تھے، اس لئے ایسے تمام چرند و پرند اپنی اپنی زبان میں دکھڑے سنا لیتے تھے؛ جب کہ جنگلوں اور صحراؤں میں پھرنے والے بھیڑیوں کی بولی سمجھنے والا کوئی نہیں ہوتا تھا، اس لئے ان کو اللہ تعالیٰ فصیح عربی میں قوت گویائی عطا کر دیتا تھا۔(۱)

حضرت ابوسعید خدریؓ راوی ہیں کہ ایک بھیڑیئے نے ریوڑ پر حملہ کیا اور ایک بکری کو اچک لیا۔ یہ دیکھ کر چرواہا اس کے پیچھے دوڑ پڑا اور بالآخر اپنی بکری کو اس کے چنگل سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ اچانک بھیڑیا فصیح عربی میں چرواہے سے مخاطب ہوا۔ کہنے لگا

''بکری کو اللہ تعالیٰ نے میرا رزق بنایا ہے اور تو نے اس کو مجھ سے چھین لیا ہے!''

چرواہے نے انتہائی حیرت کے عالم میں کہا---''میں نے ایسا حیران کن دن آج تک نہیں دیکھا--- بھیڑیا انسانوں کی طرح باتیں کر رہا ہے!!!''

بھیڑیا بولا---''میں تجھے اس سے بھی زیادہ عجیب بات نہ بتاؤں؟''

''بھلا ایسی کون سی بات ہے؟'' چرواہے نے پوچھا۔

''یہ کہ محمد ﷺ یثرب میں تشریف لا چکے ہیں اور دو پہاڑیوں کے درمیان واقع

---

(۱) جانور کا فصیح زبان میں بول پڑنا اگرچہ حیران کن ہے؛ تاہم صحیح حدیثوں سے ثابت ہے۔ اس لئے احادیث کو ماننے والا کوئی بڑے سے بڑا محقق بھی اس کا انکار نہیں کر سکتا۔

متفق علیہ روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا---''ایک شخص گائے کو ہانکے لئے جا رہا تھا، راستے میں تھک گیا تو گائے پر سوار ہو گیا۔ گائے نے کہا---''اِنَّا لَمْ نُخْلَقْ لِهٰذَا، وَاِنَّمَا خُلِقْنَا لِحِرَاثَةِ الْاَرْضِ.'' (ہمیں سواری کے لئے نہیں پیدا کیا گیا، ہماری تخلیق تو کھیتی باڑی کے لئے ہوئی ہے۔) تو لوگوں نے تعجب سے کہا، ''سبحان اللہ! گائے باتیں کرتی ہے!'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

''ہاں، میں ابوبکر اور عمر اس پر ایمان رکھتے ہیں'' (الحدیث)

غرضیکہ بعض مواقع پر قدرتِ الٰہیہ سے جانوروں کا فصیح زبان میں بول پڑنا روایت کے اعتبار سے ناقابل انکار ہے۔

نخلستان میں مقیم ہیں۔ وہ لوگوں کو ماضی و مستقبل کی خبریں بتاتے ہیں اور ان کو ہدایت وحق کی طرف بلاتے ہیں۔'' بھیڑیئے نے تفصیل بتائی۔

یہ سن کر چرواہا بکریوں سمیت مدینہ منورہ آیا اور رسول اللہ ﷺ کو سارا واقعہ سنایا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا---''اعلان کیا جائے کہ لوگ مسجد میں جمع ہو جائیں!''

اعلان سنتے ہی اہل مدینہ مسجد میں اکٹھے ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے چرواہے سے کہا کہ ان کے سامنے بھی اپنا چشم دید واقعہ بیان کر دو!

چنانچہ راعی نے وہی قصہ سب کو دوبارہ سنایا۔ اس کا بیان ختم ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا---''سچ کہہ رہا ہے۔ یہ سب قیامت کی نشانیاں ہیں اور ایک وقت آئے گا کہ آدمی جب گھر کو واپس آئے گا تو اس کا جوتا، کوڑا یا عصا اس کو وہ سب کچھ بتا دے گا جو گھر والے اس کی غیر موجودگی میں کرتے رہے ہیں۔'' (مسند احمد)

حضرت ابو ہریرہؓ بھی ایسا ہی ایک واقعہ بیان کرتے ہیں جس کا ابتدائی حصہ تو اسی سے ملتا جلتا ہے؛ البتہ اس کے آخر میں اس طرح ہے کہ بھیڑیئے نے جب راعی کو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کی تلقین کی تو راعی نے کہا کہ اگر میں اُدھر چلا گیا تو میری بکریوں کی نگہبانی کون کرے گا؟ بھیڑیئے نے کہا کہ تیری واپسی تک میں ان کی حفاظت کروں گا۔ چنانچہ راعی نے بکریاں بھیڑیئے کے سپرد کیں اور خود رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ یہ راعی یہودی تھا مگر اس واقعہ سے متاثر ہو کر آپ کے دست مبارک پر ایمان لے آیا۔ آپ نے اس سے کہا کہ اب تو واپس جا، انشاء اللہ تو اپنی تمام بکریوں کو سالم اور محفوظ پائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اس نے واپسی پر سب بکریوں کو صحیح و سلامت پایا۔

بھیڑیئے نے چونکہ راعی پر بہت احسان کیا تھا--- اسے راہ حق دکھائی تھی اور اس کی غیر موجودگی میں بکریوں کی دیکھ بھال کی تھی، اس لئے راعی نے اپنی خوشی سے ایک بکری ذبح کر کے بھیڑیئے کے آگے ڈال دی۔ (ابو نعیم)

یہ دونوں واقعات تو مدینہ منورہ سے متعلق تھے مگر بھیڑیئے کی تصدیق کا ایک واقعہ

مکہ مکرمہ میں بھی پیش آیا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب ابوسفیان اور صفوان ابھی اسلام نہیں لائے تھے۔ ایک دن دونوں حدودِ حرم کے قریب پھر رہے تھے کہ ایک بھیڑیئے کو دیکھا جو ہرن کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ ہرن بھاگتے بھاگتے حدودِ حرم میں داخل ہو گیا۔ یہ دیکھ کر بھیڑیا رک گیا اور حرم کے احترام میں ہرن کا تعاقب ترک کر دیا۔ ابوسفیان اور صفوان یہ منظر دیکھ کر حیران رہ گئے اور تعجب کا اظہار کرنے لگے، اچانک بھیڑیا ان سے کہنے لگا

''کتنی عجیب بات ہے کہ محمد ﷺ مدینہ میں بیٹھے تمہیں جنت کی طرف بلا رہے ہیں اور تم انہیں آگ کی طرف پکار رہے ہو!''

یعنی تم ان سے تقاضا کرتے ہو کہ وہ تمہارے دین کو اختیار کر لیں جو آگ میں جانے کا سبب ہے۔

بھیڑیئے کی یہ بات سن کر دونوں نے ایک دوسرے سے کہا کہ اگر ہم نے جو کچھ دیکھا ہے، اہل مکہ کو بتا دیا تو فساد پھیل جائے گا۔ اس لئے کسی سے اس بات کا تذکرہ نہیں کرنا ہے۔ (شفاء)

یہ تو اس دور کے واقعات ہیں جب جانِ دو عالم ﷺ بنفس نفیس دنیا میں موجود تھے، لیکن آپ کے وصال کے بعد بھی جہاں کہیں کوئی درندہ پایا جاتا تھا، وہ محض آپ کے نام نامی کا حوالہ سن کر نہ صرف درندگی سے باز آ جاتا تھا؛ بلکہ حوالہ دینے والے کی خدمت پر کمر بستہ ہو جاتا تھا۔

حضرت سفینہؓ کا واقعہ مشہور و معروف ہے کہ وہ روم کے علاقے میں لشکر سے بچھڑ کر تنہا رہ گئے۔ ناگاہ ان کی نظر شیر پر پڑی جو آپ کی طرف متوجہ تھا۔ بظاہر یہ صورت حال خاصی پریشان کن تھی۔ اکیلا اور غیر مسلح انسان بھلا کہاں شیر کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ مگر سفینہ کا ایمان تھا کہ ایک ہستی ایسی ہے جس کا نام سن کر خوفناک درندے بھی سر خم کر دیتے ہیں، چنانچہ انہوں نے شیر سے مخاطب ہو کر کہا۔

''يَا اَبَا الْحَارِثْ! اَنَا سَفِيْنَةُ مَوْلىٰ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ ....''

(اے ابوالحارث (شیر کی کنیت) میں سفینہ ہوں، رسول اللہ ﷺ کا غلام۔ میرے ساتھ یہ حادثہ پیش آ گیا ہے کہ میں اپنے لشکر سے بچھڑ گیا ہوں اور اس کی تلاش میں

پریشان پھر رہا ہوں۔)

رسول اللہ ﷺ کا حوالہ سنتے ہی شیر منمناتا ہوا آیا اور حضرت سفینہؓ کے پہلو میں کھڑا ہوگیا۔ پھر آپ کا محافظ بن کر آپ کی رہنمائی کرنے لگا، یہاں تک کہ آپ کو لشکر تک پہنچادیا۔ (شرح السنہ)

چرندوں، پرندوں اور درندوں کی فرمانبرداری اور اطاعت شعاری اگرچہ بے حد حیرت انگیز ہے؛ تاہم ان چیزوں میں چونکہ روح حیوانی پائی جاتی ہے اس لئے ان میں کسی حد تک ادراک اور شعور بھی پایا جاتا ہے؛ جبکہ درخت اس قسم کی روح سے بالکل خالی ہوتے ہیں مگر اس کے باوجود وہ بھی جانِ دوعالم ﷺ کو پہچانتے تھے۔ آپ کی رسالت ونبوت کی شہادت دیتے تھے اور آپ کا ہر حکم بجالاتے تھے۔

اس سلسلے کا آغاز اس وقت ہوا جب اللہ تعالیٰ نے جانِ دوعالم ﷺ کو نبوت سے سرفراز فرمایا۔ ام المومنین عائشہ صدیقہؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا---

''جب مجھ پر وحی نازل ہوئی تو یہ کیفیت ہوگئی کہ جس درخت یا پتھر کے پاس سے گزرتا تھا، وہ پکار اٹھتا تھا---اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ.'' (بزار)

سلام کی آواز بعض دفعہ ساتھ چلنے والوں کو بھی سنائی دیتی تھی۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ مکہ میں قیام کے دوران ایک دفعہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مکہ کی گھاٹیوں میں پھر رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ جو درخت یا چٹان آپ کے سامنے آتی تھی، عرض کرتی تھی---اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ.

بعض درخت اللہ تعالیٰ سے سلام پیش کرنے کی اجازت لے کر خود ہی چل کر حاضر خدمت ہوجایا کرتے تھے۔

حضرت علیؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک سفر کے دوران ہم نے پڑاؤ کیا تو رسول اللہ ﷺ آرام فرمانے کے لئے لیٹ گئے۔ اچانک ہم نے ایک کیکر کے درخت کو دیکھا کہ زمین کو چیرتا ہوا چلا آرہا ہے، یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کے قریب پہنچ گیا۔ پھر آپ کے گرد طواف کیا، آپ پر جھکا اور اپنی جگہ پر واپس چلا گیا۔ رسول اللہ ﷺ بیدار ہوئے تو ہم

نے آپ سے یہ واقعہ بیان کیا، آپ نے فرمایا---"ہاں !اس درخت نے مجھے سلام کرنے کی اللہ تعالیٰ سے اجازت طلب کی تھی۔"

سبحان اللہ! بظاہر سوئے ہوئے ہیں اور درخت کے اجازت طلب کرنے، آنے جانے اور سلام کرنے سے آگاہ ہیں۔ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡهِ وَ سَلَّمَ.

نہ صرف سلام پیش کرتے تھے بلکہ احکام بھی بجالاتے تھے۔ اس کا پہلا مظاہرہ مکہ مکرمہ میں اس روز ہوا جب کفار ومشرکین جانِ دو عالم ﷺ پر حملہ آور ہوئے اور آپ کو شدید اذیت پہنچائی۔ اس دن آپ ایک ندی کے کنارے افسردہ ومغموم بیٹھے تھے کہ جبریل علیہ السلام آئے اور تسلی آمیز لہجے میں پوچھا---"کیا بات ہے، بہت غمگین نظر آرہے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا---"اہل مکہ نے میرے ساتھ جو سلوک کیا ہے، اس سے طبیعت پریشان ہے۔"

"کیا آپ پسند کریں گے کہ میں ایک نشانی دکھاؤں؟" جبریل امین نے پوچھا۔

"ہاں دکھایئے!" آپ نے فرمایا۔

"جبریل نے وادی کی دوسری جانب ایک درخت کی طرف اشارہ کیا اور کہا

"ذرا اس کو بلایئے!"

جانِ دوعالم ﷺ نے بلایا تو وہ چلتا ہوا آپ کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔

جبریل نے کہا---"اب اسے حکم دیجئے کہ واپس چلا جائے۔"

آپ نے اس کو واپس جانے کا کہا تو وہ دوبارہ اپنی جگہ لوٹ گیا۔ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ تصرف واختیار کا یہ شاندار مظاہرہ دیکھ کر جانِ دو عالم ﷺ کا دل خوش ہوگیا اور پریشانی جاتی رہی۔ فرمایا---"حَسۡبِیۡ حَسۡبِیۡ۔ (میرے لئے کافی ہے، میرے لئے کافی ہے۔) (دارمی)

یہ واقعہ اطاعت کا نقطۂ آغاز تھا۔ اس کے بعد متعدد ایسے واقعات پیش آتے رہے کبھی اظہار معجزہ کے مطالبے پر، کبھی آپ کی کوئی ذاتی ضرورت پوری کرنے کے لئے

درخت آپ کا ہر حکم مانتے رہے۔ چند ایمان افروز واقعات مختصراً ملاحظہ فرمایئے۔

۱---ایک اعرابی نے جانِ دو عالم ﷺ سے معجزے کا مطالبہ کیا۔ فرمایا

''جاؤ اس درخت سے کہو کہ تجھے رسول اللہ بلا رہے ہیں۔''

اعرابی نے اسے جانِ دو عالم ﷺ کا پیغام پہنچایا تو وہ دائیں بائیں اور آگے پیچھے زور زور سے ہلنے لگا تا کہ جڑیں چھوٹ جائیں۔ پھر جڑوں کو گھسیٹتا ہوا تیزی سے چل پڑا اور حاضر خدمت ہو کر عرض کی---اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ.!

اعرابی نے کہا کہ اب اسے حکم دیجئے کہ واپس چلا جائے۔ آپ کا حکم سنتے ہی درخت اپنی جگہ پر لوٹ گیا اور اس کی جڑیں پھر زمین میں پیوست ہو گئیں۔ (بزار)

۲--- جانِ دو عالم ﷺ سفر کے دوران ایک جگہ ٹھہرے ہوئے تھے کہ ایک اعرابی پاس سے گزرا۔

آپ نے پوچھا---''کدھر جا رہے ہو؟''

''اپنے گھر جا رہا ہوں۔'' اس نے جواب دیا

''کیا تجھے ایک اچھی بات نہ بتاؤں؟''

''وہ کیا---؟''

''یہ کہ تو گواہی دے کہ اللہ وحدہٗ لاشریک ہے اور محمد (ﷺ) اس کے بندے اور رسول ہیں۔''

''ان دونوں باتوں کا کوئی ثبوت؟''

آپ نے ایک درخت کو بلایا تو وہ زمین کو چیرتا ہوا آپ کے روبرو آ کھڑا ہوا۔ آپ نے اس سے تین بار شہادت طلب کی اور اس نے تینوں دفعہ کہا---''اَشْھَدُاَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَاَشْھَدُاَنَّ مُحَمَّدًاعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ.''

گواہی دے کر درخت واپس چلا گیا تو اعرابی نے دل کی گہرائیوں سے وہی گواہی دے دی۔

اَشْھَدُاَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَاَشْھَدُاَنَّ مُحَمَّدًا

عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ. (مستدرک)

۳---ایک سفر میں آپ کو قضائے حاجت کی ضرورت پڑی مگر وہاں کوئی پردے کی جگہ نہ تھی۔ چنانچہ آپ ایک درخت کے پاس گئے اور اس کی ٹہنی سے پکڑ کر فرمایا---
''اِنۡقَادِیۡ عَلَیَّ بِاِذۡنِ اللّٰہِ.'' (اللہ کے حکم سے میری اطاعت کر۔)

یہ سنتے ہی درخت آپ کے پیچھے یوں چل پڑا جیسے مہار والا اونٹ، مہار کھینچنے والے کے پیچھے چل پڑتا ہے۔ اسی طرح ٹہنی سے پکڑے ہوئے آپ نے اس کو ایک جگہ لا کر چھوڑ دیا۔ پھر دوسرے درخت کے پاس تشریف لے گئے اور اسے بھی اسی طرح شاخ سے پکڑ کر کھینچ لائے اور پہلے درخت کے قریب کھڑا کر دیا۔ پھر فرمایا---''اِلۡتَئِمَا عَلَیَّ بِاِذۡنِ اللّٰہِ.'' (اللہ کے حکم سے میرے لئے ایک دوسرے کے ساتھ جڑ جاؤ۔)

جب دونوں نے تعمیل حکم کر دی اور اکٹھے ہو کر آپ کے لئے مکمل پردہ بنا دیا تو آپ نے اپنی ضرورت پوری فرمائی۔ (مسلم)

۴--- ایک غزوے کے سفر میں اسی طرح آپ کو ضرورت پڑی تو حضرت اسامہؓ سے پوچھا کہ کوئی اوٹ والی جگہ دکھائی دیتی ہے؟

''نہیں، یا رسول اللہ!'' حضرت اسامہؓ نے بتایا۔

''کہیں کھجوریں یا پتھر نظر آتے ہیں؟''

''ہیں تو سہی یا رسول اللہ! مگر بکھرے ہوئے ہیں۔'' حضرت اسامہؓ نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑا کر بتایا۔

''جا کے ان کھجوروں اور پتھروں سے کہو کہ رسول اللہ اپنی ضرورت کے لئے تمہیں ایک جگہ اکٹھا ہونے کا حکم دیتے ہیں۔''

حضرت اسامہؓ نے جونہی یہ شاہی فرمان سنایا، درخت اور پتھر یکجا ہونے لگے اور سب نے مل جل کر ایک دیوار سی بنا دی۔ جب جانِ دو عالم ﷺ فارغ ہو کر واپس تشریف لائے تو حضرت اسامہؓ سے کہا کہ اب ان سے کہو، اپنی اپنی جگہوں پر واپس چلے جائیں۔ چنانچہ حضرت اسامہؓ کے کہنے پر دوبارہ تمام درخت اور پتھر اپنی سابقہ

جگہوں پر لوٹ گئے۔ (شفاء)

سالم درخت کا ٹانگوں اور پاؤں کے بغیر چل پڑنا بلاشبہ بہت حیرت افزا ہے، مگر اس سے زیادہ حیران کن یہ واقعہ ہے کہ ایک اعرابی نے جانِ دو عالم ﷺ سے کہا

''مجھے کیسے پتہ چلے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں؟''

فرمایا---''اگر میں کھجور کے اس خوشے سے کہوں کہ وہ اتر کر میرے پاس آئے اور پھر واپس اپنی جگہ پر چلا جائے تو کیا تمہیں یقین آ جائے گا؟''

''جی ہاں!'' اعرابی نے کہا۔

آپ نے خوشے کو بلایا تو وہ اپنی جگہ سے ٹوٹ کر مختلف شاخوں سے ٹکراتا ہوا زمین پر آ رہا، پھر زمین پر اٹھتا اور گرتا ہوا آپ کے پاس آ پہنچا۔ آپ نے فرمایا---''اب واپس چلا جا!''

چنانچہ وہ دوبارہ اسی طرح چلتا ہوا درخت پر چڑھ گیا اور اپنی جگہ پر جا کر لٹک گیا۔ اعرابی اسی وقت مسلمان ہو گیا۔ (ترمذی)

سرسبز و شاداب درختوں میں تو پھر بھی ایک گونہ زندگی پائی جاتی ہے کیونکہ ان میں نمی اور نمو پایا جاتا ہے لیکن سوکھا اور خشک تنا تو ہر قسم کی حیات سے عاری ہوتا ہے مگر اللہ اکبر! کیا شان ہے اس دلربائے کونین کی، کہ خشک و بے جان تنا بھی اس کا والہ وشیدا ہے اور اس کے فراق میں گریاں و نالاں ہے۔ (ﷺ)

اس روح پرور واقعہ کو دس سے زیادہ صحابہ کرامؓ نے بیان کیا ہے اور صحیح بخاری سمیت حدیث و سیرت کی لاتعداد کتابوں میں اس کا ذکر پایا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ کچھ محدثین نے اس کو متواتر قرار دیا ہے۔ بعض روایات مختصر ہیں اور بعض میں قدرے تفصیل ہے۔ ہم نے درج ذیل ترتیب متعدد کتابوں سے اخذ کی ہے۔

ابتداء میں مسجد نبوی کے اندر منبر نہیں تھا۔ اس زمانے میں جانِ دو عالم ﷺ ایک خشک تنے سے ٹیک لگا کر خطبہ دیا کرتے تھے۔ جب لوگوں کی تعداد زیادہ ہو گئی تو حضرت تمیم داریؓ نے آپ کی اجازت سے خطبے کے لئے منبر تیار کر دیا۔

جب جانِ دو عالم ﷺ پہلی دفعہ منبر پر کھڑے ہوئے تو وہ سوکھا تنا جس سے آپ ٹیک لگایا کرتے تھے آپ کی جدائی اور فراق برداشت نہ کر سکا اور شدتِ غم سے لرزنے کانپنے لگ گیا۔ پھر بے اختیار یوں بلک اٹھا جس طرح ماں سے بچھڑا ہوا بچہ بلکتا ہے یا بچے سے جدا کی گئی اونٹنی بلبلاتی ہے۔ یہ زاری و فریاد اتنی شدید تھی کہ پوری مسجد گونج اٹھی اور ہر شخص ادھر متوجہ ہو گیا۔ لگتا تھا کہ تنا درد سے پھٹ جائے گا۔

آخر وہی ہوا، چیختے چیختے وہ ہجر کا مارا شق ہو گیا۔ جانِ دو عالم ﷺ بے تابانہ منبر سے اترے اور شفقت بھرے انداز میں اس پر ہاتھ رکھ کر اپنے پہلو سے چمٹا لیا۔ محبوب کا وصال نصیب ہوا تو اس مبتلائے ہجر کا دکھ کم ہو گیا اور رفتہ رفتہ پُرسکون ہو گیا۔ جانِ دو عالم ﷺ نے فرمایا کہ اگر اس کو میں یوں تسلی نہ دیتا تو یہ مستقل طور پر اسی طرح روتا رہتا۔

اس کے بعد آپ نے اس پر مزید کرم کیا اور اس سے پوچھا کہ بتا تو کیا چاہتا ہے؟ اگر تو پسند کرے تو میں تجھے دوبارہ باغ میں لگا دوں اور تُو پھر سے سرسبز اور ثمر آور ہو جائے، اور اگر تُو چاہے تو میں تجھے جنت میں لگا دوں جہاں اللہ کے نیک بندے تیرے سائے میں بیٹھیں گے اور تیرا پھل کھائیں گے۔

اس نے عرض کی کہ مجھے جنت میں لگا دیجئے جہاں نیک لوگ میری کھجوریں کھائیں اور میں ہمیشہ سرسبز رہوں۔

آپ نے فرمایا کہ میں نے تیری تمنا پوری کر دی ہے۔ پھر صحابہ کرام سے فرمایا کہ اس نے دار الفنا پر دار البقا کو ترجیح دی ہے۔ اس کے بعد آپ نے حکم دیا کہ اس کو میرے منبر کے نیچے دفن کر دیا جائے۔

(اس واقعے کا ابتدائی حصہ یعنی رونے کے بعد پُرسکون ہونے تک تقریباً متواتر ہے اور باقی حصہ بیہقی اور دارمی میں مذکور ہے۔)

لکڑی کے سوکھے اور بے نم تنے کا دردِ غم اور نالہ و فغاں آپ نے ملاحظہ فرمایا!

یہ سب عشقِ مصطفےٰ ﷺ کی کرشمہ سازیاں ہیں اور مصطفےٰ ﷺ کا عشق ایسا ہمہ گیر انعامِ ربانی ہے کہ سرسبز درختوں اور خشک تنوں کے علاوہ پہاڑوں اور پتھروں میں بھی یکساں

طور پر پایا جاتا ہے، حالانکہ پتھر ہر قسم کی حیات سے یکسر محروم ہوتے ہیں۔ کوہ احد کے بارے میں خود جانِ دوعالم ﷺ نے فرمایا کہ احد ایسا پہاڑ ہے جو ہمارے ساتھ محبت رکھتا ہے اور ہم اس کے ساتھ محبت رکھتے ہیں۔ (بخاری)

اس کی محبت کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ جب اس کو پابوسی محبوب کا شرف حاصل ہوا تو فرطِ طرب سے جھوم اٹھا جس سے زلزلے کی سی کیفیت پیدا ہوگئی۔

حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ احد پر چڑھے، آپ کے ہمراہ ابوبکرؓ، عمرؓ، اور عثمانؓ بھی تھے کہ اچانک پہاڑ ہلنے لگ گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس پر اپنی ایڑی ماری اور فرمایا ''ٹھہر جا! کہ تجھ پر ایک نبی ہے، ایک صدیق ہے اور دو شہید ہیں۔'' (بخاری)

اعلیٰ حضرتؒ جانِ دوعالم ﷺ کی ایڑیوں کے اس وقار کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں

ایک ٹھوکر سے احد کا زلزلہ جاتا رہا
رکھتی ہیں کتنا وقار اللہ اکبر ایڑیاں

اس طرح کی روایات مکہ میں واقع کوہ حرا اور کوہ ثبیر کے بارے میں بھی آئی ہیں۔ غرضیکہ مدینے کے پہاڑ ہوں یا مکہ کے، سب ہی جانِ دوعالم ﷺ کے ساتھ محبت رکھتے تھے اور پیار کرتے تھے۔

یہی حال پتھروں کا تھا۔ پہلے گزر چکا ہے کہ جوں ہی آپ نبوت سے سرفراز ہوئے ہر درخت اور پتھر نے آپ کو سلام کہنا شروع کر دیا، مگر ایک دیدہ ور پتھر ایسا بھی تھا جو نبوت سے پہلے بھی آپ کو سلام کرتا رہتا تھا۔

حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا--- ''میں اس پتھر کو اچھی طرح جانتا ہوں جو نبوت سے پہلے مجھے سلام کیا کرتا تھا۔'' (مسلم)

جمہور علماء کے نزدیک اس پتھر سے مراد حجر اسود ہے--- روشن انہی کے عکس سے پتلی حجر کی ہے۔

قارئین کرام! مندرجہ بالا انتہائی مستند اور معتبر روایات سے روز روشن کی طرح

واضح ہے کہ جانور چاہے چرندے ہوں، درندے ہوں یا پرندے، اسی طرح درخت سرسبز ہوں یا خشک، یوں ہی پتھر، خواہ یک جا ہو کر پہاڑ بن گئے ہوں یا جدا جدا پڑے، ہوں، یہ تمام کے تمام جانِ دو عالم ﷺ کے مطیع و فرمانبردار تھے۔ آپ سے محبت رکھتے تھے، آپ پر سلام پیش کرتے تھے، آپ کو اپنے دکھڑے سناتے تھے، آپ کے فراق میں نالہ و فغاں کرتے تھے اور آپ کی پابوسی سے مشرف ہو کر جھوم اٹھتے تھے۔ ہاں، انسان اور جن چونکہ مختار ہیں اور ایمان بالغیب کے مکلّف ہیں اس لئے ان کے بعض افراد آپ کی حقیقت سے آگاہ نہ ہونے کی وجہ سے سرکشی اور نافرمانی کا ارتکاب کرتے ہیں، ورنہ باقی ساری کائنات آپ کو جانتی، مانتی، اور عزت و احترام کرتی ہے۔ یہ بات خود جانِ دو عالم ﷺ نے یوں بیان فرمائی ''مَابَیْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ شَئْیٌ اِلَّا یَعْلَمُ اَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَّا عَاصِیُ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ.'' (جنوں اور انسانوں کے نافرمان افراد کے علاوہ زمین و آسمان میں پائی جانے والی ہر چیز جانتی ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔) (شفاء)

ان تمام مصدقہ حقائق کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بعض انسانوں کی طرح کچھ دوسری جاندار چیزیں بھی بدفطرت ہوتی ہیں اور اگر موقع ملے تو اس کا مظاہرہ بھی کر دیتی ہیں۔ جیسا کہ بخاری شریف میں چھپکلی کے بارے میں ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے لئے جلائی گئی آگ کو پھونکیں مار کر بھڑکانے کی کوشش کرتی تھی۔ حالانکہ چھپکلی کی ذرا سی پھونک اس آگ کو کیا بھڑکا سکتی تھی! مگر اپنی بدفطرتی کی بنیاد پر وہ اس سے باز نہ رہ سکی۔

اسی طرح بچھو بھی ایک انتہائی بدخصلت جاندار ہے۔ چنانچہ حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ ایک رات رسول اللہ ﷺ نماز پڑھ رہے تھے۔ اسی دوران اپنا ہاتھ زمین پر رکھا تو بچھو نے ڈس لیا۔ آپ نے بچھو کو جوتے کی ضرب سے مار ڈالا اور فرمایا ''اللہ لعنت کرے بچھو پر، نہ نمازی کو چھوڑتا ہے، نہ غیر نمازی کو'' یا یوں فرمایا ''نہ نبی کو چھوڑتا ہے نہ غیر نبی کو۔''

پھر نمک اور پانی منگوایا اور دونوں کو ایک برتن میں ڈال کر وہ نمک ملا پانی انگلی کی اس جگہ پر ڈالتے رہے جہاں بچھو نے ڈنگ مارا تھا اور اس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے معوذتین (قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس) پڑھ کر دم

کرتے رہے۔(مشکوٰۃ)

کیسا ملعون بچھو تھا جس نے آقائے کونین ﷺ کی مقدس انگلی پر ڈنگ مارنے کی ناروا جسارت کی۔!! سچ ہے

نیش عقرب نہ از پئے کین است
مقتضائے طبیعتش این است

(بچھو کا ڈسنا کسی دشمنی اور کینے کی بنا پر نہیں ہوتا، بلکہ یہ اس کی طبیعت کا تقاضا ہے۔)

متعدد اشیاء میں معجزانہ برکات کا ظہور

مدینہ منورہ میں اکثر صحابہ کرامؓ کی زندگی انتہائی فقیرانہ تھی اور بمشکل گزر بسر ہوتی تھی۔ کبھی کھانا ناکافی ہو جاتا تھا اور کبھی کھجور کے باغوں میں اتنی کھجوریں نہیں لگتی تھیں جن سے مالک باغ کی ضروریات پوری ہو سکیں۔

علاوہ ازیں اکثر و بیشتر جہاد کے لئے سفر کرنے پڑتے تھے اور طویل سفروں میں کہیں پانی ناپید ہو جاتا تھا اور کہیں کھانے کی چیزیں ختم ہو جاتی تھی۔ ان تمام صورتوں میں صحابہ کرام جانِ دو عالم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر اپنی پریشانی بیان کرتے تھے اور جانِ دو عالم ﷺ معجزانہ قوت سے ان کی ہر مشکل حل فرما دیتے تھے، ہر تکلیف دور کر دیتے تھے۔

ایسے واقعات ایک دو نہیں بیسیوں ہیں۔ ہم صرف چند مستند ترین روایات پیش کر رہے ہیں اور اس سلسلے کا آغاز ان برکات کے ظہور سے کر رہے ہیں جو پانی کے ساتھ متعلق ہیں۔

انگشتانِ مقدسہ سے پانی کا نکلنا

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم پیاس میں مبتلا ہوئی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ اپنا عصا پتھر پر ماریں۔ آپ نے ایسا ہی کیا تو اس پتھر سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے اور بنی اسرائیل کو سیراب کرنے لگے۔

بغیر کسی ظاہری سبب کے موسیٰ علیہ السلام کے عصا کی ضرب سے چشمے پھوٹ پڑنا ہے تو بلاشبہ معجزہ، مگر اتنا زیادہ حیران کن نہیں کیونکہ چشمے ہمیشہ پتھروں اور چٹانوں ہی سے پھوٹتے

ہیں۔ البتہ انتہائی حیرت افزا معجزہ یہ ہے کہ انگلیوں سے پانی کے چشمے ابل پڑیں، حالانکہ انگلیوں میں خون رواں ہوتا ہے، نہ کہ پانی۔

بلاشبہ یہ جانِ دو عالم ﷺ کا ایسا معجزہ ہے جو صرف آپ کو عطا ہوا اور اتنا حیران کن ہے کہ اس کی کوئی عقلی توجیہ ممکن ہی نہیں ہے۔

کیا ہی خوش بخت اور نصیبہ ور لوگ تھے جنہوں نے اپنی آنکھوں سے آقا ﷺ کی مقدس انگلیوں سے رحمت کی ندیاں جاری ہوتے دیکھی تھیں اور کائنات کے اس افضل ترین اور مبارک ترین پانی سے فیضیاب و سیراب ہوئے تھے!!

انگلیاں ہیں فیض پر، ٹوٹے ہیں پیاسے جھوم کر
ندیاں پنجاب رحمت کی ہیں جاری، واہ! واہ!

آیئے! پنجاب رحمت کی ان رواں اور موجزن ندیوں کے بہاؤ کا نظارہ کرتے ہیں۔

❁--- حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم ایک سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ تھے۔ پانی کی کمی ہوگئی۔ آپ نے فرمایا--- ''تلاش کرو، کسی کے پاس کچھ پانی بچا ہو تو لے آؤ!''

لوگ ایک برتن لے آئے جس میں ذرا سا پانی تھا۔ آپ نے برتن میں اپنا دست مبارک ڈالا اور فرمایا--- ''آؤ اور وضو کا پانی اور خدا کی برکت لو''

ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ میں نے بچشم خود دیکھا آپ کی انگلیوں سے پانی چشمے کی طرح پھوٹ رہا ہے۔

❁--- حضرت جابرؓ ایک سفر کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے وضو کے لئے پانی طلب فرمایا۔ جب نہ ملا تو مجھ سے فرمایا--- ''لشکر میں تلاش کرو!'' میں نے لوگوں سے پتہ کرنے کے بعد عرض کی--- ''قافلہ بھر میں ایک قطرہ پانی بھی نہیں ملا۔''

ایک انصاری خاص طور پر رسول اللہ ﷺ کے لئے اپنی مشکوں میں پانی ٹھنڈا کیا کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا--- ''اس کے پاس ہی جا کر دیکھو، ہوسکتا ہے اس کی مشک میں کچھ پانی ہو۔''

میں گیا تو ان کی مشک میں بھی اتنا ہی پانی ملا کہ اگر میں اس کو انڈیلتا تو مشک کا جو حصہ خشک تھا وہ اس کو چوس لیتا۔ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی---''ان کی مشک میں تو صرف اتنا ہی پانی ہے کہ اگر میں اس کو انڈیلوں تو وہ اس کے خشک حصہ میں جذب ہو کر رہ جائے گا۔''

آپ نے فرمایا---''جاؤ اور جا کر وہی لے آؤ!''

میں اس کو لے آیا تو آپ نے اس کو اپنے دست مبارک میں لیا اور اس پر کچھ پڑھنے لگے۔ مجھ کو معلوم نہیں کہ آپ نے کیا پڑھا تھا۔ پھر اس کو اپنے ہاتھ سے ملنے لگے۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا---''جس کسی کے پاس اتنا بڑا ٹب ہو جو پورے قافلے کے لئے کافی ہو جائے، اس کو آواز دو۔''

میں نے اعلان کر دیا کہ جس کے پاس بھی ایسا ٹب ہو وہ لے آئے چنانچہ اتنا ہی بڑا ٹب پیش کیا گیا جس کو لوگ اٹھا کر لائے۔ میں نے اس کو آپ کے سامنے لا کر رکھ دیا۔ آپ نے اس میں اپنا دست مبارک ڈال کر انگلیاں پھیلا دیں اور ان کو ٹب کے اندر رکھ دیا۔ پھر فرمایا---''جابر! یہ مشکیزہ لو اور بسم اللہ کہہ کر میرے ہاتھ پر ڈالو!''

میں نے بسم اللہ کہہ کر پانی برتن میں ڈالا تو میں نے دیکھا کہ پہلے آپ کی انگلیوں کی درمیان سے پانی امنڈا، پھر پورے ٹب میں پانی جوش سے چکر کھانے لگا حتیٰ کہ ٹب پانی سے لبریز ہو گیا۔ آپ نے فرمایا---''جابر! اعلان کر دو کہ جس کو پانی کی ضرورت ہو وہ آ کر لے لے۔''

چنانچہ لوگ آتے گئے اور پی پی کر سیراب ہوتے گئے۔ جب لوگ ذرا کم ہو گئے تو میں نے کہا---''کوئی شخص ایسا باقی ہے جس کو پانی کی ضرورت ہو؟''

کوئی جواب نہ آیا تو رسول اللہ ﷺ نے ٹب سے اپنا ہاتھ باہر نکال لیا اور ٹب جوں کا توں بھرا کا بھرا تھا۔ (مسلم)

❁---حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ لشکر میں کسی کے پاس پانی نہ رہا۔ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کی

''یارسول اللہ! لشکر کے پاس پانی نہیں رہا''

آپ نے پوچھا---''تمہارے پاس کچھ پانی ہے؟''

اس نے کہا کہ ہے۔فرمایا---''اس کو میرے پاس لے آؤ!''

وہ ایک برتن لے آیا، اس میں تھوڑا سا پانی تھا۔آپ نے اپنی انگلیاں برتن کے اوپر پھیلائیں تو آپ کی انگلیوں میں سے پانی کے چشمے ابل پڑے۔آپ نے بلال رضی اللہ عنہ سے فرمایا---''آواز دے دو کہ وضو کیلئے برکت والا پانی لے لیں۔'' (مسند امام احمد)

❁---حضرت جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم رکاب تھا۔ میں نے دیکھا کہ عصر کی نماز کا وقت آ گیا ہے اور ہمارے پاس پانی نہیں ہے۔صرف جو کسی کے پاس بچا کھچا رہ گیا تھا بس وہی تھا، وہ ایک برتن میں ڈال کر آپ کے سامنے پیش کیا گیا۔ آپ نے اپنا دست مبارک اس میں ڈالا اور اپنی انگلیاں پھیلا دیں۔اس کے بعد فرمایا ---''لوگو! آؤ، وضو کا پانی اور اللہ کی طرف سے برکت لُوٹو!''

میں نے دیکھا کہ پانی پھوٹ پھوٹ کر آپ کی انگلیوں سے ابلنے لگا، حتی کہ تمام صحابہ نے وضو بھی کرلیا اور خوب پی بھی لیا اور میں نے تو جتنا پانی میرے پیٹ میں سما سکتا تھا اتنا ہی پی ڈالا کیونکہ میں جان چکا تھا کہ یہ انتہائی برکت والا پانی ہے۔

حدیث کا راوی کہتا ہے کہ میں نے جابرؓ سے سوال کیا---''اس وقت آپ کتنے صحابہ تھے؟''

انہوں نے کہا---''ایک ہزار اور چار سو'' (شیخین)

❁---یہ روایت بھی حضرت جابرؓ سے ہی ہے کہ صلح حدیبیہ میں ہم کو پانی نہ مل سکا اور ہم کو سخت پیاس لگی۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک چمڑے کا تھیلا تھا۔آپ نے اس سے پانی لے کر وضو کیا۔پھر کیا تھا، لوگ پانی دیکھ کر بے تابی کے ساتھ اس کی طرف لپکے۔ آپ نے یہ دیکھ کر فرمایا---''تمہیں کیا ہو گیا ہے؟''

انہوں نے عرض کی---''ہمارے پاس نہ وضو کیلئے پانی ہے، نہ پینے کے لئے۔ بس یہی ہے جو آپ کے سامنے ہے۔''

آپ نے اس تھیلے میں اپنا دست مبارک ڈالا تو پانی آپ کی انگلیوں سے چشمے کی طرح ابل ابل کر نکلنے لگا۔ ہم نے خوب پیا بھی اور وضو بھی کیا۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے پوچھا---"آپ کتنے تھے؟"

جابرؓ نے کہا---"اگر ہم ایک لاکھ بھی ہوتے تو پانی کا عالم یہ تھا کہ ان کو بھی کافی ہو جاتا مگر اس وقت ہم پندرہ سو تھے۔" (شیخین)

یہ تمام واقعات تو مختلف سفروں کے دوران پیش آتے رہے، لیکن جانِ دو عالم ﷺ کی ساقی انگلیوں کا یہ معجزہ کچھ سفر ہی کے ساتھ مختص نہ تھا بلکہ مدینہ منورہ کے باسی بھی اگر قلت آب سے دو چار ہو جاتے تو رحمت کی یہ ندیاں جاری ہو جایا کرتی تھیں۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ ؓ مقام زوراء میں تھے۔ یہ مدینہ طیبہ میں بازار کے پاس ایک مقام کا نام تھا اور وہاں مسجد بھی تھی۔ اتنے میں نماز کا وقت ہو گیا مگر وہاں پانی موجود نہیں تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک پیالہ منگوایا جس میں تھوڑا سا پانی تھا اور اس میں اپنا ہاتھ ڈالا تو پانی آپ کی انگلیوں سے پھوٹ پھوٹ کر ابلنے لگا، یہاں تک کہ آپ کے سب ہمراہیوں نے وضو کر لیا۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے پوچھا---"اے ابوحمزہ! (حضرت انسؓ کی کنیت ہے) آپ کے ان ساتھیوں کی کل کتنی تعداد ہو گی؟"

انہوں نے جواب دیا---"تین سو کے قریب ہوں گے"

دوسری روایت میں یہ وضاحت بھی ہے کہ یہ پانی اتنا کم تھا کہ آپ کی انگلیاں بھی اس میں نہ ڈوبتی تھیں۔ (شیخین)

اعلیٰ حضرتؒ نے جانِ دو عالم ﷺ کی ان انگشتان مبارکہ پر کیا وجد آفرین سلام پیش کیا ہے

نور کے چشمے لہرائیں ، دریا بہیں
انگلیوں کی کرامت پہ لاکھوں سلام

تشنہ لبوں کی دادرسی کے لئے یہی ایک طریقہ مخصوص نہیں تھا؛ بلکہ جب جانِ دو عالم ﷺ مناسب سمجھتے تھے کسی اور انداز سے پانی کی کمی دور فرما دیتے تھے۔

حضرت عمران بن حصینؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ سفر جہاد کے دوران پانی ختم ہوگیا جس کی وجہ سے ہم سب پریشان تھے۔ جب ہم کو سخت پیاس لگی تو آپ نے پانی کی تلاش کیلئے ایک قافلہ آگے روانہ کیا اور مجھے اس کے ساتھ بھیج دیا۔ جب ہم چل دیئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک عورت اپنی چھاگلوں کے درمیان اونٹنی پر پیر لٹکائے جارہی ہے۔ ہم نے اس سے پوچھا---"پانی کا چشمہ کہاں ملے گا؟"

اس نے جواب دیا---"ارے یہاں پانی کہاں!"

ہم نے اس سے پوچھا---"تیرے گھر اور پانی کے درمیان کتنا فاصلہ ہوگا؟"

اس نے کہا---"ایک دن رات کا۔"

ہم نے کہا---"رسول اللہ ﷺ کے پاس چل!"

اس نے کہا---"رسول اللہ کس کو کہتے ہیں؟"

ہم اس کے ساتھ اور کوئی بات نہ کر سکے، بس اسکو ساتھ لے کر چل دیئے اور رسول اللہ ﷺ کے سامنے لاکر اس کو پیش کر دیا۔ آپ نے پانی کے متعلق اس سے دریافت کیا تو اس نے آپ کو بھی وہی جواب دیا جو ہم کو دیا تھا اور کہنے لگی، میں ایک بیوہ عورت ہوں اور میرے بچے یتیم ہیں۔ آپ نے حکم دیا کہ اس کی اونٹنی بٹھا دی جائے۔ چنانچہ تعمیل ارشاد کی گئی۔ آپ نے اس کی چھاگلوں کے اوپر کے دہانے میں دہن مبارک سے کلی کر کے پانی ڈال دیا اور اس کی اونٹنی کو کھڑا کر دیا (تاکہ نیچے کے دہانے سے پانی لے لیا جائے) اس وقت ہم چالیس شخص تھے اور سب پیاسے تھے۔ سب نے شکم سیر ہو کر پانی پیا اور اپنے اونٹوں کو پلایا۔ پھر جتنے مشکیزے اور برتن تھے، سب پانی سے بھر لئے اور چھاگلیں تھیں کہ جوش کے مارے پھٹی جارہی تھیں۔ اس کے بعد آپ نے ہم سے فرمایا---"تھوڑا بہت جو کچھ کھانے کا سامان ہو وہ اس عورت کے لئے لے آؤ!"

ہم نے اس کیلئے کچھ روٹی کے ٹکڑے اور کھجوریں جمع کر دیں۔ آپ نے ان کو ایک تھیلی میں ڈال کر اس عورت کے حوالے کیا اور کہا---"جا! یہ اپنے بچوں کو کھلا دے اور یہ یاد رکھنا کہ ہم نے تیرے پانی کا کچھ نقصان نہیں کیا۔"

جب وہ اپنے گھر آئی تو اس نے کہا---''میں نے ایسا بڑا جادوگر کوئی نہیں دیکھا، ورنہ تو تسلیم کرنا ہوگا کہ وہ شخص سچا نبی ہے، جیسا کہ اس کا دعوی ہے''

پھر اس نے گھر والوں کو وہ حیران کن معجزہ بتایا جو اس نے دیکھا تھا۔ راوی بیان کرتا ہے کہ اس عورت کی بدولت اللہ تعالیٰ نے اس کے پورے قبیلے کو ہدایت نصیب فرمائی، چنانچہ خود وہ اور اس کا سب خاندان مسلمان ہوگیا۔ (بخاری و مسلم مختصراً)

تھوڑے پانی میں اضافہ کرنے کے لئے بھی جانِ دو عالم ﷺ پانی میں اپنا دست مبارک رکھ دیتے تھے اور کبھی کلی کر کے پانی میں ڈال دیتے تھے لیکن یہ محض ایک طریق کار تھا، ورنہ پانی بڑھانے کے لئے فقط آپ کا ارادہ کافی ہوتا تھا۔

حضرت ابو قتادہؓ نے جو واقعہ ذکر کیا ہے اس میں آپ نے ایسا کوئی طریقہ اختیار نہیں کیا، اس کے باوجود سب لوگ سیراب ہوگئے۔ ہم اس واقعہ کو اختصار سے پیش کر رہے ہیں۔

حضرت ابو قتادہؓ کہتے ہیں کہ غزوہ تبوک میں ایک رات پانی ختم ہوگیا۔ صبح کے وقت رسول اللہ ﷺ نے وضو کیلئے پانی کا جو برتن میرے پاس تھا اس کو منگایا۔ اس میں تھوڑا سا پانی تھا۔ آپ نے اس سے مختصر سا وضو فرمایا اور اس سے جو پانی بچا اس کے متعلق فرمایا کہ اس کو محفوظ رکھنا، آئندہ چل کر اس سے ایک بڑا معجزہ ظاہر ہوگا۔

جب دن چڑھ چکا اور آفتاب کی تمازت سے ہر چیز جلنے لگی تو لوگوں نے آپ سے فریاد کی---''یا رسول اللہ! ہم تو پیاس سے مرے۔''

آپ ﷺ نے فرمایا---''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔''

یہ کہہ کر اپنے وضو کے پانی کا برتن منگایا۔ برتن کو دیکھتے ہی لوگ اس پر ٹوٹ پڑے۔ آپ نے فرمایا---''اپنا رویہ درست رکھو، تم میں سے ہر ہر فرد پانی پی کر سیراب ہوگا۔''

لوگوں نے اس ارشاد پر فوراً عمل کیا تو آپ نے وضو والے برتن سے پانی ڈالنا شروع کیا اور میں پیالے بھر بھر کر لوگوں کو پلانے لگا، یہاں تک کہ جب مجمع بھر میں میرے اور رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کوئی نہ رہا تو آپ نے فرمایا---''اب تم بھی پی لو۔''

میں نے عرض کی---''جب تک آپ نہ پی لیں میں کیسے پی سکتا ہوں!''

آپ نے فرمایا---''طریقہ یہی ہے کہ جو تقسیم کرنے والا ہوتا ہے اس کا نمبر سب سے آخر میں ہوتا ہے''

چنانچہ میں نے پانی پی لیا، پھر آپ ﷺ نے بھی نوش فرمایا۔ (شیخین)

اگر کہیں کنواں خشک ہو جاتا تو آپ کی برکت سے اس میں بھی پانی کی بے حد فراوانی ہو جاتی تھی۔ حضرت براء ابن عازبؓ صلح حدیبیہ کا واقعہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہاں ایک کنواں تھا جس کا سارا پانی ہم نے کھینچ کھینچ کر نکال لیا، حتیٰ کہ اس میں پانی کا ایک قطرہ تک باقی نہ چھوڑا۔ یہ خبر رسول اللہ ﷺ تک بھی پہنچ گئی۔ چنانچہ آپ تشریف لائے اور اس کے کنارے پر بیٹھ گئے، پھر ایک برتن میں کچھ پانی منگوا کر وضو فرمایا اور کلی کر کے وہ پانی اس کنویں میں ڈال دیا۔ کچھ دیر نہیں گزری تھی کہ اتنا پانی بڑھ گیا کہ ہم نے خود بھی سیر ہو کر پیا اور اپنے اونٹوں کو بھی پلایا۔ اس وقت ہماری تعداد چودہ سو ہوگی یا اس سے زیادہ۔ (بخاری)

حدیبیہ والے کنویں کے پاس تو جانِ دو عالم ﷺ بنفس نفیس موجود تھے لیکن اگر کنواں کسی دور دراز مقام پر ہوتا تھا تو اس مشکل کا حل بھی آپ کے پاس موجود تھا۔

زیاد بن حارث صدائیؓ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ ہم نے عرض کی

''یارسول اللہ! ہمارا ایک کنواں ہے، جب جاڑوں کا موسم آتا ہے تو اس کا پانی ہم کو کافی ہوتا ہے اور ہم اس کے گرد آباد ہو جاتے ہیں اور جب گرمی کا موسم آتا ہے تو اس میں پانی بہت کم رہ جاتا ہے اور ہم اپنے اردگرد کے پانیوں پر پھیل کر متفرق ہو جاتے ہیں، حالانکہ ہمارے چاروں طرف دشمن آباد ہیں۔ آپ ہمارے کنویں کے لئے دعا فرما دیجئے کہ اس کا پانی ہمیشہ ہم کو کافی ہو جایا کرے اور ہم کو اِدھر اُدھر متفرق ہونے کی ضرورت نہ ہو۔''

آپ نے سات کنکریاں منگوائیں ان کو اپنے ہاتھ میں ملا، کچھ دعا پڑھی اور فرمایا

''اچھا' ان کنکریوں کو لے جاؤ اور جب اپنے کنوئیں پر جانا تو ان کو بسم اللہ کہہ کر ایک ایک کر کے ڈال دینا۔''

صدائی بیان کرتے ہیں کہ ہم نے آپ کے حکم کی تعمیل کی تو کنوئیں میں اتنا پانی ہوگیا کہ ہم کوشش کر کے بھی اس کی تہہ کو نہ دیکھ سکتے تھے۔ (ابوداؤد)

کنوؤں کی طرح کم آب چشمے سے بھی جانِ دو عالم ﷺ کی توجہ سے پانی کی نہر رواں ہوگئی۔

حضرت معاذ ابن جبلؓ اس وقت کا واقعہ بیان کرتے ہیں جب غزوہ تبوک کا سفر اختتام پذیر ہونے کو تھا۔

وہ فرماتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے فرمایا---''انشاء اللہ کل تم تبوک کے چشمے پر پہنچ جاؤ گے اور اس وقت تک نہیں پہنچو گے جب تک کہ دن چڑھ نہ جائے تو جو شخص بھی وہاں پہنچے وہ تاوقتیکہ میں نہ آ جاؤں، پانی کو ہاتھ نہ لگائے۔''

جب ہم پہنچے تو دیکھا کہ چشمہ تسمے کی طرح باریک بہہ رہا ہے اور دو شخص ہم سے پہلے تبوک کے چشمے پر پہنچ چکے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں سے پوچھا---''تم نے اس کے پانی کو ہاتھ تو نہیں لگایا؟''

انہوں نے عرض کی---''جی، لگایا تو ہے۔''

اس پر آپ نے اظہار ناگواری فرمایا۔ اس کے بعد صحابہ نے چلّو بھر بھر کر اس چشمے سے تھوڑا تھوڑا پانی جمع کر لیا۔ آپ نے اس میں اپنا دست مبارک اور چہرہ مبارک دھویا اور وہ پانی اس چشمے میں ڈال دیا۔ اسی وقت اس سے بے تحاشا پانی ابل پڑا اور لوگوں نے خوب سیر ہو کر پیا۔ اس کے بعد حضرت معاذؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا ''معاذ! اگر تمہاری زندگی دراز ہوئی تو عنقریب تم اس جگہ اتنا پانی دیکھو گے کہ اس سے باغات پُر ہوں گے۔'' (مسلم)

دودھ میں برکت

پانی کی طرح دودھ میں بھی جانِ دو عالم ﷺ کی توجہ سے ایسی برکت پیدا ہو جاتی تھی کہ تھوڑا سا دودھ بیسیوں افراد کو کافی ہو جاتا تھا۔ ''شمائل نبویہ'' میں حضرت ابوہریرہؓ کا واقعہ اختصار کے ساتھ گزر چکا ہے، اب اسکی ایمان افروز تفصیلات پیش خدمت ہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ فرمایا کرتے تھے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود

نہیں کہ (ایک وقت مجھ پر ایسا بھی گزرا کہ) میں بھوک کی وجہ سے کبھی زمین سے اپنا کلیجہ لگا لیتا تھا اور کبھی اپنے پیٹ پر پتھر باندھ لیا کرتا تھا۔ ایک دن میں اس راستے پر جا بیٹھا جس سے مسلمان گزرا کرتے تھے۔ میرے سامنے سے ابوبکر گزرے تو میں نے ان سے قرآن کی ایک آیت کا مطلب محض اس لئے پوچھا کہ شاید میرا حال پوچھیں اور مجھ کو اپنے ساتھ لے جا کر کچھ کھانے کو دیں، مگر وہ گزرتے ہوئے چلے گئے اور انہوں نے میری بات نہ پوچھی۔ پھر حضرت ابوالقاسم ﷺ گزرے۔ جب مجھے دیکھا تو مسکرائے اور میرے چہرے؛ بلکہ دل میں جو خواہش تھی اسے جان گئے۔ فرمایا---''ابوہر!'' (عربی میں پیار بھرے تخاطب کے وقت مخاطب کا نام مختصر کر دیا جاتا ہے۔ اسی بنا پر جانِ دوعالم ﷺ نے ابوہریرہ کو ''ابوہر'' سے پکارا)

میں نے کہا---''جی، یارسول اللہ!''

فرمایا---''آؤ، میرے ساتھ چلو!''

چنانچہ میں آپ کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ آپ گھر میں تشریف لے گئے، میں نے بھی اندر آنے کی اجازت مانگی تو آپ نے اجازت دے دی۔ آپ نے ایک پیالے میں دودھ رکھا ہوا پایا تو دریافت فرمایا کہ یہ دودھ کہاں سے آیا؟ گھر والوں نے کہا کہ اسے فلاں مرد یا عورت نے (راوی کو اس میں شک ہے) آپ کے پاس بطور ہدیہ بھیجا ہے۔ آپ نے خوش ہو کر مجھ سے فرمایا ''ابوہر!'' میں نے کہا ''جی، یارسول اللہ!'' فرمایا ''اہل صفہ کے پاس جاؤ اور ان کو میرے پاس بلا لاؤ۔''

ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ اصحاب صفہ صرف اسلامی مہمان تھے۔ ان کا نہ کہیں گھر بار تھا، نہ کوئی کاروبار تھا۔ جب کبھی رسول اللہ ﷺ کے پاس کہیں سے کوئی صدقہ خیرات کا کھانا آتا تو آپ اسے انہیں لوگوں کے پاس بھیج دیتے اور خود اس میں سے کچھ نہ لیتے اور جب ہدیہ آتا تو آپ خود بھی اس میں سے کچھ تناول فرماتے اور اصحاب صفہ کو بھی اس میں شریک کر لیتے۔ مجھ کو یہ اصحاب صفہ کا بلوانا ذرا شاق گزرا اور میں نے دل میں سوچا کہ اصحاب صفہ کی تعداد تو بہت ہے۔ یہ ایک پیالہ دودھ بھلا کیا کافی ہو سکے گا! میں زیادہ مستحق تھا کہ اس

دودھ سے اتنا پینے کو مل جاتا جس سے مجھ میں کچھ جان آ جاتی۔ جب وہ لوگ آتے تو رسول اللہ ﷺ مجھی کو تقسیم کا حکم دیتے اور امید نہ تھی کہ اس میں سے کچھ بچ کر مجھے بھی مل سکے گا۔ مگر کرتا کیا، اللہ اور اس کے رسول کے حکم کو خوشی سے ماننے کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ غرض جب میں اصحاب صفہ کے پاس آیا اور دعوت پہنچائی تو وہ سب لوگ آ پہنچے اور اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ اجازت مل گئی تو سب اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے دودھ والا پیالہ مجھے دیتے ہوئے فرمایا ''ابوہر!'' میں نے کہا ''جی، یارسول اللہ!'' فرمایا ''یہ لو، اوران میں تقسیم کردو!''

میں نے وہ پیالہ لے کر ہر ایک آدمی کو باری باری دینا شروع کر دیا۔ جب وہ خوب سیر ہو لیتا تو پیالہ مجھے واپس کرتا، جب میں وہ پیالہ لے کر رسول اللہ ﷺ کے سامنے پہنچا تو بقیہ سب لوگ سیر ہو کر پی چکے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے وہ پیالہ مجھ سے لے کر دست مبارک پر رکھا، پھر میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا ''ابوہر!'' میں نے عرض کی ''جی، یارسول اللہ!'' فرمایا ''اب میں اور تم ہی باقی رہ گئے ہیں؟'' میں نے عرض کی ''آپ نے سچ فرمایا یارسول اللہ!'' فرمایا ''بیٹھو اور پیو!'' میں بیٹھ گیا اور پینے لگا۔ رسول اللہ ﷺ بار بار فرماتے جاتے ''اور پیو، اور پیو'' آخر میں نے کہا --- ''اس ذات کی قسم جس نے آپ کو دین حق دے کر بھیجا، اب میرے پیٹ میں ذرا گنجائش نہیں۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا --- ''اچھا تو لاؤ، مجھے دے دو۔'' میں نے وہ پیالہ رسول اللہ ﷺ کو دیا تو آپ نے خدا کی تعریف کی، بسم اللہ پڑھی اور بقیہ دودھ خود پی لیا۔ (بخاری)

کیوں جناب بوہریرہ! تھا وہ کیسا جام شیر؟
جس سے ستر صاحبوں کا دودھ سے منہ پھر گیا

پھلوں اور دیگر غذائی اجناس میں حیران کن برکات کا ظہور

۱---حضرت جابر بن عبداللہؓ کہتے ہیں کہ میرے والد شہید ہو گئے اور ان پر کچھ قرض تھا۔ علاوہ ازیں چھ بیٹیاں بھی ان کے پسماندگان میں شامل تھیں۔ جب کھجور توڑنے کا زمانہ آیا تو میں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی

''آپ کو معلوم ہی ہے کہ جنگ احد میں میرے والد شہید ہو گئے تھے اور ان پر بہت قرض تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے کھجوروں کے ڈھیروں کے پاس چلے چلیں تا کہ قرض خواہ آپ کو وہاں دیکھ کے مطالبے میں کچھ نرمی کریں۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا---''جاؤ اور ہر قسم کی کھجوروں کے الگ الگ ڈھیر لگاؤ۔''

جب قرض خواہوں نے ان ڈھیروں کو دیکھا تو تھوڑی اور ناکافی مقدار میں دیکھ کر یکبارگی میرے خلاف مشتعل ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ ماجرا دیکھا تو ان میں سے سب سے بڑے ڈھیر کے گرد تین بار گھومے، پھر اسی پر بیٹھ گئے اور مجھ سے فرمایا---''جاؤ اور اپنے قرض خواہوں کو میرے پاس بلا لاؤ۔''

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ ان کو ناپ ناپ کر دیتے رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے میرے والد پر جو قرض کی امانت تھی وہ سب ادا کر دی۔ اور میں تو اس پر بھی راضی تھا کہ اللہ تعالیٰ میرے والد پر جو قرض ہے وہی ادا کروا دے، خواہ میں اپنی بہنوں کے پاس ایک کھجور بھی بچا کر نہ لے جا سکوں، لیکن آپ کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے وہ سب کے سب ڈھیر بالکل بچا دیئے اور جس ڈھیر پر آپ بیٹھے تھے اس میں سے تو گویا ایک کھجور بھی کم نہیں ہونے پائی (بخاری)

۲---حضرت جابرؓ ہی راوی ہیں کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کھانے کو کچھ مانگا۔ آپ نے اس کو تھوڑے سے جَو مرحمت فرما دیئے تو عرصے تک وہ آدمی، اس کی بیوی اور ان دونوں کے آئے گئے مہمان اسی میں سے کھاتے رہے۔ یہاں تک کہ

ایک دن اس نے وہ جو ناپ ڈالے، اس کے بعد آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا---"کاش! تم نے اسے ناپا نہ ہوتا تو تم برابر اس میں سے کھاتے رہتے اور وہ اسی طرح باقی رہتا" (مسلم)

۳---انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے شادی کی اور اپنی زوجہ مطہرہ (ام المؤمنین حضرت زینبؓ) کے ساتھ شب باشی فرمائی تو میری امی ام سلیمؓ نے حریرہ (ایک قسم کا حلوہ) پکا کر اسے پتھر کے ایک برتن میں رکھ دیا اور مجھ سے کہا کہ انس! اسے رسول اللہ ﷺ کے پاس لے جاؤ۔ میں اسے لے کر آپ کے پاس آیا اور کہا کہ میری والدہ نے آپ کو سلام کہا ہے اور عرض کی ہے کہ یہ ہماری طرف سے آپ کی خدمت میں ایک حقیر سا ہدیہ ہے۔ آپ نے فرمایا---"اچھا! اسے رکھ دو اور جا کر فلاں، فلاں اور فلاں کو بلا لاؤ!" پھر فرمایا "جو شخص بھی تمہیں ملے اسے بلا لاؤ!"

انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جن کا نام رسول اللہ ﷺ نے لیا تھا ان کو اور جو مجھے ملتا گیا اس کو بھی میں بلا لایا۔ اس پر جعد (راوی کا نام) نے حضرت انسؓ سے پوچھا کہ ان سب کی تعداد کل کتنی ہوگی؟ تو انہوں نے کہا کہ تین سو سے کچھ زائد تھے۔ پھر مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "انس! وہ برتن لے آؤ" اسی دوران مہمان آنا شروع ہو گئے اور صفہ و حجرہ دونوں بھر گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا---"دس دس آدمی حلقہ بنا کر بیٹھیں اور ہر شخص اپنے سامنے ہی سے کھائے۔"

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ان دسوں نے کھایا اور پیٹ بھر کر کھایا۔ اس طرح ایک ٹولی کھا کر نکلتی اور دوسری ٹولی اندر جاتی یہاں تک کہ سب نے کھا لیا، پھر رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا---"انس! اب اسے اٹھاؤ۔" حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں کچھ بتا نہیں سکتا کہ جب میں نے وہ پیالہ لا کر رکھا تھا تب زیادہ تھا، یا جب اس کو اٹھایا۔

۴---حضرت سمرہ بن جندبؓ روایت کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ہوا کرتے تھے تو صبح شام ایک ہی پیالہ میں کھانا کھاتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ میں اس پر دس آدمی بیٹھتے، ان کے بعد پھر اور دس آدمی اسی طرح بیٹھ جاتے۔ یہ سن کر

حضرت سمرہ کے ایک شاگرد نے ان سے پوچھا یہ برکت اس میں ہوتی کہاں سے تھی؟ انہوں نے جواب دیا کہ تم کو تعجب کس بات پر ہے؟ یہ برکت وہاں سے آتی تھی۔ یہ کہہ کر آسمان کی طرف اشارہ فرمایا (یعنی آسمان سے آتی تھی۔)

۵---حضرت جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ جب جنگ کے لئے مدینہ کے اردگرد خندق کھودی جارہی تھی تو میں نے رسول اللہ ﷺ کے چہرے پر بھوک کے آثار دیکھے۔ میں فوراً لوٹ کر بیوی کے پاس آیا اور پوچھا---''تمہارے یہاں کھانے کے لئے کچھ ہے؟ کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ پر شدید بھوک کا اثر دیکھا ہے۔''

اس نے ایک تھیلا نکالا۔ اس میں ایک صاع جَو ہوں گے۔ اس کے علاوہ ہمارے یہاں گھر کا پلاہوا بکری کا بچہ تھا۔ چنانچہ میں نے اس کو ذبح کیا اور بیوی نے جَو پیسے ادھر وہ آٹا پیس کر فارغ ہوئی اُدھر میں گوشت بنا کر فارغ ہوگیا اور اس کی بوٹیاں بنا کر ہانڈی میں ڈالدیں، پھر آپ کی خدمت میں حاضری کا ارادہ کیا تو بیوی نے کہا---''دیکھنا (ذرا سا کھانا ہے) ہم کو رسول اللہ ﷺ اور ان کے ہمراہیوں میں شرمندہ نہ کرنا۔''

چنانچہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور چپکے سے آپ کے کان میں کہا

''یارسول اللہ ہم نے ایک چھوٹا سا بکری کا بچہ ذبح کیا ہے اور ایک صاع جَو کا آٹا پیسا ہے۔ پس آپ اور چند لوگ آپ کے ساتھ تشریف لے آئیں۔''

یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے عام اعلان فرمادیا---''اے خندق کھودنے والو! جابر نے تم سب کی دعوت کی ہے۔ لہٰذا جلدی سے چلو!'' پھر مجھ سے فرمایا ''جب تک میں نہ آؤں اپنی گوشت والی ہانڈی چولہے پر سے نہ اتارنا اور نہ آٹے کی روٹی پکانا۔''

میں گھر آکر تیزی سے بیوی کے پاس گیا (اور سب ماجرا کہا) اس نے کہا

''یہ سب کیا دھرا تمہارا ہی ہے۔'' میں نے کہا ''میں نے تو تمہارے کہنے کے مطابق خاموشی کے ساتھ ہی آپ کو اطلاع دی تھی لیکن کیا کروں کہ آپ نے سب کو بلالیا۔ اس میں میرا کیا قصور ہے۔'' بہرحال میں نے آٹا نکال کر آپ ﷺ کے سامنے پیش کردیا۔ آپ نے اس میں اپنا لعاب دہن ڈالا اور دعاء برکت فرمائی، پھر فرمایا---''اب ایک

عورت بلا لاؤ جو تمہارے ساتھ روٹیاں پکاتی رہے اور اپنی ہانڈی سے گوشت نکال نکال کر دیتی رہو، مگر دیکھنا، ہانڈی چولہے کے اوپر سے اتارنا مت!''

اس وقت کھانے والوں کی تعداد ایک ہزار تھی، خدا کی قسم سب نے وہ کھانا کھالیا یہاں تک کہ سب لوگ کھا کر واپس ہو گئے اور کھانا باقی رہ گیا اور ہماری ہانڈی جیسی تھی ویسی ہی بھری رہی اور آٹا بھی اتنا ہی پڑا رہا۔ (شیخین)

۶---حضرت ابو ہریرہؓ ابو سعیدؓ اور سلمہ بن اکوعؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک سفر میں جا رہے تھے تو سب لوگوں کے توشے ختم ہو گئے۔ یہاں تک کہ لوگوں نے بعض سامان اٹھانے والے اونٹوں کو ذبح کرنے کا ارادہ کیا اور عرض کی---''یارسول اللہ! کاش، آپ ہمیں اجازت دیتے کہ ہم اپنے بعض دودھ والے جانور ذبح کرتے، ان کا گوشت کھاتے اور ان کی چربی بدن پر ملتے۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اچھا ایسا ہی کرلو! مگر راوی کہتے ہیں کہ اتنے میں حضرت عمرؓ آ نکلے اور انہوں نے عرض کی---''یارسول اللہ! اگر آپ نے ایسا کیا تو سواریاں کم ہو جائیں گی۔ اس کے بجائے آپ ان سب سے ان کے بچے کھچے توشے منگوا لیجئے اور ان پر دعائے برکت فرما دیجئے تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس میں برکت دیدے گا۔''

رسول اللہ ﷺ نے بھی فرمایا---''ہاں، یہی صورت مناسب ہے۔''

اس کے بعد آپ نے چمڑے کا دستر خوان منگا کر بچھایا، پھر سب سے ان کا بچا کھچا منگوایا تو کوئی آدمی ایک مٹھی آٹا لانے لگا، کوئی ایک کھجور اور کوئی ایک روٹی کا ٹکڑا۔ اس طرح اس دستر خوان پر کچھ تھوڑا سا کھانے کا سامان اکٹھا ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس پر دعائے برکت کی، پھر فرمایا---''اپنے اپنے برتنوں کو لے آؤ اور انہیں بھرلو!''

لوگ اپنے اپنے برتن لائے یہاں تک کہ لشکر میں کوئی برتن ایسا نہ بچا جسے لوگوں نے نہ بھرلیا ہو۔ اس کے بعد سب نے شکم سیر ہو کر کھایا اور اس کے بعد بھی بہت سا بچ گیا۔ (بخاری)

۷---حضرت عبدالرحمان بن ابی بکر صدیقؓ کہتے ہیں کہ ہم ایک سو تیس آدمی رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ تھے تو آپ نے فرمایا---''کسی کے پاس کھانے کی کوئی چیز ہے؟''

معلوم ہوا کہ ایک شخص کے پاس ایک صاع (ساڑھے تین سیر) جَو کا آٹا ہے چنانچہ اس کو گوندھا گیا۔ اتنے میں ایک شخص، جس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور کشیدہ قامت تھا، کچھ بکریاں ساتھ لے کر آیا۔ اس سے آپ نے دریافت کیا۔۔۔ ''قیمت سے دو گے یا عطیہ اور ہبہ کے طور؟'' اس نے کہا ''قیمت سے دونگا۔''

آپ نے اس سے ایک بکری خرید لی اور وہ بھی ذبح کر کے پکالی گئی۔ نبی کریم ﷺ نے اس کی کلیجی، دل، گردہ وغیرہ کو بھوننے کا حکم دیا اور اللہ کی قسم، ایک سو تیس آدمیوں میں سے کوئی ایک شخص بھی نہیں بچا جس کو آپ نے اس کلیجی اور دل گردہ میں سے نہ دیا ہو، جو موجود ہوتا تو اسے دے دیتے اور جو موجود نہ ہوتا اس کے لئے رکھ دیتے۔ جب بکری کا سالن اور روٹیاں تیار ہو گئیں تو ان سے بھر کر ایک پیالہ رکھا گیا اور سب نے خوب شکم سیر ہو کر کھایا۔ اس کے بعد بھی دو پیالے بچ گئے اور ہم انہیں اونٹ پر لاد کر لے گئے (شیخین)

۸۔۔۔حضرت انس بن مالکؓ نے بیان کیا کہ حضرت ابوطلحہؓ نے اپنی بیوی ام سلیمؓ سے کہا۔۔۔ ''آج میں نے رسول اللہ ﷺ کی آواز سنی تو بہت کمزور تھی۔ مجھے اس میں بھوک کی شدت کا احساس ہوا، کیا تمہارے پاس کھانے کو کچھ ہے؟'' انہوں نے کہا ''ہاں، ہے۔'' اس کے بعد انہوں نے جَو کی چند روٹیاں نکالیں، پھر انہوں نے اپنی ایک اوڑھنی نکال کر اس کے ایک حصہ میں روٹیاں لپیٹ کر اسے میرے کپڑوں کے نیچے چھپایا اور اس کے دوسرے حصہ کو مجھے اڑھا دیا، پھر مجھے رسول اللہ ﷺ کے پاس بھیج دیا۔ میں اسے لے کر گیا تو میں نے دیکھا کہ آپ مسجد میں بیٹھے ہیں اور آپ کے ساتھ بہت سے لوگ بیٹھے ہیں۔ میں نے سلام کیا تو آپ نے میرے کچھ بتانے سے پہلے ہی از خود فرمایا ''کیا تم کو ابوطلحہ نے بھیجا ہے؟'' میں نے کہا ''جی، ہاں۔'' آپ نے پوچھا ''کچھ کھانا دے کر بھیجا ہے؟'' میں نے کہا ''جی ہاں'' آپ نے اپنے ساتھ کے لوگوں سے فرمایا ''اٹھو اور چلو!'' حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں بھی آپ کے ہمراہ چلا، یہاں تک کہ میں ابوطلحہ کے پاس پہنچا اور ان کو خبر دی تو ابوطلحہ نے ام سلیم سے کہا ''ارے سنو! رسول اللہ ﷺ سب لوگوں کو ہمراہ لئے آپہنچے ہیں اور ہمارے پاس تو کچھ ہے نہیں کہ آپ کو کھلا سکیں۔''

وہ بولیں---''اب اللہ اور اللہ کے رسول ہی اس کو خوب سمجھتے ہیں۔''

ابوطلحہ باہر آ کر رسول اللہ ﷺ سے ملے تو آپ ان کے گھر میں تشریف لے گئے اور فرمایا---''ہاں! اے ام سلیم! لاؤ دیکھیں تمہارے پاس کیا ہے؟''

وہ وہی روٹیاں سامنے لے آئیں۔ آپ نے ان کو توڑ کر چورا چورا کیا، اس کے بعد ام سلیم گھی کی کپی لے آئیں اور ان روٹیوں پر گھی لگایا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے اس پر کچھ پڑھا جو اللہ تعالیٰ نے ان سے پڑھوایا۔ اس کے بعد آپ نے حکم دیا کہ دس آدمیوں کو اندر بلالو! وہ آئے اور پیٹ بھر کر کھایا۔ پھر آپ نے فرمایا کہ دس آدمیوں کو اور بلالو! انہوں نے بھی پیٹ بھر کر کھایا اور باہر چلے گئے۔ پھر آپ نے فرمایا دس آدمیوں کو اور بلالو! وہ بھی بلا لئے گئے یہاں تک کہ پوری جماعت نے شکم سیر ہو کر کھالیا۔ اس وقت اس جماعت میں ستر یا اسی آدمی تھے۔ پھر آپ نے، ابوطلحہ نے، ام سلیم نے اور انس نے بھی کھایا، پھر بھی جو کچھ بچ رہا اسے ہم نے اپنے پڑوسیوں کے پاس ہدیہ بھیج دیا۔ (بخاری مسلم)

۹---حضرت سلمہؓ کہتے ہیں کہ ہم غزوہ خیبر میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ تھے۔ آپ نے ہم کو حکم دیا کہ جو کچھ ہمارے توشہ دانوں میں ہے، یعنی کھجوریں، اسے ایک جگہ جمع کریں۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے چمڑے کا دستر خوان بچھایا اور اس پر ہمارے توشہ دانوں کا سامان انڈیل دیا۔ راوی کہتے ہیں کہ میں نے گردن اونچی کی اور اس ڈھیر کو دیکھا تو میرے اندازے میں وہ ڈھیر بکری کے بیٹھنے کی جگہ کے برابر تھا اور ہم لوگوں کی تعداد چودہ سو تھی۔ چنانچہ ہم سب نے کھایا، اس کے بعد پھر میں نے گردن اٹھائی اور اس کا اندازہ کیا تو میرے اندازے میں وہ ڈھیر اب بھی بکری کے بیٹھنے کی جگہ کے برابر ہی تھا (یعنی اتنے کا اتنا ہی تھا۔)

۱۰---حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک لڑائی میں کھانے کی تنگی ہوگئی تو رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا---''ابوہریرہ! تمہارے پاس کچھ کھانے کو ہے؟''

میں نے عرض کی---''یارسول اللہ! تھوڑی سی کھجوروں کے سوا اور کچھ نہیں۔''

فرمایا---''انہی کو لے آؤ۔''

میں لے کر حاضر خدمت ہوا تو فرمایا ---''چمڑے کا ایک دستر خوان لاؤ!''
میں لے کر حاضر ہوا تو آپ نے اپنا ہاتھ اس میں ڈالا اور مٹھی میں کل کھجوریں لے لیں۔ وہ اکیس کھجوریں تھیں۔ پھر بسم اللہ شریف پڑھی، اور ہر کھجور کو بسم اللہ کہہ کر رکھتے گئے، یہاں تک کہ کل کھجوریں رکھدیں۔ پھر راوی نے ان کو دبانے کا اشارہ کر کے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسطرح کیا۔ پھر فرمایا کہ جاؤ! فلاں شخص کو اور اس کے ساتھیوں کو بلا لاؤ! ان سب نے آ کر کھایا اور شکم سیر ہو کر چلے گئے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ اب جاؤ فلاں شخص کو اور اس کے ساتھیوں کو بلا لاؤ! وہ لوگ بھی آئے اور خوب پیٹ بھر کر کھا کر چلے گئے۔ پھر بھی کچھ کھجوریں بچ گئیں تو آپ نے مجھ سے فرمایا ''بیٹھو!'' میں بیٹھ گیا تو آپ نے بھی کھجوریں تناول فرمائیں اور میں نے بھی کھائیں۔ اس کے بعد بھی کچھ کھجوریں بچ گئیں تو آپ نے وہ کھجوریں لیں اور ان کو میرے توشہ دان میں رکھ دیا۔ پھر مجھ سے فرمایا ---''اے ابو ہریرہ! جب تم اس میں سے کچھ لینا چاہو تو اس کے اندر ہاتھ ڈال کر نکالنا اور ان کو انڈیلنا مت، ورنہ یہ ختم ہو جائیں گی۔''

ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ پھر جب بھی مجھے کھجوریں درکار ہوتیں میں اس توشہ دان میں ہاتھ ڈالتا۔ اس طرح میں نے اسی توشہ دان میں سے پچاس وسق کھجوریں تو اللہ عزوجل کی راہ میں دے دیں۔ وہ توشہ دان میری بیٹھ کے پیچھے لٹکا رہتا تھا۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ شہادت میں اسے اتار کر رکھا تو وہ گم ہو گیا۔ (مسند احمد)

۱۱--- دکین ابن سعید مدنیؓ کہتے ہیں کہ ہم لوگ جو چار سو چالیس تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کھانے کی چیزیں مانگنے آئے۔ آپ نے حضرت عمر سے فرمایا --- ''جاؤ ان کو دے دو!''

انہوں نے عرض کی ---''یا رسول اللہ! اب تو بجز چند صاع کھجوروں کے کچھ نہیں رہا۔ یہ موسم گرما ہے، میرے بچوں کے لئے بھی کافی نہ ہوں گی۔''
آپ نے پھر فرمایا ---''جاؤ، ان کو دے دو!'' حضرت عمرؓ نے کہا ''جی، بہت اچھا''

راوی کہتے ہیں کہ پھر حضرت عمرؓ نے کنجی نکالی اور دروازہ کھولا تو وہاں اتنی تھوڑی کھجوریں تھیں جیسا کہ دودھ پیتا چھوٹا جانور کا بچہ بیٹھا ہو۔ انہوں نے ہم سب سے کہا ''لو، لیتے جاؤ!'' تو ہم میں سے ہر ایک نے جتنا چاہا لے لیا۔ پھر میں ادھر متوجہ ہوا اور میں ان میں سب سے آخری شخص تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم نے ایک کھجور بھی کم نہیں کی۔ (مسند احمد)

۱۲---ابو عبیدہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے لئے سالن کی ایک ہانڈی پکائی، چونکہ آپ کو دستی کا گوشت مرغوب تھا اس لئے میں نے پہلے دستی ہی آپ کی خدمت میں پیش کی۔ اس کے بعد آپ نے دوسری دستی طلب فرمائی تو میں نے دوسری دستی پیش کر دی پھر جب آپ نے تیسری دستی طلب کی تو میں نے باادب عرض کی،

''یارسول اللہ! بکری کی اور کتنی دستیاں ہوتی ہیں؟''

آپ نے فرمایا---''اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اگر تم خاموشی کے ساتھ دیتے رہتے تو جب تک میں تم سے مانگتا رہتا تم مجھ کو دست پر دست دیتے ہی رہتے۔'' (ترمذی)

جان دو عالم ﷺ کے لعاب دھن اور دست مبارک کی برکت و تاثیر

۱---عاصم بن عمرؓ قتادہ بن نعمانؓ سے روایت کرتے ہیں کہ جنگ احد میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ لڑتے ہوئے ان کی آنکھ میں زخم لگا اور وہ رخسار پر لٹک آئی۔ لوگوں نے چاہا کہ اسے کاٹ کر پھینک دیں۔ رسول اللہ ﷺ سے مشورہ کیا تو آپ نے فرمایا کہ نہیں ایسا نہ کرو! پھر ان کو بلایا اور آنکھ کے ڈھیلے کو اوپر اٹھا کر اپنی جگہ پر جما دیا۔ پھر اسے اپنی ہتھیلی سے ذرا دبایا اور یوں دعا فرمائی---''الٰہی! اس کو خوبصورتی اور جمال عطا فرما!''

پھر ان کے انتقال تک یہ حال رہا کہ ان سے جو بھی ملتا اس کو کبھی یہ معلوم ہی نہ ہوتا کہ ان کی کس آنکھ میں زخم لگا تھا۔ (بخاری مسلم)

۲---عثمان بن ابی العاصؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جب مجھ کو طائف پر عامل مقرر کر کے بھیجا تو وہاں پہنچ کر مجھ کو یہ شکایت ہوگئی کہ نماز میں میرے سامنے

کوئی ایسی چیز آ جاتی کہ مجھ کو یہی خبر نہ رہتی کہ میں کیا پڑھتا ہوں۔ جب میں نے یہ حالت دیکھی تو میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے تعجب سے فرمایا

''ابن ابی العاص! ضرور کسی ضرورت سے آئے ہو گے؟''

میں نے عرض کی---''یارسول اللہ! نماز میں میرے سامنے کوئی ایسی چیز آ جاتی ہے کہ مجھ کو یہی خبر نہیں رہتی کہ میں کیا پڑھتا ہوں۔''

آپ نے فرمایا---''یہ شیطان ہے، ذرا قریب آؤ!''

میں آپ کے قریب آ گیا اور اپنے دونوں پیروں پر بیٹھ گیا۔ آپ نے اپنا دست مبارک میرے سینے پر مارا اور میرے منہ میں اپنا لعاب دہن ڈالا پھر کسی نادیدہ شیطان سے مخاطب ہو کر فرمایا---''او خدا کے دشمن! نکل جا۔'' تین بار ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد فرمایا

''اچھا اب اپنے کام پر جاؤ!''

عثمانؓ کہتے ہیں کہ میں بقسم کہتا ہوں، اس کے بعد پھر کبھی مجھ کو اس کا اثر نہیں ہوا۔ (ابن ماجہ)

۳---ام جندبؓ بیان کرتی ہیں کہ میں نے ذی الحجہ کی دسویں تاریخ کو وادی کے اندر کھڑے ہو کر رسول اللہ ﷺ کو جمرۃ العقبہ کی رمی کرتے ہوئے دیکھا۔ جب آپ واپس ہوئے تو آپ کے پیچھے پیچھے قبیلہ خثعم کی ایک عورت اپنا بچہ لئے ہوئے آئی جو کچھ بیمار تھا اور بول نہیں سکتا تھا۔ اس نے عرض کی---''یارسول اللہ! یہ میرا بچہ ہے اور خاندان بھر میں بس یہی رہ گیا ہے۔ اس کو کوئی بیماری ہے جس کی وجہ سے یہ بولتا نہیں۔''

آپ نے فرمایا---''اچھا، تھوڑا سا پانی لاؤ۔''

پانی حاضر کیا گیا تو آپ نے اپنے دونوں دست مبارک دھوئے اور منہ میں پانی لے کر کلی کی اور وہ پانی اس کو دے کر فرمایا کہ یہ پانی بچہ کو پلا، کچھ اس پر چھڑک اور اللہ تعالیٰ سے اس کے لئے صحت کی دعا کر!

ام جندبؓ کہتی ہیں کہ میں نے اس عورت سے درخواست کی کہ اس پانی میں سے ذرا سا مجھ کو بھی دے دو۔ اس نے کہا کہ یہ تو صرف اس بیمار بچہ کے لئے ہے۔ ام جندبؓ

بیان کرتی ہیں کہ آئندہ سال میری اس عورت سے پھر ملاقات ہوئی تو اس سے اس کے بچہ کا حال پوچھا۔ اس نے کہا کہ وہ بالکل اچھا ہوگیا ہے اور ایسا سمجھدار ہوگیا ہے کہ عام لوگ ایسے سمجھدار نہیں ہوتے۔ (ابن ماجہ)

۴---سہلؓ روایت کرتے ہیں کہ جنگ خیبر میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "کل میں ایسے شخص کو جھنڈا دونگا، جس کے ہاتھوں پر اللہ تعالیٰ خیبر کی فتح نصیب فرمائے گا۔ اس کو اللہ اور اس کا رسول پیارے ہیں اور وہ بھی اللہ اور اس کے رسول کا پیارا ہے۔"

اس بشارت کو سن کر لوگ تمام شب بے چین رہے کہ دیکھئے کل جھنڈا کس کو ملتا ہے۔ دوسرے دن ہر شخص اسی امید میں آپ کے سامنے حاضر ہوا، مگر آپ نے پوچھا کہ علی کہاں ہیں؟ لوگوں نے عرض کی کہ ان کی آنکھیں دکھ رہی ہیں۔ آپ نے ان کو بلایا، وہ آئے تو آپ نے ان کی آنکھوں میں اپنا لعاب دہن لگایا اور دعا فرمائی۔ بس اسی وقت وہ ایسی صاف ہوگئیں گویا ان میں تکلیف ہی نہ تھی۔ پھر جھنڈا ان کے حوالے فرمادیا۔ (بخاری)

قبولیت دعا

جانِ دو عالم ﷺ کے معجزے سینکڑوں کی تعداد میں ہیں۔ اگر ان سب کو جمع کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہوسکتی ہے۔ مگر ہم نے ان میں سے صرف چند مستند ترین معجزات گزشتہ صفحات میں ذکر کیے ہیں۔ اب آخر میں قبولیت دعا کے بارہ روح پرور واقعات بیان کئے جارہے ہیں جنہیں پڑھ کے ایمان تازہ ہوجاتا ہے اور زبان پر بے اختیار اعلیٰ حضرت کے خوبصورت اشعار جاری ہوجاتے ہیں

خدا کی رضا چاہتے ہیں دو عالم
خدا چاہتا ہے رضائے محمد
اجابت نے جھک کر گلے سے لگایا
بڑھی ناز سے جب دعائے محمد
ﷺ

۱---انس بن مالکؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص جمعہ کے دن اس دروازہ کی جانب داخل ہوا جو دارالقضاء کی جانب تھا۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوئے خطبہ

دے رہے تھے۔ یہ شخص آ کر آپ کے سامنے کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا---''یارسول اللہ! قحط کی وجہ سے ہمارے مال سب تباہ و برباد ہو گئے اور (سواریاں ہلاک ہو جانے کی وجہ سے) سب راستے بند ہو گئے۔ آپ اللہ سے دعا فرما دیجئے کہ وہ بارش برسا دے''

رسول اللہ ﷺ نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور فرمایا---''اے اللہ! باران رحمت نازل فرما، اے اللہ باران رحمت نازل فرما!'' انسؓ قسم کھا کر بیان کرتے ہیں کہ اس وقت آسمان پر بادل کا کوئی ٹکڑا نظر نہ آتا تھا؛ بلکہ آسمان آئینہ کی طرح صاف تھا۔ اچانک آپ کی پشت کی جانب سے ایک چھوٹا سا بادل کا ٹکڑا اٹھا جو شروع میں ڈھال کی طرح نظر آ رہا تھا۔ جب آسمان کے درمیان پہنچا تو چاروں طرف پھیل گیا۔ پھر برسا اور ایسا برسا کہ بخدا ایک ہفتہ تک ہم نے آفتاب کی شکل نہیں دیکھی۔ انس کہتے ہیں کہ آئندہ جمعہ میں پھر وہی شخص اسی دروازہ سے آیا اور آپ اس وقت کھڑے ہوئے خطبہ دے رہے تھے۔ وہ آپ کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور عرض کی---''یارسول اللہ! بارش کی کثرت کے مارے ہمارے مال سب تباہ و برباد ہو گئے اور (ندی نالے بھر جانے کی وجہ سے) آمد و رفت بند ہو گئی، لہٰذا اللہ تعالیٰ سے دعا فرما دیجئے کہ اب تو وہ بارش بند کر دے۔''

رسول اللہ ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے اور یہ دعا فرمائی:

''اے اللہ! اب بارش ہمارے اردگرد ہو اور ہماری بستی پر نہ ہو۔ اے اللہ! اب بارش پہاڑیوں پر، ٹیلوں پر، وادیوں اور جنگلوں میں ہو''

انسؓ فرماتے ہیں کہ آپ اپنے دست مبارک سے جس جانب بھی اشارہ کرتے جاتے، اسی جانب سے بادل پھٹتے جاتے یہاں تک کہ میں نے دیکھا کہ بادل چاروں طرف سے پھٹ گئے اور مدینہ بیچ میں اس طرح نظر آنے لگا جیسے تاج ہوتا ہے۔ اس بارش سے وادی قنات ایک مہینے تک بہتی رہی اور جس جانب سے بھی کوئی شخص آتا تو بارش کی ہی خبر لے کر آتا (شیخین)

۲---ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ میری والدہ مشرکہ تھیں اور میں ان کو دعوت اسلام دیا کرتا تھا۔ ایک دن کا واقعہ ہے کہ میں نے ان سے اسلام قبول کرنے کے لئے کہا تو

انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے بارے میں ایسی بات کہی جس کو میں سن نہ سکا اور آپ کی خدمت میں روتا ہوا پہنچا اور بولا --- ''یارسول اللہ! میں اپنی والدہ کو ہمیشہ اسلام کی دعوت دیا کرتا تھا مگر وہ اس کے قبول کرنے سے انکار کرتی رہیں لیکن آج ان کو اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے آپ کے متعلق ایسی بات کہی جس کو میں سن نہ سکا، اب اللہ تعالیٰ سے دعا فرما دیجئے کہ وہ ابوہریرہ کی والدہ کو ہدایت نصیب فرمادے۔''

آپ نے فوراً یہ دعا دی --- ''الٰہی! ابوہریرہ کی ماں کو ہدایت کی توفیق بخش دے۔''

آپ کی دعا کی وجہ سے میں خوش ہوتا ہوا گھر کے دروازے کے پاس پہنچا۔ میری والدہ نے میرے پیروں کی آہٹ پائی تو کہا --- ''ابوہریرہ! باہر ہی رہنا۔'' ادھر مجھ کو پانی بہانے کی آواز آئی، وہ غسل فرما چکی تھیں۔ فوراً اپنی اوڑھنی اوڑھنے کے لئے جھپٹیں اور دروازہ کھول دیا، پھر مجھ کو آواز دے کر بولیں ''اشھدان لا الہ الا اللہ و اشھدان محمدا رسول اللہ۔''

میں خوشی کی وجہ سے روتا ہوا رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچا اور عرض کی

''یارسول اللہ! مبارک ہو، اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا قبول فرمائی اور ابوہریرہ کی والدہ کو اسلام قبول کرنے کی ہدایت نصیب فرمائی''

یہ سن کر آپ نے خدا کی تعریف کی اور دعا کے کلمات فرمائے۔ یہ سماں دیکھ کر میں بول پڑا --- ''یارسول اللہ! اب یہ دعا بھی کر دیجئے کہ اللہ تعالیٰ مجھ کو اور میری والدہ کو مسلمانوں میں محبوب بنادے اور ان کو ہماری نظروں میں محبوب بنادے۔''

آپ نے اسی وقت دعا دی --- ''الٰہی! اپنے اس بندہ کو اور اس کی والدہ کو اپنے مومن بندوں کی نظروں میں محبوب بنادے اور ان دونوں کو ان کی نظروں میں محبوب بنادے۔''

اس کے بعد ہر مومن مجھ کو دیکھے بغیر صرف میرا نام سن کر مجھ سے محبت کرنے لگتا تھا۔ (مسلم)

۳--- حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ ایک بار میں بیمار پڑا تو رسول اللہ ﷺ میری عیادت کو تشریف لائے۔ اس وقت میں یہ دعا کر رہا تھا کہ اے میرے اللہ! اگر میرا وقت آ گیا ہے تو مجھے بیماری سے نجات دے کر راحت دے اور اگر ابھی نہیں آیا تو مجھے آرام

کی زندگی عطا فرما اور اگر یہ ابتلا اور آزمائش ہے تو مجھے صبر عطا فرما!

رسول اللہ ﷺ نے میرے لئے یوں دعا فرمائی ''الٰہی! اس کو مرض سے شفا دے۔'' پھر فرمایا ''اٹھ کھڑا ہو!'' میں اسی وقت اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے بعد وہ درد مجھے دوبارہ کبھی نہیں ہوا۔ (حاکم)

۴---عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ غزوہ بدر میں تین سو پندرہ صحابہ کے ساتھ میدان بدر میں نکلے جن کے حق میں آپ نے یہ دعا فرمائی

''الٰہی! یہ سب پیادہ ہیں، ان کو سواری عطا فرما، الٰہی! یہ سب ننگے ہیں، ان کو لباس دے، الٰہی! یہ سب بھوکے ہیں، ان کو پیٹ بھر کر رزق دے۔''

اللہ تعالیٰ نے آپ کی ایسی دعا قبول فرمائی کہ فتح نصیب ہوئی اور جو شخص بھی واپس لوٹا اس کے پاس سواری کے لئے ایک یا دو اونٹ تھے۔ سب کو پوشش بھی نصیب ہوئی اور سب شکم سیر بھی ہو گئے۔ (ابوداؤد)

۵---عروہ بن ابی الجعدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے ایک دینار عطا فرمایا اور کہا---''اے عروہ! دودھ کے جانوروں میں جا کر ایک بکری خرید لاؤ۔''

میں جانوروں میں گیا، ان کے مالک سے بھاؤ کیا اور ایک دینار میں دو بکریاں خرید کر انہیں ہنکاتا ہوا لایا۔ راستے میں مجھے ایک آدمی ملا، اس نے مجھ سے ان کا بھاؤ تاؤ کیا تو میں نے اس کے ہاتھ ایک بکری ایک دینار میں بیچ دی اور ایک بکری اور ایک دینار ساتھ لایا اور عرض کی---''یارسول اللہ! لیجئے یہ آپ کا دینار ہے اور یہ آپ کی بکری ہے۔''

آپ نے فرمایا---''ارے، یہ تم نے کیا تدبیر کی؟!''

میں نے آپ سے سارا قصہ بیان کیا تو آپ نے فرمایا---''اے اللہ! اس کی خرید و فروخت میں برکت ڈال دے۔'' پھر میں نے بچشم خود دیکھا کہ میں کوفہ کے کباڑ خانے میں جا کھڑا ہوتا تھا اور بال بچوں کے پاس پہنچنے سے پہلے پہلے چالیس ہزار منافع کما لیتا تھا۔ (احمد)

۶---ایک بار رسول اللہ ﷺ حضرت انسؓ کی والدہ اُمِ سلیمؓ کے یہاں تشریف

لے گئے تو وہ آپ کے پاس کچھ کھجوریں اور گھی لے آئیں۔ آپ نے فرمایا

''یہ گھی اس کے برتن میں اور یہ کھجوریں ان کے تھیلے میں واپس رکھ دو۔''

پھر رسول اللہ ﷺ اس گھر کے ایک کونہ میں جا کھڑے ہوئے اور نفل نماز پڑھ کر ام سلیمؓ اور ان کے گھر والوں کے لئے دعا فرمائی۔ ام سلیمؓ نے کہا---''یارسول اللہ! مجھے ایک خاص بات عرض کرنی ہے''

فرمایا---''کہو کیا بات ہے؟''

انہوں نے کہا---''انس کو بطور خادم آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتی ہوں۔''

رسول اللہ ﷺ نے خوش ہو کر انس کو دعا دی---''اے اللہ! اس کو مال اور اولاد دے۔''

انسؓ کہتے ہیں کہ اس دعا کی برکت ہے کہ میں آج تمام انصاریوں میں سب سے زیادہ مالدار ہوں۔ (بخاری)

۷---حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ میں ایک اونٹ پر سفر کر رہا تھا۔ وہ بہت تھک گیا اور میں چاہتا تھا کہ اسے چھوڑ دوں۔ اتنے میں رسول اللہ ﷺ میرے برابر آ گئے اور دریافت کیا---''تمہارے اونٹ کو کیا ہو گیا ہے؟''

میں نے عرض کی---''یارسول اللہ! یہ بیمار ہے۔''

آپ ذرا اپنی جگہ سے پیچھے کو ہٹے اور اس کے لئے دعا فرمائی۔ پھر وہ ہر اونٹ سے آگے ہی آگے چلنے لگا۔ یہ دیکھ کر آپ نے فرمایا---''اچھا، تمہارا اونٹ اب ٹھیک ہو گیا ہے؟''

میں نے کہا---''جی ہاں، آپ کی دعاؤں کی برکتیں اسے مل گئی ہیں۔''

۸---جریر بن عبداللہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک بار مجھ سے پوچھا ''کیا تم اس ''ذی الخلصہ'' (بتکدہ) کو نیست و نابود کر کے مجھ کو راحت نہیں پہنچا سکتے؟''

میں نے عرض کی---''یارسول اللہ! ضرور، مگر میں گھوڑے پر جم کر سوار نہیں ہو سکتا۔''

آپ نے میرے سینے پر اپنے دست مبارک کی ایک ضرب لگائی جس کا اثر میں نے اپنے سینے کے اندر محسوس کیا، پھر یہ دعا دی---''اے اللہ! اس کو جم کر بیٹھنے کی قوت عطا

فرما اور اس کو ہدایت دینے والا اور ہدایت یافتہ بنا!''

اس کے بعد آج تک میں اپنے گھوڑے سے کبھی نہیں گرا۔ (متفق علیہ)

۹---حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے یہ دعا فرمائی ''اے میرے اللہ! عمر بن الخطاب اور عمر بن ہشام (ابوجہل) میں سے تجھے جو عمر محبوب اور پیارا ہو اس کو اسلام کی توفیق دے کر دین کو قوت اور غلبہ عطا فرما'' تو عمر بن الخطاب ہی اللہ تعالیٰ کو زیادہ پیارے اور محبوب تھے کیونکہ یہ دعا رسول اللہ ﷺ نے بدھ کے دن فرمائی تھی اور حضرت عمر جمعرات کو ایمان لے آئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعہ اسلام کو سر بلند فرمایا۔ عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں کہ جب سے حضرت عمر اسلام لائے ہم سب باعزت اور سر بلند ہو گئے۔ (بخاری)

۱۰---حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ میں نے ایک بار رسول اللہ ﷺ کے وضو کے لئے پانی رکھا۔ اس وقت آپ بیت الخلا تشریف لے گئے تھے۔ جب آپ واپس آئے تو دریافت فرمایا کہ یہ پانی کس نے رکھا ہے؟ عرض کی گئی کہ ابن عباس نے۔ آپ نے دعا فرمائی کہ اے میرے اللہ! اس کو دین کی سمجھ اور علم تفسیر عطا فرما۔ پھر آپ کی دعا کی مقبولیت کے ایسے آثار ظاہر ہوئے کہ لوگ ان کو ''حبر امت'' (امت کا بڑا عالم) کہنے لگے۔ حضرت عمر اکثر معاملات میں ان کو آگے بڑھاتے تھے اور ان کو باوجود کم عمر ہونے کے اکابر صحابہ میں داخل کیا کرتے تھے۔ (بخاری)

۱۱--- یزید ابن عمرو انصاریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دن مجھ سے فرمایا---''ذرا میرے قریب آؤ!'' میں نزدیک ہوا تو آپ نے اپنا دست مبارک میرے سر اور داڑھی پر پھیرا، پھر فرمایا---''اے اللہ! اس کو حسن و جمال عطا فرما اور اس کے حسن و جمال کو قائم رکھ!''

اس دعا کی برکت سے ان کی عمر کچھ اوپر اَسی کے ہوئی مگر ان کی داڑھی میں بس چند بال سفید ہوئے تھے۔ وہ بہت ہنس مکھ تھے اور مرنے تک ان کے چہرے پر جھریاں نہیں پڑیں۔ (احمد) عروہ کہتے ہیں کہ وہ ایک سو بیس برس تک زندہ رہے مگر ان کے سر میں بس چند

ہی بال سفید ہونے پائے تھے۔ (ترمذی)

۱۲--- انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عبدالرحمٰن بن عوف پر (زعفرانی) زردی کا اثر دیکھا تو دریافت فرمایا---"یہ کیسا رنگ ہے؟"

عرض کی---"یارسول اللہ! میں نے شادی کرلی ہے۔"

فرمایا---"مہر کتنا مقرر کیا ہے؟"

عرض کی---"گٹھلی بھر سونا!"

آپ نے دعائے برکت دی اور فرمایا ولیمہ کرو اگرچہ ایک بکری سے ہی ہو۔

(بخاری و مسلم)

آپ کی دعا کے اثر سے عبدالرحمٰن بن عوفؓ اتنے مالدار ہوگئے کہ حسب بیان زہری چار لاکھ دینار تو انہوں نے صدقہ و خیرات میں صرف کئے اور پانچ سو گھوڑے اور پانچ سو اونٹ جہاد کے لئے دیئے تھے۔ زہری کہتے ہیں کہ انکا یہ سب مال تجارت کی کمائی کا تھا۔ محمد بن سیرین کہتے ہیں کہ ان کی بیویوں نے جب ان کے ترکہ میں اپنا آٹھواں حصہ باہم تقسیم کیا تو ہر ایک کے حصہ میں ۳۲۰۰۰۰ آیا۔

ملاحظہ فرمائے آپ نے قارئینِ کرام! جانِ دوعالم ﷺ کی قبولیتِ دعا کے بارہ پُرتأثر واقعات---!!

اعلیٰ حضرت نے جانِ دوعالم ﷺ کی مستجاب دعاؤں پر یوں سلام پیش کیا ہے

وہ دعا جس کا جوبن بہارِ قبول
اس نسیم اجابت پہ لاکھوں سلام

نعت

قاضی عبدالدائم دائمؔ

آئے سرور، سب سے بہتر، سب سے برتر، ماشاء اللہ
صورتِ دلبر، سیرتِ رہبر، آئے لے کر، ماشاء اللہ
" اَحۡسَنُ مِنۡکَ لَمۡ تَرَقَطُّ عَیۡنِیۡ " ہے حسان کا فرمان
اور بولے رضاؔ " لَمۡ یَاۡتِ نَظِیۡرُکَ فِیۡ نَظَرۡ " ماشاء اللہ
پوچھا کسی نے " آقا! کب سے آپ نبی تھے؟ " فوراً بولے
آدم کی تخلیق سے پہلے میں تھا پیمبر، ماشاء اللہ
گر تم جاننا چاہو، رب نے کیا کچھ، کتنا ان کو دیا ہے!
کر لو تلاوت " اِنَّا اَعۡطَیۡنَاکَ الۡکَوۡثَرۡ " ماشاء اللہ
اللہ پاک نے صاف کہا ہے' میں نے اُس کو بخش دیا ہے
تائب ہو کر پہنچا جو محبوب کے در پر، ماشاء اللہ
پڑھ کے " فَتَرۡضیٰ " جان لیا ہے، وعدہ خدا کا مان لیا ہے
فیصلہ ہو گا اُن کی رضا پر روزِ محشر، ماشاء اللہ
اللہ اللہ! مسجدِ نبوی، جس کے اندر خلد ہے اُتری
پاس سنہری جالیوں والا روضۂ انور ماشاء اللہ
طیبہ کی مہکتی فضاؤں میں، اور روضے کی ٹھنڈی چھاؤں میں
کیا کیا دائمؔ نے مزے لوٹے اَللہ اَکۡبَرۡ، ماشاء اللہ

❁❁❁

باب ۱۴

﴿وَاَزْوَاجُه' اُمَّھَاتُھُمْ﴾
(اور نبی کی بیویاں مؤمنین کی مائیں ہیں)

ازواجِ مطہّرات

مؤمنین کی اُمّہات

گیارہ پاک بیبیوں کے ایمان افروز واقعات
عمرِ عائشہ اور نکاحِ زینب پر رد و خصوصی مقالات

اہلِ اسلام کی مادرانِ شفیق
بانوانِ طہارت پہ لاکھوں سلام

اُمّ المؤمنین سیّدہ خدیجہ طاہرہ رضی اللہ عنہا

جانِ دو عالم ﷺ کی پہلی رفیقہ حیات سیّدہ خدیجۃ الکبریٰ عام الفیل سے پندرہ سال پہلے پیدا ہوئیں۔ والدہ کا نام زائدہ اور والد کا نام خویلد تھا جو قبیلہ بنی اسد کے ایک معزز شخص تھے۔

حضرت خدیجہؓ بچپن ہی سے شریف النفس اور عالی ہمت تھیں۔ بڑی ہوئیں تو اعلیٰ کردار اور پاکیزہ اخلاق کی وجہ سے طاہرہ کے لقب سے مشہور ہوئیں۔ والد تجارت کرتے تھے اور خاصے آسودہ حال تھے۔ ان کی وفات کے بعد کاروبار سیّدہ خدیجہؓ کے ہاتھ میں آ گیا اور انہوں نے اس کو خوب ترقی دی۔ چونکہ اہل مکہ کی زیادہ تر تجارت شام کے ساتھ تھی اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا خاتونِ خانہ ہونے کی وجہ سے قافلوں کے ساتھ طویل سفر نہیں کر سکتی تھیں اس لئے کسی قابلِ اعتماد شخص کو منافع میں حصہ دار بنا کر اپنے سامانِ تجارت کے ساتھ قافلے کے ہمراہ بھیج دیتی تھیں۔ اب اسے ان کی خوش قسمتی کہئے یا غیر معمولی سوجھ بوجھ کہ اس طرح کاروبار خوب چل نکلا اور وہ مکہ کی خوشحال ترین خاتون بن گئیں۔

ان کی پہلی شادی ابوہالہ تمیمی کے ساتھ ہوئی تھی۔ اس سے دو بیٹے پیدا ہوئے --- ہندؓ (۱) اور ہالہؓ (۲)۔ تمیمی کی وفات کے بعد دوسری شادی عتیق بن عائذ سے ہوئی۔ اس

---

(۱) یہ بہت ہی فصیح و بلیغ شخص ہوئے ہیں، جانِ دو عالم ﷺ کا حلیہ مبارک پوری تفصیل کے ساتھ انہوں نے ہی بیان کیا ہے۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ میرے باپ ہیں، خدیجہ میری ماں ہیں، قاسم (جانِ دو عالم ﷺ کے صاحبزادے) میرا بھائی ہے اور فاطمہ میری بہن۔ اس لئے ماں باپ اور بھائی بہنوں کے لحاظ سے میں معزز ترین آدمی ہوں۔ (الزرقانی، ج ۱، ص ۲۴۰)

(۲) یہ بھی صحابی ہیں۔ جانِ دو عالم ﷺ کو ان سے بہت پیار تھا۔ ایک دفعہ مدینہ منورہ میں جانِ دو عالم ﷺ سے ملنے آئے۔ جانِ دو عالم ﷺ اس وقت آرام فرما رہے تھے، مگر ان کی آواز جب سمع ہمایوں میں پہنچی تو بے تابانہ اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کو سینے سے چمٹا کر مسرت بھرے لہجہ میں گویا ہوئے۔ "ہالہ! --- ہالہ! --- ہالہ!" (الاصابہ، ج ۳، ص ۵۹۴)

سے ایک بیٹی پیدا ہوئی۔ اس کا نام بھی ہند تھا۔

عتیق کی وفات سے دوبارہ بیوہ ہوگئیں تو قریش کے متعدد رؤساء نے ان سے شادی کرنے کی خواہش کا اظہار کیا اور اس سلسلے میں کافی جدوجہد کی مگر وہ آمادہ نہ ہوئیں۔ دراصل اب وہ اس نبی کی منتظر تھیں جس کی پیشنگوئی ایک یہودی عالم نے کی تھی۔

مؤرخین نے لکھا ہے کہ عرب میں قریش کی عورتوں کا ایک میلہ لگا کرتا تھا۔ اس میلے میں ایک دفعہ خدیجہ طاہرہ بھی شامل تھیں کہ ایک یہودی منجم آیا اور عورتوں سے مخاطب ہوکر کہنے لگا

''اے قریشی عورتو! عنقریب یہاں ایک نبی کا ظہور ہونے والا ہے اگر تم میں سے کوئی اس کی منکوحہ بن سکے تو اسے چاہئے کہ اس سلسلے میں ضرور کوشش کرے۔''

باقی عورتوں نے تو اس کی پیشنگوئی کو کچھ اہمیت نہ دی' الٹا اسے برا بھلا کہا لیکن خدیجہ طاہرہ کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی۔ پھر جب میسرہ کی زبانی انہیں سفرِ شام کے دوران پیش آنے والے محیّر العقول حالات معلوم ہوئے تو انہوں نے کہا

اِنْ کَانَ مَا قَالَ الْیَھُوْدِیُّ حَقًا' مَاذَاکَ اِلَّا ھٰذا. (اگر یہودی کی بات سچی ہے تو وہ شخص یہی ہیں۔)(۱)

❁❁❁

اگرچہ رسم دنیا یہی ہے کہ شادی کا پیغام لڑکے والوں کی طرف سے بھیجا جاتا ہے لیکن چونکہ خدیجہ طاہرہ کو یقین ہوگیا تھا کہ نبی منتظر یہی ہیں اس لئے انہوں نے اس سعادت کے حصول میں تاخیر کرنا مناسب نہ سمجھا اور خود ہی کوششیں شروع کردیں۔

سب سے پہلے انہوں نے جانِ دوعالم ﷺ کی ذاتی رائے معلوم کرنے کا اہتمام

---

(۱) واضح رہے کہ میسرہ حضرت خدیجہؓ کے غلام تھے اور جب جانِ دوعالم ﷺ حضرت خدیجہؓ کا سامان تجارت لے کر شام گئے تھے تو یہ بھی ساتھ تھے۔ واپسی پر انہوں نے حضرت خدیجہؓ کے سامنے جانِ دوعالم ﷺ کے وہ حیران کن کمالات بیان کئے تھے جو دورانِ سفر ان کے مشاہدے میں آئے تھے۔ ان ایمان افروز واقعات کے لئے سیدالوریٰ جلد اوّل کا مطالعہ کیجئے!

کیا اور اپنی راز دار سہیلی نفیسہ بنت منیہ کو جانِ دو عالم ﷺ کے پاس بھیجا۔ نفیسہ نے جانِ دو عالم ﷺ سے پوچھا کہ آپ نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی؟

''شادی کے لئے جس قدر مال کی ضرورت ہوتی ہے' وہ فی الحال میرے پاس نہیں ہے۔'' جانِ دو عالم ﷺ نے جواب دیا۔

''لیکن اگر ایسی صورت نکل آئے'' نفیسہ نے کہا ''کہ آپ کو روپے پیسے کی ضرورت ہی نہ پڑے اور شادی بھی ایسی عورت سے ہو جائے جو حسن و جمال' دولت و مال اور عزت و شرافت کے اعتبار سے نمایاں حیثیت رکھتی ہو تو کیا آپ تیار ہو جائیں گے؟''

''کس عورت کی بات کر رہی ہو؟'' جانِ دو عالم ﷺ نے پوچھا۔

''خدیجہ بنتِ خویلد کی۔'' نفیسہ نے بتایا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟'' آپ کو یقین ہی نہ آیا۔

بات ہی سخت تعجب کی تھی --- جس عورت نے رؤساء قریش کے رشتے ٹھکرا دیئے ہوں' وہ ایک ایسے انسان کی رفیقۂ حیات بننے پر آمادہ ہو جائے' جس کے پاس شادی کے اخراجات کے لئے معقول رقم تک نہ ہو---!

بہر حال اس سوال و جواب سے نفیسہ کو اتنا پتہ چل گیا کہ جانِ دو عالم ﷺ انکار نہیں کریں گے۔ جب اس نے جا کر خدیجہ طاہرہؓ کو آپ کی آمادگی کے بارے میں بتایا تو انہوں نے بہتر سمجھا کہ اس سلسلے میں آپ کے ساتھ براہِ راست گفتگو کر لی جائے تا کہ بات پکی ہو جائے۔ چنانچہ انہوں نے آپ کو بلا کر خود بات چیت کی اور انہیں بتایا کہ میں آپ کی عزت و عظمت' حسنِ اخلاق اور راستبازی کو دیکھتے ہوئے آپ کی رفیقۂ حیات بننا چاہتی ہوں۔

آپ نے رضامندی ظاہر کی تو خدیجہ طاہرہؓ نے کہا

''پھر اپنے چچا کو بھیج دیجئے۔''

جانِ دو عالم ﷺ نے ابو طالب کو بتایا تو وہ خدیجہ طاہرہؓ کے پاس گئے۔ خدیجہ طاہرہ نے کہا--- ''میں آپ کے بھتیجے کی رفاقت چاہتی ہوں۔ میرے چچا عمرو بن اسد سے

کہئے کہ وہ محمد (ﷺ) سے میری شادی کر دیں۔''

عمرو رضا مند ہو گیا تو ابو طالب چند رؤساء و معززین کو ساتھ لے کر گئے اور دونوں کو رشتۂ ازدواج میں منسلک کر دیا۔

نکاح کا خطبہ ابو طالب نے پڑھا۔ یہ ایک بہترین خطبہ تھا' جس میں انہوں نے حمد وثنا کے بعد جانِ دو عالم ﷺ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا

''یہ محمد بن عبداللہ ہے' اس کے پاس مال اگرچہ کم ہے لیکن عظمت و شرافت اور فضیلت و دانائی کے اعتبار سے جس شخص کے ساتھ موازنہ کیا جائے' یہ اس سے برتر و اعلیٰ ثابت ہوگا (۱) مال و دولت کا کیا ہے' یہ تو چلتی پھرتی اور ڈھلتی چھاؤں ہے۔ آج ہے کل نہیں --- یہ محمد بن عبداللہ' خدیجہ بنت خویلد سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس کا کل مہر معجّل اور مؤجل میرے ذمہ ہے اور میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ عنقریب اس کی شان و شوکت ظاہر ہونے والی ہے۔''

مختصر یہ کہ پانچ سو دراہم مہر پر نکاح ہو گیا۔ پھر اونٹ ذبح کر کے دعوت ولیمہ کی گئی اور خدیجہ طاہرہؓ کی کنیزوں نے دف وغیرہ بجا کر اس پُرمسرت تقریب کی خوشیوں کو دوبالا کر دیا۔

❁❁❁

جانِ دو عالم ﷺ کے ساتھ شادی کے وقت حضرت خدیجہؓ کی عمر تقریباً چالیس سال تھی ؛ جبکہ جانِ دو عالم ﷺ پچیس سال کے جوانِ رعنا تھے۔ عمروں کے اس

---

(۱) قارئین کرام! یہ کیسے تعجب کی بات ہے کہ ابو طالب نے رؤساء و معززین کے سامنے برملا کہا کہ ''جس شخص کے ساتھ محمد (ﷺ) کا موازنہ کیا جائے' محمد (ﷺ) اس سے اشرف و اعلیٰ قرار پائے گا'' --- اور ان سربرآوردہ حاضرین میں سے کسی نے بھی ابو طالب سے اختلاف نہیں کیا۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان سب کو بھی اس حقیقت کا اعتراف تھا' کہ محمد ﷺ بے نظیر و بے مثال ہے۔ سچ ہے

لَمْ یَاتِ نَظِیْرُکَ فِیْ نَظَرٍ

تفاوت کے باوجود خاوند بیوی میں ایسی مثالی محبت تھی کہ باید وشاید۔ حضرت خدیجہ کے ایثار، اخلاص اور شبانہ روز خدمت گزاری نے جانِ دوعالم ﷺ کو اتنا متاثر کیا کہ جب تک حضرت خدیجہ زندہ رہیں، آپ کے دل میں کسی دوسری عورت سے شادی کا خیال تک نہیں آیا۔ ہاں، ان کی وفات کے بعد آپ کے عقد میں متعدد خواتین آئیں مگر خدیجہ کی محبت کا اثر ایسا گہرا اور انمٹ تھا کہ آپ زندگی بھر ان کو یاد کرتے رہے اور ان کی وفاؤں کے تذکرے کرتے رہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک دن حسبِ معمول رسول اللہ ﷺ نے خدیجہ کی تعریف بیان کی تو مجھے غیرت سی آ گئی اور میں نے کہہ دیا---''یا رسول اللہ! وہ ایک بڑھیا عورت تھی، اب اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس سے بہتر بیویاں عنایت کر دی ہیں۔''

یہ سن کر رسول اللہ ﷺ کا چہرہ مبارک غصے سے سرخ ہو گیا اور فرمایا---''اللہ کی قسم! مجھے خدیجہ سے اچھی بیوی نہیں ملی۔ وہ اس وقت ایمان لائی جب سب لوگ کافر تھے، اس نے میری تصدیق کی جب سب مجھے جھٹلا رہے تھے، اس نے سارا مال وزر مجھ پر نثار کر دیا اور اس کے بطن سے اللہ نے مجھے اولاد بھی دی۔''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ کو اس قدر غصہ میں دیکھ کر میں ڈر گئی اور اس دن سے عہد کر لیا کہ آئندہ رسول اللہ کے سامنے خدیجہ کے بارے میں قطعاً کوئی ایسی ویسی بات نہیں کروں گی۔

❁❁❁

کہا جاتا ہے کہ بڑوں میں سب سے پہلے ایمان لانے والے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہیں، چھوٹوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ، غلاموں میں حضرت زید رضی اللہ عنہ اور عورتوں میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا --- یہ درست ہے، لیکن اگر یہ سوال کیا جائے کہ ان چاروں میں سب سے پہلے ایمان لانے کی سعادت کس کو حاصل ہوئی؟ تو اس کا جواب ایک ہی ہے---سیّدہ طاہرہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو۔

انہوں نے تو اُسی وقت جانِ دوعالم ﷺ کی صداقت کی گواہی دے دی تھی جب

آپ وحی کے اوّلیں تجربے سے دوچار ہونے کے بعد سردی محسوس کر رہے تھے اور کچھ اوڑھنے کے لئے طلب فرما رہے تھے۔ حضرت خدیجہ آپ کو کمبل میں لپیٹ رہی تھیں اور آپ کا اضطراب دور کرنے کے لئے تسلی آمیز لہجے میں کہتی جا رہی تھیں--- ''اللہ آپ کے وقار میں کبھی کمی نہیں آنے دے گا کیونکہ آپ رشتہ داروں کے حقوق ادا کرتے ہیں، مہمانوں کی تواضع کرتے ہیں، غریبوں مسکینوں اور کمزوروں کی دستگیری کرتے ہیں، مصیبت کے وقت لوگوں کی مدد کرتے ہیں اور امانت گزار ہیں--- اللہ آپ کو کبھی تنہا نہیں چھوڑے گا۔''

واللہ! کیا خوبصورت نقشہ کھینچا ہے اماں خدیجہ نے جانِ دو عالم ﷺ کے پاکیزہ کردار کا---!!

دل کی اتھاہ گہرائیوں سے ابھر کر لبوں تک آنے والے یہ ولولہ انگیز جملے جانِ دو عالم ﷺ کو خوش کر گئے اور نزولِ وحی کی انوکھی کیفیت سے دوچار ہونے کی وجہ سے طبعِ ہمایوں پر جو بے قراری سی طاری ہو گئی تھی، وہ رفع ہو گئی۔

❁❁❁

ایمان لانے کے بعد حضرت خدیجہؓ جانِ دو عالم ﷺ کے دیگر معاملات میں بھی شامل ہونے لگیں۔ نماز، فرض تو معراج کی رات ہوئی تھی مگر نفلی نماز جانِ دو عالم ﷺ پہلے بھی پڑھا کرتے تھے اور حضرت خدیجہؓ آپ کا ساتھ دیا کرتی تھیں۔ اُس وقت روئے زمین پر یہی دو نماز گزار تھے۔ پھر ایک دس گیارہ سالہ بچہ بھی ہمنوا ہو گیا اور ان کے ساتھ نمازیں پڑھنے لگا۔ اسی زمانے میں عمِ رسول حضرت عباسؓ کا ایک دوست عفیف کندی یمن سے مکے آیا اور حضرت عباسؓ کے ہاں قیام پذیر ہوا۔ ایک دن اس نے یہ دلنواز منظر دیکھا کہ ایک رشکِ ماہتاب شخص آیا اور سینے پر ہاتھ باندھ کر روبقبلہ کھڑا ہو گیا۔ پھر ایک لڑکا آیا اور اسی طرح دست بستہ ہو کر پہلے شخص کے دائیں طرف کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک عورت آئی اور وہ ان دونوں کے پیچھے کھڑی ہو گئی۔

عفیف کندی عبادت کے اس انوکھے انداز سے بہت حیران ہوا اور کہنے لگا

''میری نظریں دیکھ رہی ہیں کہ عنقریب یہاں کوئی بڑا انقلاب آنے والا ہے۔''

''ہاں! ایسا ہی لگتا ہے'' حضرت عباسؓ نے کہا'' کیا تم جانتے ہو کہ یہ تینوں کون ہیں؟''
''نہیں، میں انہیں نہیں پہچانتا۔''

حضرت عباسؓ نے کہا---'' پہلا شخص میرا بھتیجا ہے' محمد۔ بعد میں آنے والا لڑکا بھی میرے ایک اور بھائی کا بیٹا ہے' علی۔ اور آخر میں آنے والی عورت محمد کی بیوی ہے' خدیجہ۔ میرے بھتیجے محمد کا خیال ہے کہ اس کو ایک نئے دین کے ساتھ بھیجا گیا ہے اور وہ جو کچھ کرتا ہے اللہ کے حکم سے کرتا ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے تمام روئے زمین پر ان تینوں کے سوا اس دین کا کوئی پیروکار نہیں ہے۔''

کچھ عرصہ بعد حضرت عباسؓ کا یہ دوست مسلمان ہو گیا تو اس واقعہ کو یاد کر کے کہا کرتا تھا

''کاش! اس دن چوتھا نماز پڑھنے والا میں ہوتا۔''

❁❁❁

دنیا جانتی ہے کہ ابتداء نبوت میں جانِ دو عالم ﷺ کو مشرکین کے ہاتھوں کیسی کیسی ذہنی و قلبی اذیتوں سے گزرنا پڑا۔ طنز' تحقیر' ملامت' تمسخر' استہزاء---کون سا ناروا سلوک تھا جو آپ کے ساتھ نہیں کیا گیا! مخالفین کی ان حرکتوں سے جب آپ افسردہ و حزیں اور ملول و غمگین ہو کر گھر آتے اور رفیقہِ حیات سے اہل مکہ کے توہین آمیز سلوک کا تذکرہ کرتے تو وہ کہتیں---'' یارسول اللہ! آپ ان باتوں سے بالکل رنجیدہ نہ ہوں۔ رسولوں کے ساتھ تو شروع سے ایسا ہوتا آیا ہے۔ بھلا کوئی ایسا رسول بھی آیا ہے جسے لوگوں نے طعن و تشنیع اور بدزبانی کا نشانہ نہ بنایا ہو---!!''

ہمدردی و غمگساری میں گُندھے ہوئے یہ چند بول سن کر جانِ دو عالم ﷺ مطمئن ہو جاتے اور آپ کا حزن و ملال جاتا رہتا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خدیجہؓ کو تسلّی و تشفی دینے اور ڈھارس بندھانے میں اللہ تعالیٰ نے خصوصی مہارت عطا کر رکھی تھی۔ جانِ دو عالم ﷺ ان کے اس کمال کا تذکرہ کرتے ہوئے خود بیان فرماتے ہیں کہ جب میں کفار کی ایسی باتیں سنتا تھا جو مجھ کو ناگوار

گزرتی تھیں تو میں خدیجہ سے کہتا تھا اور وہ اس طرح میری ڈھارس بندھاتی تھی کہ میرے دل کو تسکین ہو جاتی تھی۔ کوئی دکھ اور رنج ایسا نہیں تھا جو خدیجہ کی باتوں سے آسان اور ہلکا نہ ہو جاتا ہو۔

درحقیقت اس پُرآشوب اور مصائب و آلام سے لبریز دور میں جانِ دوعالم ﷺ کو ایسی ہی بلند حوصلہ اور عالی ہمت رفیقہِ حیات کی ضرورت تھی جو اللہ تعالیٰ نے حضرت خدیجہؓ کی شکل میں آپ کو عنایت کر دی تھی۔

حضرت خدیجہؓ کے والد ایک خوشحال تاجر تھے۔ والد کی وفات کے بعد انہوں نے کاروبار کو مزید ترقی دی اور جانِ دوعالم ﷺ سے نکاح کے وقت ان کے تمول کا یہ عالم ہو گیا تھا کہ جو قافلہ تجارت کے لئے جاتا تھا اس میں آدھا سامان حضرت خدیجہؓ کا ہوتا تھا اور آدھا باقی تمام قافلے والوں کا۔ یہ فراواں مال و دولت انہوں نے اپنے شوہر نامدار کے قدموں پر نثار کر دی اور آپ کو اپنے تمام اثاثہ جات میں ہر طرح کے تصرف کا مکمل اختیار دے دیا۔

اللہ تعالیٰ جانِ دوعالم ﷺ سے مخاطب ہو کر فرماتا ہے--- وَوَجَدَكَ عَائِلاً فَاَغْنٰی ○ (اور پایا اللہ تعالیٰ نے آپ کو ضرورتمند تو غنی کر دیا۔)

مفسرین نے لکھا ہے کہ اس سے مراد یہی ہے کہ پہلے آپ کو مال و دولت کی فراوانی میسر نہیں تھی، اللہ تعالیٰ نے حضرت خدیجہؓ سے شادی کے ذریعے آپ کو مالدار کر دیا۔

❁❁❁

حضرت خدیجہؓ نے پوری زندگی سکون و راحت سے گزاری تھی اور کبھی ان کے ماتھے پر پسینہ نہیں آیا تھا مگر جب ان کے عالی وقار شوہر پر مشکل وقت آیا تو انہوں نے ہر آرام اور ہر آسائش کو ٹھکرا دیا، ہر سکون اور ہر راحت سے منہ موڑ لیا اور رونگٹے کھڑے کر دینے والے مصائب میں آپ کی ہم قدم رہ کر ثابت کر دیا کہ وہ حقیقتاً دکھ سکھ کی ساتھی اور آخری حد تک وفا شعار اور ہمدم و دمساز رفیقہ حیات تھیں۔

یاد کیجئے اس وقت کو جب تمام قبائل نے متفقہ طور پر بنی ہاشم کے مقاطعہ اور

بائیکاٹ کا فیصلہ کیا اور بنی ہاشم کو شعب ابی طالب میں محصور اور قید ہونا پڑا۔ بائیکاٹ کی وجہ سے باہر کی کوئی چیز اندر نہیں جا سکتی تھی، نہ یہ لوگ باہر جا کر خرید و فروخت کر سکتے تھے۔ یہاں جانِ دو عالم ﷺ کو اپنے خاندان کے ساتھ تقریباً تین سال گزارنے پڑے۔ ان تین برسوں میں سب نے فاقوں پر فاقے کئے، سوکھے چمڑے چبا کر اور درختوں کی چھال کھا کر زندگی کا رشتہ قائم رکھا۔ بچے --- اور بعض دفعہ بڑے بھی --- بھوک سے بیتاب ہو کر چیخ پڑتے تھے اور رونے لگتے تھے مگر سنگ دل دشمنوں کو رحم نہیں آتا تھا۔ حضرت خدیجہؓ اگر چاہتیں تو ان ہولناک مصائب سے جان بچا سکتی تھیں کیونکہ مقاطعہ صرف بنی ہاشم کا ہوا تھا اور حضرت خدیجہؓ کا نسبی طور پر بنی ہاشم سے کوئی تعلق نہیں تھا مگر صد آفریں کہ اس وفا کی پتلی نے اپنے محبوب خاوند کے ساتھ تین برس مصیبتیں جھیلتے اور فاقے کاٹتے ہوئے گزار دیئے مگر کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لایا۔

ایک دن حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے حکیم ابن حزام نے اپنے خادم کے ہاتھ کھانے پینے کی کچھ چیزیں بھیجیں کہ خفیہ طور پر پھوپھی تک پہنچا دو۔ اتفاقاً ابوجہل نے خادم کو ادھر جاتا دیکھ لیا اور چیزیں چھیننے کے لئے جھپٹ پڑا۔ اسی وقت ایک اور شخص ابوالبختری وہاں آ پہنچا۔ یہ بھی اگرچہ کافر تھا مگر اتنا سخت دل نہیں تھا۔ اس نے ابوجہل کو روکا اور کہا کہ ایسا نہ کرو، اگر کوئی شخص اپنی پھوپھی کے لئے چند معمولی چیزیں بھیجتا ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے اور تم اتنے چھوٹے چھوٹے معاملات میں کیوں دخل دینے لگتے ہو!

ابوالبختری صاحبِ حیثیت انسان تھا، ابوجہل اس کی بات ٹال نہ سکا اور یوں کچھ چیزیں بمشکل حضرت خدیجہؓ تک پہنچ سکیں۔

اللہ اکبر! جس عورت کو آسائش و تنعم کی ہر سہولت میسر تھی اور جس کی خدمت کے لئے متعدد غلام اور کنیزیں ہر وقت دست بستہ کھڑے رہتے تھے، اس کی مجبوری و بے کسی کا یہ عالم ہے کہ اللہ جانے کتنے دنوں بعد اس کو خورد و نوش کی چند اشیاء میسر آئیں اور وہ بھی ابوالبختری کی چشم پوشی کی وجہ سے ---!!

ایثار و اخلاص اور عشق و وفا کے ایسے ہی غیر معمولی مظاہروں نے جانِ

دوعالم ﷺ کو اتنا متاثر کیا کہ فرمایا

''خدیجہ کی محبت مجھے پلا دی گئی ہے۔''

اعلیٰ حضرت نے امہات المؤمنینؓ پر بحیثیت مجموعی سلام پیش کرنے کے بعد مؤمنین کی اس پہلی ماں پر بالخصوص سلام بھیجا ہے۔

سیّما، پہلی ماں، کہفِ امن واماں حق گزارِ رفاقت پہ لاکھوں سلام (۱)

نبوت کے دسویں سال مقاطعہ ختم ہوا اور شعب ابی طالب کے محصورین باہر آئے۔ تین سال تک فاقے کاٹنے اور زہرہ گزار مصائب جھیلنے سے حضرت خدیجہؓ کی صحت خاصی متاثر ہوئی اور وہ مقاطعہ ختم ہونے کے تھوڑے ہی عرصے بعد بیمار پڑ گئیں بالآخر وہ وقت بھی آ گیا جس نے ہر بشر پر آنا ہے۔ آخری لمحوں میں جانِ دوعالم ﷺ ان کے پاس تشریف لائے تو ان کو کافی افسردہ وغمگین پایا۔ آپ سمجھ گئے کہ میری وارفتۂ محبت رفیقۂ حیات کو زندگی کے آخری لمحات میں مجھ سے جدائی کا غم کھائے جا رہا ہے اس لئے ان کی تسلّی کے لئے فرمایا--- ''تجھے اگرچہ یہ سب کچھ ناگوار گزر رہا ہے مگر انسان جس چیز کو ناگوار سمجھتا ہے کبھی اسی میں اس کی بھلائی مستور ہوتی ہے--- کیا تجھے پتہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کی طرح آخرت میں بھی تجھ کو میری زوجہ بنا دیا ہے!''

سیّدہ خدیجہؓ کے لئے اس سے بڑی بشارت اور کیا ہو سکتی تھی---! چنانچہ انہوں نے مزید اطمینان کے لئے پوچھا--- ''اَللّٰہُ فَعَلَ ذٰلِکَ؟'' (کیا واقعی اللہ نے مجھ پر یہ

---

(۱) سیّما، عربی لفظ ہے جس کے معنی ہیں ''خصوصاً۔'' پہلی ماں واقعی کہفِ امن واماں تھیں، یعنی جس طرح اصحابِ کہف، کہف میں داخل ہو کر دشمنوں کی چیرہ دستیوں سے محفوظ ہو گئے تھے اسی طرح جانِ دوعالم ﷺ حضرت خدیجہؓ کے گھر اور آغوش میں پہنچ کر سکون وعافیت اور امن واماں کی کہف میں چلے جاتے تھے اور اعداء کے طعن و دشنام کے تیروں سے مامون ہو جاتے تھے۔ یقیناً حضرت خدیجہؓ نے جانِ دوعالم ﷺ کی رفاقت کا حق ادا کر دیا۔ ایسی حق گزارِ رفاقت ماں پر ہم سب بیٹوں کی طرف سے لاکھوں سلام۔

انعام کردیا ہے؟)

جانِ دوعالم ﷺ نے فرمایا---"نَعَمْ"

یہ سن کر ان کے چہرے سے غم کے بادل چھٹ گئے اور خلدِ بریں میں جانِ دوعالم ﷺ کے ساتھ دائمی وصال کی نوید سے سرشار ہو کر اس دنیا سے رخصت ہوگئیں۔

وصال کے بعد ان کی میت کو مکہ کے بالائی حصے میں جسے "معلاۃ" کہا جاتا تھا' لے جایا گیا اور جانِ دوعالم ﷺ نے بنفسِ نفیس قبر میں اتارا۔ اس وقت نماز جنازہ فرض نہیں ہوئی تھی اس لئے ان کو یونہی دفن کر دیا گیا۔

جانِ دوعالم ﷺ سے نکاح کے وقت حضرت خدیجہؓ کی عمر چالیس [۴۰] سال تھی اور وفات کے وقت پینسٹھ سال۔ اس طرح ان کو پچیس سال تک آپ کی رفاقت میسر رہی۔ پندرہ سال آپ کے اعلان نبوت سے پہلے اور دس سال بعد میں۔ اتنا طویل ساتھ بعد میں کسی زوجہ مطہرہ کو نصیب نہ ہو سکا۔

❀❀❀

جانِ دوعالم ﷺ نے حضرت خدیجہؓ کو "زِیْنَۃُ الْبَیْت" کہا ہے' یعنی گھر کی زینت۔ جب گھر سے یہ زینت اٹھ گئی تو آپ اکثر حزیں واندوہگیں رہنے لگے۔ ایک دن خولہ بنت حکیم تعزیت کے لئے آئیں اور افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگیں

"یا رسول اللہ! خدیجہ کے دنیا سے رخصت ہو جانے پر آپ بہت غمگین دکھائی دیتے ہیں۔"

فرمایا---"ہاں' وہ میرے بچوں کی شفیق ماں تھی' میری رازدار و غمگسار تھی' اس نے مشکل وقت میں میرا ساتھ دیا اور محبت' وفاداری اور سلیقہ شعاری کا حق ادا کر دیا--- اس کو میں بھلا کیسے بھول سکتا ہوں---!!"

کچھ عرصے تک تو جانِ دوعالم ﷺ کی یہ کیفیت رہی کہ گھر سے باہر جاتے تو زباں پر خدیجہ کا تذکرہ ہوتا اور واپس تشریف لاتے تب بھی سب سے پہلے خدیجہ کو یاد کرتے۔

رفتہ رفتہ یہ کیفیت تو کم ہوگئی مگر حضرت خدیجہؓ کی یاد آخر تک دل میں جاگزیں رہی

اور اس کو تازہ رکھنے کے لئے یہ انداز اختیار فرمایا کہ اگر تحفے کے طور پر کوئی چیز آتی تو فرماتے ---"یہ خدیجہ کی فلاں فلاں سہیلی کو دے آؤ۔" قربانی کرتے یا ویسے ہی کوئی جانور ذبح کرتے تو بھی حضرت خدیجہؓ کی سہیلیوں کو ضرور گوشت بھیجتے اور فرمایا کرتے کہ جو ہستیاں خدیجہ کو محبوب تھیں، وہ (خدیجہ سے ایک گونہ نسبت رکھنے کی وجہ سے) مجھے بھی اچھی لگتی ہیں۔

جس خوش نصیب بیوی سے محبوبِ خدا اس حد تک خوش اور راضی ہوں اس کی عظمت و رفعت اور اللہ کے ہاں اس کے مقام و مرتبے کا کون اندازہ کر سکتا ہے---!

اس سے بڑا اعزاز کیا ہوگا کہ صمد و بے نیاز رب نے ان کو سلام بھیجا ہے---!

یہ اس دور کی بات ہے جب حضرت خدیجہؓ جانِ دو عالم ﷺ کی خدمت میں ہمہ تن مصروف رہتی تھیں اور متعدد کنیزیں غلام موجود ہونے کے باوجود آپ کے کام اپنے ہاتھوں سے انجام دیا کرتی تھیں۔ اس زمانے میں ایک دن جبریل امین جانِ دو عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی---"یا رسول اللہ! خدیجہ کھانے کے کچھ برتن اٹھائے آپ کی طرف چلی آرہی ہیں، جب وہ یہاں آجائیں تو انہیں کہیئے کہ ان کا رب انہیں سلام کہتا ہے۔"

اللہ اللہ! کیا شان ہے تیری، اے ہم سب کی پیاری ماں!

عرش سے جس پہ تسلیم نازل ہوئی اس سرائے سلامت پہ لاکھوں سلام

روح الامین نے مزید عرض کی کہ میری طرف سے بھی انہیں سلام پیش کیجئے!

وَ بَشِّرْهَا بِبَيْتٍ فِي الْجَنَّةِ مِنْ قَصَبٍ، لَا صَخَبَ فِيهَا وَ لَا نَصَبَ.

(اور انہیں خوشخبری سنا دیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت میں ایک بہت بڑے موتی کو اندر سے خالی کر کے ان کے لئے محل بنایا ہے جس میں نہ شور و شغب ہوگا، نہ کسی قسم کی تکلیف۔)

اعلیٰ حضرتؒ نے صحیح بخاری کی اسی حدیث کی جانب تلمیح کرتے ہوئے فرمایا

مَنْزِلٌ مِنْ قَصَبٍ، لَا صَخَبٌ، لَا نَصَبٌ ایسے کوشک کی زینت پہ لاکھوں سلام

مصنف و قارئینِ سیّدالورٰی اپنی طاہرہ و پاکیزہ ماں کو فردوس بریں میں ایسے شاندار اور بے مثال "موتی محل" میں رہائش پذیر ہونے پر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

حضرت خدیجہؓ کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ ایک صاحبزادے ابراہیمؓ کے سوا جانِ دو عالم ﷺ کے تمام صاحبزادے اور صاحبزادیاں حضرت خدیجہؓ ہی سے پیدا ہوئے جن کا تذکرہ انشاء اللہ "اولادِ رسول" میں آئے گا۔

اُمّ المؤمنین سیّدہ سودہ رضی اللہ عنہا

حضرت سودہؓ(۱) بنت زمعہ کا تعلق قریش کے ایک معزز خاندان عامر بن لُویّ سے تھا۔ والدہ کا نام شموس بنت قیس تھا۔ حضرت سودہؓ کے نانا قیس، جانِ دو عالم ﷺ کے پردادا ہاشم کی بیوی سلمیٰ کے بھائی تھے جن کا تعلق یثرب کے قبیلہ بنونجار سے تھا۔ اس طرح جانِ دو عالم ﷺ اور سودہ کی ننھیال ایک ہی بنتی ہے۔ حضرت سودہؓ کی پہلی شادی اپنے چچازاد سکران بن عمرو سے ہوئی اور میاں بیوی پُرمسرت زندگی بسر کرنے لگے۔ سودہ چونکہ طبعاً ایک صالح، حق پسند اور دوراندیش خاتون تھیں اس لئے اوائل بعثت میں ہی حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئیں۔

وہ قبیلہ عامر بن لوی کی پہلی خاتون تھیں جنہوں نے اسلام قبول کیا۔

ایمان لانے کے ساتھ ہی انہوں نے اپنے میکے اور سسرال میں تبلیغ شروع کر دی۔ اس کا ان کے خاندان والوں پر خاطر خواہ اثر ہوا اور ان کی کوششوں سے خاندان کے کئی لوگ حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔ ان کے اسماء مبارک یہ ہیں

(۱)---حضرت سکرانؓ (شوہر)

(۲)---حضرت عبداللہؓ (دیور کے بیٹے)

(۳)---حضرت حاطبؓ (دیور)

(۴)---حضرت سلیطؓ (دیور)

(۵)---حضرت فاطمہؓ (دیورانی اور حضرت سلیط کی اہلیہ)

(۶)---حضرت مالکؓ (بھائی)

(۷)---حضرت ابوسبرہؓ (جانِ دو عالم ﷺ کی پھوپھی برہ کے صاحبزادے)

دوسری ہجرت میں حبشہ جانے والوں کی فہرست میں حضرت سودہؓ اور ان کے شوہر

---

(۱) سودہ کا لفظی معنی المنجد میں ''ارض بها نخیل'' لکھا ہوا ہے، یعنی ایسی زمین جس میں کھجور کے درخت لگے ہوں۔ گویا یہ لفظ نخلستان کا ہم معنی ہے۔

بھی شامل تھے۔ان کے قبیلے نے سخت مزاحمت ومخالفت کی کہ وہ حبشہ ہجرت نہ کریں اور اگر چلی بھی جائیں تو عزیز واقربا میں سے ان کے ساتھ اور کوئی نہ جائے۔لیکن جس طرح بلند حوصلہ اور عالی ہمت حضرت سودہ نے اسلام کی تبلیغ وتعلیم کے ذریعے چند افراد کو دامنِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستہ ہونے پر قائل کرلیا تھا اور وہ مسلمان ہوگئے تھے اسی طرح ان کی مساعی جمیلہ سے خاندان کے متعدد افراد حضرت سودہؓ کے ساتھ سوئے حبشہ ہجرت کر گئے۔

باوجود قبیلے اور خاندان کی سخت مخالفت کے بہت سے لوگوں کو اپنے ساتھ حبشہ لے جانے کا واقعہ اس امر کا غماز ہے کہ حضرت سودہؓ اپنے قبیلے اور خاندان میں کس قدر معزز، مؤثر اور قابلِ اعتماد تھیں اور وہ لوگ ان کا کتنا احترام کرتے تھے۔

وطن سے دور مسلمان حبشہ میں بڑے سکون وآرام کی زندگی بسر کر رہے تھے۔وہ اذیت ناک ماحول نہیں تھا جہاں سانس لینا بھی دشوار تھا۔حضرت سودہؓ اور ان کے شوہر حضرت سکران بھی اطمینان سے زندگی کے دن پورے کر رہے تھے، تاہم اکثر وبیشتر انہیں مکہ کے گلی کوچے یاد آجاتے تھے جہاں انہوں نے زندگی کا بیشتر حصہ گزارا تھا۔سب سے زیادہ دکھ اور قلق حضرت سودہؓ کو یہ تھا کہ وہ جانِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے محروم ہوگئی تھیں۔ چنانچہ ایک دن انہوں نے اپنے شوہر سے کہا---''ہمیں مکہ میں ہی رہنا چاہیئے تھا۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو وہاں تکالیف برداشت کریں اور ہم یہاں آرام سے رہیں۔یہ کیسی محبت ہے؟''

''یہ بات تو ہے۔آخر اور بھی مسلمان وہاں رہ رہے ہیں۔'' حضرت سکرانؓ نے ان سے اتفاق کیا۔

دوسرے مسلمان بھی کچھ انہیں خطوط پر سوچ رہے تھے۔لہٰذا مہاجرین کی کثیر تعداد مکہ مکرمہ واپس لوٹ آئی۔ان میں حضرت سودہؓ اور ان کے سب خاندان والے بھی شامل تھے۔

❁❁❁

ایک دن حضرت سودہؓ نیند سے بیدار ہوئیں تو انہوں نے اپنے شوہر حضرت سکرانؓ سے کہا۔

''سکران! آج رات میں نے ایک خواب دیکھا ہے۔''

''کیا؟ حضرت سکرانؓ نے دریافت کیا۔

''کیا دیکھتی ہوں کہ لیٹی ہوئی ہوں، آسمان پر چاند چمک رہا ہے، اچانک وہ ٹوٹا اور مجھ پر آ پڑا۔''

''سودہ! کیا تم نے ایسا ہی دیکھا ہے؟'' حضرت سکرانؓ نے حیرت سے پوچھا

''ہاں، بالکل ایسے ہی، جیسے سنایا ہے۔'' حضرت سودہؓ نے جواب دیا۔

''اس کا مطلب یہ ہے کہ میں بہت جلد دارفنا سے داربقا سدھاروں گا اور رسول اللہ ﷺ تم سے نکاح کرلیں گے۔'' حضرت سکرانؓ نے تعبیر بتائی۔ (۱)

اسی دن سے حضرت سکرانؓ بیمار پڑ گئے اور چند دنوں کے اندر ہی اندر اللہ کو پیارے ہو گئے۔

❁❁❁

۱۰ رمضان المبارک ۱۰ نبوت میں یعنی ہجرت مدینہ سے تین سال قبل جانِ دو عالم ﷺ کی زوجہ مطہرہ خدیجۃ الکبریٰؓ کا انتقال ہو گیا اور پچیس سالہ رفاقت ٹوٹ گئی۔ ان سے چند روز قبل آپ کے چچا ابو طالب بھی اس دنیا سے کوچ کر گئے تھے۔ لہٰذا اس سال کو جانِ دو عالم ﷺ نے عَامُ الْحُزْن، یعنی سالِ غم کا نام دیا۔

بیوی کے وصال کے وقت گھر میں دو چھوٹی بچیاں سیّدہ کلثومؓ اور سیّدہ فاطمہؓ تھیں، جن کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ تھا۔ گھر کے نظام میں یکایک تبدیلی آ گئی تھی جس سے کسی حد تک تبلیغی سرگرمیاں بھی متاثر ہوئیں۔

حضرت خولہ بنت حکیمؓ ان خواتین میں سے تھیں جنہوں نے اپنے آپ کو جانِ دو عالم ﷺ کی خدمت کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ ان کے شوہر حضرت عثمان بن مظعونؓ بھی قدیم الاسلام تھے۔

---

(۱) معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سکرانؓ کو تعبیر میں بہت مہارت تھی کیونکہ بعد میں ان کی بات بالکل درست ثابت ہوئی۔

ایک روز حضرت خولہؓ بارگاہِ رسالت مآب میں حاضر ہوئیں اور ادب سے بیٹھ کر عرض گزار ہوئیں۔

''یارسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان، جب سے خدیجہ داغِ مفارقت دے گئی ہیں، میں آپ کو اکثر مغموم اور اداس پاتی ہوں۔''

''خولہ! تم ٹھیک کہتی ہو۔ خدیجہ ایک غم گسار اور وفا شعار بیوی تھی۔ گھر کا انتظام و انصرام، بچوں کی نگہداشت، دیکھ بھال اور ان کی تربیت کے فرائض اسی کے سپرد تھے۔ اس کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد خاصی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔''

''تو پھر آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے یارسول اللہ!؟''

فرمایا---''کس سے؟''

''ایک بیوہ بھی ہے میری نظر میں اور ایک کنواری بھی، جس کے بارے میں آپ کہیں اسی کی بات آگے چلاؤں۔'' حضرت خولہؓ نے بتایا

فرمایا---''بیوہ کون ہے اور کنواری کون؟''

''بیوہ سودہ بنتِ زمعہ اور کنواری عائشہ بنتِ ابی بکر۔''

فرمایا---''دونوں کے لئے پیغام لے جاؤ۔'' چنانچہ حضرت خولہؓ حضرت سودہؓ کے گھر گئیں اور ان کے والد زمعہ سے بات کی۔ زمعہ نے کہا

''محمد بن عبداللہ (ﷺ) ذاتی و خاندانی لحاظ سے نجیب و شریف ہیں اور ہر عیب سے پاک ہیں۔ مجھے ذاتی طور پر تو کوئی اعتراض نہیں؛ البتہ سودہ کی مرضی اور رائے بھی معلوم کر لو۔''

حضرت خولہؓ نے حضرت سودہؓ سے ان کی رائے پوچھی تو انہوں نے کہا

''میں محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لائی ہوں۔ وہ میرے ہادی اور رہنما ہیں اس لئے میری ذات کے متعلق انہیں کلّی اختیار ہے۔ وہ جو چاہیں فیصلہ فرمائیں۔''

اس کے بعد چند ہی دن میں نکاح کی تاریخ طے ہوگئی اور وقت مقرر پر جانِ دو عالم ﷺ چند اصحاب کے ہمراہ زمعہ کے گھر تشریف لے گئے۔

زمعہ نے اپنی لختِ جگر کا نکاح خود پڑھایا اور حق مہر ۴۰۰ درہم مقرر ہوا۔ نکاح کے بعد حضرت سودہؓ جانِ دو عالم ﷺ کے حرم پاک میں شامل ہو گئیں اور اُمّ المؤمنین کے خطاب سے نوازی گئیں۔ خدیجۃ الکبریٰؓ کے وصال کے بعد وہ پہلی خاتون تھیں جو جانِ دو عالم ﷺ کی زوجیت میں آئی تھیں۔ ان سے شادی کے بعد جانِ دو عالم ﷺ کو گھر کی طرف سے اطمینان ہوا تو یکسو ہو کر تبلیغ اسلام میں مشغول ہو گئے۔

❁❁❁

نبوت کا تیرھواں سال تھا کہ آپ نے حضرت ابوبکرؓ کی ہمراہی میں ہجرت فرمائی۔ یہ ہجرت چونکہ خفیہ طور پر اختیار کی گئی تھی اور ان حالات میں یہ ممکن نہ تھا کہ اپنی زوجہ محترمہ سیّدہ سودہؓ اور دو بچیوں کو بھی ساتھ لے جاتے، لہٰذا انہیں مکہ میں ہی رہنے دیا۔

شادی سے لے کر ہجرت تک اُمّ المؤمنین حضرت سودہؓ نے جس جرأت و استقلال اور عالی ہمتی سے حالات کا مقابلہ کیا، وہ صرف انہیں کا حصہ ہے۔ اسی طرح جانِ دو عالم ﷺ کے مدینہ منورہ تشریف لے جانے کے بعد سات ماہ تک آپ کی دو شہزادیوں حضرت کلثومؓ اور حضرت فاطمہؓ کی سرپرستی، دیکھ بھال اور ان کی حفاظت کی عظیم ذمہ داری جس محبت، جانفشانی اور خوش اسلوبی سے پوری کی، اس کی مثال نہیں ملتی۔

جب جانِ دو عالم ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو حضرت ابوایوب انصاریؓ کے ہاں قیام پذیر ہوئے۔ یہ عرصۂ قیام سات مہینوں پر پھیلا ہوا ہے۔ اسی دوران آپ نے مسجد نبوی تعمیر کرائی اور دو حجرے بھی بنوانے شروع کئے۔ ایک حضرت سودہؓ کے لئے اور دوسرا حضرت عائشہ صدیقہؓ کے لئے جن سے نکاح تو ہو چکا تھا لیکن رخصتی نہیں ہوئی تھی۔

رمضان، ایک ہجری میں جانِ دو عالم ﷺ نے حضرت زید بن حارثہؓ اور حضرت ابورافعؓ کو پانچ سو درہم اور دو اونٹ دے کر مکہ کی طرف بھیجا تاکہ وہ وہاں سے اہل بیت کو لے آئیں۔

حضرت زیدؓ اور حضرت ابورافعؓ اپنے اہل و عیال کے علاوہ جانِ دو عالم ﷺ کی زوجہ مطہرہ حضرت سودہؓ اور آپ کی دو صاجزادیوں سیّدہ فاطمہؓ اور سیّدہ کلثومؓ کو ساتھ لے کر

چند ہی دنوں میں واپس آ گئے۔

اس وقت تک مسجد نبوی کے ارد گرد گھر ابھی تعمیر کے مراحل طے کر رہے تھے لہٰذا وقتی طور پر جانِ دو عالم ﷺ کے اہل بیت کو حضرت حارثہ بن نعمانؓ کے ہاں ٹھہرا دیا گیا اور جب حجرہ مکمل ہو گیا تو حضرت سودہؓ مع دونوں شہزادیوں کے اپنے گھر منتقل ہو گئیں۔

۞۞۞

حضرت سودہؓ اَن گنت صفات اور خوبیوں کی مالک تھیں۔ خاص طور پر ایمان کی حلاوت نے ان کے مزاج اور طبیعت کے اندر بشاشت و شگفتگی، سرخوشی و خندہ لبی کی ایک ایسی خوبصورت کیفیت پیدا کر دی تھی جس کی وجہ سے نہ صرف ہر اس محفل کو جہاں وہ تشریف لے جاتی تھیں کشتِ زعفران بنا دیتی تھیں؛ بلکہ اپنے آقا و مولا کی تفریحِ طبع کی خاطر اپنے انداز و گفتار میں ایسی طرز اختیار کرتی تھیں جس سے جانِ دو عالم ﷺ خوش ہو جاتے تھے اور تبسّم فرماتے تھے۔

ایک دن جانِ دو عالم ﷺ تشریف فرما تھے کہ حضرت سودہؓ نے عرض کی

''یا رسول اللہ! اجازت ہو تو ایک بات عرض کروں۔''

''کہو!'' جانِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا اور اپنی اہلیہ کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''آپ رات کے آخری حصے میں بارگاہ خداوندی میں نماز کیلئے کھڑے تھے۔ میں نے دیکھا تو آپ کی پیروی و اتباع میں آپ کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ جب آپ رکوع میں گئے تو میں بھی چلی گئی۔ لیکن آپ نے رکوع اتنا طویل کیا کہ مجھے اپنی ناک سے خون بہنے کا خطرہ محسوس ہونے لگا۔ چنانچہ میں بار بار اپنی ناک کو سہلاتی رہی۔ ایسے۔'' انہوں نے ناک سہلانے کا دلچسپ مظاہرہ کر کے دکھایا۔

یہ دیکھ کر جانِ دو عالم ﷺ کے چہرہ اقدس پر تبسّم نمودار ہوا اور انہیں متبسّم دیکھ کر سیّدہ کو بڑی راحت محسوس ہوئی۔

کبھی کبھی جانِ دو عالم ﷺ کو خوش کرنے کے لئے وہ اس انداز سے چلتی تھیں کہ آپ ہنس پڑتے تھے۔

ازواجِ مطہراتؓ بڑی محبت اور سلوک کے ساتھ رہتی تھیں۔ کبھی کبھی وہ انہی پاکیزہ اور محبت آمیز تعلقات کی بنا پر ایک دوسری سے ہنسی مزاح بھی کر لیتی تھیں۔ اصابہ میں ایک واقعہ درج ہے کہ حضرت سودہؓ دجال کے بارے میں سوچنا بھی پسند نہیں کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کے پاس حضرت سودہؓ تشریف لائیں تو دونوں محترم و معظم خواتین نے مزاح کے لہجے میں کہا

''سودہ! کچھ سنا تم نے؟''

''کیا؟'' انہوں نے سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کہتے ہیں دجال برآمد ہو گیا ہے۔''

یہ سننے کی دیر تھی کہ گھبرا گئیں اور قریب ہی ایک خیمے میں گھس گئیں۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ ہنستی ہوئی جانِ دو عالم ﷺ کے پاس گئیں اور اس مزاح کے بارے میں بتایا۔ جانِ دو عالم ﷺ اس خیمے کی طرف تشریف لے گئے جہاں حضرت سودہؓ تھیں اور خیمے سے باہر کھڑے ہو کر فرمایا

''سودہ! باہر آ جاؤ۔ ابھی دجال نہیں نکلا۔''

یہ سن کر وہ باہر تشریف لائیں تو مکڑی کا جالا کپڑوں میں لگا ہوا تھا جسے انہوں نے باہر آ کر صاف کیا۔

❁ ❁ ❁

سوائے حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے باقی تمام ازواج مطہرات حضرت سودہؓ کی موجودگی میں جانِ دو عالم ﷺ کے حرم پاک میں داخل ہوئیں لیکن ان سب کے ساتھ حضرت سودہؓ کے تعلقات اور سلوک بڑا امثالی تھا۔ اس کی تصدیق کے لئے حضرت عائشہؓ کا یہ فرمان کافی ہے۔

''میں نے سودہ کے سوا کسی عورت کو جذبہ رقابت سے خالی نہیں دیکھا۔ نیز ان کے سوا کسی اور عورت کو دیکھ کر میرے دل میں یہ خواہش پیدا نہیں ہوئی کہ کاش، اس کے جسم میں میری روح ہوتی۔''

جانِ دو عالم ﷺ نے اپنی ازواجِ مطہراتؓ کے لئے باری مقرر کر رکھی تھی اور یہ باری ایک دن اور ایک رات پر محیط ہوتی تھی۔

جب حضرت سودہؓ کافی سن رسیدہ ہو گئیں تو ان کے ذہن میں از خود یہ خیال پیدا ہو گیا کہ بوڑھی ہونے کی وجہ سے جانِ دو عالم ﷺ کہیں انہیں طلاق نہ دے دیں۔ ان کی تمنا تھی کہ آخر دم تک ان کا شمار اُمّہات المؤمنین میں ہو۔ اس لئے انہوں نے عرض کی کہ مجھے اپنی زوجیت کے شرف سے محروم نہ فرمائیں میں اپنی باری عائشہ کو دیتی ہوں۔ (۱)

---

(۱) بعض کتب میں مذکور ہے کہ جانِ دو عالم ﷺ نے ان کو طلاق کہلا بھیجی۔ حضرت سودہؓ کو حد سے زیادہ قلق ہوا اور وہ اس راہ پر بیٹھ گئیں جس سے آپ حضرت صدیقہؓ کے پاس آیا جایا کرتے تھے۔ جب آپ نے جانِ دو عالم ﷺ کو دیکھا تو عرض کی

''میں آپ کو اس ذات کا واسطہ دے کر پوچھتی ہوں جس نے آپ پر کتاب اتاری اور اپنی مخلوق میں آپ کو برگزیدہ بنایا، آپ نے مجھے کیوں طلاق دی؟ کیا آپ نے مجھ میں کوئی ایسا عیب پایا جس کی وجہ سے آپ ناراض ہو گئے ہیں؟''

''نہیں۔'' جانِ دو عالم ﷺ نے فرمایا۔

''لِلّٰہ آپ رجوع فرمالیں۔ میں بوڑھی ہوں۔ مجھے مرد کی چنداں ضرورت نہیں لیکن میں یہ چاہتی ہوں کہ میرا حشر آپ کی ازواج میں ہو۔''

آخر جانِ دو عالم ﷺ نے ان سے رجوع فرمالیا۔ اس پر حضرت سودہؓ نے کہا

''میں نے اپنی باری کا دن عائشہ کو دے دیا۔''

لیکن یہ بات جانِ دو عالم ﷺ کی شان کے لائق نہیں اور آپ کی ذاتِ اقدس سے بعید ہے کہ آپ حضرت خدیجہؓ کے بعد ایک عمر رسیدہ عورت سے شادی کرلیں جو گھر کی حفاظت اور نگرانی کے لئے موزوں ہو اور جو ماں کی طرح نو عمر بچیوں کی دیکھ بھال کرے اور چند سال بعد جب گھر میں دوسری نو عمر بیویاں آجائیں تو اس کو صرف اس لئے طلاق دینے پر آمادہ ہو جائیں کہ وہ بوڑھی ہو گئی ہے، پھر جب وہ اپنی باری کا دن آپ کی چہیتی بیوی کو ہبہ کر دے تو اسی بوڑھی عورت کو اپنی زوجیت میں رکھنے پر تیار ہو ☜

نویں سال میں حج فرض ہوا اور ۱۰ ہجری میں جانِ دو عالم ﷺ خود حج کے لئے متوجہ ہوئے۔ اس حج کو حجۃ الوداع کہتے ہیں۔ اس موقع پر جانِ دو عالم ﷺ نے اپنی ازواج مطہرات ؓ کو ساتھ لیا اور سوئے مکہ مکرمہ چل پڑے۔ حضرت سودہ ؓ بھی ساتھ تھیں۔

جائیں، حالانکہ حضرت سودہ ؓ سے پہلے، جس وقت آپ کا عالمِ شباب تھا، آپ نے ایک عورت حضرت خدیجہ ؓ کے ساتھ زندگی کے پچیس سال گزار دیئے اور اس دوران آپ نے کسی دوسری عورت سے نکاح کرنے کا خیال تک نہ فرمایا۔ اگر آپ چاہتے تو آپ کے لئے نوجوان باکرہ عورتوں کی کوئی کمی نہ تھی لیکن آپ نے ایسا نہ کیا، بلکہ جب حضرت خدیجہ ؓ وصال پاگئیں تو عمر بھر ان کو یاد فرماتے رہے۔ حتیٰ کہ حضرت عائشہ صدیقہ ؓ کو بھی ان پر رشک آتا تھا۔

اگرچہ اللہ تعالیٰ نے مرد کو طلاق دینے کا اختیار دیا ہے لیکن یہ بات اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے نزدیک ناپسندیدہ ہے کہ بغیر ناگزیر وجوہات کے بیوی کو طلاق دے دی جائے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد عالی ہے۔

تمام حلال چیزوں میں سے جو چیز اللہ تبارک وتعالیٰ کو سب سے زیادہ ناپسند ہے وہ طلاق ہے۔''

اسی لئے جب حضرت زید بن حارثہ ؓ نے اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہی اور جانِ دو عالم ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو فرمایا۔

''اپنی بیوی کو طلاق نہ دے اور اللہ سے ڈر!''

پھر یہ کیسے تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ جانِ دو عالم ﷺ نے، جن کے نزدیک طلاق ایک ناپسندیدہ فعل تھا، خود اپنی بیوی حضرت سودہ ؓ کو محض بڑھاپے کی وجہ سے طلاق دے دی ہوگی یا طلاق دینے کا خیال فرمایا ہوگا!!

صحیح بات یہ ہے کہ جب اُمّ المؤمنین حضرت سودہ ؓ بوڑھی ہوگئیں تو ان کو خیال پیدا ہوا کہ شاید جانِ دو عالم ﷺ ان کو طلاق دے دیں اور وہ شرف زوجیت سے محروم ہو جائیں۔ اس بنا پر انہوں نے اپنی مرضی سے اپنی باری حضرت عائشہ صدیقہ ؓ کو دے دی اور جانِ دو عالم ﷺ نے قبول کرلی۔ یعنی حضرت سودہ ؓ کی التجا محض ان کے اپنے وہم وگمان کی بنا پر تھی۔ چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہ ؓ فرماتی ہیں کہ ☜

چونکہ آپ دراز قد اور فربہ اندام تھیں اور تیز چلنا دشوار تھا اس لئے مزدلفہ میں قیام کے دوران انہوں نے جانِ دو عالم ﷺ سے درخواست کی

''یارسول اللہ! میرے لئے رش میں چلنا سخت مشکل ہے اس لئے آپ مجھے اجازت مرحمت فرمادیں کہ میں رات کو ہی منیٰ چلی جاؤں۔''

جانِ دو عالم ﷺ نے اجازت دے دی تو وہ رات کو ہی مزدلفہ سے روانہ ہوگئیں اور صبح کی نماز منیٰ میں ادا کی۔ اس پر حضرت عائشہؓ نے فرمایا

''کاش سودہ کی طرح میں بھی رسول اللہ ﷺ سے رات کو ہی مزدلفہ سے روانہ ہونے کی اجازت طلب کر لیتی اور لوگوں کے آنے سے پہلے صبح کی نماز منیٰ میں ادا کرتی۔''

❀❀❀

۱۲ ربیع الاول ۱۱ ہجری کو جانِ دو عالم ﷺ اپنے مولا کریم کے پاس تشریف لے گئے۔ اس وقت حضرت سودہؓ کی عمر تقریباً ساٹھ سال تھی اور انہیں جانِ دو عالم ﷺ کی رفاقت و قرب ۱۴ سال میسر رہا تھا جو حضرت خدیجہؓ کے بعد تمام ازواج سے زیادہ تھا۔

حضرت سودہؓ چمڑے کی صنعت میں نمایاں مہارت رکھتی تھیں۔ وہ طائف کی کھالیں بناتی تھیں جس کی وجہ سے ان کی مالی حالت باقی تمام ازواج مطہراتؓ سے بہتر تھی۔ اس محنت سے جو آمدنی ہوتی تھی اسے نہایت آزادی کے ساتھ نیک کاموں میں خرچ کیا کرتی تھیں اور اس سے بہت مسرت حاصل کرتی تھیں۔ کسی اور طرف سے اگر مال آجاتا تھا

جب سودہ کی عمر زیادہ ہوگئی اور انہوں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کا میلان میری طرف زیادہ ہے تو ان کو یہ خدشہ پیدا ہوگیا کہ شاید آپ انہیں طلاق دے دیں گے۔ اس لئے التجا کی کہ آپ مجھے طلاق نہ دیں اور میری باری کا دن عائشہ کو دے دیں۔

رہا حضرت سودہؓ کا اپنی باری کے دن سے دستبردار ہو جانا، تو اس میں بھی جانِ دو عالم ﷺ کا کوئی عمل دخل نہ تھا۔ بلکہ اصل بات یہ تھی کہ دونوں خواتین ایک دوسرے کے زیادہ قریب تھیں اس لئے حضرت سودہ نے از خود اور اپنی خوشی و مرضی سے اپنی باری کا دن حضرت عائشہؓ کو بخش دیا۔

تو اس کو بھی کھڑے کھڑے راہ خدا میں لٹا دیتی تھیں۔

ایک مرتبہ خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق ؓ نے حضرت سودہؓ کو توڑے میں درہم بھیجے۔ پوچھا---''یہ کیا ہے؟''

''درہم ہیں۔''لوگوں نے بتایا

''کیا توڑے میں کھجوروں کی طرح؟'' انہوں نے حیرت ظاہر کی، پھر باندی کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا---''اے لڑکی! میرے پاس پچھی لا۔''

وہ بھاگی گئی اور چھوٹی چنگیر لے آئی۔ حضرت سودہؓ درہم اس میں انڈیلتی گئیں اور بانٹتی گئیں۔ چنانچہ تھوڑی ہی دیر میں وہ سب درہم غریبوں اور مسکینوں میں کھجوروں کی طرح تقسیم فرما دیئے۔

حضرت سودہؓ سے صرف پانچ احادیث مروی ہیں۔ ان میں سے ایک بخاری شریف میں ہے اور باقی چار حدیثیں احادیث کی مختلف کتب میں ہیں۔

اُن کا وصال ۲۲ ہجری میں ہوا۔ اس وقت اُن کی عمر ۷۲ سال تھی۔ وصال سے قبل انہوں نے اپنے گھر کے متعلق وصیت فرمائی تھی کہ

''میرے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد میرا گھر عائشہ کو دے دیا جائے۔''

حضرت اسماء بنت عمیسؓ نے حبشہ میں عورتوں کی میت کے لئے لوگوں کو پردہ دار مسہری بناتے دیکھا تھا لہٰذا انہوں نے حضرت سودہؓ کے لئے بھی ویسی ہی مسہری تیار کی۔

جب اسے حضرت عمر فاروق ؓ نے ملاحظہ فرمایا تو حضرت اسماءؓ کو دعا دی اور فرمایا

''سَتَرْتِهَا، سَتَرَکِ الله. (تم نے ان کو پردے میں ڈھانپا، اللہ تعالیٰ تمہاری پردہ پوشی فرمائے۔)

جب جنازہ تیار ہو گیا تو اسے آخری منزل کی طرف لے چلے اور جنت البقیع میں لے جا کر قبر میں اتار دیا۔ حرم نبوی کا ایک اور چراغ بجھ گیا تھا لیکن حقیقتاً اس کی روشنی آج بھی برقرار ہے اور قیامت تک رہے گی۔

اُمّ المؤمنین سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا

بوقتِ نکاح و رخصتی

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر کیا تھی؟

قارئین کرام! حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حالات بیان کرنے سے پہلے ہم آپ کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ احادیث کی متعدد کتابوں میں نکاح و رخصتی کے وقت حضرت عائشہ کی جو عمر بیان کی گئی ہے، وہ ہمارے نقطۂ نظر سے درست نہیں ہے۔ ہمارے خیال میں حضرت عائشہ کی عمر بوقتِ نکاح پندرہ، سولہ سال تھی اور رخصتی کے وقت اٹھارہ، انیس سال۔ اس بات کو انشاء اللہ ہم حضرت عائشہ کے حالات میں تاریخی حوالوں سے ثابت کریں گے لیکن اس سے پہلے ضروری ہے کہ جن روایات کی بنیاد پر یہ دعوٰی کیا جاتا ہے کہ نکاح و رخصتی کے وقت علی الترتیب ان کی عمر چھ سال اور نو سال تھی، ان روایتوں کو نقد و جرح کی کسوٹی پر اچھی طرح پرکھ لیا جائے تاکہ قاری کے ذہن میں کسی قسم کی الجھن اور ابہام باقی نہ رہے۔ پیشِ نظر مقالہ اسی موضوع پر قلمبند کیا گیا ہے۔ امیدِ واثق ہے کہ اہلِ علم قارئین کو یہ تحقیق بہت پسند آئے گی اور وہ ہماری کاوشوں کو سراہیں گے۔

قارئینِ کرام! ہم آئندہ صفحات میں انشاء اللہ تاریخی حوالوں سے ثابت کریں گے کہ حضرت عائشہ کی عمر بوقتِ نکاح پندرہ سولہ سال تھی اور بوقتِ رخصتی اٹھارہ انیس سال۔ لیکن کتب احادیث میں چندروایات ایسی بھی ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ حضرت عائشہ کی عمر نکاح کے وقت ۶ سال تھی اور رخصتی کے وقت ۹ سال۔ مثلاً یہ روایت

عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ تَزَوَّجَهَا وَ هِيَ بِنْتُ سِتِّ سِنِيْنَ وَ اُدْخِلَتْ عَلَيْهِ وَ هِيَ بِنْتُ تِسْعٍ وَ مَكَثَتْ عِنْدَه، تِسْعًا. (۱)

(حضرت عائشہ بتاتی ہیں کہ نبی ﷺ نے نکاح کیا ان کے ساتھ جب وہ چھ سال کی تھیں اور وہ داخل کی گئیں آپ پر (شب باشی کے لئے) جب وہ نو سال کی تھیں اور نو سال تک آپ کے پاس رہیں۔)

یہ روایت اور اس مفہوم کی دوسری روایات پر محدثانہ حیثیت سے تو انشاء اللہ ہم بعد میں بات کریں گے، فی الحال قارئین کی توجہ اس طرف دلانا چاہتے ہیں کہ اس طرح کی روایات مستند تاریخی حوالہ جات کے خلاف ہونے کے علاوہ عقلی طور پر بھی ناقابلِ تسلیم ہیں، کیونکہ چھ سال کی بچی اگر سکول میں پڑھ رہی ہو تو دوسری جماعت کی طالبہ ہوتی ہے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ اس عمر کی معصوم اور ننھی منی بچی کے ساتھ شادی کے بارے میں کوئی سوچ بھی سکتا ہے---؟

پھر جن حالات میں حضرت خولہ نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے اس رشتے کی تجویز پیش کی تھی، ان کو مدِنظر رکھتے ہوئے تو یہ بات قطعی ناممکن ہو جاتی ہے، کیونکہ حضرت خدیجہ کی وفات سے رسول اللہ ﷺ کا گھریلو نظام خاصا درہم برہم تھا۔ دو

---

(۱) صحیح بخاری، ج ۲، کتاب النکاح، ص ۷۷۱.

بیٹیاں یعنی حضرت زینب اور حضرت رقیہ تو بیاہی جا چکی تھیں مگر حضرت اُمّ کلثوم اور حضرت فاطمہ ابھی بچیاں تھیں جن کی نگہداشت اور تعلیم و تربیت کی اشد ضرورت تھی۔ علاوہ ازیں خود رسول اللہ ﷺ کو کسی ایسی مونس و غمخوار ہستی کی ضرورت تھی جو آپ کی تنہائیوں کا ازالہ کر سکے اور دکھ درد بٹا سکے۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے حضرت خولہ نے آپ سے کہا تھا کہ آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے؟

فرمایا---"کس سے؟"

خولہ نے کہا---"بیوہ بھی ہے اور کنواری بھی۔"

فرمایا---"بیوہ کون اور کنواری کون؟"

خولہ نے کہا---"بیوہ، سودہ بنتِ زمعہ اور کنواری، ابوبکر کی بیٹی عائشہ۔"

فرمایا---"دونوں کے لئے پیغام دے دو۔"(۱)

اب سوال یہ ہے کہ اگر حضرت عائشہ اس وقت رخصتی کے قابل نہ ہوتیں تو حضرت خولہ ان کے ساتھ شادی کی پیشکش ہی کیوں کرتیں؟ ظاہر ہے کہ محض نکاح کر لینے سے تو نہ رسول اللہ ﷺ کی بیٹیوں کی دیکھ بھال ہو سکتی تھی، نہ آپ کی تنہائیوں کا مداوا۔ فرض کیجئے کہ رسول اللہ ﷺ حضرت سودہ کا رشتہ مسترد کر دیتے اور صرف حضرت عائشہ سے شادی کی پیشکش کو منظور فرماتے تو پھر کیا ہوتا؟ کیا حضرت عائشہ کی رخصتی ہو جاتی؟ اگر جواب نفی میں ہے تو پھر اس پیشکش کا فائدہ؟ اور اگر جواب اثبات میں ہے تو کیا چھ سالہ بچیوں کی بھی کبھی رخصتی ہوئی ہے؟ اور کیا اس عمر کی بچی اپنی عمر سے بڑی سوتیلی بیٹیوں کی دیکھ بھال اور نگہداشت کی ذمہ داری نبھا سکتی ہے؟ اگر نہیں، اور یقیناً نہیں تو پھر دو اور دو چار کی طرح واضح ہے کہ اس وقت حضرت عائشہ اس عمر کو پہنچ چکی تھیں جس میں لڑکی کی رخصتی بھی ہو سکتی ہے اور وہ خانگی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے علاوہ شوہر کی تنہائیوں کی رفیق بھی بن سکتی ہے، اور یہ تبھی ہو سکتا ہے کہ اس وقت حضرت عائشہ کی عمر کم از کم سولہ سال ہو اور یہی

---

(۱) ابنِ ہشام، ج ۱، ص ۱۱۹، ۱۲۰۔

ہمارا مدعا ہے۔

ایک اور پہلو سے غور کیجئے!

اگر حضرت عائشہ اس وقت رخصتی کے قابل نہ ہوتیں تو حضرت خولہ کی پیشکش کے کے جواب میں رسول اللہ ﷺ کو یہ کہنا چاہئے تھا کہ عائشہ تو ابھی بچی ہے اور اس کی رخصتی کے لئے مجھے کئی سال تک انتظار کرنا پڑے گا؛ جبکہ میرے خانگی معاملات جلد سے جلد شادی کا تقاضا کرتے ہیں اس لئے عائشہ کو فی الحال چھوڑ و اور سودہ کے لئے میرا پیغام لے جاؤ! مگر آپ نے یہ نہیں فرمایا؛ بلکہ دونوں کے لئے پیغام لے جانے کا کہا۔ اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ شادی خواہ سودہؓ سے ہوتی یا عائشہؓ سے، دونوں صورتوں میں آپ کی تنہائی کا مسئلہ حل ہوسکتا تھا اور گھریلو پریشانیاں دور ہوسکتی تھیں، اور یہ تبھی ممکن تھا کہ اس وقت حضرت عائشہؓ بھی حضرت سودہؓ کی طرح تمام خانگی ذمہ داریاں نبھانے کی اہل ہوتیں۔ ظاہر ہے کہ چھ سالہ بچی ان کاموں کی اہلیت قطعاً نہیں رکھتی۔ ہاں، سولہ سال کی لڑکی عاقل و بالغ ہوتی ہے اور گھر بار کی دیکھ بھال کے علاوہ خاوند کی ہمدم و دمساز بھی بن سکتی ہے اور یہی مطلوب ہے۔

ایک لمحے کے لئے فرض کر لیجئے کہ نظامِ فطرت اور قانونِ قدرت کے برعکس حضرت عائشہؓ نو سال میں ہی بالغ ہوگئی تھیں تو کہاں چھ سال اور کہاں نو سال۔ اگر حضرت سودہؓ کا باپ زمعہ رشتہ نہ دیتا تو کیا رسول اللہ ﷺ حضرت عائشہؓ سے چھ سال کی عمر میں نکاح کرکے مزید تین سال تک ان کے جوان ہونے کا انتظار کرتے رہتے اور اپنی نوخیز بچیوں کے سلسلے میں فکرمند و پریشان ہوتے رہتے؟ ظاہر ہے کہ آپ کے حالات اس قدر تاخیر اور انتظار کی اجازت نہیں دیتے تھے، اس لئے ماننا پڑے گا کہ حضرت سودہؓ کے ساتھ رشتہ نہ ہوتا تب بھی آپ پر کچھ فرق نہیں پڑتا تھا اور یہ تبھی ہوسکتا تھا کہ حضرت عائشہؓ اس وقت رخصتی کے قابل ہوتیں اور اگر زمعہ انکار کر دیتا تو حضرت سودہؓ کی جگہ حضرت عائشہؓ، کاشانۂ نبوت میں جلوہ گر ہو جاتیں اور تمام معاملات سنبھال لیتیں۔

کس قدر صاف اور واضح بات ہے جو روایات کے انبار تلے دب کر نہ صرف نظروں سے اوجھل ہوگئی ہے؛ بلکہ عقل و شعور کی رسائی سے بھی باہر نکل گئی ہے۔ رَبِّ ارْحَمْ!

یہ گفتگو تو ہوئی عمر بوقت نکاح کے بارے میں ۔اب ذرا رخصتی کی عمر کا جائزہ لیجئے !

روایات کے مطابق اس وقت حضرت عائشہؓ کی عمر نو سال تھی ۔اگر بچی سکول پڑھ رہی ہو تو اس عمر میں چوتھی یا پانچویں کی طالبہ ہوتی ہے۔آپ ہی بتایئے قارئین کرام! کہ کیا یہ عمر رخصتی اور ازدواجی تعلقات قائم کرنے کی ہوتی ہے!!؟ اللہ بچائے ایسے بیہودہ خیالوں اور لغو سوچوں سے!

اس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ عرب کا خطہ بہت گرم ہے اور گرم علاقے کی لڑکیاں جلدی جوان ہو جاتی ہیں اس لئے حضرت عائشہؓ نو سال کی عمر میں ہی بالغ اور رخصتی کے قابل ہو گئی تھیں ۔(۱)

نیز عربوں میں چھوٹی عمر کی لڑکیوں سے شادی کرنے کا عام رواج تھا اس لئے اُس معاشرے میں یہ کوئی معیوب بات نہیں تھی۔

رسول اللہ ﷺ کی چہیتی زوجہ مطہرہ اور تمام مؤمنین کی حقیقی ماؤں سے ہزار درجہ زیادہ محترم مادرِ مہرباں کے بارے میں ایسی باتیں لکھتے ہوئے مجھے سخت حجاب اور شرمندگی محسوس ہو رہی ہے--- یقیناً قارئین کی بھی یہی کیفیت ہو گی---مگر واہیات راویوں نے اس معاملے میں جو گند گھول رکھا ہے، اس کو صاف کرنے کے لئے یہ سب کچھ ناگزیر ہے۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ عرب گرم ملک ہے اور گرم ممالک میں لڑکیاں جلدی جوان ہو جاتی ہیں تو عرض یہ ہے کہ عرب کی یہ گرمی صرف حضرت عائشہؓ ہی پر کیوں اثر انداز ہوئی، رسول اللہ ﷺ کی اپنی بیٹیوں پر اس کا کوئی اثر کیوں نہ ظاہر ہوا؟

سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں۔

---

(۱) چنانچہ سید سلیمان ندوی، اتنی چھوٹی عمر میں نکاح اور شادی پر اعتراض کرنے والے کو جواب دیتے ہوئے رقمطراز ہیں

””معترض یورپ کی سرد آب و ہوا پر عرب کی گرم آب و ہوا کا قیاس کر رہا ہے (حالانکہ) ٹھنڈے ملکوں میں بلوغ کی عمر بہت دیر کو آتی ہے اور گرم ملکوں میں بہت جلد آ جاتی ہے۔“ (سیرت عائشہ، ص ۲۶۹.)

''حضرت عائشہؓ کی رخصتی کے وقت حضرت فاطمہؓ گو کنواری تھیں لیکن ان سے عمر میں پانچ چھ برس بڑی تھیں۔''(۱)

حضرت عائشہؓ کی نو سال کی عمر میں رخصتی کے وقت اگر حضرت فاطمہؓ ان سے پانچ سال بڑی تھیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت فاطمہؓ کی عمر اس وقت چودہ پندرہ سال ہوگی۔ اگر گرم ممالک کے فارمولے کے مطابق حضرت فاطمہؓ نو سال میں جوان ہوگئی تھیں تو رسول اللہ ﷺ نے ان کو پانچ چھ سال گھر میں کیوں بٹھائے رکھا اور ان کے ہاتھ پیلے کرنے کی کوئی تدبیر کیوں نہ کی؟ جب بالآخر ان کی شادی حضرت علیؓ ہی سے کرنی تھی تو نو دس سال کی عمر میں ہی کر دینی چاہئے تھی کیونکہ حضرت علیؓ بالاتفاق مکہ میں ہی جوان اور بالغ ہو چکے تھے۔ اس صورت میں حضرت فاطمہؓ کی شادی ہجرت سے پہلے ہو جانی چاہئے تھی، پھر آپ نے کیوں ان کو کئی سال تک گھر بٹھائے رکھا اور دو ہجری میں کہیں جا کر ان کی شادی کی---؟؟ یہی سوال حضرت اُمّ کلثوم کے بارے میں پیدا ہوگا، کیونکہ وہ حضرت فاطمہ سے بڑی تھیں اور مؤرخین کے مطابق ان کا نکاح عتیبہ سے ہو چکا تھا مگر اس نے مذہبی اختلاف کی وجہ سے باپ کے کہنے پر رخصتی سے پہلے ہی طلاق دے دی تھی۔ سوال یہ ہے کہ طلاق سے پہلے رخصتی سے کیا چیز مانع تھی؟ اور طلاق کے بعد ان کی شادی میں رسول اللہ ﷺ نے اتنی دیر کیوں کی؟ ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بیٹی کے لئے رشتوں کی کوئی کمی نہیں ہو سکتی تھی۔ ان کے متعدد جوان چچا زاد اور پھوپھی زاد مکہ میں موجود تھے۔ پھر آپ نے ہجرت سے پہلے ہی ان کی رخصتی کا انتظام کیوں نہ کیا؟(۲)

---

(۱) سیرت عائشہ ص ۷۱۔

(۲) اگر کہا جائے کہ ہوسکتا ہے حضرت فاطمہ کا، اور طلاق کے بعد حضرت اُمّ کلثوم کا کوئی رشتہ آیا ہی نہ ہو اس لئے ان کی شادی میں تاخیر ہوتی رہی ہو، تو سوال یہ پیدا ہوگا کہ آخر اتنے عرصے تک رشتے نہ آنے کی وجہ کیا تھی؟ کیا لڑکیوں کے حسب نسب میں معاذ اللہ کوئی کمی تھی یا خوبصورت اور خوش اطوار نہیں تھیں؟ ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں قطعاً غلط اور خلافِ واقعہ ہیں اس لئے رشتے نہ آنے کی یہی وجہ ☜

پھر یہ بات بھی واضح نہیں کہ عرب کی گرم آب و ہوا کیا لڑکیوں کو ہی جلد بالغ کر دیتی تھی یا لڑکے بھی قبل از وقت جوان ہو جایا کرتے تھے؟ حضرت عائشہؓ کو نو سال کی عمر میں بالغ قرار دینے والے اگر کسی ایسے عربی لڑکے کی بھی نشاندہی کر دیں جو عرب کے گرم موسم کی وجہ سے نو سال کی عمر میں جوان ہو گیا ہو تو ہمیں بے حد خوشی ہو گی۔

اس چیز کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ عرب کی گرمی اُسی دور میں لڑکیوں پر اثر انداز ہوا کرتی تھی یا آج کل بھی عرب میں نو سال کی بچیاں جوان ہو رہی ہیں اور بیاہی جا رہی ہیں؟ عجم کے بے شمار لوگ مزدوری اور کاروبار وغیرہ کے لئے عرب ممالک میں مقیم ہیں، ذرا ان سے پوچھئے کہ وہاں انہوں نے کبھی نو سالہ بچی کی رخصتی ہوتے دیکھی ہے؟!

خلاصۂ کلام یہ ہے قارئین کرام! کہ گرم آب و ہوا سے لڑکیوں کا جلد جوان ہو جانا روزمرہ کے مشاہدے کے خلاف اور سراسر غلط خیال ہے اس لئے چھ سال میں نکاح اور نو سال میں رخصتی والی روایت عقلاً اور درایۃً ناقابل تسلیم ہے۔ وھذا ھو المقصود۔

ماننی پڑے گی کہ وہ چھوٹی تھیں اور ابھی شادی کی عمر کو نہیں پہنچی تھیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ محض نو سال کی عمر میں رخصتیاں نہیں ہوا کرتی تھیں اور بالخصوص حضرت صدیقؓ اور رسول اللہ ﷺ کے خاندانوں میں تو لڑکیوں کے جوان ہونے کے بعد بھی متصلاً شادی کا رواج نہیں تھا؛ بلکہ لڑکی کے مزید سنجیدہ اور باشعور ہونے کا انتظار کیا جاتا تھا۔ چنانچہ حضرت عائشہ کی بڑی بہن حضرت اسماء کی شادی ہجرت سے چند ہی سال قبل ہوئی تھی اور ہجرت کے وقت ان کی عمر بالاتفاق ستائیس سال تھی، اسی طرح حضرت زینب جو رسول اللہ ﷺ کی پھوپھی زاد تھیں اور آپ ہی کے زیرِ سرپرستی تھیں۔ ان کی پہلی شادی جب آپ نے حضرت زید کے ساتھ کرائی تو اس وقت ان کی عمر ۳۴ سال تھی۔ پھر اس مہمل بات کی کیا وقعت رہ جاتی ہے کہ عرب میں چھوٹی عمر کی لڑکیوں کے ساتھ شادی کرنے کا رواج عام تھا اور اس معاشرے میں یہ کوئی معیوب بات نہ تھی!!

یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ حضرت عائشہؓ کی نو سال میں رخصتی کے قائل علماء، فضلاء اور صلحاء خود اس سنت پر عمل کیوں نہیں کرتے اور اپنی بیٹیوں کو نو سال کی عمر میں کیوں نہیں بیاہتے ---!؟

اب آیئے اس روایت کا محدثانہ نقطۂ نظر سے جائزہ لیتے ہیں۔

یوں تو یہ روایت، حدیث کی تقریباً تمام کتابوں میں پائی جاتی ہے لیکن ہم صرف صحیح بخاری، صحیح مسلم اور سنن ابی داؤد کی روایات پر گفتگو کریں گے کیونکہ باقی کتب کی روایتوں میں متعدد راوی بہت ہی کمزور اور مجروح ہیں؛ البتہ مندرجہ بالا تین کتب کی روایات نسبتاً بہتر ہیں اس لئے ہم انہی کا تجزیہ پیش کر رہے ہیں۔

اس مفہوم کی روایات بخاری میں پانچ (۱) مسلم میں چار (۲) اور ابو داؤد میں ایک ہے (۳) بظاہر یہ دس روایتیں نظر آتی ہیں مگر حقیقت میں یہ صرف تین ہیں کیونکہ بخاری کی پانچ، مسلم کی دو اور ابوداؤد کی ایک روایت، یہ آٹھوں ایک ہی راوی سے مروی ہیں، یعنی ہشام سے۔ وہ عروہ سے روایت کرتے ہیں اور عروہ حضرت عائشہ سے؛ جبکہ مسلم کی باقی دو روایات میں سے ایک میں زہری، عروہ سے اور عروہ حضرت عائشہ سے راوی ہیں؛ جبکہ دوسری میں ابراہیم، اسود سے اور اسود، حضرت عائشہ سے روایت کرتے ہیں۔

ان روایات میں وہ تمام روایتیں جن کے راوی ہشام ہیں، سرے سے ناقابل اعتبار ہیں کیونکہ ''حقیقت یا فسانہ؟'' میں ہم پوری تفصیل سے واضح کر آئے ہیں کہ ہشام کو

---

(۱) حوالے کے لئے ان مقامات کا مطالعہ کیجئے!

[ا] صحیح بخاری، ج ۱، کتاب المناقب، باب تزویج النبی ﷺ عائشة، ص ۵۵۱. (اس باب میں دو روایتیں ہیں۔)

[ب] صحیح بخاری، ج ۲، کتاب النکاح، باب انکاح الرجل ولده الصغار، ص ۷۷۱.

[ج] صحیح بخاری، ج ۲، کتاب النکاح، باب تزویج الرجل بنته من الامام، ص ۷۷۱.

[د] صحیح بخاری، ج ۲، کتاب النکاح، باب من بنی بأمراة وهی بنت تسع، ص ۷۷۵.

(۲) مسلم میں چاروں روایات یکجا ہیں۔ صحیح مسلم، ج ۱، کتاب النکاح، باب جواز تزویج الاب البکر الصغیرة، ص ۴۵۶.

(۳) ابو داؤد، ج ۱، کتاب النکاح، باب فی تزویج الصغار، ص ۲۸۹.

امام مالک اگرچہ صاف لفظوں میں ''کذاب'' کہتے ہیں لیکن دیگر محدثین ان کو ثقہ اور نہایت قوی راوی شمار کرتے ہیں؛ تاہم اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ آخر عمر میں ان کو کسی قدر نسیان اور وہم کا عارضہ لاحق ہوگیا تھا۔ تفصیل کے لئے سیدالوریٰ کی اِسی جلد کا باب ۱۱ ''حقیقت یا فسانہ؟'' کا مطالعہ کیجئے۔ ربط کے لئے ہم یہاں پر ایک حوالے کا اعادہ کررہے ہیں۔ علامہ ذہبی ہشام کے بارے میں لکھتے ہیں۔

اَحَدُالَا عْلَامِ، حُجَّةٌ اِمَامٌ، لٰكِنْ فِیُ الْكِبَرِ تَنَاقَصَ حِفْظُه‘...... وَلَمْ يَبْقَ حِفْظُه‘ كَهُوَ فِیُ حَالِ الشَّبَابِ، فَنَسِيَ بَعْضَ مَحْفُوْظِهٖ اَوْ وَهَمَ. (مختصراً) (۱)

(بڑے علماء میں سے ایک ہیں، حجت اور امام ہیں، لیکن بڑھاپے میں ان کا حافظہ کم ہوگیا تھا اور ویسا نہیں رہا تھا جیسا جوانی میں ہوا کرتا تھا، اس لئے اپنے حافظے میں محفوظ بعض چیزوں کو بھول جاتے تھے یا ان کو وہم ہوجاتا تھا۔)

یاداشت کی تھوڑی بہت خرابی اور کسی حد تک وہم کا ہوجانا اگرچہ کوئی ایسی خامیاں نہیں ہیں کہ ان کی وجہ سے راوی کو بالکل ہی ناقابل اعتبار قرار دے دیا جائے مگر کسی کی عمر متعین کرنے کے سلسلے میں ہشام پر اس لئے اعتماد نہیں کیا جاسکتا کہ اس معاملے میں ان کا حافظہ کچھ زیادہ ہی خراب تھا اور حضرت عائشہ تو خیر ان سے بہت پہلے گزر چکی تھیں، ان کا حال تو یہ تھا کہ ان کو اپنی بیوی کی عمر بھی یاد نہیں رہتی تھی اور کبھی کچھ کہہ دیتے تھے، کبھی کچھ۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ

ہشام کی بیوی کا نام فاطمہ ہے اور یہ بھی بہت اونچے درجے کی محدثہ ہیں۔ علم حدیث میں فاطمہ کی عظمت کا یہ عالم ہے کہ خود ہشام ان کے شاگرد ہیں اور ان سے روایت اخذ کرتے ہیں۔ مثلاً یہ سند ملاحظہ فرمایئے!

حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ ابْنُ حَرْبٍ، قَالَ حَدَّثَنَا حَمَّاد بْنُ زَيْدٍ، عَنْ هِشَامٍ، عَنْ فَاطِمَةَ، عَنْ اَسْمَاءَ، عَنِ النَّبِيِ صلی اللہ علیہ وسلم..... (۲)

---

(۱) میزان الاعتدال، ج ۳، ص ۲۵۵.

(۲) صحیح بخاری، ج ۲، باب المتشبع بمالم ینل، ص ۷۸۵.

(حدیث بیان کی ہم سے سلیمان ابن حرب نے، اس نے کہا حدیث بیان کی ہم سے حماد ابن زید نے، **ھشام سے، اس نے فاطمه سے**، اس نے اسماء سے، انہوں نے نبی ﷺ سے............

بخاری کی اس روایت میں ہشام، فاطمہ سے روایت کرتے ہیں اور یہ وہی فاطمہ بنت منذر ہیں جو ان کی بیوی ہیں۔ اس طرح فاطمہ، بیوی ہونے کے علاوہ ہشام کی استانی بھی ہیں۔ اب اتنی بڑی محدثہ کے شاگرد ایک ہشام ہی تو نہیں ہوں گے، ظاہر ہے کہ اور بھی کئی ہوں گے مگر ہشام اس بات کو نہیں مانتے تھے اور یہ سن کر ہی ان کا پارہ چڑھ جاتا تھا۔ چنانچہ ہشام ہی کے ہم زمان ایک مشہور مؤرخ و محدث ہوئے ہیں **محمد ابن اسحاق**. یہ بھی اس بات کے دعویدار تھے کہ میں فاطمہ کا شاگرد ہوں اور میں نے اس سے حدیث سنی ہے۔ ہشام کو اس بات کا پتہ چلا تو انہیں سخت غصہ آیا اور محمد ابن اسحاق کے بارے میں کہا۔

عَدُوُّ اللهِ الْكَذَّابُ، يَرْوِيْ عَنْ اِمْرَأَتِيْ، اَيْنَ رَآهَا؟ وَلَقَدْ دَخَلْتُ بِهَا وَهِيَ بِنْتُ تِسْعِ سِنِيْنَ وَمَارَاٰهَا مَخْلُوْقٌ حَتّٰى وَصَلَتْ بِاللهِ عَزَّوَجَل. (۱)

(اللہ کا دشمن، پرلے درجے کا جھوٹا، میری بیوی سے روایت کرتا ہے، اس نے میری بیوی کو کہاں دیکھا تھا!؟ حالانکہ جب میں نے اس کے ساتھ شادی کی تھی تو وہ نو سال کی تھی اور اس کے بعد اس کو کسی مخلوق نے نہیں دیکھا یہاں تک کہ وہ اللہ سے جا ملی۔)

اللہ اکبر! حضرت عائشہ کی رخصتی نو سال میں کراتے کراتے نوبت یہاں تک پہنچی اور ''نو'' کا عدد ہشام کے ذہن پر اس حد تک مسلط ہوا کہ انہوں نے اپنی بیوی کی رخصتی بھی نو سال میں کرا ڈالی---!!

چلیں، کوئی بات نہیں، ہشام کو اگر ''نو سال'' اتنے ہی پسند ہیں تو یونہی سہی، مگر انتہائی حیرت کی بات یہ ہے کہ ایک دوسری روایت میں ہشام بتاتے ہیں کہ میری بیوی مجھ سے بڑی تھی۔

قَالَ هِشَامُ ابْنُ عُرْوَةَ: كَانَتْ اَكْبَرَ مِنِّيْ بِثَلَاثِ عَشَرَسَنَةً. (۲)

---

(۱) تاریخ بغداد ج ۱، ص ۲۲۳۔

(۲) تهذیب التهذیب لابن حجر، ذکر فاطمه بنت منذر، ج ۱۲.

(ہشام ابن عروہ نے کہا کہ میری بیوی مجھ سے تیرہ سال بڑی تھی۔)

واہ جی ہشام صاحب، زندہ باد! کیا کہنے ہیں آپ کے---!! آپ نے ایک ایسی عورت سے جو عمر میں آپ سے تیرہ سال بڑی تھی، اس وقت شادی کر لی جب اس کی عمر نو سال تھی۔ گویا اپنی پیدائش سے بھی چار سال پہلے آپ شادی کر چکے تھے---!! سبحان اللہ!

اُمّ المؤمنین عائشہ صدیقہ بنتِ صدیق وزوجۂ سیدالمرسلینؐ کی نو سال میں رخصتی کرانے والی روایت تیار کرنے کی آپ کو یہ سزا ملی ہے کہ آپ ایسی باتیں کرنے لگ گئے ہیں جنہیں پڑھ کر سر پیٹ لینے کو جی چاہتا ہے۔

قارئین کرام! آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اپنی بیوی کی عمر کے بارے میں ہشام کے دو بالکل ہی متضاد بیانات ہیں۔ کون سا صحیح ہے اور کون سا غلط، یا دونوں ہی غلط ہیں، ہمیں اس سے غرض نہیں۔ ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جس شخص کا حافظہ عمروں کے معاملے میں اس حد تک خراب ہو کہ اس کو اپنی بیوی کی صحیح عمر یاد نہ رہتی ہو اور کبھی اس سے بڑا بن کر اس سے نو سال کی عمر میں شادی کرتا ہو، کبھی اس کو اپنے سے تیرہ سال بڑی بنا دیتا ہو، اس کی روایت پر حضرت عائشہ کی عمر کے سلسلے میں کس طرح اعتماد کیا جا سکتا ہے اور کیونکر اس کو درست تسلیم کیا جا سکتا ہے؟!! لَاوَ اللہ، ہرگز نہیں۔

مندرجہ بالا دس روایتوں میں سے آٹھ تو ہشام کی وجہ سے باطل ٹھہریں، اب رہ گئیں مسلم کی دو روایتیں، تو ان کی صورت حال یہ ہے۔

مسلم کی پہلی روایت کی سند اس طرح ہے۔

حَدَّثَنَا عَبْدُابْنُ حُمَيْدٍ، قَالَ حَدَّثَنَا عَبْدُالرَّزَّاقِ، قَالَ حَدَّثَنَا مَعْمَرٌ، عَنِ الزُّهْرِيْ عَنْ عُرْوَةَ عَنْ عَائِشَةَ رضی اللہ تعالیٰ عنھا........(۱)

(حدیث بیان کی ہم سے عبدابن حمید نے، اس نے کہا حدیث بیان کی ہم سے

---

(۱) صحیح مسلم ج ۱، کتاب النکاح، باب جواز تزویج الاب البکر الصغیرۃ، ص ۲۸۹.

عبدالرزاق نے، اس نے کہا حدیث بیان کی ہم سے معمر نے، اس نے زہری سے، اس نے عروہ سے، اس نے عائشہؓ سے ......)

اس روایت میں زہری، عروہ سے راوی ہیں اور محدثین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ زہری نے عروہ سے کچھ نہیں سنا۔

وَ قَدْ ذَکَرَ ابْنُ اَبِیْ حَاتِمٍ اِتِّفَاقَ الْمُحَدِّثِیْنَ عَلٰی عَدَمِ سِمَاعِ الزُّهْرِیْ عَنْ عُرْوَةَ. (۱)

(ابن ابی حاتم نے ذکر کیا ہے کہ محدثین اس پر متفق ہیں کہ زہری نے عروہ سے کچھ نہیں سنا۔)

جب زہری کا عروہ سے سماع ہی ثابت نہیں ہے تو پھر درج بالا روایت کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے؟ معلوم نہیں زہری نے کس سے یہ کہانی سنی اور بطورِ تدلیس عروہ کے ذمے لگا دی؟ جب تک درمیان والے راوی کا پتہ نہ چلے یہ روایت منقطع ہے اور نا قابلِ استدلال۔

اسی سند کے ایک اور راوی ہیں عبدالرزاق۔ ان کو اگرچہ بہت سے محدثین نے قابلِ اعتماد اور ثقہ قرار دیا ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی اعتراف کیا ہے کہ یہ شیعہ تھے۔

محترم قارئین!

یہاں ذرا ٹھہر جایئے اور پہلے سنی و شیعہ راویوں کے بارے میں ایک بے لاگ اور غیر جانبدارانہ تجزیہ پڑھ لیجئے تاکہ ہماری آئندہ گفتگو سے آپ بلا اِمتیازِ مسلک و مذہب فائدہ اُٹھا سکیں۔

واضح رہے کہ راوی کے سچا یا جھوٹا ہونے کا اس کے مسلک اور مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ بہت سے سنی راوی ہیں جن کو سنی اسماء الرجال والوں نے جھوٹا قرار دیا ہے اور متعدد شیعہ راویوں کو سچا کہا ہے۔ اسی طرح بہت سے شیعہ راوی ہیں جن کو شیعہ اسماء الرجال والوں نے کذاب کہا ہے اور کئی سنی راویوں کو صادق اور معتبر مانا ہے۔ سنی اسماء الرجال میں کچھ راویوں کے بارے میں لکھا ہوتا ہے کہ یہ بہت بڑے عالم اور حافظ الحدیث تھے عَلٰی

(۱) امانی الاحبار شرح معانی الآثار، ج ۱، ص ۳۴۵.

تَشَيُّعٍ فِيْهِ باوجودیکہ کسی قدر شیعہ تھے۔ اسی طرح شیعہ اسماء الرجال میں بعض راویوں کے متعلق مرقوم ہوتا ہے کہ یہ ثقہ اور صادق تھے عَلٰى نَصُبٍ فِيْهِ باوجودیکہ کسی حد تک ناصبی، یعنی سنی تھے۔ غرضیکہ سچا یا جھوٹا ہونے کا، سنی یا شیعہ ہونے سے کوئی تعلق نہیں۔ سنی راوی بھی سچا اور جھوٹا ہوسکتا ہے اور شیعہ راوی بھی۔ اسی لئے سنی محدثین نے بہت سے شیعہ راویوں کی اور شیعہ محدثین نے متعدد سنی راویوں کی روایات قبول کی ہیں اور اپنی صحیح ترین کتابوں میں درج کی ہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے احتیاط پسندی کوملحوظ رکھتے ہوئے یہ قاعدہ بھی بیان کیا ہے کہ اگر کسی راوی کی کوئی روایت ایسی ہو جو اس کے نظریئے کی تائید کرتی ہو اور فریقِ ثانی کے عقیدے پر اس کی زد پڑتی ہو تو وہ روایت مردود و باطل ہے۔

مثال کے طور پر خلفائے ثلاثہ، ابوبکرؓ وعمرؓ وعثمانؓ کا معاملہ لے لیں۔ شیعہ حضرات چونکہ عقیدۂ امامت کے قائل ہیں اور یہ تینوں خلفاء ان کے خیال میں امام برحق، یعنی حضرت علیؓ کی امامت ظاہرہ میں رکاوٹیں ڈالتے رہے ہیں اس لئے ان کی توہین وتحقیر اور ان سے براءت و بیزاری کا اظہار ان کے عقیدے کا لازمی جزو ہے، جبکہ سنی حضرات خلافت راشدہ کا نظریہ رکھتے ہیں اور ان کے نزدیک چاروں خلفاء کی تعظیم وتقدیس اور ان سے محبت وعقیدت صحت عقیدہ کے لئے ضروری شرط ہے۔

اب اگر کوئی سنی راوی خلفاء ثلثہ کی منقبت وفضیلت بیان کرے تو اس کی وہ روایت شیعہ علماء کے نزدیک مردود ہوگی --- خواہ وہ انہی کی کتابوں میں کیوں نہ موجود ہو۔

اسی طرح اگر کسی شیعہ راوی کی روایت سے خلفاء ثلثہ یا دیگر صحابہ کرام کی تنقیص و تذلیل کا پہلو نکلتا ہو تو وہ روایت سنی علماء کے نزدیک باطل ہوگی --- خواہ وہ سنیوں ہی کی کسی کتاب میں کیوں نہ پائی جاتی ہو۔

یہ اصول وضوابط ہر اس شخص پر روشن ہیں جس نے دونوں فریقوں کی کتب حدیث واسماء الرجال کا مطالعہ کر رکھا ہو۔ (۱)

---

(۱) یہ تمام امور چونکہ فریقین کے علماء میں طے شدہ ہیں اسلئے ان پر حوالے پیش کرنے سے سوائے طوالت کے کچھ حاصل نہیں تھا۔

ازواج مطہراتؓ کا معاملہ بھی خلفاء ثلاثہؓ ہی کی طرح ہے۔ یعنی سنی حضرات ان کی بہت زیادہ عظمت و پاکیزگی کے قائل ہیں؛ جبکہ شیعہ حضرات کے نزدیک ازواج کی اور خصوصاً حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ کی سرے سے کوئی عظمت و تقدیس ہی نہیں۔ عظمت و تقدیس کا نہ ہونا تو پھر بھی معمولی بات ہے، ان کے بارے میں تو شیعہ حضرات کا ذہن اس حد تک تلخ اور سخت ہے کہ شیعوں کی مستند کتاب حیات القلوب میں لکھا ہے۔

''عیاشی بسند معتبر از حضرت صادق روایت کردہ است کہ عائشہ و حفصہ آنحضرت رابزہر شہید کردند۔'' (۱)

(عیاشی نے معتبر سند کے ساتھ حضرت (امام جعفر) صادق سے روایت بیان کی ہے کہ عائشہ اور حفصہ نے آنحضرت (ﷺ) کو زہر دے کر شہید کیا تھا۔)

جب حفصہ و عائشہ سے نفرت کا یہ عالم ہو تو پھر آپ ہی بتایئے قارئین کرام کہ شیعہ راویوں کی وہ روایتیں جو ازواج مطہرات، خصوصاً حضرت عائشہ کے شایان شان نہ ہوں، ان پر کس طرح اعتماد کیا جا سکتا ہے اور کیونکر انہیں صحیح تسلیم کیا جا سکتا ہے---؟! ایسی صورت میں تو جس شخص میں ذرا سی بھی شیعیت پائی جاتی ہو، اس کی روایات بسلسلۂ حضرت عائشہؓ قطعی طور پر مسترد کر دینے کے قابل ہیں---خواہ یہ روایتیں سنیوں ہی کی معتبر کتابوں میں کیوں نہ پائی جاتی ہوں۔ جس طرح شیعوں کی کتابوں میں اگر بھولے سے کوئی روایت حضرت عائشہؓ کی فضیلت و منقبت والی آ جائے تو وہ شیعوں کے نزدیک مردود ہوتی ہے۔ یہ کوئی فرقہ وارانہ منافرت اور مذہبی تعصب کی بات نہیں؛ بلکہ نہایت ہی قرین قیاس اور عین عدل و انصاف ضابطہ ہے۔

سیدالوریٰ میں ہم شیعہ راویوں کی روایات کو اسی صورت میں مسترد اور ناقابلِ قبول قرار دیتے ہیں جب وہ سنی عقائد و نظریات سے متصادم ہوں یا ان کو صحیح ماننے سے سنی حضرات کی محترم شخصیات پر حرف آتا ہو، ورنہ دیگر معاملات میں سچے شیعہ راویوں کی روایتیں قبول کرنے میں ہم کوئی حرج نہیں سمجھتے۔

---

(۱) حیات القلوب ج ۲، ص ۸۷۰.

اس اصولی بحث کے بعد

آیئے دوبارہ اصل موضوع کی طرف چلتے ہیں۔

بات ہو رہی تھی عبدالرزاق کی کہ وہ شیعہ تھے، لیکن بعض محدثین کی رائے میں یہ ہلکے درجہ کے شیعہ تھے اور بہت زیادہ کٹر نہیں تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہم پھر بھی حضرت عائشہ کے بارے میں ان کی کسی روایت پر اعتماد کرنے کے لئے تیار نہیں تھے، مگر اسماء الرجال والوں نے ان سے متعلق جو چند واقعات لکھے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ عبدالرزاق پکے شیعہ تھے۔

مخلد شعیری بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ میں عبدالرزاق کی محفل میں بیٹھا تھا تو کسی نے حضرت معاویہؓ کا نام لے لیا۔ اس پر عبدالرزاق نے کہا

لَا تُقْذِرْ مَجْلِسَنَا بِذِكْرِ وَلَدِ اَبِیْ سُفْيَانَ.

(ابوسفیان کے بیٹے کا تذکرہ کر کے ہماری مجلس کو گندا نہ کر!)

اگر بات اسی حد تک رہتی تو ہم عبدالرزاق کو ہلکے درجے کا شیعہ ہی سمجھتے مگر معاملہ اس سے کچھ سوا ہے۔

علی ابن عبداللہ صنعانی بیان کرتے ہیں کہ زید ابن مبارک ہمہ وقت عبدالرزاق کے ساتھ رہتے تھے اور بہت کثرت سے ان کی روایتیں لیتے تھے۔ پھر ایک وقت آیا کہ زید نے ان کی صحبت ترک کر دی اور ان کی روایتوں پر مشتمل تمام کتابوں کو جلا ڈالا۔ لوگوں نے ان سے اس کی وجہ پوچھی تو انہوں نے بتایا کہ ایک دفعہ عبدالرزاق ہمارے سامنے ابن حدثان کی وہ حدیث بیان کر رہا تھا جس میں ذکر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وراثت سے حصہ طلب کرنے کے لئے عباسؓ اور علیؓ، عمرؓ کے پاس گئے تو عمر نے عباس سے کہا کہ تم اپنے بھتیجے کی وراثت سے حصہ لینے آئے ہو اور علی سے کہا تم وہ حصہ طلب کرنے آئے ہو جو تمہاری بیوی کو باپ کی طرف سے ملتا ہے......

زید نے بتایا کہ یہاں پہنچ کر عبدالرزاق رک گیا اور کہا

اُنْظُرْ اِلٰی هٰذَا الْاَفُوْکِ(۱)، يَقُوْلُ "مِنْ اِبْنِ اَخِيْکَ"...... "مِنْ اَبِيْهَا" لَا يَقُوْلُ رَسُوْلُ ﷺ

---

(۱) بعض نسخوں میں "الانوک" لکھا ہے یعنی "فاء" کی جگہ "نون" ہے۔ اس صورت میں اسکے معنی احمق کے ہوں گے۔

(ذرا دیکھو اس جھوٹے (یا احمق کو، یعنی حضرت عمرؓ کو) کبھی کہتا ہے "بھتیجے" کی وراثت اور کبھی کہتا ہے "بیوی کے باپ" کی وراثت، یہ نہیں کہتا کہ رسول اللہ کی وراثت۔) (۱)

زید کہتے ہیں کہ یہ بات سن کر میں اٹھ کر چلا آیا، پھر لوٹ کر نہیں گیا نہ اس سے کوئی روایت اخذ کی۔

اب جو شخص حضرت عمرؓ کو بے دھڑک "افوک" (کذاب) یا "انوک" (احمق) کہہ دے، کیا وہ معمولی درجے کا شیعہ ہو سکتا ہے؟ (۲)

اس پر مستزاد یہ کہ عبدالرزاق کا سچا ہونا بھی متنازعہ ہے۔ اگرچہ بہت سے محدثین نے ان کو سچا اور صدوق کہا ہے مگر عباس بن عبدالعظیم، جو خاص طور پر ان کے آبائی شہر صنعاء گئے تھے اور کافی عرصہ ان کے پاس رہے تھے، قسم اٹھا کر کہتے ہیں۔

---

(۱) واضح رہے کہ بات وراثت کی ہو رہی تھی اور عباسؓ و علیؓ محمد ﷺ کی وراثت سے حصہ اس بنا پر نہیں طلب کرتے تھے کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں؛ بلکہ حضرت عباسؓ اس بنا پر طلبگار تھے کہ محمد ﷺ ان کے بھتیجے تھے اور حضرت علیؓ اس وجہ سے اپنا استحقاق سمجھتے تھے کہ محمد ﷺ ان کی زوجہ کے باپ تھے۔ حضرت عمرؓ نے اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لئے بھتیجے اور بیوی کے باپ کہا تھا جو کہ موقع محل کی مناسبت سے بالکل صحیح اور درست تھا۔

(۲) عبدالرزاق سے کچھ ایسی باتیں بھی منقول ہیں جن سے ان کا سنی ہونا ثابت ہوتا ہے، مثلاً وہ کہتے ہیں کہ میں ابوبکر و عمر کو علی سے افضل سمجھتا ہوں لیکن معلوم ہونا چاہئے کہ پہلے وہ واقعی سنی ہی تھے، بعد میں شیعہ ہو گئے تھے۔ چنانچہ یحییٰ ابن معین بتاتے ہیں کہ میں نے عبدالرزاق سے ایسی گفتگو سنی جس سے اس کا شیعہ ہونا ظاہر ہوتا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ تیرے سارے استاد جن سے تو نے حدیث سیکھی ہے سنی تھے، پھر تو نے یہ شیعہ مذہب کس سے اخذ کر لیا؟ اس نے کہا کہ جعفر ابن سلیمان میرے پاس آئے تھے تو میں نے ان کو اچھی سیرت والا فاضل پایا؛ اسلئے میں نے بھی ان کا مسلک اختیار کر لیا۔

اس صورت میں ان کی وہ تمام باتیں جن سے ان کی سنیت ظاہر ہوتی ہے، اس دور کی ہوں گی جب انہوں نے شیعہ مذہب اختیار نہیں کیا تھا، ورنہ شیعیت کے بعد ابوبکرؓ و عمرؓ کو افضل سمجھنا کس طرح ممکن ہے؟

وَاللّٰہِ الَّذِیْ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ، اِنَّ عَبْدَالرَّزَاقِ کَذَّابٌ.

(اس اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں، عبدالرزاق انتہا درجے کا جھوٹا ہے۔)

یہ حال ہے قارئین کرام! صحیح مسلم کی اس روایت کا جس کے ایک راوی زہری ہیں اور دوسرے عبدالرزاق۔(۱)

اب مسلم کی دوسری روایت پر نظر ڈالتے ہیں جس میں چار راوی بیک وقت بیان کرتے ہیں کہ

حَدَّثَنَا اَبُوْمُعَاوِیَۃَ ، عَنِ الْاَعْمَشِ ، عَنْ اِبْرَاھِیْمَ، عَنِ الْاَسْوَدِ، عَنْ عَائِشَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھَا........(۲)

(حدیث بیان کی ہے ہم سے ابومعاویہ نے، اس نے اعمش سے، اس نے ابراہیم سے، اس نے اسود سے، اس نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے............)

ان میں سے پہلے دو راوی، یعنی ابومعاویہ اور اعمش، دونوں شیعہ تھے۔ اعمش کو سنی علماء تو ہلکے درجے کا شیعہ قرار دیتے ہیں ؛البتہ خود شیعہ علماء ان کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ معروف شیعہ محدث ان کے بارے میں لکھتے ہیں

ھُوَمَعْرُوْفٌ بِالْفَضْلِ وَالثِّقَۃِ وَالْجَلَالَۃِ وَالتَّشَیُّعِ.

(وہ اپنی فضیلت، اعتماد، عظمت شان اور شیعہ ہونے کے اعتبار سے مشہور ہیں۔)

بعض فقہی مسائل میں وہ فقہ جعفریہ سے اختلاف رکھتے تھے مگر فاضل مذکور کہتے ہیں کہ اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا

لَہٗ مَذْھَبٌ وَ رَأْیٌ خَاصٌّ فِی الْفِقْہِ لٰکِنْ بَعْدَ وُضُوْحِ تَشَیُّعِہٖ لَا یَضُرُّ. (۳)

---

(۱) عبدالرزاق کے درج بالا حالات میزان الاعتدال، ج۲، ص۱۲۸، ۱۲۹، سے ماخوذ ہیں۔

(۲) صحیح مسلم، ج ۱، کتاب النکاح، باب جواز تزویج الاب البکر الصغیرۃ، ص ۴۵۶.

(۳) منتھی المقال فی اسماء الرجال، ص ۱۵۷.

(فقہ میں ان کا مخصوص مذہب اور رائے ہے لیکن یہ واضح ہو جانے کے بعد کہ وہ شیعہ تھے، فقہی اختلاف مضر نہیں ہے۔)

بہر حال اعمش ہلکے درجے کے شیعہ ہوں یا اعلیٰ درجے کے، اصل مسئلہ یہ ہے کہ ابو معاویہ پکے شیعہ ہیں۔ علامہ ذہبی لکھتے ہیں

وَقَدِاشْتُهِرَ عَنْهُ الْغُلُوُّ، غُلُوُّ التَّشَيُّعِ.

(ان کا غالی ہونا مشہور ہے، یعنی شیعیت میں غالی ہونا۔)

پکا شیعہ ہونے کے علاوہ یہ ارجاء کا عقیدہ بھی رکھتے تھے اور مرجئہ میں سے تھے

قَالَ اَبُوْدَاؤد: كَانَ مُرجِئاً. (ابوداؤد نے کہا کہ مرجئہ تھے۔)

اور یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ حضرت الشیخ نے غنیۃ الطالبین میں مرجئہ کو گمراہ فرقوں میں شمار کیا ہے۔

اسی گمراہی کی وجہ سے مشہور محدث وکیع، ان کے جنازے میں شامل نہیں ہوئے تھے۔

يُقَالُ: اِنَّ وَكِيعًا لَمْ يَحْضُرْ جِنَازَتَه' لِلِارْجَاءِ. (۱)

(کہا جاتا ہے کہ وکیع ان کے جنازے میں اس لئے حاضر نہیں ہوئے تھے کہ وہ مرجئہ تھے۔)

یہ حال ہے میرے محترم قارئین!

ان روایتوں کا جن کے ذریعے حضرت عائشہ کا چھ سال میں نکاح اور نو سال میں رخصتی ثابت کی جاتی ہے۔ ہمارے خیال میں حضرت عائشہ کی توہین و تنقیص اور ان کو ناسمجھ بچی ثابت کرنے کے لئے یہ روایت بنیادی طور پر اسی طبقے کے کسی فرد نے وضع کی ہے جن کو حضرت عائشہ کی عظمت ایک آنکھ نہیں بھاتی اور ہشام کے کان میں عروہ کے حوالے سے ڈال دی۔ چونکہ ہشام نے آخر عمر میں یہ کام شروع کر دیا تھا کہ اگر ان سے کوئی شخص ان کے باپ عروہ کے حوالے سے روایت بیان کرتا تھا تو وہ اس شخص کو چھوڑ کر اپنی طرف سے وہی

---

(۱) میزان الاعتدال، ج ۳، ص ۳۹۸۔

روایت اپنے باپ سے بیان کرنے لگتے تھے۔ (۱) اس طرح یہ روایت بھی سحر کی روایت کی طرح حدیث کی معتبر ترین کتابوں میں داخل ہوگئی اور اتنی مشہور ہوئی کہ دیگر روایتیں اس کے مقابلے میں دب گئیں۔ عبدالرزاق، ابومعاویہ اور اعمش بھی ازواج مطہراتؓ کے بارے میں وہی ذہنیت رکھتے تھے اس لئے انہوں نے اپنے طور پر اس روایت کی سند جوڑی اور حضرت عائشہ تک پہنچادی۔ اس طرح ایک کے بجائے تین روایتیں بن گئیں اور یہ بات مسلّمات میں شمار ہونے لگی، مگر--- حقیقت پھر حقیقت ہے، نمایاں ہو ہی جاتی ہے۔

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰی ذٰلِکَ.

یہ تو اس صورت میں ہے کہ چھ اور نو سال والی روایت کو یکسر مسترد کر دیا جائے اور ہم اسی کے قائل ہیں؛ تاہم ہشام کے دفاع میں یہ توجیہہ ہوسکتی ہے کہ حضرت عائشہ نے ''سِتَّ عَشَرَۃَ'' اور ''تِسْعَ عَشَرَۃَ'' کہا ہو۔ یعنی سولہ سال اور انیس سال، ان کے بھانجے حضرت عروہ نے بھی ''سِتَّ عَشَرَۃَ'' اور ''تِسْعَ عَشَرَۃَ'' کہا ہو مگر ہشام کو چونکہ نسیان اور وہم کا عارضہ تھا، جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں، اس لئے ہوسکتا ہے کہ لفظ ''عَشَرَۃَ'' ان کو بھول گیا ہو اور انہوں نے سِتَّ اور تِسْعَ کہنا شروع کر دیا ہو، یعنی چھ اور نو سال، اور یوں ان کا نسیان یا وہم تاریخ کا حصہ بن گیا ہو۔ بہرحال جو صورت بھی ہو حقیقت یہی ہے کہ حضرت عائشہ کی عمر بوقتِ نکاح پندرہ سولہ سال اور رخصتی کے وقت اٹھارہ انیس سال تھی۔ یہی عقلِ سلیم کا تقاضا ہے اور یہی مہذب معاشروں کا دستور ہے۔

❀❀❀

اب آیئے ان تاریخی حقائق کا جائزہ لیتے ہیں جن سے ہمارا مدعا ثابت ہوتا ہے اور اس کا آغاز ہم حضرت عائشہ کی ولادت سے کرتے ہیں۔

حضرت عائشہ کی ولادت کب ہوئی---؟ اس کا صحیح طور پر تو تعین نہیں کیا جاسکتا؛ البتہ نو سال میں رخصتی والی روایت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اکثر مؤرخین نے پانچ نبوی قرار دی

---

(۱) تفصیل کے لئے باب ۱۱، حقیقت یا فسانہ؟ کا مطالعہ کیجئے!

ہے، یعنی اعلانِ نبوت کے پانچویں سال، کیونکہ ہجرت کے بعد پہلے ہی سال ان کی رخصتی عمل میں آ گئی تھی اور اعلانِ نبوت سے ہجرت کے پہلے سال تک چودہ برس بنتے ہیں۔ اگر اس وقت حضرت عائشہ کی عمر نو برس ہو تو چودہ سے نو نکال دینے کے بعد پانچ رہ جاتے ہیں اس لئے عام طور پر کہا جاتا ہے کہ وہ نبوت کے پانچویں سال میں پیدا ہوئیں، لیکن جیسا کہ ہم واضح کر چکے ہیں کہ چھ سال میں نکاح اور نو سال میں رخصتی والی روایت بخاری، مسلم میں موجود ہونے کے باوجود، نہ عقلی طور پر قابلِ تسلیم ہے، نہ نقلی طور پر، اسلئے ان کی عمر کے تعین کے لئے ہمیں دیگر مراجع وماخذ کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ اگر چہ وہ مراجع بھی صحیحین کی اس روایت سے اس قدر متاثر ہیں کہ حضرت عائشہ کے نکاح ورخصتی کے بارے میں وہی کچھ کہتے ہیں جو بخاری ومسلم کی روایات میں مذکور ہے؛ تاہم نکاح ورخصتی والے معاملے سے قطع نظر، ان کتابوں میں کچھ ایسے شواہد پائے جاتے ہیں جن سے حقیقت تک رسائی ہو سکتی ہے۔

مثلاً علامہ قسطلانی ان لوگوں کا تذکرہ کرتے ہوئے جو اعلانِ نبوت کے بعد بالکل ابتدائی دور میں مشرف باسلام ہوئے، لکھتے ہیں

قَالَ اِبْنُ سَعْدٍ : اَوَّلُ اِمْرَأَةٍ اَسْلَمَتْ بَعْدَ خَدِيْجَةَ، اُمُّ الْفَضْلِ زَوْجُ الْعَبَّاسِ وَ اَسْمَاءُ بِنْتُ اَبِىْ بَكْرٍ وَ اُخْتُهَا عَائِشَةُ.

(ابن سعد نے کہا ہے کہ خدیجہ کے بعد سب سے پہلے اسلام لانے والی خاتون اُمِ فضل، عباس کی اہلیہ ہیں اور ابو بکر کی بیٹی اسماء اور ان کی بہن عائشہ۔)

اس سے واضح ہے کہ حضرت عائشہؓ اعلانِ نبوت کے بعد ابتدائی دنوں میں ہی اسلام لے آئیں تھیں۔ اسلام لانے کے لئے ظاہر ہے کہ عقل وشعور ضروری ہے۔ اگر چہ حضرت عائشہؓ غیر معمولی طور پر ذہین بچی تھیں، پھر بھی پانچ، چھ سال کی عمر سے پہلے اسلام لانے کا شعور ناممکن سی بات ہے۔ اگر اپنی عمر کے پانچویں سال ہی وہ اسلام لائی ہوں تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ اعلانِ نبوت سے چار سال پہلے پیدا ہوئیں۔ اعلانِ نبوت کے بعد جانِ دو عالم ﷺ تیرہ سال تک مکہ میں رہے۔ تیرہ میں چار جمع کریں تو سترہ بنتے ہیں۔ اس طرح ہجرت سے پہلے ان کی عمر سترہ سال ہو چکی تھی۔ اٹھارہویں سال انہوں نے ہجرت کی، اس کے بعد دو

روایتیں ہیں۔ایک کے مطابق جس سال ہجرت کی اسی سال رخصتی ہوگئی اور دوسری کی رُو سے ہجرت کے دوسرے سال رخصتی عمل میں آئی۔ پہلی صورت میں اس وقت ان کی عمر اٹھارہ سال تھی اور دوسری صورت میں انیس سال۔ نکاح و رخصتی کا درمیانی وقفہ چونکہ بالاتفاق تقریباً تین سال ہے اس لئے نکاح کے وقت وہ علی الترتیب پندرہ یا سولہ سال کی تھیں۔

ابنِ سعد کے حوالے سے حضرت عائشہؓ کو اولین مسلمات میں شمار کرنے کے بعد علامہ قسطلانی لکھتے ہیں---کَذٰا قَالَ ابْنُ اِسْحَاق وَغَیْرُہ'. یعنی ابن اسحاق اور کچھ دیگر مؤرخین نے بھی اسی طرح بیان کیا ہے۔

ابنِ اسحاق بہت قدیم مؤرخ ہیں اور ہشام کے ہم زمان ہیں (۱) اس زمانے میں ہشام اور چند شیعہ راویوں کی تیار کردہ چھ اور نو سال والی روایت اتنی مشہور نہیں ہوئی تھی، نہ بخاری مسلم میں درج ہو کر مستند قرار پائی تھی، کیونکہ اس وقت تک بخاری مسلم کا وجود ہی نہیں تھا، اس لئے ابنِ اسحاق اور ان کے ہم عصر مؤرخین وہی کچھ بتاتے رہے جو حقیقت تھی مگر بعد میں جب ہشام والی روایت بخاری، مسلم اور حدیث کی دیگر کتابوں میں نفوذ کر کے معتبر و معتمد ہوگئی تو اس کے خلاف جانے والی ہر بات محدثین و مؤرخین کو غلط اور وہم نظر آنے لگی، چنانچہ علامہ قسطلانی ہی اس روایت کو رَدّ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں

وَھُوَ وَھُمٌ لِاَنَّ عَائِشَۃَ لَمْ تَکُنْ وُلِدَتْ بَعْدُ، فَکَیْفَ اَسْلَمَتْ؟ وَ کَانَ مَوْلِدُھَا سَنَۃَ اَرْبَعِ مِنَ النُّبُوَّۃِ. (۲)

یعنی ابنِ سعد، ابنِ اسحاق اور دیگر مؤرخین نے جو کچھ کہا ہے، محض وہم ہے، کیونکہ اس وقت تک عائشہ پیدا ہی نہیں ہوئی تھیں تو اسلام کیسے لے آئیں؟ ان کی ولادت تو نبوت کے چوتھے سال ہوئی تھی۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے، کہ ہشام کی روایت نے حقائق کو کس طرح مسخ کر دیا کہ جو

---

(۱) یہ وہی محمد ابنِ اسحاق ہیں جو ہشام کی بیوی فاطمہ سے حدیث سننے کا دعوٰی کرتے تھے تو ہشام طیش میں آجایا کرتے تھے۔

(۲) مواہب لدنیہ، ج ۱، ص ۴۶۔

وہم تھا، وہ حقیقت بن گئی اور جو حقیقت تھی، وہ وہم دکھائی دینے لگا۔

دیکھو تو چشمِ یار کی جادو نگاہیاں

بے ہوش اِک نظر میں ہوئی انجمن تمام

چلیں، چھوڑیں اس بات کو اور مان لیں کہ ابنِ اسحاق، ابنِ سعد اور دیگر مؤرخین کو اس سلسلے میں وہم ہو گیا تھا لیکن ابنِ کثیر---جن کی تفسیر ابنِ کثیر مشہور عالم ہے---کو وہمی قرار دینا از بس دشوار ہے کیونکہ تفسیر، حدیث اور تاریخ میں ان کا جو مقام و مرتبہ ہے، اس سے ہر صاحبِ علم آگاہ ہے۔ انہوں نے حضرت عائشہ کے نکاح و رخصتی کے بارے میں چھ اور نو سال والی روایت کے زیرِ اثر اگرچہ وہی کچھ لکھا ہے جو ہشام اور ان کے ہمنواؤں نے مشہور کر رکھا تھا مگر حضرت عائشہؓ کی بہن حضرت اسماءؓ کے بارے میں وہ ایک ایسی حقیقت سپردِ قلم کر گئے ہیں جس سے ہشام والی روایت از خود کالعدم اور باطل ہو جاتی ہے۔

علامہ ابنِ کثیر حضرت عبداللہ ابنِ زبیرؓ کے حالات بیان کرتے ہوئے ان کی والدہ حضرت اسماء کے بارے میں لکھتے ہیں

........وَهِيَ اَكْبَرُ مِنْ اُخْتِهَا عَائِشَةَ بِعَشَرِ سِنِيْنَ........ وَ بَلَغَتْ مِنَ الْعُمُرِ مِائَةَ سَنَة........وَمَاتَتْ سَنَةَ ثَلٰثٍ وَ سَبْعِيْنَ. (۱)

(وہ اپنی بہن عائشہ سے دس سال بڑی ہیں۔ انہوں نے سو سال عمر پائی اور تہتر ہجری میں فوت ہوئیں۔)

سو سے تہتر نکال دیں تو ستائیس باقی بچتے ہیں۔ گویا حضرت اسماءؓ ہجرت سے پہلے ستائیس سال کی ہو چکی تھیں اور وہ اپنی بہن حضرت عائشہؓ سے دس سال بڑی تھیں تو لازماً ماننا پڑے گا کہ حضرت عائشہؓ ہجرت سے پہلے سترہ سال کی ہو گئی تھیں۔ اٹھارہویں سال میں ہجرت کر کے مدینہ چلی گئیں اور اٹھارہ یا انیس سال کی عمر میں ان کی رخصتی عمل میں آئی---

(۱) البدایه والنهایه، ج ۸، ص ۳۴۶.

وھو المطلوب. (۱)

اس حساب سے وہ سترہ سال مکہ مکرمہ میں رہیں اور جانِ دو عالم ﷺ اعلان نبوت کے بعد تیرہ سال مکہ میں رہے۔ گویا وہ نبوت کے اعلان سے چار سال پہلے پیدا ہو چکی تھیں اور پانچ سال کی عمر میں اپنی بڑی بہن اسماءؓ کے ساتھ مشرف باسلام ہوئیں اور یہ مشرف باسلام ہونا بھی رسمی سی بات ہے ورنہ انہوں نے تو جب سے ہوش سنبھالا تھا اپنے آپ کو اسلام کی آغوش رحمت میں پایا تھا۔

بچپن ہی سے بے پناہ ذہن و حافظے کی مالک تھیں اس لئے قرآن کی جو آیات نازل ہوتی تھیں وہ ان کو ازبر ہو جاتی تھیں۔ خود فرماتی ہیں

لَقَدْ اُنْزِلَتْ عَلٰی مُحَمَّدٍ ﷺ بِمَکَّۃَ، وَاِنِّیْ لَجَارِیَۃٌ اَلْعَبُ، بَلِ السَّاعَۃُ مَوْعِدُھُمْ وَالسَّاعَۃُ اَدْھٰی وَاَمَرُّ ۝

(میں اس وقت لڑکی تھی اور کھیلا کرتی تھی، جب محمد ﷺ پر مکہ میں یہ آیت نازل ہوئی بَلِ السَّاعَۃُ مَوْعِدُھُمْ وَالسَّاعَۃُ اَدْھٰی وَاَمَرُّ)

یہ آیت سورۂ قمر کی ہے جو مفسرین کے مطابق چار یا پانچ نبوت میں نازل ہوئی

---

(۱) معلوم ہونا چاہیے کہ حضرت اسماءؓ کے بارے میں جو کچھ ابن کثیر نے بیان کیا ہے، اس میں وہ منفرد نہیں ہیں کہ اسے بھی ان کا وہم قرار دے کر جان چھڑالی جائے؛ بلکہ اس پر تمام تذکرہ نگار متفق ہیں۔ البدایہ والنہایہ اور دیگر مستند تاریخی مراجع وماخذ تو ہر کتب خانے میں موجود نہیں ہوتے؛ البتہ مشکوٰۃ تو ہر مکتبے میں دستیاب ہوتی ہے۔ اور مشکوٰۃ کے مرتب نے ہی ایک رسالہ لکھا ہے جس کا نام ہے ''اکمال فی اسماء الرجال'' یہ رسالہ ہر عربی مشکوٰۃ کے آخر میں ملحق ہوتا ہے۔ اس میں حرف الف کے ذیل میں صحابیات کے تذکرے میں سب سے پہلا ذکر حضرت اسماءؓ کا ہی ہے اور ان کے بارے میں صاحب مشکوٰۃ جیسے بڑے محدث نے بھی وہی کچھ لکھا ہے جو ابنِ کثیر نے کہا ہے۔ اہل علم حضرات اس کا مطالعہ کر کے اپنی تسلی کر سکتے ہیں۔

بہرحال یہ ایک اٹل اور ناقابلِ انکار تاریخی حقیقت ہے۔

تھی۔ اس وقت حضرت عائشہؓ نو دس سال کی ہوں گی اور کھیلتی پھرتی ہوں گی مگر ساتھ ساتھ نازل ہونے والی آیات کی طرف بھی دھیان رکھتی تھیں اور انہیں یاد کرلیتی تھیں۔

حضرت عائشہؓ نے جس آیت کا حوالہ دیا ہے، یہ سورۂ قمر کے تیسرے رکوع کی آیت ہے اور اس کا سیاق وسباق کفار کی شدید مذمت اور عنقریب ان کی ذلت وشکست کی خوشخبری پر مشتمل ہے۔ چند آیات کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے۔

(اور آلِ فرعون کے پاس بھی تنبیہات آئی تھیں مگر انہوں نے ہماری ساری نشانیوں کو جھٹلا دیا۔ آخر کو ہم نے انہیں پکڑا جس طرح کوئی زبردست قدرت والا پکڑتا ہے۔ کیا تمہارے کُفّار کچھ اُن لوگوں سے بہتر ہیں؟ یا آسمانی کتابوں میں تمہارے لئے کوئی معافی لکھی ہوئی ہے؟ یا اِن لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ ہم ایک مضبوط جتھا ہیں، اپنا بچاؤ کرلیں گے؟ عنقریب یہ جتّھا شکست کھا جائے گا اور یہ سب پیٹھ پھیر کر بھاگتے نظر آئیں گے؛ بلکہ ان سے نمٹنے کے لئے اصل وعدے کا وقت تو قیامت ہے اور وہ بڑی آفت اور زیادہ تلخ ساعت ہے۔ یہ مجرم لوگ درحقیقت غلط فہمی میں مبتلا ہیں اور ان کی عقل ماری گئی ہے۔ جس روز یہ منہ کے بل آگ میں گھسیٹے جائیں گے اس روز اِن سے کہا جائے گا کہ اب چکھو جہنم کی لپٹ کا مزا۔)

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کو بچپن ہی سے کفار ومشرکین سے شدید نفرت تھی اس لئے ان کی مذمت پر مشتمل آیات کی طرف ان کی توجہ خاص طور پر مبذول ہوجاتی تھی، ورنہ مکہ میں تو اور بھی بہت سی آیات نازل ہوئی تھیں مگر حضرت عائشہؓ نے ان کا حوالہ نہیں دیا۔

اسلام کی گرم جوش حمایت اور مشرکین سے شدید بیزاری وعداوت ہی کی بنا پر ان کا پہلا رشتہ ٹوٹ گیا تھا، ورنہ صدیق اکبرؓ تو کافی عرصہ پہلے مطعم ابنِ عدی سے، اس کے بیٹے جبیر کے لئے حضرت عائشہؓ کا رشتہ دینے کا وعدہ کرچکے تھے مگر جان دو عالم ﷺ کو اس کا علم نہیں تھا۔ چنانچہ حضرت خولہ جب جان دو عالم ﷺ کا پیغام لے کر صدیق اکبرؓ کے پاس گئیں تو انہوں نے کہا کہ ذرا ٹھہرو، میں مطعم سے بات کرلوں کیونکہ میں اسے زبان دے چکا ہوں۔ اس کے بعد حضرت صدیق اکبرؓ مطعم کے پاس گئے اور پوچھا کہ کیا تم حسب وعدہ اپنے بیٹے کے لئے عائشہؓ کا رشتہ لینے پر تیار ہو؟ مطعم تو کچھ نہ بولا؛ البتہ اس کی بیوی نے

ناک بھوں چڑھاتے ہوئے کہا کہ ہمیں تو یہ خوف لاحق ہے کہ اگر تمہاری بیٹی ہمارے گھر میں آ گئی تو ہمارے بیٹے کو بھی ''بے دین'' کر دے گی، اس لئے ہمیں یہ رشتہ منظور نہیں۔ (۱)

حضرت صدیقؓ نے مطعم کی طرف دیکھا تو اس نے بھی اپنی بیوی کی تائید کر دی۔

چنانچہ حضرت صدیقؓ اسی وقت اٹھ کر چلے آئے اور خولہؓ سے کہہ دیا کہ رسول اللہ ﷺ سے کہو مجھے یہ رشتہ قبول کرنے میں اور تو کوئی تامل نہیں؛ البتہ یہ بات الجھن میں ڈالتی ہے کہ رسول اللہ مجھے اپنا بھائی کہتے ہیں اور بھائی کی بیٹی بھتیجی ہوتی ہے، پھر اس سے رسول اللہ کا رشتہ کس طرح ہو سکتا ہے---! (۲)

حضرت خولہؓ نے یہ بات جانِ دو عالم ﷺ کے گوش گزار کی تو آپ نے فرمایا کہ ابوبکر میرا دینی بھائی ہے، نہ کہ حقیقی بھائی، اس لئے اس کی بیٹی میرے لئے حلال ہے۔

یوں یہ مبارک رشتہ طے ہو گیا اور پندرہ سولہ سال کی عمر میں حضرت عائشہؓ کا نکاح جانِ دو عالم ﷺ کے ساتھ ہو گیا۔ (۳)

مقالہ ختم ہؤا

۞۞۞

---

(۱) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت حضرت عائشہ کی دین سے شدید وابستگی اور دوسروں کو اپنا ہمنوا بنا لینے کی صلاحیت اتنی معروف تھی کہ مطعم کا گھرانہ بھی اس سے آگاہ تھا اور دونوں میاں بیوی ڈر رہے تھے کہ اگر دعوتِ دین اور تبلیغِ اسلام کی شیدائی یہ لڑکی ہمارے گھر آ گئی تو جبیر ''بے دین'' ہو جائے گا اور ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ اب اگر حضرت عائشہ اس وقت چھ سال کی تھیں--- جیسا کہ ہشام اور ان کے ہمنوا بتاتے ہیں--- تو اس چھوٹی سی بچی سے مطعم اور اس کی بیوی کو ایسا کونسا ہولناک خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ انہوں نے رشتہ لینے سے ہی انکار کر دیا! اس صورت میں تو یہ کہنا چاہئے تھا کہ ابوبکر! تمہاری بیٹی ابھی چھوٹی ہے، جب بڑی ہو گی تو دیکھا جائے گا۔ اگر وہ ہماری ہم خیال ہوئی تو ہم شادی کر لیں گے ورنہ معذرت کر دیں گے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت عائشہؓ اس وقت ننھی منی بچی نہیں تھیں؛ بلکہ انتہائی ہوشمند اور پُرتاثیر مبلّغہ تھیں۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔

(۲) عرب کے قدیم معاشرے میں منہ بولے بھائی کی بیٹی کو حقیقی بھتیجی کی طرح حرام سمجھا جاتا تھا۔

(۳) یہ تفصیل مسند احمد، ج ۶، ص ۲۱۱، سے ماخوذ ہے۔

حضرت عائشہؓ کے حالات زندگی پر سیّد سلیمان ندوی مرحوم نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے ''سیرت عائشہ۔'' اس کتاب کے مندرجات سے ہمیں چند مسائل میں اختلاف ہے۔ ایک تو یہی حضرت عائشہ کی عمر کا مسئلہ ہے جس میں ہم نے اپنے موقف کو حتی الوسع روشن اور واضح کر دیا ہے۔ دوسرا مسئلہ ''تحریم عسل'' کا ہے۔ سیّد صاحب اس بات کے قائل ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہؓ کی کوششوں سے اپنے آپ پر شہد حرام کر لیا تھا؛ جبکہ ہمارے نزدیک ایسا کوئی واقعہ سرے سے پیش ہی نہیں آیا۔ رسول اللہ ﷺ نے صرف ''ایلاء'' کیا تھا اور اسی کو اللہ تعالیٰ نے تحریم سے تعبیر کیا ہے۔(۱) تیسرا مسئلہ ''افک'' کا ہے جس کو سیّد صاحب تمام تر روایاتی تفصیلات کے ساتھ صحیح سمجھتے ہیں؛ جبکہ ہمیں اس سے اتفاق نہیں ہے۔(۲) ان تین مسئلوں کے علاوہ ''سیرتِ عائشہ'' ہر لحاظ سے ایک بہترین اور عمدہ کتاب ہے۔ سیّد صاحب نے جس محنت اور کاوش سے حضرت عائشہؓ کے حالات حدیث اور تاریخ کے ذخیرے سے چُن چُن کر جمع کئے ہیں، وہ انہی کا حصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے کہ انہوں نے حضرت عائشہؓ کی تابناک زندگی کا کوئی پہلو تشنہ اور کوئی گوشہ مبہم نہیں چھوڑا۔ آئندہ صفحات میں ہم انہی کی کتاب سے چند اقتباسات قدرے تلخیص کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔ مزید تفصیلات جاننے کے خواہشمند قارئین اصل کتاب کا مطالعہ فرمائیں۔

سیّد صاحب لکھتے ہیں

نام، نسب اور خاندان

عائشہ نام، صدیقہ لقب، اُمّ المؤمنین خطاب، اُمِ عبداللہ کنیت اور حمیرا لقب ہے۔ والد کا نام عبداللہ، ابوبکر کنیت اور صدیق لقب تھا۔ ماں کا نام اُمّ رُومان تھا۔ حضرت اُمِ رومان کا پہلا نکاح عبداللہ ازدی سے ہوا تھا۔ عبداللہ کے انتقال کے

---

(۱) ہمارے موقف کی پوری تفصیل جاننے کے لئے سیّدالوریٰ، ج۲،ص ۳۶۰ کا مطالعہ فرمائیے۔

(۲) ملاحظہ فرمائیے سیّدالوریٰ، ج۲،ص ۹۳۔

بعد وہ حضرت ابوبکرؓ کے عقد میں آئیں۔ ان سے حضرت ابوبکرؓ کی دو اولادیں ہوئیں، عبداللہؓ اور حضرت عائشہؓ۔ حضرت عائشہؓ کی ولادت کی تاریخ سے تاریخ و سیر کی عام کتابیں خاموش ہیں۔

صدیق اکبرؓ کا کاشانہ وہ برج سعادت تھا جہاں خورشید اسلام کی شعاعیں سب سے پہلے پرتو افگن ہوئیں۔ اس بناء پر حضرت عائشہؓ اسلام کے ان برگزیدہ لوگوں میں سے ہیں جن کے کانوں نے کبھی کفر و شرک کی آواز نہیں سنی۔ خود حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب سے میں نے اپنے والدین کو پہچانا، ان کو مسلمان پایا۔

شادی

احادیث میں آیا ہے کہ نکاح سے پہلے جانِ دو عالم ﷺ نے خواب دیکھا کہ ایک فرشتہ ریشم کے کپڑے میں لپیٹ کر آپ کے سامنے کوئی چیز پیش کر رہا ہے۔ پوچھا کیا ہے؟ جواب دیا کہ آپ کی بیوی ہیں۔ آپ نے کھول کر دیکھا تو حضرت عائشہؓ تھیں۔ حضرت خدیجہؓ نے نبوت کے دسویں سال ہجرت سے تقریباً تین برس پہلے رمضان المبارک میں انتقال کیا اور اسی کے ایک مہینے بعد شوال میں حضرت عائشہؓ سے جانِ دو عالم ﷺ کا نکاح ہوا............اس حساب سے شوال ۳ قبل ہجرت بمطابق مئی ۶۲۰ء میں حضرت عائشہؓ کا نکاح ہوا۔

ہجرت

حضرت عائشہؓ نکاح کے بعد تقریباً تین برس تک میکے ہی میں رہیں۔ دو برس تین مہینے مکہ میں اور سات آٹھ مہینے ہجرت کے بعد مدینہ میں۔ جب مکہ کے مشرکوں کے ظلم و ستم کے شعلے مسلمانوں کے صبر و تحمل کے خرمن میں آگ لگا رہے تھے، رسول اللہ ﷺ نے مدینہ کی طرف ہجرت کا ارادہ فرمایا۔ جس دن یہ مختصر قافلہ مدینہ پہنچا، نبوت کا چودھواں سال اور ربیع الاول کی بارہویں تاریخ تھی۔

مدینہ میں ذرا اطمینان ہوا تو آپ نے اہل و عیال کے لانے کے لئے حضرت زید بن حارثہؓ اور ابو رافعؓ اپنے غلام کو مکہ بھیجا۔ حضرت ابوبکرؓ نے بھی اپنا آدمی بھیج دیا۔ چنانچہ حضرت عبداللہؓ بن ابی بکرؓ اپنی ماں اور دونوں بہنوں کو لے کر مکہ سے روانہ ہوئے۔

رخصتی

حضرت عائشہؓ اپنے عزیزوں کے ساتھ بنو حارث بن خزرج کے محلّہ میں اتریں اور سات آٹھ مہینے تک یہیں اپنی ماں کے ساتھ رہیں۔ اکثر مہاجرین کو مدینہ کی آب و ہوا نا موافق آئی اور متعدد اشخاص بیمار پڑ گئے۔ حضرت ابو بکرؓ سخت بخار میں مبتلا ہو گئے۔ کم سن بیٹی اس وقت اپنے بزرگ باپ کی تیمارداری میں مصروف رہی۔ اس کے بعد وہ خود بیمار پڑ گئیں۔ یہ اس شدت کی علالت تھی کہ حضرت عائشہ کے سر کے تمام بال گر گئے۔ صحت ہوئی تو حضرت ابو بکرؓ نے آ کر عرض کی کہ یا رسول اللہ! اب آپ اپنی بیوی کو اپنے گھر کیوں نہیں بلوا لیتے۔ یعنی رخصتی کیوں نہیں کروا لیتے؟ آپ نے فرمایا کہ اس وقت میرے پاس مہر ادا کرنے کے لئے روپے نہیں ہیں۔ گزارش کی کہ میری دولت قبول ہو۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے تقریباً سو روپے حضرت ابو بکر سے قرض لے کر حضرت عائشہ کے پاس بھجوا دیئے۔

مدینہ گویا حضرت عائشہؓ کی سسرال تھی۔ انصار کی عورتیں دلہن کو لینے حضرت ابو بکرؓ کے گھر آئیں۔ حضرت اُمِّ رومان بیٹی کو اس کمرے میں لے گئیں جہاں انصار کی عورتیں دلہن کے انتظار میں بیٹھی تھیں۔ دلہن جب اندر داخل ہوئی تو مہمانوں نے عَلَی الْخَیْرِ وَالْبَرَکَۃِ وَعَلٰی خَیْرِ طَائِرِ یعنی تمہارا آنا بخیر و بابرکت اور فال نیک ہو، کہہ کر استقبال کیا۔ دلہن کو سنوارا، تھوڑی دیر کے بعد خود آنحضرت ﷺ بھی تشریف لے آئے۔

حضرت عائشہؓ کی رخصتی صحیح روایتوں کی بناء پر دن کے وقت شوال ۱ھ میں ہوئی۔

مذکورہ بالا بیانات سے اتنا ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کا نکاح، مہر، رخصتی، غرض ہر رسم کس سادگی سے ادا کی گئی تھی۔ جس میں تکلف، آرائش اور اسراف کا نام تک نہیں۔ وفی ذلک فلیتنا فس المتنافسون.

جاہلیت کی رسموں کو مٹانا

حضرت عائشہؓ کے نکاح کی تقریب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعے سے عرب کی بہت سے بیہودہ اور لغو رسموں کی بندشیں ٹوٹیں۔ سب سے اوّل یہ کہ عرب منہ

بولے بھائی کی لڑکی سے شادی نہیں کرتے تھے۔ اسی لئے حضرت خولہؓ نے جب حضرت ابوبکرؓ سے آنحضرت ﷺ کی خواہش کا اظہار کیا تو انہوں نے حیرت سے کہا کیا یہ جائز ہے؟ عائشہ تو رسول اللہ ﷺ کی بھتیجی ہے۔ لیکن آنحضرت ﷺ نے فرمایا اخ فی الاسلام یعنی وہ صرف اسلامی بھائی ہے۔

دوسری رسم یہ تھی کہ اہل عرب شوال میں شادی نہیں کرتے تھے۔ پہلے کبھی شوال میں عرب میں طاعون ہوا تھا۔ اس لئے ماہ شوال کو وہ منحوس سمجھتے تھے اور اس مہینے میں شادی کی کوئی تقریب انجام نہیں دیتے تھے۔

حضرت عائشہؓ کی شادی اور رخصتی دونوں شوال میں ہوئیں اور اسی لئے وہ شوال ہی کے مہینہ میں اس قسم کی تقریبوں کو پسند کرتی تھیں اور کہتی تھیں کہ میری شادی اور رخصتی دونوں شوال میں ہوئیں اور بایں ہمہ شوہر کے حضور میں مجھ سے خوش قسمت کون تھی۔

عرب میں قدیم سے دستور تھا کہ دلہن کے آگے آگے آگ جلاتے تھے اور یہ بھی رسم تھی کہ شوہر اپنی عروس سے پہلی ملاقات محمل یا محفہ (عورتوں کی سواری کی پالی) کے اندر کرتا تھا۔ بخاری اور قسطلانی (کتاب النکاح) نے یہ تصریح کی ہے کہ ان رسوم کی پابندی بھی اس تقریب میں ٹوٹی۔

حضرت عائشہؓ جس گھر میں رخصت ہوکر آئی تھیں، وہ کوئی بلند اور عالی شان عمارت نہ تھی۔ بنی نجار کے محلہ میں مسجد نبوی کے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے متعدد حجرے تھے۔ ان ہی میں ایک حجرہ حضرت عائشہؓ کا مسکن تھا۔ یہ حجرہ مسجد کی شرقی جانب واقع تھا۔ اس کا ایک دروازہ مسجد کے اندر مغربی رخ اس طرح واقع تھا کہ گویا مسجد نبوی اس کا صحن بن گئی تھی۔ آنحضرت ﷺ دروازہ سے ہوکر مسجد میں داخل ہوتے تھے۔ جب مسجد میں معتکف ہوتے تو سر مبارک حجرے کے اندر کر دیتے اور حضرت عائشہؓ بالوں کے اندر کنگھا کر دیتیں۔ کبھی مسجد میں بیٹھے بیٹھے حجرہ کے اندر ہاتھ بڑھا کر کوئی چیز مانگ لیتے۔

گھر کا نقشہ

حجرہ کی وسعت چھ سات ہاتھ سے زیادہ نہ تھی۔ دیواریں مٹی کی تھیں اور کھجور کی

پتیوں اور ٹہنیوں سے چھت تیار کی گئی تھی۔ اوپر سے کمبل ڈال دیا گیا تھا کہ بارش کی زد سے محفوظ رہے۔ بلندی اتنی تھی کہ آدمی کھڑا ہوتا تو ہاتھ چھت تک پہنچ جاتا۔ دروازہ میں ایک پٹ کا کواڑ تھا۔ لیکن وہ عمر بھر کبھی بند نہ ہوا۔ پردہ کے طور پر ایک کمبل پڑا رہتا تھا۔ حجرہ سے متصل ایک بالا خانہ تھا جس کو مشربہ کہتے تھے۔ ایلاء کے ایام میں آپ نے اسی بالا خانہ پر ایک مہینہ بسر فرمایا تھا۔

اثاث البیت

گھر کی کل کائنات ایک چارپائی، ایک چٹائی، ایک بستر، ایک تکیہ جس میں چھال بھری تھی، آٹا اور کھجور رکھنے کے ایک دو برتن، پانی کا ایک برتن اور پانی پینے کے ایک پیالہ سے زیادہ نہ تھی۔ مسکن مبارک گو منبع انوار تھا لیکن راتوں کو چراغ جلانا بھی صاحب مسکن کی (ظاہری) استطاعت سے باہر تھا۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ چالیس چالیس راتیں گزر جاتی تھیں اور گھر میں چراغ نہیں جلتا تھا۔ کھانا پکنے کی بہت کم نوبت آتی تھی۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ کبھی تین دن متصل ایسے نہیں گزرے کہ خاندان نبوت نے سیر ہو کر کھانا کھایا ہو۔ اکثر ایسا ہوتا کہ آپ باہر سے تشریف لاتے اور دریافت فرماتے کہ عائشہ! کچھ ہے؟ جواب دیتیں کہ یارسول اللہ! کچھ نہیں اور پھر گھر بھر کا روزہ ہوتا۔ کبھی بعض انصار دودھ بھیج دیا کرتے تھے، اسی پر قناعت کر لیتے۔

بیوی سے محبت

آنحضرت ﷺ حضرت عائشہؓ سے نہایت محبت رکھتے تھے اور یہ تمام صحابہ کو معلوم تھا۔ چنانچہ لوگ قصداً ہدیئے اور تحفے اسی دن بھیجتے تھے، جس روز حضرت عائشہؓ کے ہاں قیام کی باری ہوتی۔ دیگر ازواج مطہراتؓ کو اس کا ملال ہوتا لیکن کوئی ٹوکنے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ آخر سب نے مل کر حضرت فاطمہؓ کو آمادہ کیا۔ وہ پیام لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئیں۔ آپ نے فرمایا۔۔۔ ''لختِ جگر! جس کو میں چاہوں اس کو تم نہیں چاہو گی؟'' سیدہ عالم کے لئے اتنا ہی کافی تھا، وہ واپس چلی آئیں۔ ازواجِ مطہراتؓ نے پھر بھیجنا چاہا مگر وہ راضی نہ ہوئیں۔ آخر انہوں نے حضرت ام سلمہؓ کو بیچ میں ڈالا۔ وہ نہایت سنجیدہ اور

متین بیوی تھیں۔ انہوں نے موقع پا کر متانت اور سنجیدگی کے ساتھ درخواست پیش کی۔ آپ نے فرمایا کہ اُمِّ سلمہ! مجھ کو عائشہ کے معاملے میں دق نہ کرو!

حضرت عمرؓ بن العاصؓ جب غزوۂ سلاسل سے واپس آئے تو دریافت کیا کہ یارسول اللہ! آپ دنیا میں سب سے زیادہ کس کو محبوب رکھتے ہیں؟ ارشاد ہوا کہ عائشہ کو۔ عرض کی، یارسول اللہ! مردوں کی نسبت سوال ہے؟ فرمایا، عائشہ کے باپ کو۔

ایک دن حضرت عمرؓ نے حضرت حفصہؓ کو سمجھایا کہ عائشہ کی رِیس نہ کیا کرو، وہ تو حضور ﷺ کو محبوب ہے۔

رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ الٰہی جو چیز میرے امکان میں ہے (یعنی بیویوں میں معاشرت اور لین دین کی برابری) میں اس میں عدل سے گریز نہیں کرتا لیکن جو میرے امکان سے باہر ہے (یعنی حضرت عائشہ کی محبت) اس کو معاف کرنا۔

عام لوگ سمجھتے ہیں کہ آپ کو حضرت عائشہؓ سے محبت حسن و جمال کی بناء پر تھی۔ حالانکہ یہ قطعاً غلط ہے۔ اصل یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا شادی کے لئے عورت کا انتخاب چار اوصاف کی بناء پر ہوسکتا ہے۔ دولت، حسن و جمال، حسب ونسب اور دینداری۔ تم دیندار کی تلاش کرو۔ اس لئے ازواج میں وہی زیادہ منظور نظر ہوتیں جن سے دین کی خدمت سب سے زیادہ بن سکتی تھی۔ حضرت عائشہ فہمِ مسائل، اجتہادِ فکر اور حفظِ احکام میں تمام ازواج سے ممتاز تھیں، اس بناء پر شوہر کی نظر میں سب سے زیادہ محبوب تھیں۔

شوہر سے محبت

حضرت عائشہؓ کو بھی رسول اللہ ﷺ سے نہ صرف محبت تھی؛ بلکہ شغف وعشق تھا۔ کبھی راتوں کو حضرت عائشہؓ بیدار ہوتیں اور آپ کو پہلو میں نہ پاتیں تو بے قرار ہو جاتیں۔ ایک بار شب کو آنکھ کھلی تو آپ کو نہ پایا۔ راتوں کو گھروں میں چراغ نہیں جلتے تھے۔ اِدھر اُدھر ٹٹولنے لگیں۔ آخر ایک جگہ آنحضرت ﷺ کا قدم مبارک ملا۔ دیکھا تو آپ سربسجود مناجات الٰہی میں مصروف ہیں۔ ایک دفعہ یہی واقعہ پیش آیا تو شک سے خیال کیا کہ شاید آپ

کسی اور بیوی کے ہاں تشریف لے گئے ہیں۔ اٹھ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگیں۔ دیکھا تو آپ تسبیح وتہلیل میں مصروف ہیں۔ اپنے قصور پر نادم ہوئیں اور بے اختیار زبان سے نکل گیا---
''میرے ماں باپ آپ پر قربان، میں کس خیال میں ہوں اور آپ کس عالم میں ہیں!''

ساتھ کھانا

آپ اکثر حضرت عائشہؓ کے ساتھ ایک دستر خوان؛ بلکہ ایک ہی برتن میں کھانا کھاتے تھے۔ ایک دفعہ ایک ساتھ کھانا کھا رہے تھے کہ حضرت عمرؓ گزرے۔ آپ نے ان کو بھی بلا لیا اور تینوں نے ایک ساتھ کھانا کھایا۔ اس وقت تک پردہ کا حکم نہیں آیا تھا۔ کھانے میں بھی محبت کا یہ عالم تھا کہ آپ وہی ہڈی چوستے جس کو حضرت عائشہؓ چوستی تھیں۔ پیالہ میں وہیں پر منہ رکھ کر پیتے تھے جہاں حضرت عائشہؓ منہ لگاتی تھیں۔

ایک دفعہ ایک ایرانی پڑوسی نے آپ کی دعوت کی۔ آپ نے فرمایا ''عائشہ بھی ہوگی؟'' اس نے کہا ''نہیں۔'' ارشاد ہوا ''تو میں بھی قبول نہیں کرتا۔'' میزبان دوبارہ آیا اور پھر یہی سوال و جواب ہوا اور وہ واپس چلا گیا۔ تیسری دفعہ پھر آیا۔ آپ نے پھر کہا ''عائشہ کی بھی دعوت ہے؟'' عرض کی ''جی ہاں'' اس کے بعد آپ اور حضرت عائشہؓ اس کے گھر گئے۔ (۱)

خدمت گزاری

گھر میں اگرچہ خادمہ موجود تھی لیکن حضرت عائشہؓ آپ کا کام خود اپنے ہاتھ سے انجام دیتی تھیں۔ آٹا خود پیستی تھیں، وضو کا پانی خود لا کر رکھتی تھیں۔ آپ قربانی کے لئے جو اونٹ بھیجتے، اس کے لئے خود قلادہ بٹتی تھیں۔ آنحضرت ﷺ کے سر میں اپنے ہاتھ سے کنگھا

(۱) یہ واقعہ غالباً ہجرت کے اوائل سال کا ہوگا۔ محدثین بیان کرتے ہیں کہ آپ کے تنہا دعوت نہ قبول کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اس روز خانۂ نبوی میں فاقہ تھا۔ آپ نے مروت اور لطف و اخلاق سے دور سمجھا کہ گھر میں بیوی کو بھوکا چھوڑ کر خود شکم سیر کریں۔ پڑوسی نے اس لئے دو دفعہ انکار کیا کہ اس کے ہاں سامان ایک ہی آدمی کے لئے تھا۔ تیسری دفعہ کچھ سامان کر کے حاضر ہوا۔ فقہاء نے اس حدیث سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ بے تکلف دوستوں سے انکارِ دعوت یا کسی اور مہمان کے بڑھانے کے لئے اصرار کرنا جائز ہے۔ یہ حدیث صحیح مسلم کتاب الاطعمہ میں ہے۔ نووی بھی دیکھنا چاہئے۔

کرتی تھیں ۔ جسم مبارک میں عطرمل دیتی تھیں ۔ آپ کے کپڑے اپنے ہاتھ سے دھوتی تھیں ۔ سوتے وقت مسواک اور پانی سرہانے رکھتی تھیں ۔ مسواک کو صفائی کی غرض سے دھویا کرتی تھیں ۔ گھر میں آپ کا کوئی مہمان آتا تو مہمانی کی خدمت انجام دیتیں ۔

ہم سفری اور حکمِ تیمّم کا نزول

سفر میں تمام ازواج تو ساتھ نہیں رہ سکتی تھیں اور کسی کو خاص طور پر ترجیح دینا بھی خلاف انصاف تھا۔ اس بناء پر آپ سفر کے وقت قرعہ ڈالتے تھے جن کا نام آتا، وہ شرف ہمراہی سے ممتاز ہوتیں ۔ حضرت عائشہؓ بھی متعدد سفروں میں آپ کے ساتھ رہی ہیں ۔

ایک سفر میں حضرت عائشہؓ ساتھ تھیں ۔ قافلہ مقام ذات الجیش میں پہنچا تو ان کے گلے کا ہار ٹوٹ کر گر پڑا۔ فوراً آنحضرت ﷺ کو مطلع کیا۔ صبح قریب تھی، آپ نے پڑاؤ ڈال دیا اور ایک آدمی اس کے ڈھونڈنے کو دوڑایا۔ اتفاق یہ کہ جہاں فوج نے منزل کی تھی وہاں پانی مطلق نہ تھا۔ نماز کا وقت آ گیا، لوگ گھبرائے ہوئے حضرت ابوبکرؓ کے پاس پہنچے کہ عائشہؓ نے فوج کو کس مصیبت میں ڈال رکھا ہے۔ وہ سیدھے حضرت عائشہؓ کے پاس پہنچے، دیکھا تو حضور ﷺ ان کے زانو پر سر رکھے آرام فرما رہے ہیں ۔ بیٹی کو کہا کہ ہر روز تم نئی مصیبت سب کے سر لاتی ہو اور غصہ سے ان کے پہلو میں کئی کونچے دیئے ۔ لیکن وہ آپ کی تکلیف کے خیال سے حرکت بھی نہ کر سکیں ۔

آپ صبح کو بیدار ہوئے تو واقعہ معلوم ہوا۔ اسلام کے تمام احکام کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ ہمیشہ مناسب واقعات کی تقریب سے نازل ہوئے ہیں ۔ اسلام میں نماز کے لئے وضو فرض تھا لیکن بیسیوں مواقع ایسے پیش آئے ہیں جہاں پانی نہیں ملتا، یہ موقع بھی اسی قسم کا تھا۔

چنانچہ اس موقع پر آیتِ تیمّم نازل ہوئی جس کا ترجمہ یہ ہے

''اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا حاجت ضروری سے فارغ ہوئے ہو یا عورتوں سے مقاربت کی ہے اور تم پانی نہیں پاتے تو پاک مٹی کا قصد کرو اور اس سے کچھ منہ اور ہاتھ پر پھیر لو، اللہ معاف کرنے والا بخشنے والا ہے۔''

ابھی ابھی مجاہدین کا پرجوش گروہ جو اس مصیبت میں تلملا رہا تھا، اس ابرِ رحمت کو

دیکھ کر مسرت سے لبریز ہو گیا۔ اسلام کے فرزند اپنی ماں کو دعائیں دینے لگے۔ حضرت اسیدؓ بن حضیرؓ ایک بڑے پایہ کے صحابی تھے، جوشِ مسرت میں بول اٹھے---''اے صدیق کے گھر والو! اسلام میں یہ تمہاری پہلی برکت نہیں۔'' صدیق اکبرؓ جو ابھی لختِ جگر کی تادیب کے لئے بے قرار تھے، فخر کے ساتھ صاحبزادی کو خطاب کر کے فرمایا---''جانِ پدر! مجھے معلوم نہ تھا کہ تو اس قدر مبارک ہے، تیرے ذریعہ سے اللہ نے کتنی آسانی بخشی۔'' اس کے بعد قافلہ کی روانگی کے لئے جب اونٹ اٹھایا گیا تو وہیں اسی کے نیچے ہار پڑا ملا۔

فیاضی

حضرت عائشہؓ کے اخلاق کا سب سے ممتاز جوہر ان کی طبعی فیاضی اور کشادہ دستی تھی۔ خیرات میں تھوڑے بہت کا لحاظ نہ کرتیں جو موجود ہوتا سائل کو نذر کر دیتیں۔ ایک دفعہ ایک سائلہ آئی جس کی گود میں دو ننھے بچے تھے۔ اتفاق سے اس وقت گھر میں کچھ نہ تھا۔ صرف ایک چھوہارا تھا، اس کے دو ٹکڑے کر کے دونوں میں تقسیم کر دیا۔

حضرت عروہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ حضرت عائشہؓ نے ان کے سامنے پوری ستر ہزار کی رقم اللہ کی راہ میں دے دی اور دوپٹہ کا گوشہ جھاڑ دیا۔

امیر معاویہ نے ایک لاکھ درہم بھیجے۔ شام ہوتے ہوتے ایک حبہ بھی پاس نہ رکھا، سب محتاجوں کو دے دلا دیا۔ اتفاق سے اس دن روزہ رکھا تھا۔ لونڈی نے عرض کی افطار کے سامان کے لئے کچھ رکھنا تھا۔ فرمایا کہ تم نے یاد دلا دیا ہوتا۔

ایک دفعہ اور اسی قسم کا واقعہ پیش آیا۔ روزے سے تھیں، گھر میں ایک روٹی کے سوا کچھ نہ تھا۔ اتنے میں ایک سائلہ نے آواز دی۔ لونڈی کو حکم دیا کہ وہ ایک روٹی بھی اس کی نذر کر دو۔ عرض کی کہ شام کو افطار کس چیز سے کیجئے گا؟ فرمایا کہ یہ تو دے دو۔ شام ہوئی تو کسی نے بکری کا سالن ہدیتاً بھیجا۔ لونڈی سے کہا کہ دیکھو یہ تمہاری روٹی سے بہتر چیز اللہ نے بھیج دی۔

اپنے رہنے کا مکان امیر معاویہؓ کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ قیمت جو آئی وہ سب اللہ کی راہ میں صرف کر دی۔

حضرت عبداللہؓ بن زبیرؓ بھانجے تھے اور خالہ کی نظر میں سب سے زیادہ چہیتے تھے۔ وہ

اس فیاضی کو دیکھتے دیکھتے گھبرا گئے۔ کہیں ان کے منہ سے نکل گیا کہ اب ان کا ہاتھ روکنا چاہیے۔ خالہ کو معلوم ہوا تو انہوں نے قسم کھالی کہ اب کبھی ابن زبیر سے بات نہیں کروں گی۔ وہ میرا ہاتھ روکے گا حضرت ابن زبیرؓ مدت تک معتوب رہے اور آخر بڑی مشکل سے ان کو معاف فرمایا۔

خشیت الٰھی اور رقیق القلبی

دل میں خشیت الٰہی بہت تھی۔ رقیق القلب بھی بہت زیادہ تھیں، بہت جلد رونے لگتی تھیں۔ ایک دفعہ کسی بات پر قسم کھالی تھی پھر لوگوں کے اصرار پر ان کو اپنی قسم توڑنی پڑی اور گو اس کے کفارے میں چالیس غلام آزاد کیے۔ تاہم ان کے دل پر اتنا گہرا اثر تھا کہ جب یاد کرتیں تو روتے روتے آنچل تر ہو جاتا۔ واقعہ افک میں جب منافقین کی اس تہمت کا حال ان کو معلوم ہوا تو رونے لگیں۔ والدین لاکھ تشفی دیتے تھے لیکن ان کے آنسو نہیں تھمتے تھے۔

ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ ایک سائلہ ان کے دروازہ پر آئی۔ دو ننھے ننھے بچے اس کے ساتھ تھے۔ اس وقت گھر میں کچھ اور نہ تھا۔ تین کھجوریں ان کو دلوادیں۔ سائلہ نے ایک ایک کھجور ان بچوں کو دی اور ایک اپنے منہ میں ڈال لی۔ بچوں نے اپنا اپنا حصہ کھا کر حسرت سے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ ماں نے اپنے منہ سے کھجور نکال کر آدھی آدھی دونوں میں بانٹ دی اور خود نہیں کھائی۔ ماں کی محبت کا یہ حسرت ناک منظر اور اس کی یہ بے کسی دیکھ کر بے تاب ہو گئیں اور ان کی دونوں آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے

عبادت الٰھی

عبادت الٰہی میں اکثر مصروف رہتیں۔ اکثر روزے رکھا کرتی تھیں اور بعض روایتوں میں ہے کہ ہمیشہ روزے سے رہتی تھیں۔ ایک دفعہ گرمی کے دنوں میں عرفہ کے روز روزے سے تھیں۔ گرمی اور تپش اس قدر شدید تھی کہ سر پر پانی کے چھینٹے دیئے جاتے تھے۔ عبدالرحمٰن آپ کے بھائی نے کہا کہ اس گرمی میں روزہ کچھ ضرور نہیں، افطار کر لیجئے، فرمایا کہ جب میں آنحضرت ﷺ کی زبانی یہ سن چکی ہوں کہ عرفہ کے دن روزہ رکھنا سال بھر کے گناہ معاف کرا دیتا ہے تو میں روزہ توڑ دوں گی؟

(سیرت عائشہؓ سے اقتباسات ختم ہوئے)

علم و فضل

حضرت عائشہؓ کا شمار محدثین کے طبقۂ اُولیٰ میں ہوتا ہے۔ان سے تقریباً دو ہزار دوسودس احادیث مروی ہیں، جن میں سے ۱۷۴ متفق علیہ ہیں۔ حدیث کے علاوہ ان کو تفسیر، طب، اشعارعرب، انساب اور دیگر بہت سے علوم پر حیران کن دسترس حاصل تھی۔

وصال

جانِ دوعالم ﷺ کی احادیث کو آگے پہنچاتے اور دین و دانش کے خزانے لٹاتے ہوئے بالآخر وہ گھڑی بھی آ گئی جس سے کسی کو مفر نہیں۔

رمضان المبارک ۵۷ ھ میں حضرت عائشہؓ صدیقہ بیمار پڑ گئیں۔انہوں نے سمجھ لیا کہ یہ مرض الموت ہے اور اس جہانِ رنگ و بو سے رخصتی کا وقت قریب ہے۔ وصال سے پہلے وصیت فرمائی۔

''مجھے رات کو ہی جنت البقیع میں امہات المؤمنین کے قریب دفن کیا جائے۔''

اور پھر سترہ رمضان المبارک ۵۷ ھ کو رات نماز وتر کے بعد اپنے پیچھے ایک عالم کو سوگوار و افسردہ چھوڑ کر اس کارگہ عالم سے رخصت ہو گئیں۔

آپ کی وفات کی خبر آن واحد میں مدینہ طیبہ میں پھیل گئی۔ ہر آنکھ مقدس ماں کی موت پر آنسو بہا رہی تھی۔ حسب وصیت رات کو ہی جنازہ اٹھا لیا گیا۔ جنازہ کے ساتھ اتنا ہجوم تھا کہ تہوار کا گمان ہوتا تھا۔

نماز جنازہ حضرت ابو ہریرہؓ نے پڑھائی۔ قبر میں عبداللہ، عروہ (زبیرؓ کے بیٹے) قاسم بن محمد، عبداللہ بن محمد اور عبداللہ بن عبدالرحمٰن پانچ اشخاص اترے اور پھر ان کے جسم پاک کو سپرد خاک کر دیا۔

حضرت ابن عمرؓ سے پوچھا گیا--- ''سیدہ عائشہؓ صدیقہ کی موت کا غم کس کس نے کیا۔''
جواب دیا--- ''جس جس کی وہ ماں تھیں اسی کو ان کا غم تھا۔'' یعنی تمام مسلمان۔
حضرت اُمِ سلمہؓ نے ان کی وفات پر کہا--- ''اللہ تعالیٰ ان پر رحمت فرمائے۔ رسول اللہ ﷺ کو وہ سب سے زیادہ عزیز تھیں۔''

❁❁❁

اب آخر یں ایک رونمائی پڑھ لیجئے جس میں

اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ

کی شان کو ایک نئے انداز میں اجاگر کیا گیا ہے۔

ماہ شوال اس لحاظ سے غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں صدیقہ بنتِ صدیقؓ نبی کریم ﷺ کے عقد میں آئیں۔

اللہ تعالیٰ کے ہاں اس مقدس خاتون کی قدر و منزلت کا اندازہ اس سے کیجئے کہ اس کی برأت و پاکدامنی کی شہادت دینے کے لئے قرآن کریم کا پورا رکوع نازل ہوا۔

حضرت یوسف علیہ السلام اللہ کے پیغمبر تھے۔ ان پر جب زلیخا نے الزام عائد کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی معصومیت کی شہادت زلیخا ہی کے گھرانے کے ایک فرد سے دِلوا دی۔ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا...... اور زلیخا کے گھرانے سے ایک گواہ نے گواہی دی کہ اگر یوسف کا گریبان چاک ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یوسفؑ پیش دستی کر رہے تھے اور زلیخا انہیں روک رہی تھی، پیچھے ہٹا رہی تھی۔ اسی کشمکش میں گریباں پھٹ گیا--- اور اگر دامن پھٹا ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یوسفؑ جان بچا کر بھاگ رہے تھے اور زلیخا پیچھے سے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ اسی کھینچا تانی میں دامن تار تار ہو گیا۔

عزیز مصر نے یوسف علیہ السلام کے دامانِ دریدہ کو دیکھا تو سب سمجھ گیا اور زلیخا سے مخاطب ہو کر بولا: اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخَاطِئِيْنَ o بلاشبہ تو ہی خطا کاروں میں سے ہے۔

یونہی مریم علیہا السلام پر الزام لگا--- بغیر باپ کے بچہ!! يَا مَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْئًا فَرِيًّا o مریم! یہ تو تم نے بہت ہی غلط کام کر ڈالا۔

بی بی مریم نے بچے کی طرف اشارہ کر دیا کہ اسی سے پوچھ لو---! لوگوں کو حیرت ہوئی کہ جھولے میں پڑا ہوا بچہ بھلا کیا بتا سکتا ہے---! مگر حیرت کی کیا بات تھی، جو قادرِ مطلق بعد میں گویائی عطا کر سکتا ہے، وہ ایک خاتون کی عصمت و طہارت کی شہادت دلوانے کے لئے پہلے بھی بولنے کی قوت عطا فرما سکتا ہے، چنانچہ بچہ خود ہی بول اٹھا اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتَانِیَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِيًّا o میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اس نے مجھے کتاب عنایت کی اور نبی بنایا۔

نوزائیدہ بچے کی یہ معجزانہ گفتگوسن کرالزام لگانے والے اپنا سامنہ لے کررہ گئے۔

غرضیکہ ایک پیغمبر پر الزام لگا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی پاکیزگی کی گواہی، اسی گھرانے کے ایک فرد سے دلوائی۔ ایک پیغمبر کی ماں پر تہمت لگی تو اس کی عفت کی شہادت نومولود سے دلوائی، لیکن جب اپنے محبوب کی زوجہ محبوبہ پر بات آئی اور صدیق اکبرؓ کی اس پاکباز بیٹی پر منافقین نے ایک بے ہودہ بہتان باندھا تو رب العرش العظیم بہ نفسِ نفیس اس کی براءت ونزاہت کا گواہ بن گیا اور سورۂ نور کا ایک مکمل رکوع نازل فرما کر ابدالآباد تک اس کی عفت وطہارت کا چاردانگ عالم میں ڈنکا بجادیا۔(۱)

یہ کسی انسان کی شہادت نہیں ہے؛ بلکہ احکم الحاکمین کی گواہی ہے، اس لئے ذرا اس کے تیور تو ملاحظہ کیجئے ---!

لِكُلِّ امْرِیءٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ وَالَّذِیْ تَوَلّٰی كِبْرَه' مِنْهُمْ لَه' عَذَابٌ عَظِیْمٌ○ اس الزام تراشی میں جتنا کسی نے حصہ لیا، اتنا ہی اس کو گناہ ہوگا اور اس فتنہ وشر کے بانی کے لئے تو عذاب عظیم ہے۔

بہتان تراشوں کے بارے میں ارشاد ہوا، فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَاللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ○ یہ سب اللہ کے نزدیک جھوٹے ہیں اور اگر اللہ کا فضل وکرم تمہارے شامل حال نہ ہوتا اور وہ عفوودرگزر سے کام نہ لیتا تو لَمَسَّكُمْ فِیْمَا اَفَضْتُمْ فِیْهِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ○ تم جس معاملے میں دھنس پڑے تھے، اس کی پاداش میں تم پر عذاب عظیم نازل ہوجاتا۔

پھر تنبیہ کی گئی کہ تم لوگوں نے ایسی بے ہودہ بات کو سننا کیسے گوارا کیا؟

وَ لَوْلَا اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَایَكُوْنُ لَنَا اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِیْمٌ○ یہ افواہ سنتے ہی تم نے یہ کیوں نہ کہہ دیا کہ ہمیں ایسی بات زبان پر لانی ہی نہیں چاہئے۔ سبحان اللہ یہ تو بہتان عظیم ہے۔

پھر اہل ایمان کو آئندہ کے لئے خبردار کیا گیا۔

---

(۱) واقعہ کی تفصیل جاننے کے لئے سیّدالورٰی، ج ۲، ص ۹۳ کا مطالعہ کیجئے!

يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖ اَبَدًا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ اگر تم مؤمن ہو تو خبردار! آئندہ ایسی حرکت کبھی نہ کرنا۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے شہنشاہ ذوالجلال کا انداز سرزنش وعتاب---! کتنا غصہ آیا اسے اپنے محبوب کی زوجہ محبوبہ پر الزام لگنے سے!!!

چونکہ یہ ساری آیتیں لے کر جبریل امین ہی نازل ہوئے تھے اس لئے اس مقدس ماں کی عظمتوں کا ان سے زیادہ واقف اور کون ہوسکتا ہے۔ غالباً اسی لئے جبریل کی نگاہ میں مؤمنین کی اس مادرِ مہرباں کا اتنا اعزاز واکرام تھا کہ اس کے کاشانۂ عفت میں داخل ہونے سے پہلے باقاعدہ اجازت طلب کیا کرتے تھے۔

جس پیکر پاکیزگی کے حجلۂ نزاہت میں روح القدس بھی بلا اجازت نہ داخل ہوسکیں، اس کی رفعتوں کا کیا ٹھکانہ!

بنتِ صدیق ، آرام جانِ نبیؐ
اس حریمِ برأت پہ لاکھوں سلام
یعنی ہے سورتِ نور جن کی گواہ
ان کی پُر نور صورت پہ لاکھوں سلام
جن میں روح القدس بے اجازت نہ جائیں
ان سرادق کی عصمت پہ لاکھوں سلام

اپنی اس زوجہ طاہرہ کے ساتھ جانِ دوعالم ﷺ کا ایسا غیر معمولی تعلق تھا کہ جس گھڑی جانِ دوعالم ﷺ اس جہانِ فانی سے رفیقِ اعلیٰ کی جانب روانہ ہوئے، اس وقت آپ انہی کی گود میں، انہی کے شانوں پر سر رکھے ہوئے تھے اور چند لمحے پہلے انہی کے لعاب دہن سے تر شدہ مسواک سے اپنے دندان مبارک صاف کئے تھے--- زہے نصیب!

شوہر کی طرف سے ایسی لازوال محبت ورفاقت کس بیوی کو نصیب ہوئی ہوگی؟!!

رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا

اُمّ المؤمنین سیّدہ حفصہ رضی اللہ عنہا

حضرت حفصہؓ خلیفہ دوم سیدنا عمر فاروقؓ کی صاحبزادی ہیں۔ والدہ کا نام زینب بنت مظعون تھا۔ نبوت سے پانچ سال قبل پیدا ہوئیں۔ جب حضرت عمرؓ نے اسلام قبول کیا تو اس کے بعد آپ کا قبیلہ بھی دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا۔ سیّدہ حفصہؓ نے بھی انہی ایام میں اسلام قبول کیا۔ سیّدہ حفصہؓ کا پہلا نکاح خاندان بنوسہم کے ممتاز فرد حضرت خنیس بن حذافہؓ سے ہوا۔ وہ دعوتِ اسلام کے ابتدائی زمانے ہی میں اسلام قبول کر چکے تھے۔ حضرت خنیسؓ نے ۶/نبوی میں ہجرت کی اور حبشہ چلے گئے اور ہجرت نبوی ﷺ سے کچھ عرصہ قبل مکہ واپس آ گئے اور پھر سیّدہ حفصہؓ کے ساتھ ہجرت کر کے مدینہ چلے گئے۔

حضرت خنیسؓ جانِ دو عالم ﷺ کے ایک جاں نثار سپاہی تھے۔ ۲/ھ میں جب بدر کا معرکہ پیش آیا تو اس میں بڑے جوش و جذبے اور ولولے کے ساتھ شریک ہوئے۔ پھر جب ۳/ھ میں احد کا معرکہ درپیش ہوا' تو اس میں بھی شوق شہادت کے جذبہ کے تحت شرکت کی اور شجاعت کے نظارے دکھاتے ہوئے شدید زخمی ہوئے۔ زخمی حالت ہی میں ان کو اُٹھا کر مدینہ طیبہ لایا گیا لیکن علاج کے باوجود جانبر نہ ہو سکے اور ان ہی زخموں کی وجہ سے شہادت پائی۔

جب سیّدہ حفصہؓ اپنے خاوند کی رفاقت اور محبت سے محروم ہوئیں اور بیوگی کی چادر اوڑھی تو اس وقت ان کی عمر اکیس سال تھی۔ جب عدت ختم ہوئی تو لامحالہ اپنی جوان بیٹی کے عقد کی فکر ان کے والد گرامی حضرت عمر فاروقؓ کو ستانے لگی۔ تمنا تھی کہ جلد سے جلد اس کا گھر دوبارہ آباد ہو جائے اور کوئی قابلِ اعتماد رفیق زندگی اس کے لئے مِل جائے۔ وہ اسی تذبذب میں تھے کہ ان کا خیال معاً حضرت عثمانؓ کی طرف گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی اہلیہ محترمہ حضرت رقیہؓ بنتِ رسول اللہ کا انتقال ہو چکا تھا اور انہیں خانہ آبادی کی ضرورت تھی۔ چنانچہ ایک دن حضرت عمرؓ نے حضرت عثمانؓ سے کہا

"آپ جانتے ہیں کہ حفصہ بیوہ ہو چکی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس سے

شادی کرلیں۔''

''مجھے چند دن کی مہلت دیں۔ سوچ کر جواب دوں گا۔'' حضرت عثمانؓ نے کہا۔

کچھ دنوں کے بعد حضرت عمرؓ پھر حضرت عثمانؓ سے ملے۔ انہیں یقین تھا کہ عثمان مثبت جواب دیں گے۔

''کیا سوچا ہے آپ نے حفصہ کے بارے میں؟'' حضرت عمرؓ نے پوچھا۔

''فی الحال میرا نکاح کرنے کا ارادہ نہیں ہے۔'' حضرت عثمانؓ نے دوٹوک جواب دے دیا۔

یہ جواب حضرت عمرؓ کی توقع کے خلاف تھا اس لئے طبیعت میں ملال پیدا ہوا۔ پھر وہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس گئے اور انہیں بھی یہی پیش کش کی مگر انہوں نے خاموشی اختیار کی اور کوئی جواب نہ دیا۔ انہیں اپنے دوست اور دینی بھائی حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خاموشی پر سخت تعجب تھا۔ وہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ وہ ایسا رویّہ اختیار کریں گے۔ چنانچہ ایک دن بارگاہ نبوی میں حاضر ہوئے اور عرض کی

''یا رسول اللہ! میں نے حفصہ سے شادی کے لئے عثمان سے کہا تو انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ ابوبکر سے اس ضمن میں بات کی تو انہوں نے چپ سادھ لی۔''

جانِ دوعالم ﷺ نے فرمایا

''فکر نہ کرو، حفصہ کی شادی اس شخص کے ساتھ ہوگی جو ابوبکر اور عثمان سے افضل ہے اور عثمان کی شادی اس خاتون سے ہوگی جو حفصہ سے بہتر ہے۔''

یہ سن کر حضرت عمرؓ کو اطمینانِ قلب ہوگیا۔

پھر جانِ دوعالم ﷺ نے فرمایا

''تم اپنی بیٹی کی شادی میرے ساتھ کر دو!''

اس سے بڑھ کر اور کیا خوش قسمتی ہوسکتی تھی' چنانچہ حضرت عمرؓ نے اپنی بیٹی کا نکاح جانِ دوعالم ﷺ کے ساتھ بعوض چار سو درہم کر دیا اور وہ حرم نبوی میں داخل ہو کر

اُمّ المؤمنین کے اعزاز سے مشرف ہوئیں۔ یہ شادی شعبان ۳ ر ہجری میں ہوئی۔

حضرت حفصہؓ کی جانِ دو عالم ﷺ سے شادی کے بعد سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ حضرت عمر فاروقؓ سے ملے اور کہا

''عمر! جب تم نے اپنی بیٹی حفصہ کا رشتہ پیش کیا تھا تو عثمان کے انکار اور میرے سکوت پر یقیناً تمہیں دکھ پہنچا ہوگا۔''

''ہاں' ایسا ہی ہوا تھا۔'' حضرت عمرؓ نے کہا اور پھر بولے

''مجھے عثمان کے انکار پر اتنا دکھ نہیں ہوا تھا' جتنا آپ کی خاموشی پر۔''

''لیکن جب تمہیں حقیقت معلوم ہوگی تو پھر تمہیں ہم دونوں سے کوئی شکایت نہ رہے گی۔ دراصل رسول اللہ ﷺ نے حفصہ کا ذکر ہمارے سامنے کیا تھا اور ہم دونوں رسول اللہ ﷺ کا راز فاش کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اگر رسول اللہ ﷺ کا ان سے نکاح کا قصد نہ ہوتا تو میں اس کے لئے آمادہ تھا۔''

یہ سن کر حضرت عمرؓ مطمئن ہو گئے اور اپنے دونوں دوستوں کی سردمہری سے دل میں جو ملال پیدا ہوا تھا، وہ رفع ہو گیا۔

جب سیّدہ حفصہؓ جانِ دو عالم ﷺ کی زوجیت سے سرفراز ہوئیں تو دو ازواج مطہرات پہلے سے موجود تھیں۔ ایک سیّدہ سودہؓ اور دوسری حضرت عائشہ صدیقہؓ۔ حضرات شیخین کے باہمی قریبی تعلقات کی وجہ سے حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت حفصہؓ کی آپس میں گاڑھی چھنتی تھی اور ایک دوسرے کے بہت قریب تھیں۔

❁❁❁

دورِ جاہلیت کے عرب معاشرے نے مردوں اور عورتوں میں جن رویوں کو جنم دیا تھا ان کی تبدیلی کے لئے یقیناً وقت درکار تھا۔ اسلام نے ان کے حقوق کی خاطر بے شمار اصلاحات کیں۔ جانِ دو عالم ﷺ نے اپنے گھر میں ازواج مطہرات سے حسنِ سلوک کا ایک مثالی معیار قائم کیا اور انہیں رائے کی آزادی کا پورا پورا حق دیا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض روایات میں ایسے واقعات ملتے ہیں جن میں وہ اپنی ضروریات اور اپنے مطالبات پوری

بیبا کی اور بے تکلفی سے جانِ دو عالم ﷺ کے سامنے پیش کرتی تھیں اور معاشرتی اور دیگر معاملات میں بھی اپنی رائے کا اظہار آزادی سے کر دیا کرتی تھیں۔

اُمّ المؤمنین سیّدہ حفصہؓ کے مزاج میں قدرے سختی تھی، لہٰذا بعض اوقات گھریلو ماحول میں معمولی سی تلخی پیدا ہو جاتی تھی لیکن اس مبارک گھر میں یہ صورتِ حال محبت وشفقت اور ملائمت ونرمی کی شیرینی میں تبدیل ہو جاتی تھی۔

سیدنا حضرت عمر فاروقؓ فرماتے ہیں

''اللہ کی قسم! ہم عہد جاہلیت میں عورتوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے اور دبا کر رکھتے تھے۔ جب ہم مدینہ آئے تو ہمیں یہاں ایسے لوگ بھی ملے جن پر ان کی بیویاں حاوی تھیں اور یہی سبق ہماری عورتیں بھی ان سے سیکھنے لگیں۔ ایک دفعہ کسی کام سے متعلق کسی سے مشورہ کر رہا تھا کہ میری بیوی کہنے لگی

''ایسا اور ایسا کرلو!''

''تمہیں اس بات سے کیا واسطہ؟'' میں نے سخت لہجے میں بیوی سے پوچھا۔

بیوی نے جواب دیا---''تعجب ہے کہ آپ اپنے کام میں کسی کی مداخلت گوارا نہیں کرتے، حالانکہ آپ کی بیٹی رسول اللہ ﷺ سے تکرار کرتی ہے' جو ان کی رنجیدگی کا باعث بنتی ہے۔''

یہ سن کر میں نے اپنی چادر سنبھالی اور سیدھا حفصہ کے گھر گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر خوش ہوئی۔ میں نے پوچھا

''بیٹی! کیا تم رسول اللہ سے تکرار کرتی ہو اور جواب دیتی ہو جو انہیں گراں گزرتا ہے؟''

''ہاں' کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔'' بیٹی نے جواب دیا۔

''کیا تم اللہ اور اس کے رسول کے غضب سے نہیں ڈرتی ہو جو ایسا کرتی ہو؟'' میں نے اسے تنبیہ کی اور پھر نصیحت کرتے ہوئے کہا

''اللہ کے رسول ﷺ سے کبھی کوئی ایسی بات نہ کرنا جو ان کی طبیعت پر گراں گزرے اور نہ ان سے کسی چیز کا مطالبہ کرنا اور نہ تم عائشہ سے ریس کرنا جو رسول اللہ کی محبت

پرنازاں ہے۔''

ایک دفعہ جانِ دوعالم ﷺ نے ایلاء (۱)، فرمایا یعنی کسی بات پر ناراض ہوکر ایک ماہ کے لئے ازواج سے علیحدگی اختیار کرلی۔ اس دوران آپ ﷺ ایک بالاخانے میں جو سیّدہ عائشہ صدیقہؓ کے حجرے کا بالاخانہ تھا اور مسجد نبوی کے متصل ازواج مطہرات کے حجروں کے برابر تھا' گوشہ نشین ہوگئے اور اپنے حبشی غلام رباح کو بطور دربان دروازے پر بٹھا دیا۔ بوقتِ ضرورت کھجور کے ایک تنے کے سہارے اس بالاخانے میں آتے جاتے تھے۔ سوئے اتفاق سے انہی دنوں جانِ دوعالم ﷺ اپنی سواری سے گر گئے اور آپ ﷺ کی پنڈلی مبارک پر زخم آ گیا تھا جس کی وجہ سے بالاخانے سے اُترنے اور چڑھنے میں دقت بھی ہوتی تھی۔

اس دوران کسی نے یہ غلط خبر مشہور کردی کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی ازواج کو طلاق دے دی ہے۔ اس افواہ نے اہل ایمان کو مضطرب کردیا اور طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔

ادھر ازواج مطہراتؓ کا برا حال تھا۔ ان کے سان وگمان میں بھی نہ تھا کہ حالات یہ رخ اختیار کرجائیں گے۔ ہر زوجہ محترمہ افسردہ و پریشان تھی کہ اس نے کیونکر اپنے مشفق و غمگسار اور مہربان و کریم شوہر کو ناراض کردیا۔ سیّدہ حفصہؓ بلک بلک کر رو رہی تھیں۔

حضرت عمرؓ نے خادم رباح سے کہا

''رسول اللہ سے میرے لئے اجازت مانگو!''

لیکن جانِ دوعالم ﷺ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ تھوڑی دیر بعد پھر اُٹھ کر گئے اور پھر رباح کو بآواز بلند پکار کر کہا

''رسول اللہ ﷺ سے میرے لئے اجازت مانگ۔ میں حفصہ کی سفارش کرنے نہیں آیا۔ اللہ کی قسم اگر آپ فرمائیں تو میں اپنی بیٹی کی گردن اُڑادوں۔''

---

(۱) ایلاء کا واقعہ اور اس کے اسباب سے مفصل بحث سیدالوریٰ، جلد دوم میں گزر چکی ہے۔

روایت ہے کہ جانِ دوعالم ﷺ نے سیّدہ حفصہؓ کو ایک طلاق رجعی دے دی تھی۔ جب حضرت عمرؓ کو اس کی خبر ملی تو بہت دکھ ہوا اور شدتِ غم سے سر پر مٹی ڈال لی اور کہنے لگے۔

''اس کے بعد اب اللہ کی نگاہ میں عمر اور اس کی بیٹی کی کوئی قدر و منزلت نہیں رہی۔''

اور جب اس کی اطلاع سیّدہ حفصہؓ کے ماموں عثمان' قدامہ اور دیگر پسرانِ مظعون رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو ہوئی تو وہ سب آئے۔ سیّدہ حفصہؓ ان کے سامنے رونے لگیں اور بولیں

''اللہ کی قسم! رسول اللہ نے مجھ سے اکتا کر طلاق نہیں دی۔''

اتنے میں جانِ دوعالم ﷺ تشریف لے آئے اور فرمایا

''حضرت جبرائیل علیہ السلام آئے تھے اور کہا تھا کہ میں حفصہ سے رجوع کرلوں کیونکہ وہ کثرت سے روزے رکھنے والی اور شب بیدار ہے اور جنت میں میری زوجہ ہوگی۔''

لیکن عقبہ بن عامر کی روایت کے مطابق حضرت جبرائیلؑ نے حضرت عمرؓ کی خاطر حفصہ سے رجوع کر لینے کا مشورہ دیا تھا۔ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ.

اس طرح کی خانگی شکر رنجیاں تو ہر گھر میں کبھی کبھار ہو ہی جاتی ہیں' تاہم بحیثیت مجموعی سیّدہ حفصہؓ کو اپنے شوہر جانِ دوعالم ﷺ سے بے حد محبت تھی اور ان کی معیت و رفاقت میں گزری ہوئی گھڑیوں کو وہ حاصلِ حیات سمجھتی تھیں اور ان کے حصول کے لئے کوشاں رہتی تھیں۔

ایک مرتبہ سیّدہ حفصہؓ اور سیّدہ عائشہؓ جانِ دوعالم ﷺ کے ساتھ کسی سفر میں چلی جا رہی تھیں۔ رات کے وقت جانِ دوعالم ﷺ سیّدہ عائشہؓ کے اونٹ کے قریب چلتے تھے۔ ایک دن سیّدہ حفصہؓ نے سیّدہ عائشہؓ سے کہا کہ آج رات کو تم میرے اونٹ پر سوار ہو جاؤ اور میں تمہارے اونٹ پر۔ سیّدہ عائشہؓ اس بات پر رضامند ہو گئیں اور دونوں نے اپنے اونٹ تبدیل کر لئے۔ چنانچہ رات کے وقت جانِ دوعالم ﷺ اس اونٹ کو جس پر سیّدہ حفصہ سوار تھیں حضرت عائشہؓ کا اونٹ سمجھ کر اس کے قریب چلتے رہے اور سیّدہ حفصہؓ آپ کی رفاقت و

دیدار سے سرشار ہوتی رہیں۔

✡✡✡

سیّدہ حفصہؓ شب بیدار، کثرت سے روزے رکھنے والی اور احکام دین کی بجا آوری میں پورا اہتمام کرنے والی خاتون تھیں۔ علاوہ ازیں وہ پڑھی لکھی بھی تھیں۔ جانِ دوعالم ﷺ نے بھی اپنی اس زوجہ محترمہ کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ فرمائی۔ مسند احمد بن حنبل کی روایت کے مطابق آپ نے ایک صحابیہ حضرت شفاء بنتِ عبداللہؓ عدویہ کو جو لکھنا پڑھنا جانتی تھیں اس بات پر مامور فرمایا کہ وہ سیّدہ حفصہؓ کو لکھنا سکھائیں۔ چنانچہ حضرت شفاءؓ نے انہیں لکھنا سکھایا اور زہریلے کیڑے مکوڑوں کے کاٹنے کا دم بھی بتایا۔ بہت جلد انہوں نے لکھنے میں مہارت حاصل کر لی اور دم بھی سیکھ لیا۔

سیّدہ حفصہؓ بڑے انہماک و توجہ سے اپنے شوہر نامدار کے ارشاداتِ عالیہ سنا کرتی تھیں اور دل و دماغ میں انہیں محفوظ کر لیتی تھیں۔ اگر کبھی کسی مسئلہ پر ذہن میں کوئی خیال اُبھرتا یا اشکال پیدا ہوتا تو اس کے بارے میں پوچھ لیتی تھیں تاکہ وضاحت ہو جائے اور کسی طرح کا ابہام باقی نہ رہے۔ جانِ دوعالم ﷺ بھی ان کے سوالات بڑے تحمل سے سنتے اور ان کے جوابات دیتے۔ ایک مرتبہ جانِ دوعالم ﷺ نے ارشاد فرمایا

''جو اہل ایمان غزوۂ بدر اور بیعت رضوان میں شریک ہوئے وہ جہنم میں نہیں جائیں گے۔''

یہ سن کر حضرت حفصہؓ کے ذہن میں ایک الجھن پیدا ہوئی اور عرض کی

''یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ○ تم میں کوئی ایسا نہیں جو جہنم پر وارد نہ ہو۔ یہ ایک طے شدہ بات ہے جسے پورا کرنا تیرے رب کے ذمے ہے۔''

''یہ درست ہے۔'' جانِ دوعالم ﷺ نے فی البدیہہ جواب دیا ''مگر اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ بھی تو ارشاد فرمایا ہے ثُمَّ نُنَجِّی الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّ نَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا ○ پھر ہم ان لوگوں کو بچا لیں گے جو دنیا میں متقی تھے اور ظالموں کو اس میں گرا ہوا چھوڑ

دیں گے۔''

❁❁❁

قرآن پاک وقفے وقفے سے نازل ہوا تھا۔ جانِ دوعالم ﷺ نے اپنی حیات مقدسہ کے دوران اس بات کا اہتمام فرما دیا تھا کہ جونہی آیات مبارکہ نازل ہوں انہیں متعلقہ سورت میں شامل کر کے احاطہ تحریر میں لایا جائے۔ دوسرے کاتبانِ وحی کے علاوہ یہ ذمہ داری سیّدہ حفصہؓ کے بھی سپرد تھی کیونکہ وہ لکھنا سیکھ چکی تھیں۔ لہٰذا جانِ دوعالم ﷺ کی ہدایت کے مطابق نازل شدہ آیت مبارکہ کو اپنے پاس موجود قرآنی نسخے میں درج کر لیتی تھیں۔ اہل سیر کے مطابق جانِ دوعالم ﷺ نے اپنی حیات مبارکہ میں ہی قرآن مجید کے تمام کتابت شدہ اجزاء یکجا کرا کے سیّدہ حفصہؓ کے پاس رکھوا دیئے تھے جو تا حیات ان کے پاس رہے۔

جانِ دوعالم ﷺ کے وصال کے بعد جب مانعینِ زکوٰۃ اور مدعیان نبوت کے خلاف جنگوں میں بہت سے حفاظ کام آ گئے تو سیدنا حضرت عمر فاروقؓ نے خطرہ محسوس کیا کہ اس طرح اللہ کی کتاب کا کیا بنے گا۔ لہٰذا ایک دن وہ خلیفۃ رسول اللہ سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس گئے اور اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ چنانچہ انہوں نے اہتمام کیا کہ قرآن پاک کتابی شکل میں مدون ہو جائے۔ انہوں نے تمام کتابت شدہ قرآنی اجزاء جو مختلف صحابہ کے پاس موجود تھے جمع کئے۔ اس سلسلہ میں جو سب سے اہم نسخہ تھا وہ حضرت حفصہؓ کے پاس تھا جو سب سے زیادہ کارآمد ثابت ہوا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے وہ نسخہ لے کر اہل علم صحابہ کی ایک جماعت کے تعاون سے تمام قرآنی اجزاء کو کتابی شکل میں مدون کر دیا اور پھر یہ مکمل و مستند نسخہ جو تاریخ میں مصحفِ صدیقی کے نام سے معروف ہے سیّدہ حفصہؓ کی تحویل میں دے دیا گیا۔

عہد عثمانی میں جب عجمیوں کی ایک کثیر تعداد اسلام میں داخل ہوئی اور قرآن حکیم کی کتابت، املاء، تلفظ اور تلاوت میں اختلاف کی صورتیں پیدا ہوئیں تو خلیفہ سوم امیر المؤمنین حضرت عثمان غنیؓ نے سیّدہ حفصہؓ کے پاس جو نسخہ قرآن تھا اس کی نقول کرا کر اپنی مہر کے

ساتھ اپنی مملکت کے مختلف شہروں میں بھجوادیں تاکہ ہر جگہ ایک طرح کتابت وقرأت ہو اور اختلاف کی کوئی گنجائش نہ رہے۔ لہٰذا قرآن کی ترتیب وتدوین اور اس کی حفاظت کا سہرا بھی اُمّ المؤمنین سیّدہ حفصہؓ کے سر ہے۔

حضرت حفصہؓ سے ساٹھ احادیث منقول ہیں جو انہوں نے جان دو عالم ﷺ اور حضرت عمر فاروقؓ سے سماعت فرمائی تھیں۔ ان میں سے چار متفق علیہ ہیں۔ چھ صرف صحیح مسلم شریف میں ہیں اور باقی پچاس احادیث مختلف کتب میں ہیں۔

زمانہ مختلف نشیب وفراز سے گزرتا ہوا آگے بڑھتا رہا اور ۴۵ رہجری تک چشمِ فلک نے بڑے بڑے انقلابات دیکھے۔ اس وقت سیّدہ حفصہؓ کی عمر مبارک ۶۳ ربرس تھی کہ آپ علیل ہوگئیں۔ آثار بتا رہے تھے کہ اجل نے رخصتی کے لئے زندگی کے دروازے پر دستک دے دی ہے' اور پھر ایک دن اچانک مدینہ میں یہ خبر پھیل گئی کہ اُمّ المؤمنین سیّدہ حفصہؓ بنتِ عمر فاروقؓ سفرِ آخرت پر روانہ ہوگئی ہیں۔ یہ حضرت امیر معاویہؓ کی خلافت کا زمانہ تھا اور ان دنوں مدینہ منورہ کا گورنر مروان تھا۔ نماز جنازہ اسی نے پڑھائی اور کچھ دور تک جنازہ کو کندھا دیا۔ سیّدہ حفصہؓ کے بھائی حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور ان کے بیٹے عاصمؒ' سالم اور حمزہ رضوان اللہ تعالیٰ عنہم قبر میں اُترے اور اس مقدس ہستی کے جسمِ پاک کو سپردِ خاک کردیا۔

رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالیٰ عَنْھَا.

اُمّ المؤمنین سیّدہ زینب بنتِ خزیمہ رضی اللہ عنہا

زینب نام کی دو خواتین کو حرم نبوی میں شمولیت کا شرف حاصل ہوا۔ ایک زینب بنتِ جحشؓ جن کے حالات بعد میں بیان ہوں گے۔ دوسری یہی زینب بنتِ خزیمہؓ جو ام المساکین کی کنیت سے معروف تھیں۔

ان کا پہلا نکاح حضرت عبیدہؓ سے ہوا تھا۔ عبیدہؓ غزوہ بدر میں شہید ہو گئے تو دوسرا نکاح عبداللہ ابن جحشؓ سے ہوا۔ وہ بھی غزوہ احد میں شہادت سے ہمکنار ہو گئے تو جانِ دوعالم ﷺ نے مختصر سے عرصے میں دو بار بیوگی کا صدمہ جھیلنے والی اس دکھیا خاتون کو اپنی زوجیت میں لے لیا تا کہ اس کے غموں کی کچھ تلافی ہو سکے مگر افسوس کہ جانِ دوعالم ﷺ کی رفاقت کے یہ خوشگوار اور پر لطف لمحات نہایت مختصر ثابت ہوئے اور نکاح سے صرف چند ماہ بعد سیّدہ زینبؓ کا وصال ہو گیا۔ اس لئے کتبِ تاریخ و سیرت میں ان کے تفصیلی حالات مذکور نہیں ہیں۔ صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ سیّدہ زینبؓ نہایت عبادت گزار اور سخی دل خاتون تھیں۔ فقراء و مساکین اور غریبوں کو نہایت فیاضی سے کھانا کھلاتی تھیں اور بہت خیرات و صدقات کرنے والی تھیں۔ مساکین و یتامٰی کی بڑی خبر رکھتی تھیں۔ ضعیفوں کی مدد کے لئے ہمہ وقت کمر بستہ رہتی تھیں۔ بڑی دریا دل اور کشادہ دست تھیں۔ انہیں صفات جلیلہ کے باعث لوگوں میں اُمّ المساکین (مسکینوں کی ماں) کے لقب سے مشہور ہو گئیں تھیں۔ ان کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ جانِ دوعالم ﷺ نے خود ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔ سیّدہ خدیجۃ الکبرٰیؓ کے بعد صرف سیّدہ زینب بنتِ خزیمہؓ کو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ جانِ دوعالم ﷺ کے دستِ اقدس میں رخصت ہوئیں اور آپ کے ہاتھوں جنت البقیع میں مدفون ہوئیں۔ وفات کے وقت ان کی عمر مبارک تیس سال کی تھی۔

رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہَا

اُمّ المؤمنین سیّدہ اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا

حضرت ام سلمہؓ کا اصلی نام ہند تھا۔ ان کے والد مکہ کے دولت منداور سخی شخصیت تھے۔ ان کا نام تو حذیفہ تھا مگر ابوامیہ کی کنیت سے مشہور تھے۔ ام سلمہ نے انہی کی آغوشِ تربیت میں بڑے نازونعم کے ساتھ پرورش پائی۔ ابوامیہ تمام قبائلِ قریش میں نہایت عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے کیونکہ وہ بہت فیاض انسان تھے۔ ان کی سخاوت کا یہ عالم تھا کہ جب کبھی سفر پر جاتے تو خود تمام قافلہ کے کفیل ہوتے تھے۔ اسی لئے انہیں ''زادالراکب'' اور ''زادالمسافر'' کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا، یعنی مسافروں کا توشہ۔

والدہ کا نام عاتکہ بنت عامر تھا۔

سیّدہ ام سلمہؓ کا پہلا نکاح ان کے چچازاد ابوسلمہؓ سے ہوا۔ ابوسلمہ کا نام عبداللہ بن عبدالاسد تھا مگر وہ ابوسلمہ سے معروف تھے، وہ جانِ دوعالم ﷺ کے رضاعی بھائی بھی تھے۔ سیّدہ ام سلمہؓ اور ان کے شوہر ان لوگوں میں ہیں جن کو قدیم الاسلام کہا جاتا ہے۔ نبوت کے آغاز میں جب لوگ اسلام کے بارے میں تردد اور شک کا شکار تھے، یہ دونوں میاں بیوی اسلام کی دولت سے مشرف ہوئے۔ جوں جوں مسلمانوں کی تعداد بڑھتی گئی، کفارِ مکہ کی ایذاء رسانیوں میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ جب کفار کا ظلم وستم حد سے بڑھا تو جانِ دوعالم ﷺ نے صحابہ کرام کو اس بات کی اجازت دے دی کہ جو شخص اپنے دین اور جان کو بچانے کے لئے ہجرت کرنا چاہے وہ حبشہ جا سکتا ہے۔ اس اعلان کے ساتھ ہی سیّدہ ام سلمہؓ اپنے شوہر کے ساتھ ہجرت کر کے حبشہ چلی گئیں۔

حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ ہم حبشہ میں سکون کی زندگی بسر کرنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے وہاں قیام کے دوران پہلے ایک بیٹی عطا کی جس کا نام ہم نے زینب رکھا۔ اس کے بعد ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام سلمہ رکھا جس کی وجہ سے میرے سرتاج ابوسلمہ اور میں ام سلمہ کہلائی۔ اس کے بعد ایک دوسرا بیٹا پیدا ہوا جس کا نام عمر رکھا، پھر اللہ تعالیٰ نے بیٹی عطا کی جس کا نام درہ رکھا۔ اس طرح ہمارا گھران خوشنما کلیوں سے مہکنے لگا۔ زندگی کے دن خوشگوار

گزر رہے تھے۔ حبشہ کا نیک دل حکمران نجاشی بھی ہم پر بڑا مہربان تھا، لیکن مکہ معظّمہ کی یاد دل سے بھلائی نہ جارہی تھی۔ ہردم دل میں یہی خیال سمایا رہتا کہ وہ کون سی گھڑی ہوگی جب ہم اپنے پیارے وطن کو واپس لوٹیں گے۔ ایک روز حبشہ میں یہ خبر پہنچی کہ عمر بن خطاب نے اسلام قبول کرلیا ہے اور اب مکہ معظّمہ کے حالات یکسر بدل چکے ہیں کیونکہ عمر کے رعب و دبدبہ کی بناپر قریش مسلمانوں پر ظلم وستم ڈھانے سے باز آچکے ہیں۔

اس خبر سے ہمارے دلوں میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی اور ہم مکہ معظّمہ کی طرف روانہ ہوگئے۔ عثمان بن عفان بھی اپنے اہل خانہ کے ہمراہ ہمارے ساتھ واپس لوٹے۔ مکہ پہنچ کر ہمیں پتا چلا کہ یہ تو محض ایک افواہ تھی۔ قریشِ مکہ تو پہلے سے بھی زیادہ مسلمانوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بنارہے ہیں لیکن اب کیا ہوسکتا تھا۔ ہم تو پھر اسی چکی میں پسنے کے لئے واپس پہنچ چکے تھے۔ اب پچھتاوا کس کام کا؟

ایک روز تنگ آ کر ابوسلمہ نے دوبارہ حبشہ چلے جانے کا ارادہ کرلیا تھا مگر اسی دوران رسول اللہ ﷺ نے اپنے جاں نثاروں کو مدینہ منورہ چلے جانے کا حکم صادر فرمادیا کیونکہ مدینہ سے آنے والے وفد نے بیعتِ عقبہ میں مسلمانوں کو مدینہ منورہ آباد ہونے کی پیش کش کردی تھی، جسے رسول اللہ ﷺ نے قبول کرلیا تھا۔

حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ مدینہ منورہ کی جانب ہجرت کرنے کا جب حکم ملا تو ابوسلمہ نے اونٹ پر مجھے اور بچوں کو سوار کیا اور سب کے سامنے سوئے مدینہ چل پڑے۔ ہماری روانگی کا منظر دیکھ کر میرے خاندان کے چند افراد آگے بڑھے اور اونٹ کی مہار پکڑ کر ابوسلمہ سے کہا---''تم جہاں چاہو جاؤ لیکن یہ ہماری بیٹی ہے، یہ تمہارے ساتھ نہیں جائے گی۔ یہ کیا مذاق ہے؟ کبھی حبشہ، کبھی مدینہ، کبھی اِدھر، کبھی اُدھر۔ سکون سے ایک جگہ رہنا تو تجھے نصیب ہی نہیں۔'' اس طرح انہوں نے مجھے روک لیا۔

ابوسلمہ کے خاندان کو جب پتا چلا تو وہ بھی آ گئے۔ انہوں نے میری گود سے دونوں بیٹے چھین لئے اور کہا---''یہ ہمارا خون ہے۔ ان کی پرورش ہم کریں گے۔''

یوں پلک جھپکنے میں مَیں اپنے میکے چلی گئی اور میرے بیٹے سسرال والے لے

گئے۔ اس حادثے سے مجھ پر غموں کے پہاڑ گر پڑے۔ آنسو تھے کہ تھمنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ خاوند کی جدائی کیا کم تھی کہ میرے لختِ جگر بھی مجھ سے چھین لئے گئے۔ ہر دم انہیں کا خیال دل میں سمایا رہتا تھا اور مجھے پل بھر کے لئے بھی چین نہ آتا تھا۔ میں اس جگہ جاتی جہاں ہمارے درمیان جدائی کی خلیج حائل کی گئی تھی۔ وہاں بیٹھ کر زار و قطار روتی، آہیں بھرتی اور سسکیاں لیتی۔ یہ میرا روزانہ کا معمول تھا۔ ایک روز میں وہاں بیٹھی رو رہی تھی کہ میرے خاندان کا ایک فرد وہاں سے گزرا۔ اسے میری حالت دیکھ کر ترس آ گیا اور مجھ سے پوچھا

''اے زادِ مسافر کی بیٹی! تم نے یہ اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے؟''

میں نے اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا تو اس نے ابوسلمہ اور میرے خاندان کے ذمہ دار افراد سے بات کرتے ہوئے کہا

''ظالمو! تمہیں اس بیچاری پر ترس نہیں آتا؟ کیا تمہارے دل پتھر ہو چکے ہیں؟ دیکھ نہیں رہے کہ یہ کس طرح ایک عرصے سے غم کے آنسو بہا رہی ہے؟ کچھ شرم کرو، کچھ ہوش کے ناخن لو، آخر کب تک تم اسے جدائی کے عذاب میں مبتلا کئے رکھو گے؟ تمہارے لئے ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ لاچار اور شریف خاتون سے یہ ظالمانہ سلوک---!!''

جب اس نے جذبات میں آ کر انہیں کھری کھری سنائیں تو ان کی نگاہیں جھک گئیں۔ انہوں نے اپنی ضد چھوڑ دی، میرے بیٹے واپس کر دیئے اور کہا کہ تم جا سکتی ہو، ہمارے طرف سے اجازت ہے۔ لیکن میرے ساتھ مدینہ تک جانے کی کسی نے حامی نہ بھری۔ بیٹوں کے دوبارہ میری گود میں آنے سے غموں کے بادل کافی حد تک چھٹ گئے تھے اور دل کو سکون مل گیا تھا اس لئے میں کسی کی پرواہ کیے بغیر بچوں سمیت اونٹ پر سوار ہوئی اور اکیلی ہی اللہ کے بھروسہ پر مدینہ چل پڑی۔ جب میں مقام تنعیم پر پہنچی تو عثمان بن طلحہ عبدری ملا جو اس وقت ابھی مسلمان نہیں ہوا تھا۔ اس نے پوچھا---''اکیلی کہاں جا رہی ہو؟''

میں نے کہا---''ابوسلمہ کے پاس مدینہ جا رہی ہوں۔''

اس نے پوچھا---''تم کو چھوڑنے خاندان کا کوئی فرد ساتھ جا رہا ہے؟''

میں نے کہا---''کوئی نہیں، اللہ کے سہارے جا رہی ہوں۔ وہی میرا حامی و

ناصر ہے، وہی میری حفاظت کرے گا۔''

اس نے آگے بڑھ کر میرے اونٹ کی مہار پکڑتے ہوئے کہا---''میں تم کو مدینہ چھوڑ کر آؤں گا۔''

حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ عثمان جیسا نیک خصلت، شریف الطبع، پاکیزہ نگاہ اور پاکیزہ دل شخص میں نے کوئی اور نہ دیکھا۔ مکہ سے مدینہ تک سفر کے دوران جب کہیں پڑاؤ کا وقت آتا تو یہ کہیں مناسب جگہ پر اونٹ بٹھا دیتا۔ میں بچوں کو لے کر نیچے اترتی، یہ اونٹ کو کسی درخت کے ساتھ باندھ کر خود دور جا کر لیٹ جاتا اور مجھے بچوں سمیت آزادانہ آرام کا موقع میسر آ جاتا۔ جب روانگی کا وقت ہوتا تو اونٹ میرے پاس لا کر بٹھا دیتا، میں بچوں کو لے کر اس پر سوار ہوتی اور یہ اس کی مہار پکڑ کر آگے آگے پیدل چلنے لگتا۔ جب ہم کئی روز سفر طے کر کے مدینہ منورہ کی ملحقہ آبادی قباء میں پہنچے، جہاں بنو عمر بن عوف آباد تھے، تو عثمان بن طلحہ عبدری نے کہا---''ابوسلمہ اس بستی میں رہائش پذیر ہے۔ تم ان کے پاس چلی جاؤ، میں واپس جاتا ہوں۔''

حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ اس کے حسن سلوک نے مجھے بہت متاثر کیا۔ اللہ اسے جزائے خیر عطا کرے۔

حضرت ابوسلمہؓ نے جب اپنے اہل خانہ کو سامنے دیکھا تو خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی اور میاں بیوی راضی خوشی زندگی کے دن گزارنے لگے۔

❁❁❁

ابوسلمہؓ غزوۂ بدر میں شریک ہوئے اور پھر انہیں غزوۂ احد میں شریک ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ اس جنگ میں ابواسامہ نے ان کے بازو پر نیزہ مارا جس سے بہت گہرا زخم لگا۔ مہینہ بھر اس کا علاج ہوتا رہا۔ اوپر سے تو زخم مل گیا لیکن اندر سے خشک نہ ہوا۔ غزوۂ احد کو ابھی دو ماہ کا عرصہ ہی گزرا تھا کہ جانِ دو عالم ﷺ کو یہ خبر ملی کہ بنواسد مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ آپ نے لشکر اسلام کو تیاری کا حکم دیا اور اس کی قیادت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کی۔ یہ لشکر ایک سو پچاس افراد پر مشتمل تھا۔ بنواسد کے علاقے میں پہنچ کر

لشکر اسلام نے اچانک ان پر حملہ کر دیا۔تلواروں کی جھنکار اور مجاہدین کی للکار دشمن پر بجلی بن کر گری۔مجاہدین اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں اترے تھے۔حضرت ابو سلمہؓ نے اپنے زخمی بازو کی پرواہ نہ کی۔زخم اندر سے ہرا تھا، وہ پھٹ پڑا لیکن یہ برق رفتاری سے دشمن کو تہہ تیغ کرنے میں مصروف رہے۔آخر بنو اسد کو شکست فاش کا سامنا کرنا پڑا۔اس معرکے میں بہت سا مالِ غنیمت بھی لشکر اہلِ اسلام کو حاصل ہوا لیکن لشکر کے قائد ابو سلمہؓ کو بازو کے زخم نے نڈھال کر دیا تھا۔حضرت ام سلمہؓ نے جب انہیں دیکھا تو گھبرا گئیں۔

حضرت ابو سلمہؓ شدید زخمی حالت میں بستر پر لیٹے ہوئے تھے کہ جانِ دو عالم ﷺ ان کی عیادت کے لئے تشریف لائے۔آپ نے محسوس کیا کہ یہ اپنی زندگی کے آخری سانس لے رہے ہیں۔آپ نے انہیں تسلی دی اور دعائیہ کلمات کہے۔ابو سلمہ رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر یہ دعا کی

اَللّٰھُمَّ اخْلُفْنِیْ فِیْ اَھْلِیْ بِخَیْرٍ. (الٰہی! میرے بعد اہل خانہ کو میرا نعم البدل عطا کرنا۔)

اور ساتھ ہی یہ دعا بھی کی

اَللّٰھُمَّ ارْزُقْ اُمَّ سَلَمَةَ بَعْدِیْ رَجُلاً خَیْرًا مِنِّیْ لاَ یُحْزِنُھَا وَلاَ یُؤْذِیْھَا.
(الٰہی! میرے بعد ام سلمہ کو ایسا خاوند عطا کرنا جو مجھ سے بہتر ہو۔جو اسے نہ کوئی غم دے اور نہ ہی تکلیف۔)

اس دعا کے بعد حضرت ابو سلمہؓ کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔جانِ دو عالم ﷺ نے اپنے مبارک ہاتھوں سے ان کی آنکھیں بند کیں۔جب ابو سلمہؓ اللہ کو پیارے ہو گئے تو ام سلمہؓ کے دل میں خیال آیا کہ بھلا ابو سلمہ سے بہتر میرے لئے کون ہو سکتا ہے؟ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی---''یا رسول اللہ! میں اپنے لئے کیا دعا کروں؟''

آپ نے فرمایا--- یوں کہو اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلَنَا وَلَه' وَاعْقِبْنِیْ مِنْهُ عُقْبٰی صَالِحَةً. (الٰہی! ہمیں اور اسے بخش دے اور اس کی مناسبت سے میرا انجام بہتر ہو۔)

میں نے یہ دعا کی اور اللہ تعالیٰ نے اسے شرف قبولیت بخشا۔ جب میری عدت پوری ہوگئی تو جانِ دوعالم ﷺ نے شادی کی پیش کش کی۔ میں نے عرض کی

''یارسول اللہ! میں ایک غیرت منداور غصے والی عورت ہوں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں کوئی گستاخی نہ ہو جائے اور میرے جملہ نیک اعمال ضائع ہو جائیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں عمر رسیدہ ہوں اور تیسری بات یہ ہے کہ میں کثیرالاولاد ہوں۔''

آپ نے ارشادفرمایا---''جہاں تک تیرے غصے کا تعلق ہے تو میں دعا کروں گا کہ تیرا غصہ جاتا رہے۔رہا تیرے عمر رسیدہ ہونے کا مسئلہ، تو میں بھی تیری ہی طرح عمر رسیدہ ہوں۔رہی بات اولاد کے زیادہ ہونے کی، تو میں نے شادی کی پیش کش ہی اس لئے کی ہے کہ بچوں کی کفالت اپنے ذمے لے کرتمہارا ہاتھ بٹایا جائے۔''

یہ جواب سن کر میرے دل کوانتہائی مسرت ہوئی اور آپ کے حبالۂ عقد میں آ کر اُمّ المؤمنین کا اعزاز حاصل کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے میری اورابوسلمہ کی دعا کوشرف قبولیت عطا کرتے ہوئے میرے لئے نعم البدل کا اہتمام کر دیا۔ یہ مبارک شادی ماہ شوال ۴ ہجری کو ہوئی۔

۞ ۞ ۞

حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ جانِ دوعالم ﷺ روزانہ نماز عصر کے بعد ازواج مطہرات کے حجروں میں تشریف لے جایا کرتے۔ ہر ایک کے پاس باری باری تھوڑی دیر کے لئے تشریف رکھتے، حال دریافت کرتے اور گھریلو ضروریات کے بارے میں سوال کرتے۔آغاز آپ ام سلمہ کے گھر سے کرتے کیونکہ وہ عمر میں دیگر ازواج مطہرات سے بڑی تھیں اوراس دورے کا اختتام میرے حجرے پر ہوتا۔

حضرت ام سلمہؓ علم وفضل کے اعتبار سے ممتاز حیثیت کی حامل تھیں۔ان کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ انہیں جانِ دوعالم ﷺ کے ساتھ غزوۂ مریسیع، غزوۂ خیبر، فتح مکہ، معرکۂ طائف، غزوۂ حنین، وغیرہ میں شریک ہونے کا شرف حاصل ہوا۔اس مبارک تاریخی سفر میں بھی آپ شریک تھیں جس میں صلح حدیبیہ یا بیعت رضوان کا واقعہ پیش آیا تھا۔

حضرت ام سلمہؓ کو دینی علوم میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ تین سو ستاسی احادیثِ رسول زبانی یاد تھیں۔ رضاعت اور طلاق کے مسائل پر ان کی گہری نظر تھی۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ بعض شرعی احکام کے بارے میں ان سے دریافت کیا کرتے تھے۔ جن صحابہ کرامؓ کا فتویٰ چلتا تھا ان میں حضرت ام سلمہؓ کا نام بھی آتا ہے۔

حضرت ام سلمہؓ نے لمبی عمر پائی۔ خلافت راشدہ کا پورا دوران کی نظروں کے سامنے گزرا۔ وصال نبوی کے بعد امہات المؤمنین میں سب سے پہلے حضرت زینب بنت جحشؓ نے وفات پائی۔ یہ حضرت عمر بن خطابؓ کے دور خلافت میں اللہ کو پیاری ہوئیں اور سب ازواج مطہراتؓ کے بعد حضرت ام سلمہؓ نے وفات پائی۔ یہ یزید بن معاویہ کا دورِ حکومت تھا۔ نوے سال کی عمر میں اور ایک روایت کے مطابق ۸۴ سال کی عمر میں ۶۲ ہجری میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ وفات سے پہلے انہوں نے وصیت کی تھی کہ میری نماز جنازہ ابو ہریرہؓ پڑھائیں۔ انہیں امہات المؤمنینؓ کے پہلو میں جنت البقیع کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔

رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنۡهَا

اُمُّ المؤمنین سیّدہ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا

حضرت زینبؓ کے والد جحش ابن ریاب خاندان بنی اسد کے ایک معزز فرد تھے۔ والدہ ماجدہ کا اسم گرامی اُمیمہ تھا جو حضرت عبدالمطلب کی صاحبزادی تھیں۔ اس لحاظ سے حضرت زینبؓ جانِ دوعالم ﷺ کی حقیقی پھوپھی زاد بہن تھیں۔ جب اس جہانِ رنگ و بو میں پیدا ہوئیں تو اس وقت جانِ دوعالم ﷺ کی عمر مبارک ۲۱ر برس تھی۔ آپ کے سامنے وہ پلیں بڑھیں اور جوان ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ نے سیرت وصورت دونوں لحاظ سے ان کو خوب نوازا تھا۔ نسوانی حسن و جمال اور سلیقہ شعاری میں اپنے دور کی کسی خاتون سے کم نہ تھیں۔ قد مبارک نہایت مناسب تھا۔ موزوں اندام اور خوبصورت تھیں۔ ان کا خاندان ہجرت کر کے مدینہ منورہ آیا تو وہ بھی ساتھ آئیں اور اپنے آپ کو جانِ دوعالم ﷺ کی کفالت میں دے دیا۔ خاصی عمر ہو چکی تھی مگر ابھی تک شادی نہیں ہوئی تھی۔ آپ نے ان کے لئے شوہر کے طور پر حضرت زیدؓ کو منتخب کیا حالانکہ حضرت زیدؓ کی اس سے پہلے حضرت اُم ایمنؓ سے شادی ہو چکی تھی اور ان سے ایک بیٹا اسامہ بھی پیدا ہو چکا تھا۔ (۱) حضرت زیدؓ کا حضرت زینبؓ کے لئے انتخاب کرنے کی اصل وجہ یہ تھی کہ عرب میں آزاد اور غلام میں بہت زیادہ طبقاتی فرق تھا۔ غلام کو ہمیشہ حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور اس عہد کے رسم ورواج کے مطابق اشراف کی بیٹیاں آزاد شدہ غلاموں سے نکاح اپنی توہین سمجھتی تھیں۔ جانِ دوعالم ﷺ چاہتے تھے کہ اس قسم کے بے بنیاد رسمی تصورات کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا جائے اور تعصب وعصبیت کے پردے مکمل طور پر چاک کر دیئے جائیں۔ چنانچہ خاندانی بڑائی اور برتری کے زعم پر مبنی اس جاہلانہ رسم کو ختم کرنے کے لئے آپ نے پہل اپنے خاندان سے کرنا چاہی اور اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینب بنت جحش کی شادی اپنے منہ بولے بیٹے حضرت زیدؓ سے کرنے کا ارادہ فرمایا۔

---

(۱) حضرت زید کے حالات سیدالورٰی، جلد اوّل میں گزر چکے ہیں۔

حضرت زیدؓ اگر چہ ان گنت خوبیوں کے مالک اور نامور سپہ سالار تھے مگر تھے تو ایک آزاد کردہ غلام، اس لئے حضرت زینبؓ نے کہا

''یا رسول اللہ! میں زید کو پسند نہیں کرتی کیونکہ میں ایک قریشی خاتون ہوں اور نسب کے لحاظ سے اس سے بہتر ہوں۔''

حضرت زینبؓ کے گھر والے بھی اس رشتہ کو پسند نہیں کرتے تھے اور ان کے بھائی حضرت عبداللہ بن جحشؓ بھی اپنی بہن کے ہمنوا تھے۔ مگر جانِ دو عالم ﷺ نے حضرت زینبؓ سے کہا کہ میں زیدؓ کو تمہارے لئے پسند کرتا ہوں۔

حضرت زینبؓ نے کہا---''یا رسول اللہ! اس بارے میں غور و فکر کے لئے مجھے کچھ مہلت عنایت فرمائیں۔''

ایسی باتیں ہو رہی تھیں کہ جبرائیل علیہ السلام وحی لے کر حاضر ہوئے اور سورہ احزاب کی آیت نازل ہوئی جس کا ترجمہ ہے:

''کسی مسلمان مرد و عورت کو حق نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے میں فیصلہ فرما دے تو ان کو اپنے معاملہ میں کوئی اختیار رہے اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی بلاشبہ وہ کھلی گمراہی میں مبتلا ہوا۔''

جب اس آیت کو سیّدہ زینبؓ اور ان کے دونوں بھائیوں نے سنا تو فوراً بولے ''ہم راضی ہیں۔ ہماری کیا مجال ہے کہ ہم اپنے اختیار کو درمیان میں لائیں اور معصیت کا ارتکاب کریں۔''

اس کے بعد خود جانِ دو عالم ﷺ نے نکاح پڑھایا اور حضرت زیدؓ کی طرف سے دس دینار اور ساٹھ درہم مہر کے طور پر ادا کئے۔

اس وقت تک حضرت زیدؓ جانِ دو عالم ﷺ کے گھر میں ایک فرد کی حیثیت سے رہتے تھے لیکن اس شادی کے بعد ان کی رہائش کے لئے آپ نے علیحدہ مکان کا بندوبست کیا اور اس نئے جوڑے کی ضروریات کے لئے کھانے پینے کے سامان کے علاوہ کپڑے بھی بھجوائے۔

اپنے ہی آزاد کردہ غلام سے اپنی پھوپھی زاد حضرت زینبؓ بنت جحش کی شادی کر کے آپ نے دنیا میں جو مساوات کی تعلیم رائج کی اور پست و بلند کو جس طرح عملی طور پر ایک جگہ لا کھڑا کیا، اس کی مثال پیش کرنے سے زمانہ قاصر ہے کیونکہ قریش اور خصوصاً خاندان بنی ہاشم کو تولیتِ کعبہ کی وجہ سے عرب میں جو درجہ حاصل تھا اس کے لحاظ سے شاہانِ یمن بھی ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتے تھے؛ چہ جائیکہ ایک آزاد کردہ غلام، لیکن اسلام نے محض تقویٰ کو بزرگی کا معیار قرار دیا اور نسب پر فخر و غرور کو جاہلیت کا شعار ٹھہرایا، اس لئے جانِ دو عالم ﷺ کو حضرت زیدؓ کے ساتھ حضرت زینبؓ کا نکاح کر دینے میں کوئی تکلف نہیں ہوا۔

حضرت زیدؓ پر یوں تو آپ کے بے شمار احسانات تھے مگر تین عنایتیں بہت ہی نمایاں ہیں۔ پہلے ان کو غلامی سے آزادی عطا کی، پھر ان کو اپنا منہ بولا بیٹا بنایا اور آخر میں قریش کی نہایت معزز خاتون اور حضرت عبدالمطلب کی نواسی کو ان کی بیوی بنا دیا مگر افسوس کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ جانِ دو عالم ﷺ کے اس تیسرے بڑے احسان کی کما حقہٗ قدر نہ کر سکے اور ابھی سال سے کچھ ہی اوپر عرصہ گزرا تھا کہ آپ کے منع کرنے کے باوجود انہوں نے حضرت زینبؓ کو طلاق دے دی۔

ظاہر ہے کہ اس سے جانِ دو عالم ﷺ بہت آزردہ ہوئے ہوں گے کیونکہ آپ نے ہی اصرار کر کے حضرت زینبؓ کی شادی حضرت زید سے کرائی تھی اس لئے آپ نے مناسب سمجھا کہ اپنی اس بے سہارا پھوپھی زاد کو اپنے عقد میں لے لیں، کیونکہ اس طرح ایک تو اُمّ المؤمنین کا شرف پا کر اس غم کی تلافی ہو جائے گی جو طلاق کی وجہ سے حضرت زینب کو لاحق تھا اور دوسرے منہ بولے بیٹے کی بیوی کو حقیقی بہو کی طرح سمجھنے کا جو غلط خیال عربوں میں رائج تھا اس کا قلع قمع ہو جائے گا۔(۱) چنانچہ جب حضرت زینب کی طلاق کے بعد

---

(۱) واضح رہے کہ جزیرۃ العرب میں دیگر ممالک کی طرح بچے گود لینے کا رواج تھا اور اسے منہ بولا بیٹا بنا لیتے تھے۔ اس رسم کے تحت جس بچے کو منہ بولا بیٹا بنا لیا جاتا تھا اس کے حقوق وہی ہوتے تھے جو سگے بیٹوں کے ہوتے تھے۔ حقیقی اولاد کی طرح برتاؤ کیا جاتا تھا۔ وراثت بھی ملتی تھی۔ ☜

عدت پوری ہوگئی تو آپ نے حضرت زیدؓ کے ذریعے ہی حضرت زینبؓ کے پاس اپنے نکاح کے لئے پیغام بھیجا۔ وہ فرماتے ہیں کہ جب میں وہاں پہنچا تو دیکھا کہ زینب آٹا گوندھ رہی ہے۔ میں نے شرماتے ہوئے اپنا رُخ دوسری طرف کرتے ہوئے کہا کہ زینب ! میں تمہارے لئے ایک خوشخبری لے کر آیا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے مجھے یہ پیغام دے کر بھیجا ہے کہ وہ تمہیں اپنے حبالۂ عقد میں لے کر ازواج مطہرات کی فہرست میں شامل کرنا چاہتے ہیں----تمہاری کیا رائے ہے؟

زینب نے بغیر نظریں اُٹھائے آٹا گوندھتے ہوئے کہا کہ میں اپنے اللہ سے مشورہ کرنے کے بعد ہی اس معاملہ میں کچھ کہہ سکتی ہوں۔ اس کے بعد وہ استخارہ کرنے کے لئے مصلے پر کھڑی ہوگئیں۔

جانِ دوعالم ﷺ حضرت عائشہؓ سے مصروف گفتگو تھے کہ اچانک آپ پر وحی کے آثار نمودار ہوئے۔ پھر جب وحی کھل گئی تو آپ فرمانے لگے۔

''کوئی ہے جو زینب کے پاس جا کر بشارت دے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان پر مجھ سے اس کا نکاح کرا دیا ہے۔'' اور پھر سورہ احزاب کی آیات مبارکہ پڑھیں جن کا ترجمہ ہے

منہ بولی ماں اور بہنیں اسی طرح میل جول رکھتی تھیں جس طرح حقیقی بیٹے اور بھائی سے تعلق و واسطہ رکھا جاتا ہے۔ منہ بولے باپ کے مرجانے کے بعد اس کی بیوہ سے نکاح ناجائز سمجھا جاتا تھا جس طرح حقیقی ماں اور بہن سے نکاح حرام ہے۔ جب منہ بولا بیٹا مرجاتا یا اپنی بیوی کو طلاق دے دیتا تو منہ بولے باپ کے لئے وہ عورت اس کی بہو کی طرح سمجھی جاتی تھی۔ اس رسم بد کی وجہ سے وراثت کے اصل حقدار محروم رہ جاتے تھے۔ نیز جن سے نکاح حلال تھا وہ محرم بن جاتے تھے۔ جانِ دوعالم ﷺ اس بری رسم کو ختم کرنا چاہتے تھے مگر لوگوں کے ذہنوں میں رچے ہوئے صدیوں کے تصورات کا صرف زبانی تبلیغ سے خاتمہ نہیں ہوسکتا تھا جب تک آپ اس کا عملی مظاہرہ دنیا کے سامنے پیش نہ کرتے، اور آپ نے ایسا ہی کیا، یعنی منہ بولے بیٹے کی مطلقہ خاتون سے شادی کر کے عملاً واضح کر دیا کہ منہ بولے بیٹے کی بیوی حقیقی بہو کی طرح نہیں ہوتی اور اس سے شادی کرنے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔

''جب زید اس سے اپنی حاجت پوری کر چکا تو (اے نبی!) ہم نے اس مطلقہ خاتون کا نکاح تم سے کر دیا تا کہ مومنوں پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے معاملے میں کوئی تنگی نہ رہے جبکہ وہ ان سے اپنی حاجت پوری کر چکے ہوں اور اللہ کا حکم تو عمل میں آنا ہی چاہیئے۔''

سلمیٰؓ جانِ دو عالم ﷺ کی خادمہ تھیں۔ انہوں نے سنا تو وہ حضرت زینبؓ کے گھر کی طرف دوڑیں، تا کہ ان کو بشارت سنائیں۔ وہاں پہنچیں تو حضرت زینب ہنوز سر بسجود تھیں اور مصروفِ استخارہ تھیں۔ سلمیٰؓ نے کہا

''اے زینب! مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کا نکاح اپنے رسول کے ساتھ آسمانوں پر کر دیا ہے۔''

یہ عظیم ترین خوشخبری سن کر حضرت زینب نے جو زیورات اس وقت پہن رکھے تھے، وہ سلمیٰ کو عطا فرما دیئے اور سجدہ شکر بجا لائیں۔

یہ نکاح ذیقعد ۵ ہجری میں ہوا جبکہ حضرت زینبؓ کی عمر ۳۶ سال تھی۔

جب اللہ تعالیٰ نے جانِ دو عالم ﷺ کا نکاح آسمانوں پر حضرت زینب سے کر دیا تو آپ پیشگی اطلاع کے بغیر ان کے ہاں تشریف لے گئے۔ اس وقت وہ سر برہنہ تھیں۔ جانِ دو عالم ﷺ کو اس طرح اپنے پاس آتے دیکھ کر حیران رہ گئیں اور بولیں

''یا رسول اللہ آپ!؟''

جانِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا--- ''زینب! ہمارا نکاح ہو چکا ہے۔ نکاح کرانے والا خود اللہ جل جلالہ ہے اور جبرائیل گواہ ہیں۔''

اس طرح یہ شادی پایہ تکمیل کو پہنچ گئی۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ اس شادی میں آپ نے ایک بکری ذبح کر کے ولیمہ کا کھانا تیار کروایا۔ حضرت خدیجہؓ کے بعد اس قدر ولیمہ کسی اور زوجہ محترمہ پر نہیں کیا گیا تھا۔

اس پُر مسرت موقعہ پر حضرت انسؓ کی والدہ ماجدہ ام سلیمؓ نے بھی آپ کے لیے حیس (ایک قسم کا حلوہ) تیار کیا جو عمدہ کھجوروں سے بنایا گیا تھا اور ایک لگن میں اتنا بھر دیا جتنا آپ اور آپ کی زوجہ محترمہ کے لئے کافی ہو۔ پھر حضرت انسؓ سے کہا

''یہ رسول اللہ کے پاس لے جاؤ!''

ماں کے حکم کے مطابق حضرت انسؓ کھانے کا برتن لے کر جانِ دو عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی---''یا رسول اللہ! یہ والدہ ماجدہ نے بھیجا ہے۔''

فرمایا---''رکھ دو!''

چنانچہ انہوں نے برتن کو آپ کے اور دیوار کے درمیان رکھ دیا۔

آپ نے پھر ارشاد فرمایا---''ابو بکر، عمر، عثمان، علی اور فلاں فلاں کو بلا لاؤ!''

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ مجھے حیرت ہوئی کہ آپ نے اتنے سارے آدمی بلوا لئے ہیں اور کھانا تھوڑا سا ہے---!

بہر کیف وہ حسب الارشاد سب کو بلا لائے تو پھر حکم ہوا

''اگر کوئی مسجد میں ہو تو اسے بھی بلا لاؤ۔''

چنانچہ حضرت انسؓ مسجد میں نماز پڑھنے والوں اور سونے والوں سب کو بلا لائے۔ حتیٰ کہ گھر لوگوں سے بھر گیا۔ جانِ دو عالم ﷺ نے حضرت انسؓ کو پھر مخاطب کر کے دریافت فرمایا---''کوئی باقی تو نہیں رہا؟''

''نہیں یا رسول اللہ!'' حضرت انسؓ نے جواب دیا۔

فرمایا---''اب لگن اُٹھا لاؤ!''

چنانچہ انہوں نے لگن اُٹھا کر جانِ دو عالم ﷺ کے سامنے رکھ دیا آپ نے اس میں تین انگلیاں رکھیں اور اسے دبایا، پھر لوگوں سے فرمایا---''بسم اللہ کر کے کھاؤ!''

حضرت انسؓ فرماتے ہیں---''میں نے دیکھا کہ کھجوروں کا بنا ہوا حیس ابل رہا تھا جیسے چشموں کا پانی ابلتا ہے۔ چنانچہ گھر اور حجرے میں بھرے تمام لوگوں نے پیٹ بھر کر کھایا اور لگن میں اتنا ہی باقی تھا جتنا میں لے کر آیا تھا۔ پھر میں نے اسے آپ کی زوجہ مطہرہ کے سامنے لے جا کر رکھ دیا اور یہ حیرت انگیز مشاہدہ جو میں نے کیا تھا اپنی والدہ محترمہ کو سنانے کے لئے گھر چلا گیا اور جو دیکھا تھا ان کے گوش گزار کیا تو وہ بولیں

''تعجب نہ کرو۔ اگر آپ تمام مدینہ والوں کو کھلانا چاہتے تو انہیں بھی کافی ہو جاتا۔''

پھر پوچھا---''تمہارے اندازے کے مطابق کتنے آدمی ہوں گے؟''

میں نے جواب دیا---''تین سو آدمی۔''

کھانا کھانے کے بعد کچھ لوگ وہاں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے اور اس قدر دیر لگائی کہ جانِ دوعالم ﷺ کو کوفت ہوئی لیکن فرطِ مروت سے خاموش رہے۔

اسی مکان میں جہاں وہ لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے حضرت زینبؓ بھی بیٹھی ہوئی تھیں اور ان کا چہرہ مبارک دیوار کی طرف تھا۔ جانِ دوعالم ﷺ بار بار اندر جاتے اور باہر آتے تھے۔ آپ کی آمد و رفت کو دیکھ کر وہاں موجود لوگوں کو اس امر کا احساس ہوا تو اُٹھ کر چلے گئے۔ اس موقع پر جانِ دوعالم ﷺ کے گھر جانے، وہاں بیٹھنے، کھانا کھانے اور پھر اُٹھ کر چلے جانے کے آداب اور حجاب کے احکام پر مشتمل وحی نازل ہوئی جو سورہ احزاب کا حصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے

''اے ایمان والو! نبی کے گھروں میں مت جایا کرو، سوائے اس کے کہ تم کو کھانے کے لئے اجازت دی جائے۔ (مگر اس صورت میں بھی اتنے پہلے نہ چلے جایا کرو کہ وہاں بیٹھ کر) کھانے کی تیاری کے منتظر رہو؛ بلکہ جب تم کو بلایا جائے تب جایا کرو۔ پھر جب کھانا کھا چکو تو اُٹھ کر چلے جایا کرو اور باتوں میں جی لگا کر مت بیٹھے رہا کرو۔ اس بات سے نبی کو تکلیف ہوتی ہے مگر وہ تمہارا لحاظ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ صاف بات کہنے سے نہیں ہچکچاتا، اور جب تم ازواج مطہرات سے کوئی چیز مانگو تو پردے کے پیچھے سے مانگو۔''

آیات حجاب کے بعد جانِ دوعالم ﷺ نے دروازے پر پردہ لٹکا دیا اور لوگوں کو گھر کے اندر جانے کی ممانعت ہوگئی۔

اُمّ المؤمنین حضرت زینب بنتِ جحشؓ کے دو نکاح ہوئے اور دونوں اس لحاظ سے بہت مبارک ثابت ہوئے کہ پہلے نکاح سے بندہ و آقا کا امتیاز ختم ہوا اور عملاً واضح ہوگیا کہ انتہائی معزز خاتون کا نکاح ایک آزاد کردہ غلام سے بھی ہوسکتا ہے اور دوسرے نکاح سے

جاہلیت کی یہ رسم کہ متبنیٰ اصلی بیٹے کا حکم رکھتا ہے، مٹ گئی اور جانِ دو عالم ﷺ نے اپنے عمل سے ثابت کردیا کہ منہ بولے بیٹے کی مطلقہ سے شادی کی جاسکتی ہے۔

اس شادی کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کے لئے وحی الٰہی آئی اور ولی، گواہوں، خطبے اور معروف طریقے سے ایجاب و قبول کے بغیر محض وحی کی بنا پر یہ نکاح پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔

اسی بنا پر اُمّ المؤمنین حضرت زینبؓ دیگر ازواج کے مقابلہ میں فخر کیا کرتی تھیں اور کہا کرتی تھیں کہ تم سب کا نکاح گھر والوں نے کیا جبکہ میرا نکاح اللہ تعالیٰ نے سات آسمانوں سے اوپر پڑھایا۔

❁❁❁

اس شادی کے بعد منافقین نے حیرت کا انداز اپناتے ہوئے جگہ جگہ یہ ہوائیاں اڑانی شروع کردیں کہ دیکھو، غضب خدا کا---! ہمیں تو منع کیا جاتا ہے کہ اپنے بیٹوں کی طلاق یافتہ بیویوں سے نکاح نہ کرنا اور خود اپنے بیٹے زید کی مطلقہ بیوی سے شادی کرلی۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی

﴿ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ وَ كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۝ ﴾

(لوگو! محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں مگر وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔)

اللہ تعالیٰ نے لے پالک بیٹوں کے بارے میں وضاحتی حکم بھی اسی شادی کے موقع پر نازل فرمایا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے

﴿ وَ مَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَ هُوَ يَهْدِی السَّبِيْلَ ۝ اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ

(اور نہ اس نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا حقیقی بیٹا بنایا ہے۔ یہ تو وہ باتیں ہیں جو تم لوگ اپنے منہ سے نکال دیتے ہو اور اللہ حق بات کہتا ہے اور وہی صحیح راستے کی

طرف راہنمائی کرتا ہے۔ منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں کی نسبت سے پکارو، یہ اللہ کے نزدیک زیادہ منصفانہ بات ہے۔)

❁❁❁

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ قدر ومنزلت کے اعتبار سے زینب میرے ساتھ مقابلہ کیا کرتی تھی۔ میں نے اپنی زندگی میں اس سے بڑھ کر کوئی دوسری صدقہ کرنے والی، صلہ رحمی سے پیش آنے والی اور اللہ کا تقرب حاصل کرنے والی نہیں دیکھی۔ فرماتی ہیں کہ جس دن مجھ پر جھوٹا الزام عائد کیا گیا، میرے خلاف مدینے میں طوفانِ بدتمیزی بپا کیا گیا اور منافقین کی ریشہ دوانیوں سے فضا اتنی مکدر ہوگئی کہ رسول اللہ ﷺ بھی پریشان ہو گئے تو ایک روز زینب سے میرے بارے میں پوچھا کہ عائشہ تیری نظر میں کیسی ہے؟ تو اس نے برجستہ کہا---''یارسول اللہ! میں اس بہتان عظیم سے اپنے کانوں، آنکھوں اور زبان کو محفوظ رکھنا چاہتی ہوں۔ بخدا میں عائشہ کو ایک بلند کردار خاتون دیکھتی ہوں۔ وَمَا عَلِمۡتُ فِيۡهَا اِلَّا خَيۡرًا (اور خوبی کے سوا اور کچھ میں نے اس میں نہیں جانا)

اگر وہ چاہتیں تو اس موقعہ سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے دربارِ رسالت میں اپنی حریف کو پچھاڑ سکتی تھیں لیکن صحبتِ رسول ﷺ نے ان کمزوریوں سے ان کو بالا کر دیا تھا۔ حضرت عائشہؓ نے ان کے اس احسان کو زندگی بھر یاد رکھا۔

دنیا سے رخصت ہوجانے کے بعد کسی کی خوبیوں کا تذکرہ اسے زندہ جاوید بنا دیتا ہے۔

حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی تمام بیویوں کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا---''تم میں سب سے پہلے، وہ مجھ سے آ کر ملے گی جس کے ہاتھ سب سے لمبے ہوں گے۔''

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ یہ دیکھنے کے لئے کہ کس کے ہاتھ زیادہ لمبے ہیں ہم اپنے اپنے ہاتھوں کو ناپا کرتی تھیں مگر تمام ازواج میں سب سے پہلے جب زینب کا انتقال ہوا تو ہمیں یہ نکتہ معلوم ہوا کہ ہاتھوں کی لمبائی سے آپ کی مراد فیاضی اور سخاوت تھی۔ نیز فرماتی ہیں کہ میں نے کوئی عورت زینب سے بڑھ کر دیندار، پرہیزگار، راست گفتار، فیاض،

سخی، مخیّر اور اللہ جل جلالہ کے قرب کی متلاشی نہیں دیکھی۔

حضرت زینبؓ نے اپنے گھر کے ایک کونے میں ایک عبادت گاہ بنا رکھی تھی جس میں وہ اکثر اوقات عبادت میں مصروف رہتیں۔ گاہے بگاہے جانِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس میں نماز ادا کیا کرتے تھے۔ حضرت زینب کا معمول یہ تھا کہ کوئی کام کرنے سے پہلے استخارہ ضرور کیا کرتی تھیں۔

حضرت زینبؓ کا انتقال فاروقِ اعظمؓ کے دورِ خلافت میں ہوا۔ اس وقت ان کی عمر ۵۳ ر سال تھی۔ جب انہوں نے موت کے آثار دیکھے تو لواحقین سے کہا کہ میرا آخری وقت آ چکا ہے اور میں نے اپنا کفن خود تیار کر رکھا ہے۔ اگر عمر میرے لئے کفن بھیجیں تو ان دونوں میں سے ایک کو اللہ کی راہ میں دے دیں۔

حضرت عمرؓ نے نماز پڑھائی۔ اسامہ بن زیدؓ، محمد بن عبداللہ بن جحشؓ، عبداللہ بن ابی احمد بن جحشؓ اور محمد بن طلحہ بن عبداللہؓ قبر میں اُترے۔ یہ تمام آپ کے قریبی رشتہ دار تھے۔ اس طرح اس جنتی خاتون کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔

آئندہ صفحات پر ایک خصوصی مقالہ پیش خدمت ہے جس کے بارے میں بحمداللہ یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ اس موضوع پر ایسی تحقیق اس سے پہلے آپ کی نظر سے نہیں گزری ہو گی۔

قارئینِ کرام! جیسا کہ آپ جانتے ہیں اس کتاب میں ہمارا موضوع سیرت ہے، نہ کہ تفسیر، لیکن کچھ آیات کریمہ سیرتِ نبویہ کے ساتھ اس قدر جڑی ہوئی ہیں کہ ان پر مفصل گفتگو کئے بغیر چارا نہیں ہوتا؛ خصوصاً اس صورت میں جب تفسیری روایات سے سیرت کا صاف وشفاف چشمہ گدلا ہو رہا ہو اور جانِ دو عالم ﷺ کی ردائے عصمت وطہارت داغدار ہو رہی ہو۔

اُمّ المؤمنین حضرت زینب بنتِ جحشؓ کی جانِ دو عالم ﷺ کے ساتھ شادی کے سلسلے میں نازل ہونے والی ایک آیت کی تفسیر میں بھی بعض مفسرین نے ایسی ہوش ربا داستانیں رقم کی ہیں، جنہیں پڑھ کر آدمی کا دل لرز جاتا ہے اور زبان پر بے ساختہ **استغفر اللہ، معاذ اللہ** اور **لاحول و لا قوۃ الا باللہ** جیسے کلمات جاری ہو جاتے ہیں۔

آیئے! دل پر جبر کر کے ان تفسیری روایات پر ایک نظر ڈالتے ہیں جنہیں لکھ کر لکھنے والے آپ بھی شرمسار ہوئے اور ہمیں بھی شرمسار کیا۔

تو لیجئے! پہلے اس آیت کریمہ کو ملاحظہ کیجئے جس کی تفسیر وتشریح کے لئے ایک عجیب وغریب عشقیہ افسانہ گھڑا گیا۔

﴿وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیْ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ اَنْعَمْتَ عَلَیْہِ اَمْسِکْ عَلَیْکَ زَوْجَکَ وَاتَّقِ اللّٰہَ وَتُخْفِیْ فِیْ نَفْسِکَ مَا اللّٰہُ مُبْدِیْہِ وَ تَخْشَی النَّاسَ ج وَاللّٰہُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰہُ ط فَلَمَّا قَضٰی زَیْدٌ مِّنْھَا وَ طَرًا زَوَّجْنٰکَھَا لِکَیْ لَایَکُوْنَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ حَرَجٌ فِیْ اَزْوَاجِ اَدْعِیَآءِ ھِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْھُنَّ وَطَرًا ط وَکَانَ اَمْرُ اللّٰہِ مَفْعُوْلًا o﴾ (قرآن مجید، پارہ ۲۲، سورہ احزاب، آیت ۳۶)

تمام مفسرین جس نقطۂ نظر پر متفق ہیں اس کے مطابق ترجمہ یوں ہوگا۔

(اور یاد کرو (اے نبی!) جب تم اس شخص سے جس پر اللہ نے انعام فرمایا اور تم نے بھی انعام کیا، کہہ رہے تھے---''اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھ اور اللہ سے ڈر!'' اور (اے نبی!) تم چھپا رہے تھے اپنے دل میں اس چیز کو جسے اللہ ظاہر کرنے والا تھا اور تم ڈر

رہے تھے لوگوں سے حالانکہ اللہ تعالیٰ زیادہ حقدار ہے اس بات کا کہ تم اس سے ڈرو۔ پس جب زید اس سے (یعنی اپنی بیوی سے) ضرورت پوری کر چکا تو ہم نے تمہاری شادی اس کے ساتھ کر دی تا کہ اہل ایمان پر ان کے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے بارے میں کوئی تنگی نہ ہو، جبکہ وہ (منہ بولے بیٹے) اپنی بیویوں سے ضرورت پوری کر لیں، اور اللہ کا حکم ہر حال میں پورا ہو کر رہتا ہے۔)

مفسرین کے مطابق وہ شخص جس پر اللہ اور اللہ کے رسول نے انعامات کئے، حضرت زید ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے انعامات تو ان پر ظاہر ہیں کہ مختلف مراحل سے گزار کر اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے محبوب کی خدمت میں پہنچا دیا اور نورِ ایمان سے ان کے دل کو منور کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ کے احسانات بھی ان پر بہت ہیں۔ انہیں آزاد کیا، منہ بولا بیٹا بنایا اور اپنی پھوپھی زاد زینب کو ان کے ساتھ بیاہ دیا۔ مگر کچھ عرصے بعد زید رسول اللہ ﷺ کے پاس شکایت لے کر آئے کہ زینب میرے ساتھ بدزبانی کرتی ہے اور ہر وقت اپنی خاندانی برتری جتلاتی رہتی ہے اس لئے میں اس کو طلاق دینا چاہتا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے بظاہر تو زید کو طلاق دینے سے منع کیا اور کہا کہ اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھ اور اللہ سے ڈر! مگر درحقیقت زینب آپ کو اچھی لگنے لگی تھیں اور آپ خود ان سے شادی کرنا چاہتے تھے اس لئے دل میں آپ نے یہ خواہش چھپا رکھی تھی کہ زید جلد از جلد طلاق دے مگر یہ بات آپ زید سے اس خوف اور ڈر کی وجہ سے نہ کہہ سکے کہ اس صورت میں لوگ اعتراض کریں گے اور طعنے دیں گے کہ زید سے اس کی بیوی چھڑوا دی اور خود اس کے ساتھ شادی رچا لی---!!

مفسرین کی ایک جماعت کہتی ہے کہ مندرجہ بالا آیات میں اللہ تعالیٰ آپ کے اس طرزِ عمل پر عتاب ظاہر کرتے ہوئے کہہ رہا ہے کہ بظاہر تو اے نبی! تم زید کو طلاق نہ دینے کا کہہ رہے تھے مگر دل میں تم یہی چاہتے تھے کہ زید طلاق دے دے تا کہ تم زینب کے ساتھ شادی کر سکو لیکن اس بات کو تم چھپا رہے تھے، حالانکہ اللہ تعالیٰ اس بات کو ظاہر کرنے والا تھا، یعنی بالآخر زید نے زینب کو طلاق دینی تھی اور تمہاری اس کے ساتھ شادی ہونی تھی، اس لئے جب زید طلاق دینے کا ارادہ ظاہر کر رہا تھا تو تمہیں اس سے یہ نہیں کہنا چاہیے تھا کہ اپنی بیوی

کو اپنے پاس رکھ۔ یہ بات تم نے محض لوگوں کے ڈر کی وجہ سے کہہ دی، حالانکہ لوگوں کی بنسبت اللہ زیادہ حقدار ہے اس کا کہ تم اس سے ڈرو۔

یہ مفہوم ہے آیت کے ان الفاظ کا---وَتُخْفِیْ فِیْ نَفْسِکَ مَا اللّٰہُ مُبْدِیْہِ وَ تَخْشَی النَّاسَ ج وَاللّٰہُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰہُ ط

(اور چھپا رہے تھے تم اپنے دل میں اس چیز کو جسے اللہ ظاہر کرنے والا تھا اور ڈرتے تھے تم لوگوں سے حالانکہ اللہ زیادہ حقدار ہے اس کا کہ تم اس سے ڈرو۔)

اس تفسیر کے بارے میں علامہ قرطبی لکھتے ہیں---فَذَھَبَ قَتَادَۃُ وَ ابْنُ زَیْدٍ وَ جَمَاعَۃٌ مِنَ الْمُفَسِّرِیْنَ مِنْھُمُ الطِّبْرِیُ وَغَیْرُہ،---

یعنی قتادہ، ابن زید اور مفسرین کی ایک جماعت نے، جن میں طبری وغیرہ بھی شامل ہیں یہی تفسیر بیان کی ہے۔ لیکن اس تفسیر میں یہ الجھن ہے کہ اگر زینب رسول اللہ ﷺ کو اتنی پسند آ گئی تھیں کہ آپ ان سے شادی کرنے کے لئے بیتاب تھے تو پھر آپ نے پہلے ہی ان کے ساتھ شادی کیوں نہ کر لی---! یہ عجیب بات ہے کہ جب تک وہ کنواری تھیں اور آپ کے زیرِ کفالت ہونے کی وجہ سے ہر وقت آپ کی نظروں کے سامنے رہتی تھیں، اس دور میں تو آپ کو ان سے شادی کا خیال نہ آیا اور خود ہی اصرار کر کے ان کا نکاح زید سے کرا دیا مگر جب وہ شادی شدہ ہو گئیں اور زید کی منکوحہ بن گئیں تو اس وقت آپ کے دل میں ان کی محبت جاگ اٹھی اور آپ کی دلی تمنا یہ ہو گئی کہ زید جلد از جلد طلاق دیں تا کہ آپ ان سے شادی کر سکیں---یہ کیا گورکھ دھندا ہے---؟!!

اس کا جواب ان مفسرین اور مؤرخین نے یہ دیا ہے کہ زید سے شادی کے بعد ایک دن اتفاقاً رسول اللہ ﷺ نے زینب کو ایسے حال میں دیکھ لیا تھا کہ اس سے پہلے اس حالت میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس بنا پر آپ ان کی محبت میں گرفتار ہو گئے تھے۔

اس دعوے کا ثبوت وہ بیہودہ روایت ہے جو مختلف الفاظ کے ساتھ متعدد تفسیروں اور تاریخوں میں مذکور ہے۔ ہم انتہائی ناگواری اور سخت بیزاری کے ساتھ اس کا ترجمہ پیش کر رہے ہیں۔

ابو عبداللہ محمد ابن احمد الانصاری القرطبیؒ اپنی تفسیر الجامع لاحکام القرآن میں بیان کرتے ہیں کہ

''مقاتل نے کہا ہے کہ جب نبی ﷺ نے زینب کی شادی زید سے کردی تو وہ زید کے پاس کچھ عرصہ تک رہیں۔ پھر ایک دن نبی ﷺ زید کو تلاش کرتے ہوئے ان کے گھر آئے تو آپ نے زینب کو کھڑے دیکھا۔ اور زینب گوری چٹی، خوبصورت اور گدرائے ہوئے بدن والی ایک بھرپور قریشی عورت تھیں۔ انہیں دیکھ کر رسول اللہ ﷺ کو ان سے محبت ہوگئی اور آپ نے کہا---''سُبْحَانَ اللهِ! مُقَلِّبِ الْقُلُوب'' (پاک ہے اللہ، دلوں کو پھیرنے والا) یہ تسبیح زینب نے بھی سن لی اور جب زید آئے تو ان کو یہ بات بتائی۔ زید سمجھ گئے اور رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ یارسول اللہ! مجھے زینب کو طلاق دینے کی اجازت دیجئے کیونکہ اس میں کبر ہے، وہ مجھ پر برتری جتاتی ہے اور اپنی زبان سے مجھے دکھ پہنچاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا---''اَمْسِکْ عَلَیْکَ زَوْجَکَ وَاتَّقِ الله'' اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھ اور اللہ سے ڈر!''

اس روایت میں کچھ باتیں مبہم تھیں، مثلاً یہ کہ زینب کی دلکش رنگت، خوبصورتی، بدن کی شادابی اور بھرپور قریشی عورت ہونے کے بارے میں تو رسول اللہ ﷺ کو اس وقت بھی معلوم تھا جب وہ کنواری تھیں، پھر اس زمانے میں آپ کو ان سے محبت کیوں نہ ہوئی؟ ایک اور الجھن یہ بھی تھی کہ اس روایت کے مطابق جب زینب نے رسول اللہ ﷺ کی تسبیح والی بات زید کو بتائی تو وہ سمجھ گئے---کیا سمجھ گئے؟

ان الجھنوں کو دور کرنے کے لئے ایک اور روایت سے مدد لی گئی ہے۔

''اور کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہوا کو بھیجا تو اس نے زینب سے پردہ ہٹا دیا اور زینب اس وقت عام گھریلو لباس میں تھیں۔ جب رسول اللہ ﷺ نے ان کو اس حال میں دیکھا تو وہ آپ کے دل میں کھب گئیں اور زینب بھی سمجھ گئیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے من کو بھا گئی ہوں۔ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب رسول اللہ زید کو ڈھونڈتے ہوئے وہاں آئے---پھر جب زید گھر آئے تو جو کچھ پیش آیا تھا، زینب نے ان سے بیان کیا، اس

وقت زید نے زینب کو طلاق دینے کا ارادہ کرلیا۔''

یہ دوسری روایت کہاں سے آئی ہے---؟ اس کے بارے میں علامہ قرطبی نے کچھ نہیں بیان کیا، صرف ''کہا گیا ہے'' کہہ کر روایت ذکر کردی ہے۔ ہم اگر چاہتے تو اس کی اصلیت کا کھوج لگا سکتے تھے مگر اس تکلف میں اس لئے نہیں پڑے کہ اس روایت کا حرف حرف اور لفظ لفظ پکار رہا ہے کہ یہ جھوٹ ہے، کذب ہے، افتراء ہے اور بہتانِ عظیم ہے۔ جس بدنہاد نے بھی یہ افسانہ گھڑا ہے، اس نے نہ تو اپنی اور تمام مؤمنین کی ماں کی عزت کا پاس کیا، نہ ہی جانِ دو عالم ﷺ جیسے پیکرِ شرم و حیا کی جانب ایسی باتیں منسوب کرتے ہوئے اسے کچھ حیا آئی--- بلکہ اس نے تو اللہ تعالیٰ کو بھی اس گھناؤنی عشقیہ داستان میں گھسیٹ لیا اور کہہ دیا---''اللہ تعالیٰ نے ہوا کو بھیجا تو اس نے زینب سے پردہ ہٹا دیا۔'' گویا اللہ تعالیٰ بھی اس عشق کو پروان چڑھانے کے منصوبے میں شامل تھا---!!!!

استغفر اللہ، معاذ اللہ، لاحول و لا قوۃ الا باللہ، لَعْنَةُ اللهِ عَلَى الْكَاذِبِيْن٥

کسی مجہول یاوہ گو کی گھڑی ہوئی یہ گھٹیا اور لغو روایت، جسے علامہ قرطبی نے ''کہا گیا ہے'' سے بیان کیا ہے، ایسا کھلا اور شرمناک جھوٹ ہے کہ اس پر مزید کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔ رہی پہلی روایت، تو اس میں اگرچہ لغویت کچھ کم ہے مگر ہے وہ بھی محض کذب و افتراء، کیونکہ علامہ قرطبی نے اس کو مقاتل کے حوالے سے نقل کیا ہے اور مقاتل ابنِ سلیمان ایسا مفسر ہے جو اسرائیلی روایات کا شیدائی اور مانا ہوا کذاب و دروغ گو ہے۔(۱)

آیئے، مقاتل کے بارے میں محدثین کی آراء ملاحظہ فرمایئے اور دیکھئے کہ کہتی ہے خلقِ خدا اس کو غائبانہ کیا---!

وکیع نے کہا---''کذاب تھا۔'' یحییٰ نے کہا---''اس کی حدیث کسی کام کی نہیں ہے۔'' جوزجانی نے کہا---''دجال اور بے باک تھا۔'' ابن حبان نے کہا---

---

(۱) واضح رہے کہ مشہور ''مقاتل'' دو ہیں۔ ایک مقاتل ابنِ حیان اور دوسرا مقاتل ابنِ سلیمان۔ ابنِ حیان محدث ہے اور ابنِ سلیمان مفسر۔ محدث اکثر کے نزدیک سچا ہے، جبکہ مفسر جھوٹا ہے۔

''قرآن کی تفسیر میں یہود و نصاریٰ سے وہ روایتیں لیا کرتا تھا جو ان کی کتابوں کے موافق ہوتی تھیں اور اللہ تعالیٰ کو مخلوق جیسا سمجھتا تھا اور حدیث میں جھوٹ بولتا تھا۔'' خارجہ ابن مصعب (تو اس سے کچھ زیادہ ہی نالاں تھے) کہتے ہیں---''میں کسی یہودی کا خون بہانے کا بھی روادار نہیں ہوں لیکن مقاتل اگر مجھے تنہائی میں مل گیا تو اس کا پیٹ ضرور چاک کردوں گا۔''(۱)

یہود و نصاریٰ کی بیان کردہ روایتوں کو تفسیر و حدیث کا حصہ بنانے میں مقاتل جیسے چالبازوں اور مکاروں نے ہی بھرپور کردار ادا کیا ہے اور آج حالت یہ ہے کہ حدیث و تفسیر کی شاید ہی کوئی کتاب ہو جو ان جعلسازوں کی دسیسہ کاریوں سے بچی ہوئی ہو۔

اَللّٰھُمَّ ارْحَمْ!

✿✿✿

اللہ بھلا کرے کچھ مفسرین کا کہ انہوں نے ان روایات کو اور ان روایات پر مبنی تفسیر کو شانِ رسالت کے منافی سمجھتے ہوئے ترک کردیا ہے اور اس سے یکسر مختلف تفسیر بیان کی ہے۔(۲)

---

(۱) میزان الاعتدال، ج ۳، ص ۱۹۶، ۱۹۷ سے ماخوذ۔

(۲) نہایت افسوس اور دکھ کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جن مفسرین نے یہ تفسیر بیان کی ہے، وہ اگرچہ سابقہ تفسیر کو مقام نبوت اور شان عصمت کے منافی سمجھتے ہیں اور یہاں تک کہتے ہیں کہ---اَمَّا مَارُوِیَ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ ھَوٰی زَیْنَبَ امْرَأَۃَ زَیْدٍ اَوْ عَشَقَھَا فَھٰذَا اِنَّمَا یَصْدُرُ عَنِ الْجَاھِلِ بِعَصْمَۃِ النَّبِیِّ ﷺ عَنْ مِّثْلِ ھٰذَا اَوْ مُسْتَخِفٍّ بِحُرْمَتِہٖ. (وہ جو مروی ہے کہ زید کی بیوی زینب کے ساتھ نبی ﷺ کو محبت یا عشق ہوگیا تھا، تو یہ بات وہی کہہ سکتا ہے جو ایسی چیزوں سے رسول اللہ ﷺ کے پاک اور معصوم ہونے سے جاہل ہو یا جان بوجھ کر آپ کی عظمت میں کمی کرنا چاہتا ہو۔) جمل علی الجلالین، ص ۴۲۶

لیکن یہ سب کچھ جاننے اور ماننے کے باوجود ان میں سے بیشتر مفسرین کے ذہنوں پر سابقہ روایات اس حد تک مسلط ہیں کہ وہ کھل کر ان کو جھوٹ اور افتراء کہنے سے نہ صرف پہلو بچا جاتے ☜

یہ تفسیر امام حسینؓ کے صاحبزادے علی ابن حسینؓ کی طرف منسوب ہے اور اس کا ماحصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زید کے طلاق دینے سے پہلے نبی ﷺ کو آگاہ کردیا تھا کہ زید عنقریب زینب کو طلاق دے دے گا اور پھر وہ آپ کے عقد میں آئے گی۔ چنانچہ زید جب زینب کی شکایت لے کر رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے تو آپ جانتے تھے کہ یہ طلاق ہو کر رہے گی مگر یہ بات آپ نے دل میں چھپائے رکھی حالانکہ اللہ تعالیٰ اس بات کو ظاہر کرنے والا تھا، یعنی زید نے بہرحال طلاق دینی تھی، مگر آپ طلاق کا مشورہ دینے کے بجائے زید سے یہ کہتے رہے کہ اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھ اور اللہ سے ڈر! تو اللہ تعالیٰ نے آپ پر عتاب نازل کرتے ہوئے کہا کہ اے نبی! جب میں نے تمہیں آگاہ کردیا تھا کہ زید نے طلاق دینی ہے اور پھر زینب نے تمہارے نکاح میں آنا ہے تو تم نے اس کے برعکس زید

ہیں؛ بلکہ آخر میں معذرت خواہانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے ان کی کوئی ایسی توجیہہ وتاویل بھی کردیتے ہیں جو عذرِ گناہ بدتر از گناہ کے زمرے میں آتی ہے۔ مثلاً علامہ آلوسی، شرح مواقف کے حوالے سے لکھتے ہیں ''فَاِنْ صَحَّتْ فَمَيْلُ الْقَلْبِ غَيْرُ مَقْدُوْرٍ، مَعَ مَافِيْهِ مِنَ الْاِبْتِلَاءِ لَهُمَا'' (روح المعانی ج ۲۲، ص ۲۵)

(اگر سابقہ روایتیں صحیح ہوں تو دل کا کسی کی طرف مائل ہوجانا آدمی کے بس میں نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں اس میں ان دونوں کی ابتلاء بھی ہے۔)

یعنی اگر وہ روایتیں صحیح بھی ہوں تو کون سی آفت ٹوٹ پڑے گی! زیادہ سے زیادہ یہی ثابت ہوگا ناں، کہ رسول اللہ ﷺ کو زینب سے محبت ہوگئی تھی اور آپ کا دل ان پر مائل ہوگیا تھا، تو اس میں اعتراض کی کیا بات ہے؟ یہ تو ایک بے اختیار جذبہ ہے، جو کسی کے بس میں نہیں ہوتا۔ نیز اس سے یہ اضافی فائدہ بھی حاصل ہوگیا کہ رسول اللہ ﷺ اور زینب دونوں عشق کے امتحان اور آزمائش سے گزر گئے۔

اس سے ملتے جلتے مفہوم کی عبارتیں جمل، روح البیان، خازن اور درِ منثور وغیرہ میں بھی پائی جاتی ہیں۔ ان عبارات کو پڑھ کر مجھ سا بے نوا آدمی کانوں کو ہاتھ لگانے، استغفار کرنے اور اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْن پڑھنے کے سوا کیا کرسکتا ہے---!!

سے یہ کیوں کہا کہ اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھ! دراصل تمہیں یہ ڈر تھا کہ اگر زید نے طلاق دے دی اور اس کی مطلقہ سے تمہیں نکاح کرنا پڑ گیا تو لوگ کہیں گے کہ محمد نے اپنے منہ بولے بیٹے کی مطلقہ (سابقہ بہو) سے شادی کر لی ہے حالانکہ لوگوں سے ڈرنے کے بجائے اللہ زیادہ حقدار ہے اس کا کہ تم اس سے ڈرو(۱)

اس تفسیر میں چونکہ سابقہ من گھڑت روایات کا کوئی ذکر نہیں ہے اس لئے بہت سے مفسرین اور محققین کو یہ تفسیر نہایت پسند آئی ہے، مثلاً زہری، قاضی بکر ابن العلاء اور قاضی ابوبکر ابن عربی وغیرہ۔(۲)

دورِ حاضر کے تقریباً تمام مفسرین نے اسی روایت کو اختیار کیا ہے اور اسے درست ثابت کرنے کے لئے اپنے اپنے انداز میں پورا زور بیان صرف کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ اس روایت میں سابقہ روایات والی لغویت نہیں پائی جاتی؛ تاہم اس میں ایسی الجھنیں ہیں جن کا اطمینان بخش حل خود وہ مفسرین بھی پیش نہیں کر سکے جنہوں نے اس تفسیر کو ترجیح دی ہے۔

مثلاً یہ کہ جب رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے پہلے سے آگاہ کر دیا تھا اور آپ جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی یہی ہے کہ زید طلاق دے اور آپ زینب کے ساتھ شادی

---

(۱) حضرت زین العابدین کی طرف منسوب یہ تفسیر متعدد تفاسیر میں مختلف عبارات کے ساتھ منقول ہے۔ ایک مختصر عبارت ملاحظہ فرمایئے! ''اِنَّ اللّٰہَ عَزَّوَجَلَّ قَدْ اَعْلَمَہٗ اَنَّھَا سَتَکُوْنُ مِنْ اَزْوَاجِہٖ وَ اَنَّ زَیْدًا سَیُطَلِّقُھَا، فَلَمَّا جَاءَ زَیْدٌ وَ قَالَ :اِنِّیْ اُرِیْدُ اَنْ اُطَلِّقَھَا، قَالَ لَہٗ:اَمْسِکْ عَلَیْکَ زَوْجَکَ، فَعَاتَبَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ وَ قَالَ :لِمَ قُلْتَ اَمْسِکْ زَوْجَکَ وَقَدْ اَعْلَمْتُکَ اَنَّھَا سَتَکُوْنُ مِنْ اَزْوَاجِکَ؟'' (خازن، ج۳، ص۴۶۸.)

(۲) قَالَ عُلَمَاءُ نَا رَحْمَۃُ اللّٰہِ عَلَیْھِمْ:وَھٰذَا الْقَوْلُ اَحْسَنُ مَاقِیْلَ فِیْ تَاْوِیْلِ ھٰذِہِ الْاٰیَۃِ، وَھُوَالَّذِیْ عَلَیْہِ اَھْلُ التَّحْقِیْقِ مِنَ الْمُفَسِّرِیْنَ وَالْعُلَمَاءِ الرَّاسِخِیْنَ، کَالزُّھْرِیْ وَالْقَاضِیْ بَکْرِابْنِ الْعَلَاءِ الْقُشَیْرِیْ وَالْقَاضِیْ اَبِیْ بَکْرِ ابْنِ الْعَرَبِیْ وَغَیْرِھِمْ. (تفسیر قرطبی، ج۴، ص۱۹۱)

کریں تو پھر زید سے یہ کیسے کہہ دیا کہ اپنی بیوی اپنے پاس رکھ! کیا اللہ تعالیٰ کی رضا اور منشاء معلوم ہونے کے بعد آپ کوئی ایسا حکم دے سکتے تھے جو رضائے الٰہی کے برعکس ہو---!؟

جواب ملاحظہ فرمایئے!

''قُلْنَا: اَرَادَ اَنْ یَّخْتَبِرَ مِنْهُ مَالَمْ یُعَلِّمْهُ اللهُ مِنْ رَّغْبَتِهٖ فِیْهَا اَوْ رَغْبَتِهٖ عَنْهَا، فَاَبْدٰی لَهٗ زَیْدٌ مِّنَ النَّفْرَةِ وَالْكَرَاهَةِ فِیْهَا مَالَمْ یُعَلِّمْهُ اللهُ فِیْ اَمْرِهَا.''

اس جواب کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو یہ تو بتا دیا تھا کہ زید طلاق دے گا مگر یہ نہیں بتایا تھا کہ زید کے دل میں اب بھی زینب کی طرف رغبت پائی جاتی ہے یا نہیں (اس بات کو معلوم کرنے کے لئے آپ نے زید کو بیوی پاس رکھنے کا حکم دیا) تو زید نے زینب سے نفرت اور کراہت کا اظہار کر کے رسول اللہ ﷺ پر وہ چیز واضح کر دی جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو نہیں بتائی تھی، یعنی زید کا زینب سے متنفر ہونا۔

سبحان اللہ---! یہ جواب تو تب درست ہوتا کہ رسول اللہ ﷺ نے زید کو بیوی پاس رکھنے کا مشورہ پہلے دیا ہوتا اور زید نے نفرت اور کراہت کا اظہار بعد میں کیا ہوتا، حالانکہ زیدؓ تو روایات کے مطابق خود زینب کی تلخ مزاجی وغیرہ کی شکایت لے کر آئے تھے اور طلاق دینے کی اجازت طلب کر رہے تھے۔ اس طرح انہوں نے زینب سے بیزاری کا اظہار تو رسول اللہ ﷺ کے مشورہ دینے سے پہلے ہی کر دیا تھا، پھر اَمْسِکْ عَلَیْکَ زَوْجَکَ کا حکم سننے کے بعد زید نے کون سی نادر و نایاب معلومات فراہم کر دی تھیں جو پہلے آپ کو حاصل نہیں تھیں---!؟

علاوہ ازیں اصل سوال اپنی جگہ پر قائم ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ کی رضا اور منشاء معلوم ہونے کے بعد---محض معلومات حاصل کرنے کے لئے---آپ کوئی ایسا حکم دے سکتے تھے جو رضائے الٰہی کے برعکس ہو؟

انہیں مفسرین کے بیان کردہ ایک اور سوال و جواب سے لطف اٹھایئے!

سوال یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو بتا دیا تھا کہ زید نے طلاق دینی ہے تو یہ بات پتھر پر لکیر سے بھی زیادہ قطعی و یقینی ہو گئی تھی اور اس کے برعکس کسی چیز کے

ظہور پذیر ہونے کے امکانات ہی ختم ہو گئے تھے، پھر آپ نے زید سے یہ کیسے کہہ دیا کہ اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھ؛ جبکہ آپ اچھی طرح جانتے تھے کہ ایسا ہونا ممکن ہی نہیں ہے---؟ یہ تو کھلا تضاد اور تناقض ہے۔

جواب یہ ہے---قُلْنَا: بَلْ هُوَ صَحِيْحٌ لِلْمَقَاصِدِ الصَّحِيْحَةِ، لِإِقَامَةِ الْحُجَّة---الخ

یعنی کسی کام کے ناممکن ہونے کا علم ہونے کے باوجود اس کا حکم دینا اچھے مقاصد کے لئے صحیح ہے، مثلاً اتمام حجت وغیرہ---

یہ جواب دیتے وقت غالباً مجیب کے ذہن سے پوری روایت نکل گئی تھی کیونکہ اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ زیدؓ کو طلاق سے منع کرنا صحیح مقاصد کے لئے کیا گیا ایک صحیح کام تھا تو پھر اس پر اتنا شدید عتاب کیوں نازل ہوا---؟ اگر اچھے مقاصد کے لئے کئے گئے صحیح کام اللہ تعالیٰ کے عتاب کا سبب بن سکتے ہیں تو پھر اس کی خوشنودی حاصل کرنے کا کیا طریقہ ہوگا اور اس کے لئے کس قسم کے کام کرنے پڑیں گے---!!؟

غرضیکہ یہ روایت ہر لحاظ سے بے معنی، بے مطلب اور ناقابلِ فہم ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ یہ گنجلک روایت علی ابنِ حسین، یعنی امام زین العابدین کی طرف منسوب کر دی گئی ہے؛ حالانکہ علوم نبوت سے فیضیاب و سیراب ہونے والا وہ جلیل القدر امام تو کجا، ایک عام سا ذہین وفہیم آدمی بھی ایسی بے سروپا باتیں نہیں کرتا۔

دراصل یہ کہانی علی ابنِ زید ابنِ جدعان نے تیار کی ہے جو اس روایت کی جملہ اسانید کا مرکزی راوی ہے۔ یہ شخص پیدائشی اندھا تھا مگر قدرت نے حافظہ بلا کا عطا کیا تھا۔ قرآنِ کریم کا بہت پختہ حافظ تھا، قرآن میں کہاں کہاں يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اور کس کس جگہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ آیا ہے، گن کر بتا دیتا تھا۔ اسی طرح حدیثیں بھی بہت یاد تھیں۔ جلیل القدر محدثین سے اکتساب علم کیا اور خود اس سے متعدد علماء نے فیض حاصل کیا۔

یہ تو اس کی زندگی کے تابناک پہلو ہیں لیکن دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ بیشتر ائمہ جرح و تعدیل اس کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے۔ اگرچہ کچھ محدثین نے اس کو سچا اور قابلِ

قبول قرار دیا ہے مگر اکثریت کی آراء کتب اسماء الرجال سے بلا ترجمہ پیش خدمت ہیں

امام احمد حنبل نے کہا--- لَیۡسَ بِالۡقَوِیّ، لَیۡسَ بِشَیۡءٍ، ضَعِیۡفُ الۡحَدِیۡثِ۔ یحییٰ ابنِ معین نے کہا--- لَیۡسَ بِذَاکَ الۡقَوِی، لَیۡسَ بِحُجَّةٍ، لَیۡسَ بِشَیۡءٍ، ضَعِیۡفٌ فِیۡ کُلِّ شَیۡءٍ۔ جوزجانی نے کہا--- وَاهِیُ الۡحَدِیۡثِ، ضَعِیۡفٌ، لَا یُحۡتَجُّ بِحَدِیۡثِهٖ۔ ابوزرعہ اور نسائی نے کہا--- لَیۡسَ بِقَوِی۔ حاکم ابو احمد نے کہا --- لَیۡسَ بِالۡمَتِیۡنِ عِنۡدَهُمۡ۔ حماد ابن زید نے کہا--- کَانَ یُقَلِّبُ الۡاَحَادِیۡثَ۔ دارقطنی نے کہا---عِنۡدِیۡ فِیۡهِ لِیۡنٌ.

حاصل ان تمام آراء کا یہ ہے کہ علی ابنِ زید زیادہ قوی نہیں ہے؛ بلکہ ضعیف اور لاشی ءہے، حدیثوں کو الٹ پلٹ دیتا تھا اور اس کی بیان کردہ روایت اس قابل نہیں ہوتی کہ اس سے استدلال کیا جائے۔

اگر علی ابنِ زید میں صرف اسی قدر خامیاں ہوتیں تب بھی اس کی روایت نکاحِ زینب جیسے اہم معاملے میں قابلِ قبول نہ ہوتی مگر اس میں مزید ایک خرابی ایسی ہے کہ اس کی وجہ سے اس کی روایات---خصوصاً ازواج مطہراتؓ سے متعلقہ معاملات میں--- بالکل ہی ناقابلِ اعتبار ٹھہر جاتی ہیں---اور وہ خرابی یہ ہے کہ وہ شیعہ تھا۔

احمد ابنِ عجلی کہتے ہیں--- کَانَ یَتَشَیَّعُ. (شیعہ مسلک رکھتا تھا۔)

یزید ابنِ ذریع کہتے ہیں---لَقَدۡ رَأَیۡتُ عَلِیَّ ابۡنَ زَیۡدٍ وَلَمۡ اَحۡمِلۡ عَنۡهُ فَاِنَّهٗ کَانَ رَافِضِیًّا. (میں نے علی ابن زید کو دیکھا تو ہے مگر اس سے کوئی روایت نہیں اٹھائی کیونکہ وہ رافضی تھا۔)

صرف یہی نہیں کہ اس مسلک کے ساتھ اتفاق رکھتا تھا؛ بلکہ اس میں غالی اور متشدد تھا۔

ابو احمد ابنِ عدی کہتے ہین--- کَانَ یَغۡلِیۡ فِی التَّشَیُّعِ، فِیۡ جُمۡلَةِ اَهۡلِ الۡبَصۡرَةِ. (تمام اہل بصرہ میں غالی شیعہ تھا۔)

شیعیت میں غلو کا یہ عالم تھا کہ اس قسم کی روایتیں بھی رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کرنے سے نہیں ہچکچاتا تھا--- ''اِذَا رَأَیۡتُمۡ مُعَاوِیَةَ عَلٰی هٰذِهِ الۡاَعۡوَادِ

فَاقْتُلُوْهُ، وَفِيْ رِوَايَةٍ: فَارْجُمُوْهُ. (جب تم معاویہ کو ان لکڑیوں پر یعنی ممبر پر دیکھو تو اسے قتل کردو! اور ایک روایت میں ہے کہ اس کو سنگسار کردو!)(۱)

شیعہ ہونے کی وجہ سے حضرت معاویہؓ کو قتل یا سنگسار کرنے کی خواہش اس کے دل میں ضرور ہوگی اور--- ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے، مگر ایسی ناکام حسرتوں کو سرورِ عالم ﷺ کا فرمان بتانا، بلاشک وشبہ بہتان وافتراء ہے۔ پھر آپ ہی بتائیے محترم قارئین! کہ ایسے بہتان طراز اور افتراء پرداز کی بے سروپا روایت نکاحِ زینب جیسے حساس معاملے میں ہم کس طرح قبول کرلیں---!!

سوال:- اگر مقاتل ابن سلیمان اور علی ابنِ زید کی بیان کردہ دونوں روایتیں من گھڑت ہیں تو ان روایات پر مبنی ہر دو تفسیریں بھی کالعدم ہو جائیں گی، پھر آیت محولہ بالا کی صحیح تفسیر کیا ہوگی؟

جواب:- ہم جس تفسیر کو صحیح سمجھتے ہیں اسے آئندہ صفحات میں انشاء اللہ پوری تفصیل سے پیش کریں گے، لیکن پہلے یہ وضاحت کرنا ضروری ہے کہ ہمارا اصل اختلاف ان دونوں تفسیروں سے ہی ہے۔ روایات پر بحث تو ہم نے اس لئے کردی ہے تاکہ وہ بنیاد ہی منہدم ہو جائے جس پر ان تفسیروں کی عمارت کھڑی کی گئی ہے۔

ہمیں ان تفسیروں میں جو چیز شدید طور پر کھٹکتی ہے، وہ ان کا مقامِ نبوت اور شانِ رسالت کے منافی ہونا ہے کیونکہ ان ہر دو تفاسیر کے مطابق وَتَخْشَى النَّاسَ ج وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ ط سے مخاطب جانِ دو عالم ﷺ ہیں اور اللہ پاک آپ پر عتاب نازل کرتے ہوئے کہہ رہا ہے کہ اے نبی! تم لوگوں سے ڈرتے ہو حالانکہ اللہ زیادہ حقدار ہے اس بات کا

(۱) علی ابنِ زید کے بارے میں محدثین کی آراء معلوم کرنے کے لئے ملاحظہ فرمائیے!

تهذيب الكمال في اسماء الرجال، للحافظ مزی، ج۱۳، ص۲۶۹ تا ۲۷۵، خلاصة تذهيب للخزرجي، ج۲، ص۲۴۸، ميزان الاعتدال للذهبي، ج۲، ص۲۲۴، ۲۲۵، تهذيب التهذيب، لابن حجر، ج۷، ص۲۸۵۔

کہ تم اس سے ڈرو!

ہمارے خیال میں یہ خطاب رسول اللہ ﷺ سے نہیں ہوسکتا اور اس کی چند وجوہ ہیں۔

اوّلاً---اس لئے کہ اللہ تعالیٰ قرآنِ کریم میں ایک اچھی اور مثالی قوم کی صفات بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے وَلاَ یَخَافُوْنَ لَوْمَۃَ لاَئِمٍ، یعنی وہ لوگ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتے۔

جب ایک عام سا خوفِ خدا رکھنے والا انسان بھی جس چیز کو درست سمجھے، اسے کر گزرتا ہے اور اس سلسلے میں کسی کی ملامت وغیرہ سے نہیں ڈرتا تو سیدالاشجعین اور امام المتقین ﷺ کے بارے میں یہ بات کیسے تصور کی جاسکتی ہے کہ نکاح زینب کے معاملے میں آپ لوگوں سے ڈر گئے ہوں گے، حالانکہ اللہ زیادہ حقدار تھا کہ آپ اس سے ڈرتے---!

ثانیاً---اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے عام مساجد کی تعمیر و آباد کاری کا ذوق رکھنے والے انسان کے اوصاف میں ایک یہ وصف بھی ذکر کیا ہے---وَلَمْ یَخْشَ اِلَّا اللہ، یعنی اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ مسجد قباء اور مسجد نبوی جیسی مقدس مساجد کے معمارِ اعظم اور دنیا بھر میں پھیلی ہوئی مسجدوں کے نقاش اول ﷺ ایک مسئلے میں لوگوں کی چہ میگوئیوں سے اتنے خوفزدہ ہو جائیں کہ اللہ تعالیٰ کو اس انداز میں تنبیہ کرنی پڑی، اور تم لوگوں سے ڈرتے ہو، حالانکہ اللہ زیادہ حقدار ہے اس بات کا کہ تم اس سے ڈرو---!!

ثالثاً---اس لئے کہ لَایَخَافُوْنَ لَوْمَۃَ لَائِمٍ. اور لَمْ یَخْشَ اِلَّا اللہ تو امتوں میں پائے جانے والے بلند پایہ متقین کی صفات ہیں، جہاں تک رسولوں کا تعلق ہے تو ان کے بارے میں بالخصوص یہ نصِ قطعی موجود ہے۔ اَلَّذِیْنَ یُبَلِّغُوْنَ رِسَالَاتِ اللہِ وَ یَخْشَوْنَہ‘ وَلَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللہ (جو اللہ کے پیغامات لوگوں تک پہنچاتے ہیں اور اللہ سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔)

کیا یہ بات کسی درجے میں بھی قابلِ قبول ہوسکتی ہے کہ باقی تمام رسولوں کی تو یہ شان ہو کہ لَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللہ اور جملہ انبیاء و رسل کے سردار و تاجدار ﷺ سے کہا

جائے کہ وَتَخْشَی النَّاسَ وَاللّٰہُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَاہُ ---!!

رابعًا --- اس لئے کہ رسولوں کی تو خیر شان ہی بہت بڑی ہے، اللہ تعالیٰ تو عام مؤمنین کے لئے بھی یہ پسند نہیں کرتا کہ وہ اللہ کے علاوہ کسی سے ڈریں۔ چنانچہ مجاہدین سے خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے

اَتَخْشَوْنَهُمْ ج فَاللّٰہُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْہُ اِنْ کُنْتُمْ مُؤْمِنِیْنَ o (کیا تم ان سے (کفار سے) ڈرتے ہو؟ تو اللہ زیادہ حقدار ہے اسکا کہ تم اس سے ڈرو اگر تم مؤمن ہو۔) گویا کمالِ ایمان کا یہ بنیادی تقاضا ہے کہ مؤمن غیر اللہ سے نہ ڈرے۔ پھر کتنے افسوس کی بات ہے کہ جو چیز ایمانِ کامل کے بنیادی تقاضوں ہی کے منافی ہو، اس کو بے دھڑک رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کر دیا جائے اور کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر عتاب کرتے ہوئے فرمایا کہ تم لوگوں سے ڈرتے ہو حالانکہ اللہ زیادہ حقدار ہے اس بات کا کہ تم اس سے ڈرو---!!

خامسًا --- اس لئے کہ جانِ دو عالم ﷺ قسم اٹھا کر فرماتے ہیں---فَوَاللّٰہِ اِنِّیْ لَاَخْشَاکُمْ وَ اَتْقَاکُمْ لِلّٰہِ. اللہ کی قسم میں تم سب کی بنسبت اللہ سے زیادہ ڈرنے والا ہوں، جبکہ ان تفسیروں کے مطابق اللہ تعالیٰ آپ سے کہہ رہا ہے کہ تم لوگوں سے ڈرتے ہو حالانکہ اللہ زیادہ حقدار ہے اس کا کہ تم اس سے ڈرو---! معاذ اللہ، کون سی بات درست ہے---؟ آپ اللہ سے زیادہ ڈرتے تھے یا لوگوں سے---؟ یا عام حالات میں اخشاکم و اتقاکم للہ کے مطابق اللہ سے زیادہ ڈرنے والے تھے مگر اس خاص معاملے میں لوگوں سے ڈر گئے تھے اور وَتَخْشَی النَّاسَ وَاللّٰہُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَاہُ سے عتاب کے مستحق قرار پائے تھے---!!؟؟

یَاۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ---! خدارا مجھے بتایئے کہ ان تین صورتوں میں سے کون سی صورت آپ کا ایمان گوارا کرتا ہے---؟؟ یقیناً آپ کا دل گواہی دے رہا ہو گا کہ تمام اہلِ تقویٰ وخشیت کے سرور و سردار ﷺ کے بارے میں ایسی باتیں سوچنا بھی ناجائز اور گناہ ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو پھر چھوڑ دیجئے ان روایتوں کو اور ان روایتوں پر مبنی ایسی تفسیروں کو جو

ایسے ہولناک تصورات پر منتج ہوں اور مرکوز کردیجئے اپنی پوری توجہ اللہ رب العالمین کے کلامِ دلنشین پر--- پھر دیکھئے کہ عظمتِ نبوت کیونکر اجاگر ہوتی ہے اور تقدیسِ رسالت کس شان سے جلوہ گر ہوتی ہے---وباللہ التوفیق.

❁❁❁

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

اور یاد کرو (اے نبی!) جب تم اس شخص سے جس پر اللہ نے انعام فرمایا اور تم نے بھی انعام کیا، کہہ رہے تھے

اَمۡسِکۡ عَلَیۡکَ زَوۡجَکَ

وَاتَّقِ اللّٰہَ

وَتُخۡفِیۡ فِیۡ نَفۡسِکَ مَا اللّٰہُ مُبۡدِیۡہِ

وَتَخۡشَی النَّاسَ ج وَاللّٰہُ اَحَقُّ اَنۡ تَخۡشٰہُ ط

یہ چار جملے نہایت خوبصورت ترتیب کے ساتھ ایک ہی لڑی میں پروئے ہوئے ہیں۔

مفسرین نے غیر صحیح اور وضعی روایات کے زیر اثر آخری دو جملے، پہلے دو جملوں سے الگ کر دیئے ہیں اور یہ سمجھ لیا ہے کہ پہلے دو جملوں میں رسول اللہ ﷺ زید سے کہہ رہے ہیں اَمۡسِکۡ عَلَیۡکَ زَوۡجَکَ اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھ! وَاتَّقِ اللّٰہَ اور اللہ سے ڈر!

اس کے بعد اللہ تعالیٰ رسول اللہ ﷺ پر عتاب فرماتے ہوئے آپ سے کہہ رہا ہے وَ تُخۡفِیۡ فِیۡ نَفۡسِکَ مَااللّٰہُ مُبۡدِیۡہِ اور چھپاتے تھے تم (اے نبی!) اپنے دل میں اس چیز کو جسے اللہ ظاہر کرنے والا ہے وَتَخۡشَی النَّاسَ ج وَاللّٰہُ اَحَقُّ اَنۡ تَخۡشٰہُ ط اور ڈرتے تھے تم لوگوں سے، حالانکہ اللہ زیادہ حق دار ہے اس کا کہ تم اس سے ڈرو!

حاصل یہ کہ ابتدائی دو جملوں میں رسول اللہ ﷺ متکلم ہیں اور زید مخاطَب ہیں؛ جبکہ آخری دو جملوں میں اللہ تعالیٰ متکلم ہے اور رسول اللہ ﷺ مخاطَب ہیں۔

اگر روایات ذہنوں پر نہ چھائی ہوتیں تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ ایک ہی سیاق میں واقع ہونے والے چار مربوط جملوں کو درمیان سے کاٹ دیا جائے اور دو کو رسول اللہ ﷺ کا قول

بنا دیا جائے، دو کو اللہ تعالیٰ کا، حالانکہ دوسرے جملے اور تیسرے جملے میں وقف کی کوئی ہلکی سی علامت بھی موجود نہیں ہے---!!

درحقیقت یہ چاروں جملے رسول اللہ ﷺ نے زید سے کہے تھے، یعنی (اے زید!) اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھ، اور (اے زید!) اللہ سے ڈر اور (اے زید!) تو چھپا رہا ہے اپنے دل میں اس چیز کو جسے اللہ ظاہر کرنے والا ہے، اور (اے زید!) تو ڈرتا ہے لوگوں سے، حالانکہ اللہ زیادہ حقدار ہے اس کا کہ تو اس سے ڈرے۔

اب اس کی وضاحت ملاحظہ فرمائیے!

حضرت زید نے بی بی زینب کی شکایت کرتے ہوئے جب یہ کہا کہ وہ مجھ پر برتری جتاتی ہے اور اپنی زبان سے مجھے دکھ پہنچاتی ہے تو یہ بات سر بسر خلاف حقیقت تھی۔ شادی سے پہلے انہوں نے زید کے رشتے پر ناگواری کا اظہار ضرور کیا تھا مگر اسی دوران جب یہ آیت نازل ہوئی جس کا ترجمہ درج ذیل ہے

''کسی مؤمن مرد اور عورت کو یہ حق نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے میں فیصلہ کر دیں تو پھر اسے اس معاملے میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل رہے اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی وہ صریح گمراہی میں پڑ گیا۔'' (سورہ احزاب، آیت ۳۶)

تو زینب نے جانِ دو عالم ﷺ سے پوچھا---''قَدْرَضِیْتَه' لِیْ یَارَسُوْلَ اللهِ مُنْكَحًا---!؟'' (یارسول اللہ! کیا آپ نے زید کو میرے لئے شوہر کے طور پر پسند کر لیا ہے؟) جانِ دو عالم ﷺ نے جواب دیا---''نَعَمْ!'' (ہاں۔) یہ سن کر بی بی صاحبہ نے فی الفور سرِ تسلیم خم کر دیا اور کہا---''اِذَا لَا اَعْصِیْ رَسُوْلَ اللهِ--- قَدْاَنْكَحْتُه' نَفْسِیْ'' (اگر یہ بات ہے تو میں ہرگز رسول اللہ کی نافرمانی نہیں کرتی--- میں نے اپنے آپ کو زید کے نکاح میں دے دیا۔) (۱)

جو حق پسند دوشیزہ شادی سے پہلے رسول اللہ ﷺ کے روبرو عہد و اقرار کرلے کہ

---

(۱) تفسیر ابن کثیر، ج ۳، ص ۴۸۹.

میں رسول اللہ ﷺ کے حکم سے سرتابی نہیں کرتی اور پھر آپ کی خوشنودی کا اتنا خیال رکھے کہ ایسے مواقع پر ایک کنواری بچی کو جو فطری شرم وحیا لاحق ہوتی ہے، اس کو آپ کی رضا پر قربان کرتے ہوئے اپنے منہ سے کھل کر کہہ دے کہ میں نے اپنے آپ کو زید کے نکاح میں دے دیا، اس سے یہ کیسے توقع کی جاسکتی ہے کہ اس نے شادی کے بعد شوہر کو دکھ دینے اور ایذا پہنچانے کا وتیرہ اپنا لیا ہوگا---!! کیا اس کو مندرجہ بالا آیات بھول گئی تھیں؟ کیا وہ نہیں جانتی تھی کہ جس شخص کو رسول اللہ ﷺ نے میرے لئے بطور شوہر پسند کیا ہے، اس کو ایذا اور دکھ پہنچا کر میں رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کی مرتکب ٹھہروں گی!؟ کیا اس کو شوہر کی اطاعت اور اس کی نافرمانی کی ممانعت سے متعلقہ رسول اللہ ﷺ کے سارے احکام نسیاً منسیاً ہو گئے تھے---!؟ یا جان بوجھ کر اس نے ان احکامات کو پسِ پشت ڈال دیا تھا اور--- مَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَه، فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا کے زمرے میں داخل ہونے پر کمر بستہ ہو بیٹھی تھی---؟؟ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ! ایسا ہرگز نہیں ہوا تھا، نہ اس اطاعت شعار خاتون سے اس طرز عمل کی توقع کی جاسکتی ہے۔

جانِ دو عالم ﷺ چونکہ اپنی پھوپھی زاد کے مزاج وطبیعت سے بخوبی آگاہ تھے اور جانتے تھے کہ وہ شوہر کو دکھ اور ایذا پہنچانے والی کوئی حرکت کر ہی نہیں سکتی، اس لئے جب زید طلاق کی اجازت طلب کرنے آئے اور شکایت کی کہ زینب احساسِ برتری میں مبتلا ہے اور مجھے ایذا پہنچاتی ہے تو آپ سمجھ گئے کہ زید کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو کر خواہ مخواہ اپنی بیوی سے بدگمان ہو گیا ہے، اس لئے آپ نے زید کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا---''اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھ اور خدا سے ڈر!'' یعنی اس پر ایسے الزامات مت لگا جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

آپ خود ہی سوچئے! کہ اگر زینب فی الواقع تیز مزاج اور درشت طبیعت ہوتیں تو پھر اللہ سے ڈر!، کہنے کا کیا موقع تھا؟ اس صورت میں تو یہ کہنا چاہئے تھا کہ اس کی تلخی و بد مزاجی پر صبر کر اور کسی نہ کسی طرح نباہ کرنے کی کوشش کر! ''اِتَّقِ اللّٰه'' یعنی خدا سے ڈر! کا تو صاف مطلب یہی ہے کہ تو جو شکایتیں لگا رہا ہے وہ خلاف واقع ہونے کی وجہ سے تقویٰ کے تقاضوں کے منافی ہیں اس لئے خدا سے ڈر اور ایسی باتیں نہ کر!

مزے کی بات یہ ہے کہ ''اِتَّقِ اللہ'' کا یہ مفہوم بعض مفسرین نے بھی بیان کیا ہے۔ چنانچہ علامہ قرطبی لکھتے ہیں ''وَقِیلَ: ''اِتَّقِ اللہ'' فَلَا تَذُمَّهَا بِالنِّسْبَةِ اِلَی الْكِبْرِ وَ اَذَی الزَّوْجِ. ''(۱) یعنی کہا گیا ہے کہ اِتَّقِ اللہ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ سے ڈر اور اس حوالے سے زینب کی برائی مت بیان کر کہ وہ بڑائی جتاتی ہے اور خاوند کو دکھ دیتی ہے۔

اس تفسیر سے واضح ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے زید کی شکایات کو درست نہیں سمجھا اور اتق اللہ کہہ کر ان کو ایسی باتیں کرنے سے منع کر دیا، لیکن اِتَّقِ اللہ کا اگر یہ مفہوم تسلیم کر لیا جاتا تو پھر زینب کی زبان درازی اور شوہر کی تحقیر و تذلیل کے وہ افسانے کہاں جاتے جنہیں داستان گوئی کے رسیا راویوں نے بڑی محنت سے تیار کیا تھا، اس لئے یہ تفسیر روایتوں کے غوغا میں دب گئی اور عام مفسرین اس طرف چلے گئے کہ اِتَّقِ اللہ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ سے ڈر اور اپنی بیوی کو طلاق مت دے۔ حالانکہ اگر زینب فی الواقع جھگڑالو اور شوہر کی نافرمان ہوتیں تو پھر ایسی عورت کو طلاق دینے سے بھلا تقویٰ کی کیا خلاف ورزی لازم آتی تھی---؟ کیا تقویٰ کا یہی تقاضا ہے کہ بیوی جو چاہے کہتی رہے اور جس طرح اس کی مرضی ہو خاوند کی توہین کرتی رہے مگر خاوند سب کچھ کان دبا کر سنتا رہے اور ٹک ٹک دیدم، دم نہ کشیدم کی تصویر بنا رہے---!؟

حاصل ان تمام گزارشات کا یہ ہے کہ حضرت زید نے زینب کے احساس برتری میں مبتلا ہونے اور شوہر کو ایذا پہنچانے کے بارے میں جو شکایات رسول اللہ ﷺ کے روبرو بیان کی تھیں وہ ان کے اپنے نقطہ نظر کے مطابق تو یقیناً صحیح اور درست ہوں گی مگر حقیقت سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ اسی لئے آپ نے ان کو ایسی بے بنیاد شکایتوں کی بنا پر طلاق دینے سے منع کیا اور فرمایا اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھ اور اللہ سے ڈر! مگر زید بہر صورت زینب کو چھوڑنے کا تہیہ کر چکے تھے اس لئے آپ کے اس واضح ارشاد کے باوجود اپنی بیوی کو پاس رکھنے کے روادار نہ ہوئے اور اسے طلاق دے کر فارغ کر دیا۔

---

(۱) تفسیر قرطبی، ج ۱۴، ص ۱۹۱

قارئین کرام!

اب آپ کے ذہن میں قدرتی طور پر یہ سوال ابھر رہا ہوگا کہ اگر زینب احساسِ برتری میں مبتلا نہیں تھیں، نہ ان کے مزاج میں کسی قسم کی تلخی پائی جاتی تھی تو پھر زید نے ان کو طلاق کیوں دی---!؟ اور وہ بھی رسول اللہ ﷺ کے منع کرنے کے باوجود---!!؟ آخر زید کی اتنی شدید غلط فہمی اور بدگمانی کا کوئی نہ کوئی سبب تو ہوگا---!!

جواباً عرض ہے کہ اس کا سبب حضرت زید کی کوئی نفسیاتی گرہ تھی جس کی وجہ سے ایک زینب ہی کیا، وہ کسی بھی عالی نسب اور خاندانی عورت کے ساتھ نباہ نہیں کر سکتے تھے اور انتہائی مختصر عرصے میں نوبت طلاق تک پہنچ جاتی تھی۔

اس بات کی تہہ تک پہنچنے کے لئے حضرت زید کی عائلی زندگی پر ایک طائرانہ نظر ڈالنی پڑے گی۔

حضرت زید کی پہلی شادی ام ایمنؓ سے ہوئی۔ ام ایمن جانِ دو عالم ﷺ کے والد ماجد کی کنیز تھیں جو وراثت میں جانِ دو عالم ﷺ کے حصے میں آئیں۔ جانِ دو عالم ﷺ نے حضرت خدیجہؓ سے نکاح کے موقع پر انہیں آزاد کر دیا۔ آزادی کے بعد ان کی پہلی شادی عبید بن یزید سے ہوئی جس سے ایمن نام کا بیٹا پیدا ہوا اور اسی نسبت سے ام ایمن کہلائیں۔ عبید بن یزید کے بعد ان کی شادی زید سے ہوئی۔ اس وقت زید بالکل نوجوان تھے جبکہ ام ایمن ان سے دگنی عمر والی ایک گرم و سرد چشیدہ عورت تھیں۔ اگر عمروں کے تفاوت کو مدِ نظر رکھا جائے تو ایسی بے جوڑ شادی شاید ہی کوئی ہوئی ہو مگر ازدواجی حوالے سے دیکھا جائے تو یہ ایک کامیاب ترین شادی تھی، جو زید کے دنیا سے رخصت ہو جانے تک قائم رہی اور کسی ناخوشگوار نشیب و فراز سے دوچار نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ محض یہ تھی کہ خاوند بیوی دونوں ایک ہی مرتبے کے تھے، یعنی معاشرتی اور سماجی معیار دونوں کا یکساں تھا۔ ام ایمنؓ آزاد کردہ لونڈی تھیں؛ جبکہ زید آزاد کردہ غلام تھے۔ معاشرتی معیار کی اسی یکسانیت نے دونوں میں ذہنی ہم آہنگی پیدا کر دی اس لئے بخوبی گزر بسر ہونے لگی۔ لیکن زینبؓ کا معاملہ ام ایمنؓ سے یکسر مختلف تھا۔ وہ نہایت اونچے خاندان کی انتہائی معزز خاتون تھیں اس

لئے زید ان کے مقابلے میں احساس کمتری کا شکار ہو گئے اور ان سے نباہ نہ کر سکے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ زینب کسی قسم کے احساسِ تفاخر و برتری میں مبتلا نہیں تھیں؛ بلکہ در حقیقت خود زید احساس کمتری کے اسیر تھے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ زینب کے علاوہ بھی کسی عالی نسب عورت کے ساتھ گزارا نہ کر سکے۔ علامہ ابنِ حجر لکھتے ہیں

ثُمَّ لَمَّا طَلَّقَ زَيْنَبَ زَوَّجَه' اُمَّ كُلْثُوْمِ بِنْتَ عُقْبَه، ثُمَّ طَلَّقَ اُمَّ كُلْثُوْمٍ وَ تَزَوَّجَ دُرَّةَ بِنْتَ اَبِیْ لَهَبِ ابْنِ عَبْدِالْمُطَّلِبِ،ثُمَّ طَلَّقَهَا وَ تَزَوَّجَ هِنْدَ بِنْتَ الْعَوَامِ اُخْتَ الزُّبَيْرِ. (١)

(جب زید نے زینب کو طلاق دے دی تو رسول اللہ ﷺ نے ان کی شادی ام کلثوم بنت عقبہ سے کرادی، پھر انہوں نے ام کلثوم کو بھی طلاق دے دی اور درہ بنت ابی لہب سے شادی کرلی، پھر درہ کو بھی طلاق دے دی اور زبیر کی بہن ہند بنت العوام سے شادی کرلی۔)

یہ تمام عورتیں خاندانی لحاظ سے نہایت معزز اور بلند پایہ تھیں۔ اگر زینب کے بارے میں مان بھی لیا جائے کہ ان کا مزاج تلخ تھا تو دیگر شریف النسب خواتین کے بارے میں کیا کہا جائے گا، جنہیں زید نے طلاق دے دی تھی ---؟ کیا وہ بھی جھگڑالو اور بدمزاج تھیں ---؟ کیا اُمِ کلثوم بھی کبر میں مبتلا تھیں اور اپنی برتری جتاتی تھیں ---؟ کیا درہ بھی ان کی توہین کرتی تھی اور ایذا پہنچاتی تھی ---؟

زینب کے سلسلے میں تو پھر بھی بقولِ مؤرخین یہ پس منظر موجود تھا کہ انہوں نے ابتداء میں زید سے رشتہ ہونے پر ناگواری کا اظہار کیا تھا۔ بعد میں آیت نازل ہونے اور رسول اللہ ﷺ کے کہنے سننے پر وقتی طور پر بظاہر رضامند ہو گئی تھیں مگر دل سے خوش نہیں تھیں اس لئے زید سے نباہ نہ کر سکیں۔ اگر زینب کے بارے میں یہ باتیں مان بھی لی جائیں تو دیگر خواتین کے ساتھ تو ایسا کوئی معاملہ نہیں تھا۔ وہ سب تو اپنی خوشی اور رضامندی سے زید کے

---

(١) اصابہ، ج ١، ص ۵۶۴۔

عقد میں آئی تھیں، پھر ان کے ساتھ زید کی کیوں نہ نبھ سکی---؟

واضح رہے کہ اکثر کے نزدیک زینب کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی شادی ۵ ہجری کو ہوئی تھی۔ اس لحاظ سے زید نے زینب کو طلاق ۴ ہجری کے آخر میں یا ۵ ہجری کی ابتداء میں دی ہو گی اور ۸ ہجری میں پیش آنے والے غزوۂ موتہ کے دوران زید شہید ہو گئے تھے۔ اس طرح صرف چار سال کے مختصر عرصے میں انہوں نے تین عورتوں کو طلاق دے دی، یعنی زینب، ام کلثوم اور درہ کو۔ ہند البتہ بچ گئی کیونکہ اس دوران زید خود شہادت پا گئے تھے۔

ان مسائل میں ہے کچھ ژرف نگاہی درکار
یہ حقائق ہیں، تماشائے لبِ بام نہیں

اور ان تاریخی حقائق کو پیش کرنے کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ زینب کو طلاق دینے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ زینب کے مزاج میں تلخی اور شدت رچی ہوئی تھی۔ نہیں، ہرگز نہیں؛ بلکہ زید کے لاشعور میں کوئی ایسی گرہ پڑی ہوئی تھی کہ آزاد، عالی نسب اور بلند مرتبہ خواتین کے ساتھ وہ گزارا کر ہی نہیں سکتے تھے اور جلد ہی ان سے جان چھڑانے پر کمر بستہ ہو جاتے تھے۔

زینب کو طلاق دینے کے موقع پر بھی یہی صورت پیش آئی۔ زینب ان کے پاس سال سے کچھ زیادہ عرصہ گزار چکی تھیں اور زید اپنی افتادِ طبع کے مطابق ان کو طلاق دینے کا تہیہ کر چکے تھے لیکن انتہائی قدم اٹھانے سے اس لئے ڈرتے تھے کہ لوگ کہیں گے زید نے رسول اللہ ﷺ کے احسانات کا ذرا خیال نہ رکھا۔ آپ نے اسے آزاد کیا، منہ بولا بیٹا بنایا، پرورش کی، دین سکھایا، ام ایمن سے شادی کرائی، پھر زینب کو اس کے عقد میں دے دیا مگر زید نے ان تمام انعامات و احسانات کا یہ صلہ دیا کہ رسول اللہ ﷺ کی پھوپھی زاد کو صرف سال بھر میں طلاق دے دی حالانکہ یہ نکاح خود رسول اللہ ﷺ نے کتنے اصرار اور چاؤ سے کرایا تھا---!!

ان چہ میگوئیوں سے بچنے کے لئے انہوں نے زینب کی کچھ شکایات بیان کر کے رسول اللہ ﷺ سے طلاق کی اجازت طلب کی۔ مقصد یہ تھا کہ اگر آپ کی طرف سے اجازت مل گئی تو اعتراض کرنے والوں کے منہ خود بند ہو جائیں گے اور میں کہہ سکوں گا کہ

میں نے جو کچھ کیا آپ کی اجازت سے کیا، مگر آپ صحیح صورت حال سے آگاہ تھے کیونکہ حضرت زینبؓ کے حوالے سے یہ آپ کا خاندانی معاملہ تھا اور اس کے ہر پہلو پر آپ کی گہری نظر تھی اس لئے آپ نے زید کی شکایات کو درخور اعتناء نہ سمجھا اور ایسی بے حقیقت اور خلاف واقعہ باتوں کی بنیاد پر طلاق دینے سے منع کرتے ہوئے فرمایا کہ (اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھ اور اللہ سے ڈر!)

یہ مخلصانہ اور مشفقانہ نصیحت آپ نے کر تو دی مگر دوسری طرف آپ یہ بھی جانتے تھے کہ زید نے دل میں بہر صورت زینب کو طلاق دینے کی ٹھان رکھی ہے--- خواہ میں اجازت دوں یا نہ دوں، اس لئے فرمایا کہ (تو چھپاتا ہے اپنے دل میں اس بات کو جسے اللہ ظاہر کرنے والا ہے) اور اللہ نے اس بات کو یوں ظاہر کیا ہے کہ زید نے اجازت نہ ملنے کے باوجود زینب کو طلاق دے دی جس سے واضح ہوگیا کہ اجازت طلب کرنا ایک رسمی کاروائی تھی ورنہ دل میں طلاق دینے کا وہ پہلے سے تہیہ کر چکے تھے؛ البتہ ڈرتے تھے کہ اگر میں نے یوں بلاوجہ طلاق دے دی تو لوگ کہیں گے---''واہ بھئی، زید نے رسول اللہ ﷺ کے احسانات کا خوب بدلہ چکایا!'' یہی بات ان پر رسول اللہ ﷺ نے یوں واضح کی (تو لوگوں سے ڈرتا ہے، حالانکہ اللہ زیادہ حقدار ہے اس کا کہ تو اس سے ڈرے) اور بغیر کسی وجہ کے اپنی بیوی کو طلاق نہ دے۔

زید کے شکایتیں لگانے کے باوجود زینب نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور مکمل خاموش رہیں۔ چاہتیں تو جوابی شکایات لگا سکتی تھیں، یا کم از کم اپنا دفاع تو کر ہی سکتی تھیں مگر انہوں نے معاملہ اپنے رب پر چھوڑے رکھا اور خود اس جھگڑے سے بالکل کنارہ کش رہیں۔ اللہ تعالیٰ کو ان کے صبر اور رضا بالقضا کا یہ انداز اتنا پسند آیا کہ جب زید نے ان کو طلاق دے دی تو اس صمد و بے نیاز مولیٰ نے بنفسِ نفیس ان کا نکاح رسول اللہ ﷺ سے کیا اور ان کو امہات المؤمنین کے مقدس اور پاک زمرے میں شامل کر دیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ اے نبی! (جب زید نے زینب سے اپنی ضرورت پوری کر لی اور اسے چھوڑ دیا تو ہم نے خود تمہارا عقد اس کے ساتھ کر دیا۔ اس طرح

مؤمنین پر واضح ہوگیا کہ منہ بولے بیٹے اگر اپنی بیویوں کو طلاق دے دیں تو ان سے نکاح کرنے میں کوئی حرج اور تنگی نہیں ہے) یہ سب کچھ اللہ کی تقدیر میں پہلے سے طے شدہ تھا (اور اللہ تعالیٰ کا طے کردہ معاملہ بہرحال وقوع پذیر ہو کر رہتا ہے۔)

کیسا صاف و شفاف، مربوط و مسلسل اور واضح و عام فہم مفہوم ہے جسے روایات کے سہارے چیستاں بنا کر رکھ دیا گیا ہے---!!

قارئین کرام!

مندرجہ بالا تاریخی اور قرآنی حقائق کو ذہن میں ایک بار پھر تازہ کر لیجئے اور نئے سرے سے آیت مبارکہ کی تلاوت کیجئے اور اس کے ترجمے سے لطف اٹھایئے!

وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیْ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ اَنْعَمْتَ عَلَیْہِ اَمْسِکْ عَلَیْکَ زَوْجَکَ وَاتَّقِ اللّٰہَ وَتُخْفِیْ فِیْ نَفْسِکَ مَا اللّٰہُ مُبْدِیْہِ وَ تَخْشَی النَّاسَ ج وَاللّٰہُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰہُ ط فَلَمَّا قَضٰی زَیْدٌ مِّنْھَا وَ طَرًا زَوَّجْنٰکَھَا لِکَیْ لَایَکُوْنَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ حَرَجٌ فِیْ اَزْوَاجِ اَدْعِیَآءِ ھِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْھُنَّ وَطَرًا ط وَکَانَ اَمْرُ اللّٰہِ مَفْعُوْلًا ○

اور یاد کرو (اے نبی!) جب تم اس شخص سے جس پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا اور تم نے بھی انعام کیا، کہہ رہے تھے۔

''اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھ اور اللہ سے ڈر! اور تو اپنے دل میں جو چھپا رہا ہے، اسے اللہ ظاہر کرنے والا ہے اور تو لوگوں سے ڈرتا ہے حالانکہ اللہ زیادہ حقدار ہے اس کا کہ تو اس سے ڈرے!''

پھر جب زید نے اپنی بیوی سے ضرورت پوری کر لی (اور اسے طلاق دے دی) تو ہم نے تمہاری شادی اس کے ساتھ کرادی تاکہ مؤمنین پر منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے سلسلے میں کوئی تنگی نہ رہے، جب وہ (منہ بولے بیٹے) اپنی بیویوں سے ضرورتیں پوری کر لیں (اور انہیں طلاق دے دیں) اور اللہ کا حکم ہر حال میں پورا ہو کر رہتا ہے۔

❁❁❁

درج بالا دلائل سے روزِ روشن کی طرح عیاں ہوگیا کہ **وَتُخْفِیْ فِیْ نَفْسِکَ**

مَا اللّٰہُ مُبْدِیْہِ وَ تَخْشَی النَّاسَ ج وَاللّٰہُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰہُ ط کے مخاطب رسول اللہ ﷺ نہیں ہیں؛ بلکہ جس طرح پہلے دو جملوں کا تعلق زینب اور زید سے ہے اسی طرح یہ جملے بھی زینب اور زید ہی کے بارے میں نازل ہوئے ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے کہ پہلے دو جملوں میں تو زینب اور زید کی بات ہو رہی ہو اور آخری دو جملے رسول اللہ ﷺ کے بارے میں نازل ہو گئے ہوں۔ اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لئے امام بخاری اپنی کتاب میں یہ مختصر سی حدیث لائے ہیں

عَنْ اَنَسِ ابْنِ مَالِکٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالیٰ عَنْہُ اَنَّ ھٰذِہِ الْاٰیَةَ "وَتُخْفِیْ فِیْ نَفْسِکَ مَا اللّٰہُ مُبْدِیْہِ" نَزَلَتْ فِیْ شَانِ زَیْنَبَ بِنْتِ جَحْشٍ وَ زَیْدِ ابْنِ حَارِثَةَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا. (صحیح بخاری، ج ۲، کتاب التفسیر، تفسیر سورہ احزاب.)

(انس ابن مالک ؓ سے روایت ہے کہ یہ آیت، یعنی تُخْفِیْ فِیْ نَفْسِکَ مَا اللّٰہُ مُبْدِیْہِ زینب بنتِ جحش اور زید ابن حارثہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔)

بالکل حق اور سچ فرمایا حضرت انس بن مالک ؓ نے کہ آیت کا یہ جملہ تُخْفِیْ فِیْ نَفْسِکَ مَا اللّٰہُ مُبْدِیْہِ رسول اللہ ﷺ کے متعلق ہرگز نازل نہیں ہوا؛ بلکہ اس کا تعلق بھی سابقہ جملوں کی طرح زینب اور زید کے ساتھ ہے اور جب یہ جملہ زینب اور زید کے ساتھ متعلق ہو گیا تو آخری جملہ وَ تَخْشَی النَّاسَ ج وَاللّٰہُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰہُ ط از خود زینب اور زید کے بارے میں ہو جائے گا۔ وھو المطلوب.

❁❁❁

آخر میں گذارش ہے کہ کسی بھی شخص کی ازدواجی زندگی کا اختتام جب طلاق پر ہو تو اس میں کوئی نہ کوئی قصوروار ضرور ہوتا ہے۔ کبھی بیوی، کبھی خاوند اور کبھی دونوں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ زید نے جب زینب کو طلاق دی تو معاملات کو اس انتہا تک پہنچانے کا ذمہ دار کون تھا---؟ آج تک مؤرخین اور مفسرین زید کی شکایات کو درست سمجھ کر ساری ذمہ داری زینب پر ڈالتے رہے ہیں مگر ہم نے اس سلسلے میں غور کیا تو زینب کو بے خطا پایا اور وہ

محض گناہ بے گناہی کی اسیر نظر آئیں۔ اگر سابقہ تمام تحقیقات پیشِ نظر نہ بھی ہوں تب بھی اتنی سی بات تو ہر آدمی آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے زید کی شکایات پر مطلق توجہ نہیں دی تھی۔ اگر آپ کے نزدیک زید کی شکایات کی کچھ بھی حقیقت ہوتی تو کم از کم ایک دفعہ تو زینب کو سمجھاتے کہ تم نے یہ کیا سلسلہ شروع کر رکھا ہے کہ خاوند کو آئے دن تنگ کرتی رہتی ہو اور اس کو دکھ پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی ہو---! اگر یہی کچھ کرنا تھا تو پہلے اس شادی پر رضا مندی کا اظہار ہی کیوں کیا تھا، وغیرہ وغیرہ۔ مگر رسول اللہ ﷺ نے زینب سے اشارتاً بھی کوئی ایسی بات نہیں کی؛ بلکہ زید ہی کو سمجھایا کہ اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھ اور اللہ سے ڈر! رسول اللہ ﷺ کے اس طرزِ عمل سے واضح ہے کہ آپ زینب کو اس سلسلے میں بالکل بے قصور سمجھتے تھے۔ چنانچہ ہم نے بھی آپ کے اتباع میں یہی فکر اپنائی اور پھر حقیقت نکھرتی چلی گئی، جسے ہم نے بصد احساسِ ذمہ داری آپ تک پہنچا دیا ہے۔ لیکن یہ بات ہمیشہ پیشِ نظر رہنی چاہئے کہ ذمہ دار خواہ زینب ہوں---جیسا کہ مفسرین و مؤرخین کا خیال ہے، یا زید ہوں---جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے طرزِ عمل سے ظاہر ہے، دونوں صورتوں میں یہ ایک جزوی کوتاہی اور لغزش ہے جس سے دونوں کے مجموعی مقام و مرتبے پر کوئی اثر نہیں پڑتا، نہ ان کی عظمت و شان میں کوئی کمی آتی ہے؛ بلکہ ان پر تو اللہ تعالیٰ نے متعدد ایسی نوازشیں بھی کر رکھی ہیں جو انہی دونوں کے ساتھ خاص ہیں اور کسی دوسرے شخص کو ان نوازشات سے کوئی حصہ نہیں ملا۔

محولہ بالا آیت کو ہی لیجئے! اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے دونوں کو ایک ایک ایسا اعزاز بخشا ہے کہ اس میں ان کا کوئی مثیل و ہمسر نہیں پایا جاتا۔

زینبؓ کو یہ خصوصی امتیاز حاصل ہے کہ دنیا بھر کی پاکباز خواتین---خواہ ازواجِ مطہراتؓ اور بناتِ طاہراتؓ کیوں نہ ہوں---ان کے نکاح اولیاء نے کرائے مگر زینب کا نکاح خود رب العالمین نے کرایا اور فرمایا---زَوَّجْنٰكَهَا.

مصنف و قارئینِ سیدالورٰی، بی بی صاحبہ رضی اللہ عنہا کے اس امتیاز خاص پر ان کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

زیدؓ کو یہ خصوصی اعزاز ملا کہ جہاں بھر کے ممتاز افراد---خواہ خلفاء راشدین اور نواسہ ہائے رسول کیوں نہ ہوں---ان میں سے کسی کا بھی نام لے کر اللہ تعالیٰ نے قرآن میں تذکرہ نہیں فرمایا؛ جبکہ زیدؓ کا نام اللہ پاک نے قرآن میں تاابد ثبت کر دیا اور فرمایا---فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ۔

مصنف و قارئینِ سیدالورٰی حضرت زید رضی اللہ عنہ کو بھی اس اعزاز خاص پر ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان نفوسِ قدسیہ کے طفیل ہم پر بھی خصوصی کرم فرمائے اور زندگی کے ہر مرحلے میں صراطِ مستقیم پر ثابت قدم رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

و صلی اللہ علی سیّدنا و مولٰینا محمد و علی اٰلہ و اصحابہٖ اجمعین.

اُمّ المؤمنین سیّدہ جویریہ رضی اللہ عنہا

حضرت جویریہؓ کا اصل نام برہ تھا۔ والد کا نام حارث تھا جو قبیلہ بنی مصطلق کا سردار تھا۔ یہ قبیلہ بحیرہ احمر کے کنارے رابغ اور جدہ کے درمیان قدید نامی علاقہ میں آباد تھا۔ جس چشمہ پر ان کی آبادی تھی اس کا نام مریسیع تھا۔ اس قبیلے کے قریشِ مکہ سے بڑے دوستانہ مراسم تھے۔ بعثت سے دو سال پہلے حارث کے ہاں ایک بیٹی نے جنم لیا۔ باپ نے اس کا نام برہ رکھا اور اس کی پرورش بڑے ناز ونعم میں ہونے لگی۔ جوان ہوئی تو قبیلے کے ایک نوجوان مسافع ابن صفوان سے شادی ہوگئی۔ مسافع اور حارث دونوں اسلام کے سخت مخالف تھے۔ ان کو اسلام کا پھیلنا ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ سرایا میں مسلمانوں کی کامیابی اور غزوۂ بدر میں کفار ومشرکین کی شکست نے حارث کو اسلام اور مسلمانوں کا مزید مخالف بنا دیا تھا۔ لہٰذا وہ اپنی قوم اور زیر اثر افراد میں گھوما پھرا اور انہیں اپنا ہمنوا بنانے کے لئے اسلام، مسلمانوں اور جانِ دوعالم ﷺ کے خلاف ابھارا۔ قریش بھی مختلف قبائل کو اسلام کی جدید ریاست کے خلاف بھڑکاتے رہتے تھے اور ان کے تعلقات بنی مصطلق سے بھی بہت گہرے تھے۔ چنانچہ سب نے حارث کو تعاون کا یقین دلایا۔ اس سے حوصلہ پا کر حارث نے مدینہ پر یلغار کی نیت سے تیاریاں شروع کر دیں۔

ایک دن جانِ دوعالم ﷺ تشریف فرما تھے کہ ایک شخص نے اطلاع دی کہ حارث نے قریش کے اشارہ سے، یا از خود مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دی ہیں۔

یہ سن کر جانِ دوعالم ﷺ نے حضرت بریدہؓ کو حکم دیا کہ تم بنی مصطلق جاؤ اور آ کر وہاں کی خبر دو۔

چند دنوں کے بعد حضرت بریدہؓ نے واپس آ کر بارگاہ نبوت میں عرض کی۔

''یارسول اللہ! جو خبر آپ کو پہنچی تھی وہ درست ہے۔''

چنانچہ جانِ دوعالم ﷺ نے حملے کے لئے تیاری کا حکم دے دیا۔

اسلامی لشکر نے چل کر مریسیع میں قیام کیا۔ وہ لوگ جو اسلام دشمنی سے مغلوب ہو کر

حارث کے پاس جمع ہو گئے تھے، انہوں نے جب دیکھا کہ مسلمان ان کے سر پر پہنچ گئے ہیں تو انہوں نے راہِ فرار اختیار کی۔ حارث نے بھی اسی میں عافیت سمجھی کہ بھاگ جائے لیکن باقی اہل قبیلہ نے صف بندی کر لی اور مسلمانوں پر تیر برسانے شروع کر دیئے۔ مجاہدین اسلام نے بھی جواب تیروں سے دیا۔ تھوڑی دیر تک تیروں کا آپس میں تبادلہ ہوتا رہا پھر جانِ دو عالم ﷺ نے یکبارگی حملے کا حکم دے دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں مشرکین کے کس بل نکل گئے۔ ان کے دس آدمی جنگ میں کام آئے جن میں مسافع بن صفوان' برہ کا خاوند بھی شامل تھا۔

اس غزوہ میں، جو تاریخ میں غزوہ بنی مصطلق یا مریسیع مشہور ہے، دو ہزار اونٹ اور پانچ ہزار بکریاں غنیمت میں ملیں اور دو سو گھروں کے چھ سو مرد' عورتیں اور بچے اسیر ہوئے جن میں رئیسِ قبیلہ کی بیٹی برہ بھی شامل تھیں۔ مال غنیمت کو مجاہدین میں بانٹ دیا گیا اور قیدیوں کو لوگوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ برہ حضرت ثابت بن قیسؓ کے حصہ میں آئیں۔ اس طرح حالات نے ایک مشہور و معروف رئیس کی بیٹی کو کنیز بنا دیا۔ یہ صورت حال برہ کے لئے بڑی پریشان کن اور سوہانِ روح تھی اس لئے انہوں نے حضرت ثابتؓ کو پیش کش کی کہ براہ مہربانی مجھ سے کچھ رقم لے کر مجھے آزاد کر دیں۔

''ٹھیک ہے، تم مجھے نو اوقیہ (عرب میں مروج ایک پیمانے کا نام) سونا دے دو تو میں تمہیں آزاد کر دوں گا۔'' حضرت ثابت بن قیسؓ نے وعدہ کر لیا۔

برہ بہت خوش تھیں کہ نو اوقیہ سونا جس کی رقم چار ہزار درہم بنتی تھی ادا کر کے آزاد ہو جائیں گی لیکن معاً خیال آیا کہ بحالت کنیز نو اوقیہ سونا کہاں سے آئے گا؟

پھر خیال آیا کہ مکاتبت کی رقم مانگ کر ادا کر دینی چاہئے۔ (کچھ رقم کے عوض آزادی حاصل کرنے کو مکاتبت کہا جاتا ہے۔)

اس سلسلے میں وہ سب سے پہلے جانِ دو عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں

''کون ہو اور کیسے آئی ہو؟'' آپ نے دریافت فرمایا۔

''حضور! میں مسلمان ہو کر حاضر خدمت ہوئی ہوں'' برہ نے کہا ''اشهد ان لا اله الا الله وانک رسوله.'' پھر بولیں ''یارسول اللہ! میں حارث بن ضرار کی بیٹی ہوں

جو اپنے قبیلے کا سردار تھا۔ لشکر اسلام کے ہاتھوں قید ہوئی اور ثابت بن قیس کے حصے میں آ گئی ہوں۔ اس نے مجھے نو اوقیہ سونے پر مکاتبہ بنایا ہے۔ میں اسے ادا نہیں کر سکتی، میری اعانت و مدد فرمائیں تاکہ مکاتبت کی رقم ادا کر سکوں۔''

حارث جو غزوہ بنی مصطلق کے وقت بھاگ گیا تھا اسے جب پتہ چلا کہ مسلمان اس کی بیٹی کو کنیز بنا کر لے گئے ہیں تو اپنی بیٹی کے فدیہ میں چند اونٹ لے کر مدینے کی طرف چل پڑا۔ جو اونٹ وہ لے کر چلا تھا ان میں سے دو اونٹ اسے بہت پسند تھے لہٰذا وہ اس نے وادیٔ عقیق کی گھاٹیوں میں سے ایک گھاٹی میں چھپا دیئے اور باقی اونٹ لے کر جانِ دو عالم ﷺ کی خدمت اقدس میں پہنچا۔

جب وہ مدینہ منورہ پہنچا تو اس سے پہلے اس کی بیٹی جان دو عالم ﷺ سے مدد کی درخواست کر چکی تھیں۔ آپ باہر تشریف لائے تو حارث نے عرض کی---''میری بیٹی کنیز نہیں بن سکتی۔ میری شان اس سے بالاتر ہے۔ میں اپنے قبیلے کا سردار اور رئیسِ عرب ہوں۔ آپ اس کو آزاد کر دیں اور فدیہ لے لیں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر وہ دو اونٹ کہاں ہیں جو تم راستے میں چھپا آئے ہو؟'' جانِ دو عالم ﷺ نے دریافت فرمایا اور اس گھاٹی کا نام بھی بتا دیا جہاں انہیں چھپایا تھا۔

''آپ کو کس نے اطلاع دی؟'' حارث نے حیرانی سے پوچھا۔

''میرے رب نے۔'' آپ نے ارشاد فرمایا۔

''بے شک آپ اللہ کے رسول ہیں۔'' حارث نے کہا اور مسلمان ہو گیا۔ دوسرے کئی افراد بھی مسلمان ہو گئے اور پھر اس نے گھاٹی میں چھپائے ہوئے دو اونٹ بھی لا کر پیش خدمت کر دیئے۔

جانِ دو عالم ﷺ نے مکاتبت کی رقم اپنی طرف سے ادا کر کے برہؓ کو حضرت ثابتؓ سے آزاد کرا لیا۔

برہؓ جب آزاد ہو گئیں تو انہوں نے جانِ دو عالم ﷺ کی خدمتِ عالیہ میں ہی رہنے کو فوقیت دی اور والد کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ جب آپ کو علم ہوا تو آپ نے

حضرت حارثؓ کو برہ سے نکاح کا پیغام بھیجا جو انہوں نے بصد خوشی قبول کر لیا اور چار سو درہم حق مہر پر اپنی بیٹی آپ کے حبالۂ عقد میں دے دی۔ آپ نے نام بدل کر برہ کے بجائے جویریہ رکھ دیا۔ اس وقت ان کی عمر بیس سال تھی۔ مزید مہربانی فرماتے ہوئے آپ نے حضرت جویریہؓ کے قبیلے کے چالیس غلام بھی آزاد کر دیئے۔ جب لوگوں کو علم ہوا کہ آپ نے حضرت جویریہؓ سے شادی کر لی ہے تو بعضوں نے کہا---''کیا رسول اللہ ﷺ کے سسرال والے غلام بنائے جائیں؟ ہرگز نہیں' یہ محبت کے منافی ہے۔''

لہٰذا لوگوں نے بنی مصطلق کے تمام قیدی آزاد کر دیئے۔ اس نکاح کی یہ برکت ہوئی کہ سو خاندان آزاد ہو گئے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی تھیں۔

''میں نے کسی عورت کو جویریہؓ سے بڑھ کر اپنی قوم کے حق میں مبارک نہیں دیکھا۔ اس کے سبب بنو مصطلق کے تمام گھرانے آزاد کر دیئے گئے۔''

ام المؤمنین سیّدہ جویریہؓ جانِ دو عالم ﷺ کی زوجیت کی نور و نکہت سے بھرپور فضاؤں میں بے مثل زندگی گزار رہی تھیں۔ وہم و گمان بھی نہیں تھا کہ یہ حسین و خوشگوار زندگی صرف چھ سال پر محیط ہے اور اس کے بعد وہ بیوگی و جدائی کا داغ دے کر اپنے رفیقِ اعلیٰ کے پاس تشریف لے جائیں گے۔ جب جانِ دو عالم ﷺ نے وصال فرمایا تو دنیا اندھیر ہو گئی۔ یقین نہیں آتا تھا کہ آنکھیں جو دیکھ رہی ہیں وہ حقیقت ہے۔ دل میں ہول اٹھتا تھا، آنکھوں سے اشک رواں تھے لیکن لبوں پر یہ الفاظ تھے۔

''اے باری تعالیٰ تو جس حال میں مجھے رکھے میں ویسے ہی راضی ہوں۔ مجھے حوصلہ عطا فرما۔''

اس وقت ان کی عمر مبارک چھبیس سال تھی۔ انہوں نے بیوگی کا طویل عرصہ گزارا۔ آخر جانِ دو عالم ﷺ سے جدا ہوئے پینتالیس سال ہو گئے تو ان کے وصال کا وقت قریب آ گیا اور ربیع الاوّل ۵۶ ہجری کو آپ کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ اس وقت ان کی عمر ۷۱ سال تھی۔

ان دنوں حضرت امیر معاویہؓ کی طرف سے مدینہ منورہ میں مروان بن الحکم حاکم تھے۔

انہوں نے نماز جنازہ پڑھائی اور جنت البقیع میں آسودہ خواب ہوگئیں۔

کتب معتبرہ میں ان سے سات احادیث مروی ہیں۔ جن میں سے دو بخاری شریف میں، دو مسلم شریف میں اور تین دیگر کتب میں مروی ہیں۔

آپ کے بہن بھائی بھی مسلمان ہوگئے تھے۔ ان کے بھائی حضرت عمرو بن حارث سے ایک حدیث پاک مروی ہے۔ کہتے ہیں۔

''اللہ کی قسم! رسول اللہ ﷺ نے وصال کے وقت نہ دینار چھوڑا، نہ درہم، نہ غلام، نہ لونڈی، نہ اور کوئی چیز۔ صرف ایک سفید خچر تھا یا ہتھیار تھے یا کچھ زمین تھی جسے آپ نے صدقہ فرمادیا۔''

آپ کی بہن سے بھی درج ذیل حدیث مروی ہے۔

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دنیا بظاہر بڑی شاداب اور شیریں معلوم ہوتی ہے مگر درحقیقت تلخ اور ناخوشگوار ہے۔''

اُمّ المؤمنین سیّدہ اُمِّ حبیبہ رضی اللہ عنہا

حضرت اُمّ حبیبہ، ابوسفیان صخر ابن حرب کی بیٹی تھیں۔ ابوسفیان کا تعلق بنوامیہ سے تھا۔ سردارانِ قریش سے تھے اور تجارت پیشہ تھے۔ ہر سال قریش کا مالِ تجارت لے کر شام اور قرب و جوار کے ممالک میں جاتے تھے۔ سردارانِ قریش کا جھنڈا عقاب ان کی تحویل میں تھا۔ جب بھی جنگ کی تیاری ہوتی تو قریش اکٹھے ہوتے اور علم لشکر کے سردار کے ہاتھ میں دے دیتے۔

ابوسفیان کی شادی صفیہ بنتِ ابوالعاص سے ہوئی جوان کے چچا کی بیٹی اور حضرت عثمانؓ کی پھوپھی تھیں۔ ان کے ہاں ابوسفیان کی ایک بیٹی پیدا ہوئی جس کا نام ماں باپ نے رملہ رکھا۔ (۱)

رملہ بنت ابوسفیان جب اس جہانِ رنگ و بو میں پیدا ہوئیں، اس وقت ابوسفیان کی عمر تینتیس برس تھی اور سال فیل کو گزرے تیس سال بیت چکے تھے۔

جوان ہوئیں تو عبیداللہ ابن جحش سے شادی ہوگئی۔ عبیداللہ ان لوگوں میں سے تھا جو جانِ دو عالم ﷺ کے اعلانِ نبوت سے پہلے ہی بت پرستی سے متنفر ہو چکے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ عید کی تقریب پر جب قریش ایک نخلستان میں جمع ہوئے تو ان میں سے چار اشخاص زید بن عمرو، عثمان بن حویرث، عبیداللہ بن جحش اور ورقہ بن نوفل مجمع سے الگ ہٹ کر کہنے لگے کہ یہ بت پرست لوگ بے خبر اور گمراہ ہیں۔ پتھر کیا ہیں جن کا یہ لوگ طواف کرتے ہیں۔ یہ دیکھتے ہیں نہ سنتے ہیں اور نہ نفع و ضرر پر قدرت رکھتے ہیں۔ آؤ، ہم ان سے ہٹ کر

---

(۱) رملة کا معنی ہے "قطعة من الارض یعلوها الرمل" (المنجد) زمین کا ایک ایسا ٹکڑا جس میں ریت بکثرت ہو۔ اس لحاظ سے یہ لفظ ریگستان کا ہم معنی ہے۔ ریگستان کی وسعت و کشادگی، اس کے طلوع و غروب کے حسین مناظر اور اس کی پرسکون خنک راتیں عربوں کو نہایت مرغوب تھیں اس لئے رملة ان کے ہاں پسندیدہ نام تھا۔

الگ اپنے دین کی بنیاد رکھیں۔

ان میں سے ورقہ بن نوفل اور عثمان بن حویرث نے مسیحیت قبول کر لی۔ زید بن عمرو نے نہ یہودیت اختیار کی، نہ مسیحیت ؛ البتہ اسے اپنے آبائی مذہب سے نفرت ضرور ہوگئی۔ رملہ کا شوہر عبیداللہ ذہنی کشمکش کا شکار ہو گیا اور کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔

وقت کا دھارا بہتا رہا۔ عبیداللہ ہنوز تذبذب کا شکار تھا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے سال فیل کے چالیس برس بعد اپنے محبوب ﷺ کو مبعوث فرمایا اور وہ در پردہ تبلیغ فرمانے لگے۔

ایک دن عبیداللہ گھر میں چپ چاپ بیٹھا تھا۔ چہرے پر گہری سوچ وفکر کے آثار تھے۔ رملہ بڑے غور سے خاوند کی طرف تک رہی تھیں۔ آخر کار بولیں

''عبیداللہ! کیا فکر لاحق ہے؟''

''میں نے آج ایک بڑی عجیب بات سنی ہے!''

''کیا؟'' رملہ نے رازدارانہ انداز میں پوچھا

''محمد بن عبداللہ (ﷺ) نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ کہتے ہیں میں اللہ کا نبی ہوں۔''

''یہ بات بڑے عرصے سے مکے کی فضاؤں میں گردش کر رہی تھی کہ اللہ کا برگزیدہ نبی مبعوث ہونے والا ہے اور ہر آدمی جانتا ہے کہ محمد بن عبداللہ نے ہر لحاظ سے بے داغ و پاکیزہ زندگی گزاری ہے۔ کوئی بعید نہیں کہ اللہ نے ان کو نبوت عطا فرمائی ہو۔'' رملہ نے کہا اور جب عبیداللہ نے کوئی جواب نہ دیا تو بولیں

''ہمیں جو بھی فیصلہ کرنا ہے، بہت جلد کرنا چاہئے۔''

چند دن بعد دونوں میاں بیوی بارگاہ نبوت میں حاضر ہو گئے۔

''کیسے آئے ہو؟'' جانِ دو عالم ﷺ نے پوچھا۔

''اسلام لانے کے لئے یا رسول اللہ!'' رملہ بولیں۔

''کس کی بیٹی ہو؟'' آپ نے دریافت فرمایا۔

''ابوسفیان کی۔'' رملہ نے بتایا اور دونوں میاں بیوی کلمہ شہادت پڑھ کر حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔

حبشہ کی طرف دوسری ہجرت میں یہ دونوں میاں بیوی بھی شامل تھے۔ حبشہ میں قیام کے دوران ان کے ہاں ایک بیٹی نے جنم لیا۔ باپ نے اس کا نام حبیبہ رکھا اور پھر سب لوگ رملہ کو اُمّ حبیبہ کے نام سے منسوب کرنے لگے۔ یعنی حبیبہ کی ماں۔ یہ کنیت نام پر اس قدر غالب آئی کہ لوگ ان کا اصل نام بھول گئے اور سب انہیں اُمّ حبیبہ کہنے لگے۔

ایک دن اُمّ حبیبہؓ کسی گہری سوچ میں مستغرق تھیں۔ وہ محسوس کر رہی تھیں کہ کچھ دنوں سے عبیداللہ کا رویہ بدلا بدلا سا ہے اور پہلے جیسی گرمجوشی و محبت باقی نہیں رہی۔

رفتہ رفتہ اُمّ حبیبہؓ کی زندگی میں فکروں اور سوچوں نے گھر بنانا شروع کر دیا کیونکہ عبیداللہ کا طور طریقہ بہت بدل چکا تھا۔ زیادہ تر وقت گھر سے باہر گزارتا تھا اور اِدھر اُدھر سے پتہ چلتا رہتا تھا کہ وہ عیش و عشرت میں پڑ گیا ہے۔ یہی بات ان کے لئے پریشان کن تھی۔ ایک رات خواب میں انہوں نے عبیداللہ کو نہایت ہی مکروہ اور ناگوار شکل میں دیکھا تو فوراً آنکھ کھل گئی۔ اب نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ صبح ہوئی تو عبیداللہ نے اُمّ حبیبہ کو مخاطب کر کے کہا۔

''اے حبیبہؓ کی ماں! میں نے دین کے بارے میں بہت سوچا ہے اور آخر کار اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تمام مذاہب میں سے نصرانیت بہترین ہے۔ پہلے بھی میں اس کی طرف مائل ہوا تھا لیکن پھر میں نے اسلام اختیار کر لیا تھا۔ اس کی وجہ میں خود بھی نہیں جانتا۔ تاہم اب میں نے نصرانیت کی طرف رجوع کر لیا ہے۔''

اُمّ حبیبہؓ نے کہا---''اس میں تمہاری کوئی بھلائی نہیں ہے بلکہ سراسر نقصان ہے۔''

''میں نے ہر پہلو پر خوب غور کیا ہے اور یہی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ نصرانیت اچھی ہے اس لئے شاہی مذہب سے متاثر ہو کر عیسائی ہو گیا ہوں۔'' عبیداللہ نے جواب دیا۔

''عبیداللہ! ابھی وقت ہے کہ اس خیال کو چھوڑ دو'' اُمّ حبیبہؓ نے کہا ''رات میں نے خواب میں تمہیں نہایت بھیانک اور مکروہ شکل میں دیکھا ہے۔''

مگر سمجھانے کے باوجود عبیداللہ اپنے خیال سے باز نہ آیا اور مرتد ہو گیا۔ لٰہذا میاں بیوی کی علیحدگی ہو گئی۔

طرفہ تماشا دیکھیں کہ عبید اللہ نے نجاشی کے مذہب سے متاثر ہو کر اسلام ترک کر دیا تھا لیکن اس کے برعکس جب ۶ ہجری میں جانِ دو عالم ﷺ نے نجاشی کو اسلام قبول کرنے کا دعوت نامہ بھیجا تو وہ فوراً آپ کی رسالت پر ایمان لے آیا اور اسی سن ہجری میں عبید اللہ مذہبِ عیسائیت پر اس جہان سے کوچ کر گیا۔

سچ فرمایا جانِ دو عالم ﷺ نے مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہ، وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہ.

❁❁❁

اب اُمّ حبیبہؓ کی زندگی پر بیوگی کے سائے پھیلے ہوئے تھے اور پردیس میں یکہ وتنہا زندگی گزار رہی تھیں۔ جانِ دو عالم ﷺ کو جب اُمّ حبیبہؓ کے بارے میں علم ہوا تو حضرت عمر ابن امیہ ضمریؓ کو طلب کیا اور فرمایا

''تم ابھی حبشہ روانہ ہو جاؤ اور اس کے بادشاہ کو میرا خط پہنچاؤ!''

حضرت عمرو بن امیہ ضمریؓ نے خط کو بصد ادب ہاتھوں میں لیا اور سوئے حبشہ چل پڑے۔ شاہ حبشہ نے ان کا بڑی محبت سے استقبال کیا اور قریب لا کر بٹھایا۔ قاصد نے خط پیش کیا تو اسے سر آنکھوں پر رکھا اور پھر کھول کر پڑھا۔ لکھا تھا

''میری طرف سے اُمّ حبیبہ کو پیامِ شادی دو۔''

خط پڑھنے کے بعد شاہ حبشہ نے اپنی باندی ابرہہ کو طلب کیا جو ملبوسات وعطریات کی منتظمہ تھی۔ اسے کچھ ہدایات دیں اور اُمّ حبیبہؓ کی خدمت میں بھیجا۔ ابرہہ اُمّ حبیبہؓ کے پاس گئی اور کہا

''مجھے بادشاہ سلامت نے بھیجا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے آپ کے لئے شادی کا پیغام آیا ہے۔ کیا آپ ان کی ازواج مطہرات میں شامل ہونے پر آمادہ ہیں؟''

''شاہ حبشہ سے کہو کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی رحمت سے نوازے، مجھے کوئی عذر نہیں۔'' اُمّ حبیبہؓ نے جواب دیا۔

''آپ کی جانب سے وکیل کون ہوگا؟'' ابرہہ نے پوچھا۔

''خالد بن سعید۔'' اُمّ حبیبہؓ نے اپنے ایک قریبی رشتہ دار کا نام لیا جو مہاجرین حبشہ میں شامل تھے۔

جواب سن کر ابرہہ واپس جانے لگی تو حضرت اُمّ حبیبہؓ نے اسے روک لیا اور چاندی کے دو کنگن، دو جھانجھن جو آپ کے پیروں میں تھیں اور انگلیوں میں جتنی چاندی کی انگوٹھیاں تھیں، اتار کر اسے دے دیں کیونکہ وہ بہت بڑا مژدہ لے کر آئی تھی۔ یہ اس کا انعام تھا۔

شام کو تقریب نکاح کا انتظام کیا گیا۔ نجاشی نے حضرت جعفر طیارؓ اور وہاں جو مسلمان تھے سب کو بلا بھیجا۔ جب سب جمع ہو گئے تو شاہ حبشہ نجاشی نے حاضرین سے کہا

''مجھے رسول اللہ ﷺ نے پیغام بھجوایا تھا کہ میں ان کا نکاح اُمّ حبیبہ سے پڑھا دوں۔ اس سلسلے میں آپ کو یہاں بلایا ہے۔''

اور پھر اصحمہ شاہِ حبشہ نے جن کا لقب نجاشی تھا۔ خطبۂ نکاح پڑھا جس کا مطلب تھا۔

''تمام خوبیاں اور بڑائیاں اس اللہ کے لئے مخصوص ہیں جو بادشاہ ہے اور تمام عیوب و نقائص سے پاک ہے۔ جو سلام ہے، امن دینے والا ہے اور غلبہ والا ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی حق دار عبادت نہیں اور محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں۔ اور آپ وہی ہیں جن کی بشارت حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دی تھی۔

اما بعد، رسول اللہ ﷺ نے مجھے لکھا ہے کہ میں آپ ﷺ کا نکاح اُمّ حبیبہ سے کرا دوں۔ میں آپ کے اس حکم کو بجالانے کے لئے کھڑا ہوا ہوں اور میں نے مہر میں اُمّ حبیبہ کو چار سو دینار دینے کا تہیہ کر لیا ہے۔''

پھر نجاشی نے وہ دینار لوگوں کے سامنے رکھ دیئے۔

اس کے بعد حضرت خالد بن سعیدؓ نے جو اُمّ حبیبہؓ کے وکیل تھے، خطبہ دیا۔

''تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں۔ میں اس کی بڑائی بیان کرتا ہوں اور اسی سے اپنے ہر کام میں نصرت اور مدد مانگتا ہوں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی حقدارِ عبادت نہیں اور محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں۔ اللہ نے آپ کو ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا ہے تا کہ اس دین کو تمام دینوں پر غالب فرما دے، اگرچہ مشرکوں کو برا معلوم ہو۔

امابعد، میں نے رسول اللہ ﷺ کی تمنا پر لبیک کہتے ہوئے اُمّ حبیبہ کو رسول اللہ ﷺ کے نکاح میں دے دیا۔ اللہ تعالیٰ رسول اللہ ﷺ کے اس نکاح میں برکت عطا فرمائے۔''

اس کے بعد نجاشی نے چار سو دینار خالد بن سعید کو دیئے اور انہوں نے مہر کی یہ رقم اُمّ حبیبہؓ کی خدمت میں پیش کر دی۔ نکاح کے وقت اُمّ حبیبہؓ کی عمر ۳۶ سال اور سن ۶ ہجری تھا۔

واپسی کے لئے بادشاہ نے دو کشتیوں کا بندوبست کر دیا۔ کچھ اور مہاجرین بھی واپس جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ چنانچہ مقررہ روز مسلمانوں کا یہ قافلہ حضرت جعفر طیارؓ کی قیادت میں حبشہ سے روانہ ہو گیا اور طویل سفر طے کر کے بخیریت مدینہ منورہ پہنچ گیا۔

ہجرتِ حبشہ سے لے کر جانِ دو عالم ﷺ کے نکاح میں آ کر مدینے واپس آنے تک تیرہ سال حضرت اُمّ حبیبہؓ حبشہ میں رہیں۔ جب وہ مدینہ منورہ پہنچیں تو ان دنوں جانِ دو عالم ﷺ خیبر کی مہم پر تشریف لے گئے ہوئے تھے۔ واپس تشریف لائے تو حضرت اُمّ حبیبہؓ شدت سے چشم براہ تھیں۔ بیٹی حبیبہ ان کے ساتھ تھی جس نے آغوش نبوت میں تربیت پائی اور جب بڑی ہوئی تو قبیلہ ثقیف کے رئیس اعظم داؤد بن عروہ کو منسوب ہوئی۔

❁❁❁

حضرت اُمّ حبیبہؓ کو جانِ دو عالم ﷺ سے کس قدر عقیدت تھی، اس کا اندازہ اس واقعے سے کیجئے کہ ایک دفعہ ان کا والد ابوسفیان جو ابھی اسلام نہیں لایا تھا، کسی سلسلے میں مدینہ آیا اور اپنی بیٹی سے بھی ملا۔ یہ ملاقات چودہ سال بعد ہوئی تھی۔ ابتدائی بات چیت کے بعد ابوسفیان حجرے میں بچھے ایک بستر پر بیٹھنے لگا تو اُمّ حبیبہؓ نے اسے فوراً لپیٹ دیا۔ ابوسفیان کو سخت شرمندگی محسوس ہوئی اور شکوہ کناں لہجے میں کہنے لگا---''کیا تم نے اپنے باپ کو اس لائق بھی نہیں سمجھا کہ وہ بستر پر ہی بیٹھ سکے؟''

''یہ رسول اللہ ﷺ کا بستر ہے اور آپ ابھی شرک کی نجاست سے آلودہ ہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ آپ کے بیٹھنے سے اس بستر کے تقدس میں فرق آئے۔''

ابوسفیان یہ سن کر غصے سے تلملا اٹھا اور بڑبڑاتا ہوا بیٹی کے گھر سے باہر نکل گیا۔(۱)

حضرت اُمّ حبیبہؓ نے تقریباً ۴ سال جانِ دو عالم ﷺ کے ساتھ ازدواجی زندگی بسر کی۔ اس کے بعد آپ کا وصال ہو گیا۔ جب انہیں مفارقت کا داغ لگا اس وقت ان کی عمر مبارک چالیس سال تھی۔ دنیا اندھیر ہو گئی۔ جب کبھی ملاقات کو دل چاہتا تو حجرۂ عائشہ صدیقہؓ میں تشریف لے جاتیں۔ کچھ دیر وہاں بیٹھتیں اور پھر واپس تشریف لے آتیں۔

✿✿✿

وقت گزرتا رہا۔ اُمّ المؤمنین حضرت اُمّ حبیبہؓ اپنے محبوب شوہر جانِ دو عالم ﷺ

---

(۱) ابوسفیان کے اسلام لانے کی تفصیلات سیدالورٰی ج ۲، باب فتح مکہ میں گزر چکی ہیں۔ دولت ایمان سے مشرف ہونے کے بعد انہوں نے نمایاں دینی خدمات انجام دیں اور حق و باطل کے دو معرکوں میں یکے بعد دیگرے اپنی دونوں آنکھیں راہ حق میں قربان کر دیں۔

پہلا معرکہ طائف میں برپا ہوا جب مالک بن عوف ثقیف و ہوازن کے مشرکوں کی ایک جماعت کے ساتھ حنین سے فرار ہو کر طائف چلا گیا اور اس کے قلعہ میں پناہ لی جہاں اس نے پہلے ہی ساز و سامان تیار کر رکھا تھا۔ جانِ دو عالم ﷺ کو جب اس کی خبر ملی تو اس قلعہ کو فتح کرنے کا ارادہ فرمایا۔ اس میں حضرت ابوسفیان خوب لڑے۔ دوران جنگ ایک تیر آ کر ان کی آنکھ میں لگا جس سے وہ ضائع ہو گئی۔

دوسرا معرکہ حضرت فاروقؓ کے عہد میں یرموک کے میدان میں پیش آیا۔ اس میں بھی حضرت ابوسفیانؓ شامل ہوئے اور خوب داد شجاعت دی۔ وہ زور زور سے کہہ رہے تھے۔

''اے اللہ کی مدد! ہمارے پاس آ، ہمارے قریب آ۔'' سواروں کے بڑے بڑے جتھوں کے سامنے کھڑے ہو کر انہیں اکساتے اور کہتے

''اللہ اللہ! تم عرب ہو اور اسلام کے مددگار ہو جبکہ تمہارے دشمن رومی ہیں اور کفر کے مددگار ہیں۔ ان پر اسی طرح بھرپور حملے کرو جس طرح عہد رسالت میں کیا کرتے تھے اور ان کو تہس نہس کر کے رکھ دو! اے اللہ! آج کا دن تیرے دنوں میں سے ہے۔ اے اللہ! تو اپنے بندوں پر اپنی فتح نازل فرما۔''

اسی اثنا میں ایک تیر آ کر ان کی آنکھ میں لگا اور وہ نابینا ہو گئے کیونکہ ایک آنکھ ان کی پہلے ہی غزوۂ طائف میں ضائع ہو گئی تھی۔ اس طرح انہوں نے اپنی دونوں آنکھیں راہ خدا میں نثار کر کے اپنی سابقہ اسلام دشمنی کا کفارہ ادا کر دیا۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

سے حاصل کردہ علم وعرفان اپنے روحانی بیٹوں اور بیٹیوں میں تقسیم فرماتی رہیں۔ آپ سے کتب متداولہ میں ۶۵، احادیث مروی ہیں۔ ان میں ۲ متفق علیہ، ایک تنہا مسلم شریف میں اور باقی دیگر کتب میں ہیں۔

عہد عثمانی میں جب اسلام دشمن قوتوں اور بدباطنوں نے حضرت عثمان غنیؓ کے گھر کا محاصرہ کرلیا اور ضرورت کی کوئی چیز گھر کے اندر جانے نہیں دیتے تھے تو حضرت اُمّ حبیبہؓ اپنے اس روحانی بیٹے کی حالت وکیفیت جان کر مضطرب ہوگئیں۔ اور ہر طرح کے خطرات کو پس پشت ڈالتے ہوئے پانی کا ایک مشکیزہ اور کچھ کھانا لے کر اپنے گھر مبارک سے نکلیں اور خچر پر سوار ہوکر حضرت عثمان غنیؓ کے کاشانۂ اقدس کی طرف چل پڑیں۔ کھانے کی اشیاء کو انہوں نے چھپا رکھا تھا تاکہ بلوائی چھین نہ لیں مگر فسادیوں میں سے بعض لوگوں نے انہیں روک لیا اور خچر کے منہ پر دو ہنٹر مارے۔ حضرت اُمّ حبیبہؓ نے فرمایا

''مجھے عثمان کے پاس جانے دو۔''

''نہیں جانے دیں گے۔'' ایک لعنتی نے گستاخانہ کہا اور تلوار سے خچر کی رسی کاٹ دی جس سے وہ خچر سے گرتے گرتے بچیں۔

پھر جب حضرت اُمّ حبیبہؓ کو کسی نے آکر یہ خبر دی کہ حضرت عثمانؓ کو ان کے گھر میں محاصرے کے بعد شہید کر دیا گیا ہے تو دلی افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا

''عثمان کے قاتل کا ہاتھ کٹ جائے اور وہ سرعام رسوا ہو۔''

اللہ تعالیٰ نے ان کی زبان سے نکلے ہوئے کلمات کی لاج رکھ لی۔ کسی شخص نے قاتل کے مکان میں گھس کر تلوار سے اس پر حملہ کیا۔ اس وقت وہ صرف ایک چادر اوڑھے ہوئے تھا۔ اس نے اپنے بچاؤ کے لئے اپنا دایاں ہاتھ آگے کیا جو کٹ کر نیچے گر گیا۔ اس نے اپنی چادر کو دانتوں سے سہارا دیا اور کمرے سے نکل کر باہر دوڑ پڑا مگر چادر سنبھال نہ سکا اور اپنے کٹے ہوئے ہاتھ کے ساتھ مکمل برہنہ حالت میں بھاگتا رہا اور ذلیل ورسوا ہوتا رہا۔

جب حضرت اُمّ حبیبہؓ کا دمِ واپسیں آیا تو انہوں نے امہات المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت ام سلمہؓ کو بلا بھیجا۔ جب وہ تشریف لائیں تو حضرت اُمّ حبیبہؓ نے ان

سے مخاطب ہو کر کہا

''اگر ایک شوہر کی متعدد بیویاں ہوں تو ان میں کبھی کبھی اختلاف اور شکر رنجی ہو ہی جاتی ہے، لہٰذا جو کچھ میری جانب سے تمہارے متعلق واقع ہوا ہو، اسے معاف کر دو۔''

دونوں امہات المؤمنین نے بیک زبان کہا

''اے اُمّ حبیبہ! حق تعالیٰ تم کو معاف کرے۔ ہم بھی معاف کرتی ہیں۔''

یہ سن کر حضرت اُمّ حبیبہؓ کے چہرۂ اقدس پر رونق ابھر آئی۔ بولیں۔

''اللہ تبارک وتعالیٰ تمہیں خوش رکھے، تم نے مجھے خوش کر دیا۔''

اور پھر اس دنیا کو خیر باد کہہ کر فردوس کے باغوں کی طرف تشریف لے گئیں۔

اس وقت آپ کی عمر مبارک ۷۴ سال تھی۔ سن ۴۴ ہجری اور عہد خلافت ان کے بھائی حضرت امیر معاویہؓ کا تھا۔

ابوالقاسم بن عساکر حضرت حسنؓ کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ ایک روز امیر معاویہ جانِ دو عالم ﷺ کے پاس آئے۔ آپ کے پاس ان کی بہن اُمّ حبیبہ بھی بیٹھی ہوئی تھیں۔ امیر معاویہ واپس پلٹنے تو رسول اللہ ﷺ نے آواز دی---''آؤ معاویہ اور ہمارے ساتھ بیٹھو۔'' وہ واپس پلٹے اور آپ کے پاس بیٹھ گئے۔

جانِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا---''میری دلی تمنا ہے کہ جنت میں تم، اُمّ حبیبہ اور میں اکٹھے جام طہور نوش کریں۔''

اس فرمان میں نہ صرف اُمّ حبیبہؓ؛ بلکہ ان کے بھائی حضرت معاویہؓ کے لئے بھی جنت کی بشارت کا تذکرہ ہے۔ رَضِیَ اللہُ تَعَالیٰ عَنْھُمَا.

آپ کے مدفن کے بارے میں مختلف روایات ہیں۔

امام نووی نے ابوالقاسم کی تاریخ دمشق کے حوالے سے یہ روایت نقل کی ہے کہ اُمّ المؤمنین حضرت اُمّ حبیبہؓ دمشق میں اپنے بھائی سے ملنے تشریف لے گئی تھیں، وہیں سانحۂ ارتحال پیش آیا اور ان کی قبر مبارک وہیں ملک شام میں ہے، لیکن صحیح قول یہ ہے کہ آپ کا وصال مدینہ طیبہ میں ہوا اور وہیں مدفون ہوئیں۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہا

اُمّ المؤمنین سیّدہ صفیہ رضی اللہ عنہا

ایک روایت کے مطابق سیّدہ صفیہ رضی اللہ عنہا کا اصل نام زینب تھا۔ جنگ خیبر میں خاص کر جان دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے حصہ میں آئی تھیں اور عرب میں مال غنیمت کے ایسے حصے کو جو امام وقت یا بادشاہ وقت کے لئے مخصوص ہوتا تھا ''صفیہ'' کہتے تھے اس لئے وہ بھی صفیہ کے نام سے مشہور ہوگئیں۔ لیکن ہمیں اس روایت کو ماننے میں اس لئے تامل ہے کہ صفیہ نام کی متعدد خواتین عرب میں ہوئی ہیں۔ خود جان دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک پھوپھی صاحبہ کا نام صفیہ تھا۔ اس لئے یہ روایت چنداں معتبر نہیں ہے۔ سیّدہ صفیہ رضی اللہ عنہا کے والد حیٔ بن اخطب یہودیوں کے معروف قبیلے بنونضیر کے سردار تھے۔

ان کی والدہ کا نام ضرہ تھا جو نامور سردار سموئیل کی بیٹی تھیں۔ اس طرح سیّدہ صفیہ رضی اللہ عنہا کا ددھیال بنونضیر اور ننھیال بنو قریظہ یہودیوں کے دو یک جدی خاندان قرار پاتے ہیں۔ اس لحاظ سے سیّدہ صفیہ رضی اللہ عنہا کا حسب ونسب ایک خصوصی امتیاز رکھتا تھا۔

سیّدہ صفیہ رضی اللہ عنہا کی پہلی شادی سلام بن مشکم القرظی سے ہوئی تھی جو ایک مشہور شاعر اور سردار تھا لیکن دونوں میاں بیوی میں بن نہ سکی اور سلام بن مشکم القرظی نے انہیں طلاق دے دی۔ طلاق کے بعد ان کے باپ نے ان کا نکاح بنی قریظہ کے ایک نامور سردار کنانہ بن ابی الحقیق سے کر دیا جو ابو رافع، تاجرِ حجاز اور خیبر کے رئیس کا بھتیجا تھا۔ خود بھی بلند مرتبہ تھا اور خیبر کے مشہور قلعہ القموص کا سردار تھا۔

سن ۷ ہجری میں جان دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں کی سازشوں کا قلع قمع کرنے کے لئے ان کے مرکز خیبر کا رخ کیا۔ یہیں جنگ خیبر ہوئی جس میں مسلمانوں کو تاریخی فتح و نصرت حاصل ہوئی اور القموص جیسا مضبوط قلعہ بھی مسلمانوں کے ہاتھ لگا۔ کنانہ ابن ابی الحقیق اپنے قلعہ ہی میں مارا گیا۔ اس کے تمام اہل وعیال کے ساتھ سیّدہ صفیہ رضی اللہ عنہا بھی قید ہوئیں۔ اس جنگ میں ان کے باپ شوہر اور بھائی بھی مارے گئے۔

سیّدہ صفیہ رضی اللہ عنہا نے کئی ایسے خواب دیکھے جن کی تعبیر سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ ان کی

شادی جانِ دو عالم ﷺ سے ہوگی۔ ایک مرتبہ خواب میں دیکھا کہ ان کی گود میں چاند آ کر گرا۔ اس خواب کا ذکر انہوں نے اپنے خاوند سے کیا تو اس نے ان کے چہرے پر زوردار طمانچہ مارا اور کہا کہ تو چاہتی ہے کہ تو شہنشاہ عرب کے نکاح میں چلی جائے؟

سیّدہ صفیہؓ جنگ خیبر میں قید ہو کر آئیں۔ وہ ابھی نئی دلہن تھیں کہ ان کا شوہر جنگ میں قتل ہو گیا۔ بعض لوگوں نے جان دو عالم ﷺ کے سامنے سیّدہ صفیہؓ کی خوب صورتی کا تذکرہ کیا مگر آپ نے کوئی توجہ نہ فرمائی۔ اتنے میں حضرت دحیہ کلبیؓ نے عرض کی

''مجھے ایک لونڈی دلوا دیجئے!''

جانِ دو عالم ﷺ نے فرمایا---''ٹھیک ہے تم ایک لونڈی لے لو!''

انہوں نے حضرت صفیہؓ کو لے لیا۔ ایک شخص نے جانِ دو عالم ﷺ سے آ کر کہا کہ صفیہ بنو قریظہ کی رئیسہ ہیں۔ ایک سردار کی بیوی اور ایک سردار کی بیٹی ہیں اور خاندانی وقار و وجاہت کی حامل ہیں اس لئے وہ آپ کے علاوہ کسی اور کے لئے مناسب نہیں۔

مقصود یہ تھا کہ رئیسہ عرب کے ساتھ عام عورتوں کا سا برتاؤ نامناسب ہے۔ جان دو عالم ﷺ نے لوگوں کی نفسیات کا جائزہ لیتے ہوئے فرمایا کہ دحیہ کو مع اس لڑکی کے بلاؤ۔ حضرت دحیہ کلبیؓ حاضر ہوئے، تو آپ نے ان سے کہا

''دحیہ! تم دوسری لونڈی لے لو!'' پھر آپ نے سیّدہ صفیہؓ کو آزاد کر دیا اور انہیں اختیار دے دیا کہ چاہیں تو اپنے گھر واپس چلی جائیں یا پسند کریں تو جانِ دو عالم ﷺ کے نکاح میں آ جائیں۔ سیّدہ صفیہؓ نے آپ کے نکاح میں آنا اپنے لئے باعثِ سعادت سمجھا۔

خیبر کی فتح کے بعد جانِ دو عالم ﷺ مدینہ منورہ روانہ ہوئے۔ راستہ میں بمقام سدالصہباء حضرت ام سلیمؓ نے سیّدہ صفیہؓ کو دلہن بنایا اس طرح ان کا نکاح جانِ دو عالم ﷺ سے ہو گیا اور ان کی آزادی کو ان کا مہر قرار دے دیا گیا۔ دوسرے دن صبح کو آپ نے فرمایا---''جو چیز جس کے پاس ہو لے آئے۔''

لوگوں نے اپنے زادِ راہ لا کر چمڑے کے دستر خوان پر رکھ دیئے، پھر کھجور پنیر اور گھی سے ملیدہ تیار کیا گیا۔ اسی ملیدہ سے جانِ دو عالم ﷺ نے ولیمہ دیا۔ آپ نے دو تین

دن وہاں قیام فرمایا، پھر مدینہ منورہ روانہ ہوگئے۔ سیّدہ صفیہؓ کے لئے آپ نے اونٹ پر بیٹھنے کی جگہ بنائی اور پردہ تان کر اپنی چادر اوڑھا دی۔ راستہ میں جب سیّدہ صفیہؓ اونٹ پر سوار ہوتیں تو آپ اپنا گھٹنا زمین پر ٹکا دیتے اور سیّدہ صفیہؓ آپ کے گھٹنے پر اپنا پیر رکھ کر اونٹنی پر سوار ہو جاتیں۔

مدینہ منورہ پہنچ کر سیّدہ صفیہؓ کو جانِ دو عالم ﷺ نے حضرت حارثہ بن نعمان انصاریؓ کے مکان پر ٹھہرایا۔ حضرت حارثہ بن نعمان انصاریؓ نہایت جاں نثار صحابی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو دولت سے نوازا تھا اس لئے جان دو عالم ﷺ کی ضروریات کا خصوصی خیال رکھنا اپنے لئے سعادتِ دارین سمجھتے تھے۔ چنانچہ اس وقت بھی ان کا ایثار کام آیا۔

سیّدہ صفیہؓ اور جانِ دو عالم ﷺ کے نکاح اور سیّدہ صفیہؓ کے حسن و جمال کی شہرت سن کر انصار مدینہ کی خواتین اور ازواج مطہرات انہیں دیکھنے کے لئے آئیں۔ جن میں سیّدہ زینبؓ بنت جحش، سیّدہ عائشہؓ اور سیّدہ جویریہؓ شامل تھیں۔ جب یہ سب دیکھ کر اور مل کر جانے لگیں تو جانِ دو عالم ﷺ بھی سیّدہ عائشہؓ کے پیچھے چلے اور پوچھا ''کَیُفَ رَاَیْتِھَا یَا عَائِشَۃ!''

(اے عائشہ تم نے اس کو کیسا پایا؟)

وہ بولیں ''یہودیہ ہے۔''

جانِ دو عالم ﷺ نے فرمایا --- ''یوں نہ کہو، اب وہ اسلام قبول کر چکی ہیں اور ان کا اسلام اچھا اور بہتر ہے۔''

سیّدہ صفیہؓ میں بہت سے محاسن جمع تھے۔ وہ عاقلہ، فاضلہ، حلیم الطبع، خلیق، کشادہ دل، سیر چشم اور سخی تھیں۔ جب وہ اُمّ المؤمنین کی حیثیت سے مدینہ منورہ تشریف لائیں اور سیّدہ فاطمۃ الزہراءؓ ان سے ملنے آئیں تو انہوں نے اپنے بیش قیمت طلائی جھمکے اپنے کانوں سے اتار کر سیّدہ فاطمۃ الزہراءؓ کو دے دیئے اور ان کے ساتھ آنے والی خواتین کو بھی کچھ نہ کچھ دیا۔ آپ کا صرف ایک ذاتی مکان تھا۔ وہ بھی آپ نے اپنی زندگی میں صدقہ کر دیا۔

سیّدہ صفیہؓ میں دوسروں کے ساتھ ہمدردی کا بہت جذبہ تھا، جب خلیفۂ ثالث حضرت عثمان غنیؓ محصور ہو گئے اور ان کے مکان پر پہرہ بٹھا دیا گیا تو سیّدہ صفیہؓ ایک غلام کو لے کر خچر پر سوار ہو کر ان کے مکان کی طرف چلیں۔ اشترنخعی نے دیکھا تو خچر کو مارنے لگا، چونکہ آپ اشتر کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں، اس لئے واپس چلی گئیں اور سیدنا امام حسنؓ کو اس خدمت پر مامور کیا۔ وہ ان کے مکان سے حضرت عثمان غنیؓ کے پاس کھانا اور پانی لے جاتے تھے۔

ایک مرتبہ جانِ دوعالم ﷺ کسی بات پر سیّدہ صفیہؓ سے ناخوش ہو گئے۔ سیّدہ صفیہؓ، سیّدہ عائشہؓ کے پاس گئیں، اور کہا کہ آپ جانتی ہیں کہ میں اپنی باری کسی چیز کے معاوضہ میں نہیں دے سکتی ہوں لیکن رسول اللہ کو مجھ سے راضی کرا دیں تو میں اپنی باری کا دن آپ کو دیتی ہوں۔

سیّدہ عائشہؓ اس کام کے لئے آمادہ ہوگئیں اور زعفران کی رنگی ہوئی ایک اوڑھنی لے کر اس پر پانی چھڑکا تا کہ اس کی خوشبو مہک جائے۔ اس کے بعد جان دو عالم ﷺ کی خدمت میں تشریف لے گئیں۔ آپ نے فرمایا---''عائشہ! یہ تمہاری باری کا دن تو نہیں ہے!''

سیّدہ عائشہؓ نے کہا---''یہ خدا کا فضل ہے جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔''

پھر تمام واقعہ سنایا تو جانِ دوعالم ﷺ سیّدہ صفیہؓ سے راضی ہو گئے۔

سیّدہ صفیہؓ کو آپ سے بڑی محبت تھی۔ آپ کے آخری ایام میں تمام ازواج مطہرات آپ کی عیادت کے لئے حجرے میں تشریف لائیں۔ سیّدہ صفیہؓ نے آپ کو بے چین دیکھا تو عرض کی---''یارسول اللہ! کاش، آپ کی بیماری مجھے ہو جاتی''

دوسری ازواج مطہراتؓ نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا تو جانِ دوعالم ﷺ نے فرمایا---''واللہ! وہ سچی ہے۔''یعنی ان کا اظہار عقیدت نمائشی نہیں؛ بلکہ سچے دل سے وہ یہی چاہتی ہیں۔

سیّدہ صفیہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر اعلیٰ اخلاق والا کوئی

نہیں دیکھا۔ جب وہ خیبر سے مجھے لے کر روانہ ہوئے تو مجھے اونٹنی پر نیند آ جاتی تھی اور میرا سر کجاوہ سے ٹکرانے لگتا تھا۔ آپ اپنے ہاتھ سے میرا سر تھامتے اور فرماتے

''اے حیی کی بیٹی! ذرا دھیان سے سوار رہ۔''

سیّدہ صفیہؓ سے چند احادیث مروی ہیں جن کو حضرت زین العابدین، اسحاق بن عبداللہ بن حارث، سلم بن صفوان، کنانہ اور یزید بن معتب نے روایت کیا ہے۔ دیگر ازواج مطہرات کی طرح سیّدہ صفیہؓ بھی منبع علم و عرفاں تھیں۔ علم و فضل، تقویٰ و طہارت میں ان کا مرتبہ نہایت بلند تھا اور خاندانی شرف کے لحاظ سے بھی نہایت ممتاز تھیں۔ ایک بار جانِ دو عالم ﷺ تشریف لائے تو سیّدہ صفیہؓ رو رہی تھیں۔ آپ نے رونے کا سبب پوچھا تو انہوں نے کہا کہ عائشہ اور زینب کہتی ہیں کہ ہم تمام ازواج مطہرات میں افضل ترین ہیں، کیونکہ بیوی ہونے کے علاوہ ہم رسول اللہ ﷺ کی قرابت دار بھی ہیں۔

جانِ دو عالم ﷺ نے سیّدہ صفیہؓ کی دل جوئی کے لئے فرمایا

''اگر عائشہ اور زینب کہتی ہیں کہ ان کا تعلق خاندان نبوت سے ہے تو تم نے ان سے کیوں نہ کہا کہ میرے باپ حضرت ہارون، میرے چچا موسیٰ اور میرے شوہر محمد (ﷺ) ہیں۔''

قبول اسلام کے بعد یہودیت کا طعنہ سیّدہ صفیہؓ کے لئے بڑی دل آزاری کا موجب ہوتا تھا لیکن وہ نہایت صبر و تحمل سے کام لیتی تھیں اور کبھی کسی کو سخت جواب نہ دیتی تھیں۔ ان کی ایک لونڈی تھی جس نے فاروقی دور میں حضرت عمرؓ سے شکایت کی کہ صفیہ میں اب تک یہودیت کی بو اور اثر باقی ہے وہ اب بھی (یوم السبت) ہفتہ کے دن کو متبرک سمجھتی ہیں اور یہودیوں کے ساتھ نرم برتاؤ کرتی ہیں۔ حضرت عمرؓ نے تصدیق کے لئے ایک شخص کو بھیجا تو سیّدہ صفیہؓ نے جواب دیا---''جب اللہ نے مجھے ہفتہ کے بدلے جمعہ عطا فرما دیا ہے تو ہفتہ کو دوست رکھنے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ جہاں تک یہودیوں سے تعلقات اور ان سے نرمی کا معاملہ ہے تو یہودیوں سے میری قرابت داری ہے اور مجھے صلہ رحمی کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔''

حضرت عمرؓ اس جواب سے مطمئن ہو گئے۔ اس کے بعد سیّدہ صفیہؓ نے کنیز کو بلا کر

پوچھا کہ تجھے کس نے اس بات پر آمادہ کیا کہ تو میری شکایات کرے۔ کنیز نے کہا کہ شیطان نے مجھے بہکایا تھا۔ یہ سن کر سیّدہ صفیہؓ خاموش ہوگئیں اور اس کو آزاد کردیا۔

ایک بار جانِ دو عالم ﷺ سفر میں تھے۔ ازواج مطہراتؓ بھی ہمراہ تھیں۔ اتفاق سے سیّدہ صفیہؓ کا اونٹ بیمار ہوگیا۔ سیّدہ زینبؓ کے پاس ضرورت سے زیادہ اونٹ تھے۔ آپ نے ان سے کہا کہ ایک اونٹ صفیہ کو دے دو، انہوں نے کہا ---''کیا میں اپنا اونٹ اس یہودیہ کو دے دوں؟'' اس بات پر جانِ دو عالم ﷺ اس قدر ناراض ہوئے کہ تین ماہ ان کے پاس نہیں گئے۔

سیّدہ صفیہؓ کی وفات سن ۵۰ ہجری میں ہوئی اور جنت البقیع میں تدفین ہوئی۔ اس وقت آپ کی عمر ساٹھ سال کی تھی۔

رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالیٰ عَنْہَا

ام المؤمنین سیّدہ میمونہ رضی اللہ عنہا

حضرت میمونہؓ کا تعلق عرب کے مشہور قبیلے بنو ہلال سے تھا۔ والد کا نام حارث اور والدہ کا نام ہند تھا۔ ان کا پہلا نکاح مسعود بن عمرو ثقفی سے ہوا لیکن جلد ہی میاں بیوی میں علیحدگی ہوگئی۔ اس کے بعد ابورہم سے شادی ہوئی۔ وہ بھی فوت ہوگیا تو میمونہ جوانی ہی میں بیوہ ہوگئیں۔ اب ان کے دل میں یہ خیال انگڑائیاں لے رہا تھا کہ کاش مجھے حرم نبوی میں شامل ہونے کی سعادت حاصل ہو جائے۔ اپنی اس دلی رغبت کا تذکرہ انہوں نے اپنی بہنوں سے بھی کیا اور کہا کہ میرے قبیلہ بنو ہلال کی بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وہ نسبت قائم ہونی چاہئے جو اس سے پہلے بنوتمیم' بنوعدی' بنوامیہ' بنومخزوم' بنواسد اور بنومصطلق قبائل کو حاصل ہو چکی ہے۔ واضح رہے کہ دیگر ازواج مطہراتؓ کا تعلق انہی مذکورہ قبائل کے ساتھ تھا۔

۷ ہجری میں جانِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کرامؓ کے ہمراہ عمرہ ادا کرنے کے لئے مکہ معظمہ تشریف لے گئے تو میمونہؓ کی بہن لبابۃ الکبریٰؓ نے اپنے خاوند حضرت عباسؓ سے تذکرہ کیا کہ میری بہن میمونہ کی دلی خواہش ہے کہ اس کی شادی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہو جائے۔ آپ ان کے چچا ہیں اور آپ کو وہ احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اس لئے آپ ان سے بات کر کے دیکھیں' شاید یہ کام بن جائے اور ہماری بہن کے دل کی مراد پوری ہو جائے۔

حضرت عباسؓ نے اس موضوع پر جانِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کی تو آپ نے حضرت جعفرؓ بن ابی طالب کو یہ کام سپرد کیا کہ میمونہ سے نکاح کا اہتمام کریں۔ جب جانِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم عمرۃ القضا سے فارغ ہوئے تو ایک موقع پر حضرت میمونہؓ سے آمنا سامنا ہوگیا۔ حضرت میمونہ اونٹ پر سوار تھیں۔ جب ان کی نگاہ چہرۂ نبوت پر پڑی تو بے ساختہ پکار اُٹھیں۔

"اَلْبَعِیْرُ وَمَا عَلَیْهِ لِلّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ"

"اونٹ اور اس پر جو سوار ہے یہ سب اللہ اور اس کے رسول کے لئے وقف ہے۔"

اس طرح حضرت میمونہؓ نے اپنے آپ کو جانِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہبہ کر دیا۔

جانِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پیشکش کو خندہ پیشانی سے قبول کرلیا اور آسمان سے یہ حکم نازل ہوا

﴿وَامۡرَاَةً مُّؤۡمِنَةً اِنۡ وَّهَبَتۡ نَفۡسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنۡ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنۡ يَّسۡتَنۡكِحَهَا﴾

(اور کوئی مؤمن عورت اگر ہبہ کرے اپنے نفس کو نبی کے لئے۔ اگر نبی بھی اس کے ساتھ نکاح کرنا چاہے (تو اس سے نکاح حلال ہے۔)

عمرۃ القضا کی ادائیگی کے لئے جانِ دو عالم ﷺ نے تین دن مکہ معظمہ میں قیام کیا۔ چوتھے دن صبح کے وقت حویطب بن عبدالعزیٰ چند مشرکین کو ساتھ لے کر آیا اور آپ سے کہا کہ آپ نے عمرہ ادا کر لیا ہے اس لئے اب آپ یہاں سے چلے جائیں کیونکہ معاہدے کے مطابق مکہ میں آپ کے قیام کا وقت پورا ہو چکا ہے۔

آپ نے فرمایا---"کچھ دن ہمیں اور یہاں رہنے دو۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ میمونہ سے شادی کا اہتمام مکہ میں ہی ہو اور آپ لوگ بھی شادی کے کھانے میں شریک ہوں۔"

اس نے کہا---"ہمیں کھانے کی کوئی طلب نہیں، بس آپ یہاں سے چلے جائیں۔"

جانِ دو عالم ﷺ وہاں سے چلے اور مکہ سے دس میل دور سرف نامی جگہ پر پڑاؤ کیا اور یہیں شادی کا اہتمام کیا گیا۔ آپ کے غلام حضرت ابورافعؓ حضرت میمونہؓ کو اونٹ پر بٹھا کر سرف لے آئے اور یہیں سہاگ رات میں آپ نے ان کا نام میمونہ رکھ دیا ورنہ پہلے ان کا نام برہ تھا۔

حضرت میمونہؓ ازواج مطہرات کی فہرست میں سب سے آخر میں شامل ہونے والی تھیں۔ ان کے بعد آپ ﷺ نے کسی بھی خاتون سے شادی نہیں کی۔ شادی کے وقت حضرت میمونہؓ کی عمر چھبیس سال تھی۔ مدینہ منورہ پہنچ کر حضرت میمونہؓ کو مسجد نبوی کے ساتھ متصل بنایا گیا حجرہ تفویض کر دیا گیا اور وہ اس میں رہائش پذیر ہو گئیں۔ دیگر ازواجِ مطہرات نے انہیں خوش آمدید کہا اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آئیں۔

✿✿✿

مدینہ منورہ میں جس سال مختلف علاقوں سے جانِ دو عالم ﷺ کے پاس وفود آئے ان میں ایک وفد حضرت میمونہؓ کے قبیلے بنو ہلال کا بھی تھا۔ بنو ہلال کے وفد میں ان کا

بھانجا زیاد بن عبداللہ بھی تھا۔ یہ جب اپنی خالہ حضرت میمونہؓ کے گھر آیا' اس وقت جانِ دو عالم ﷺ وہاں تشریف فرما نہ تھے۔ جب آپ گھر تشریف لائے اور ایک اجنبی کو وہاں بیٹھے دیکھا تو آپ کی طبیعت پر ناگوار تاثرات ظاہر ہوئے۔ حضرت میمونہؓ نے یہ دیکھتے ہی جلدی سے کہا

''یارسول اللہ! یہ میری بہن کا بیٹا ہے اور بنو ہلال کے وفد میں شریک ہے۔ مجھے ملنے یہاں چلا آیا ہے۔''

آپ نے یہ بات سن کر خوشی کا اظہار کیا اور اس کے لئے برکت و رحمت کی دعا کی۔

حضرت میمونہؓ کو جانِ دو عالم ﷺ سے بے حد محبت تھی اس لئے آپ کو پریشان دیکھ کر خود بھی پریشان ہو جاتی تھیں۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ حضرت میمونہؓ سے روایت کرتے ہیں' انہوں نے فرمایا

''رسول اللہ ﷺ ایک دن صبح کے وقت کبیدہ خاطر دکھائی دیئے۔ شام کو بھی وہ اسی حالت میں تھے۔ پھر دوسری صبح کو بھی آپ کی یہی کیفیت تھی۔ میں نے عرض کی

''یارسول اللہ! کیا وجہ ہے کہ میں آپ کو کبیدہ خاطر دیکھ رہی ہوں؟''

آپ نے فرمایا---''جبریل نے میرے پاس آنے کا وعدہ کیا تھا مگر اب تک آئے نہیں، حالانکہ انہوں نے اس سے پہلے کبھی وعدے کی خلاف ورزی نہیں کی۔''

اہل خانہ نے دیکھا تو چارپائی کے نیچے کتے کا ایک بچہ بیٹھا ہوا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کو نکلوا کر اس جگہ کو پانی سے دھونے کا حکم دیا۔ بعد ازاں جبریل تشریف لائے تو رسول اللہ ﷺ نے ان سے کہا---''آپ نے میرے پاس آنے کا وعدہ کیا تھا لیکن نہیں آئے، حالانکہ پہلے آپ نے کبھی وعدہ خلافی نہیں کی۔''

جبریل نے کہا---''کیا آپ کو معلوم نہیں کہ ہم اس گھر میں نہیں آتے جس میں تصویر یا کتا ہو۔''

جانِ دو عالم ﷺ سے حضرت میمونہؓ کی محبت کا یہ عالم تھا کہ اپنی باری کے دن جانِ دو عالم ﷺ کا کسی اور زوجہ کے پاس جانا برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔ خود روایت فرماتی ہیں

کہ میری باری کی ایک رات تھی۔ میرے پاس تھوڑی دیر رکنے کے بعد رسول اللہ اٹھ کر باہر تشریف لے گئے تو میں نے دروازہ بند کر لیا۔ کچھ دیر کے بعد آپ واپس آ گئے اور دروازے پر دستک دی۔ میں نے دروازہ نہ کھولا تو ارشاد فرمایا

''میمونہ! تمہیں قسم ہے، دروازہ کھولو۔''

میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو آپ اندر تشریف لائے اور فرمایا

''تم نے دروازہ کیوں بند کر لیا تھا؟''

میں نے کہا---''یارسول اللہ! مجھے وہم ہوا کہ آپ میری باری کی رات کسی دوسری زوجہ کے پاس تشریف لے جاتے ہیں۔

فرمایا---''ایسا نہیں ہے۔ میں حاجت ضروریہ کے لئے باہر گیا تھا۔''

حضرت میمونہؓ کبھی کبھی قرض لے لیتی تھیں مگر فوراً ادا کر دیتی تھیں۔ ایک مرتبہ زیادہ رقم قرض لے لی تو کسی نے پوچھا کہ آپ اس کو ادا کس طرح کریں گی؟ جواباً ارشاد فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے جو شخص ادا کرنے کی نیت رکھتا ہو اللہ تعالیٰ اس کا قرض خود ادا کر دیتا ہے۔

حضرت میمونہؓ کو دینی مسائل کا بہت اچھا ادراک تھا اور سمجھانے کا انداز نہایت عمدہ تھا۔ ایک دن حضرت عبداللہ بن عباسؓ جو، ان کے بھانجے اور شاگرد بھی ہیں' اس حالت میں تشریف لائے کہ ان کے سر کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ سیّدہ میمونہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا

''کیا بات ہے، تمہارے بال کیوں بکھرے ہوئے ہیں؟''

حضرت عبداللہؓ نے کہا---''میری بیوی ایام کی حالت میں ہے۔ وہی میرے سر میں کنگھا کرتی تھی لیکن اب اس حالت میں ہونے کی وجہ سے میں نے اس سے یہ کام لینا مناسب نہیں سمجھا۔''

سیّدہ میمونہؓ نے فرمایا---''کیا کبھی ہاتھ بھی ناپاک ہوتے ہیں؟ عورتیں ماہواری کی حالت میں ہوں تو ان کے چھونے سے کوئی چیز ناپاک نہیں ہوتی۔''

سفرِ حج میں سیّدہ میمونہؓ جانِ دو عالم ﷺ کے ساتھ تھیں۔ لوگوں کو نو ذی الحجہ کو شک

ہوا کہ جانِ دو عالم ﷺ کا روزہ ہے یا نہیں۔ سیّدہ میمونہؓ نے ایک پیالہ دودھ کا آپ ﷺ کی خدمت اقدس میں بھیج دیا' جسے آپ نے پی لیا اور سب لوگوں نے دیکھ لیا۔ اس ترکیب سے سب کو پتہ چل گیا کہ رسول اللہ ﷺ کا روزہ نہیں ہے۔

❁❁❁

آخر وہ وقت بھی آ گیا جس سے کسی ذی روح کو رستگاری نہیں ہے۔ ان دنوں سیّدہ میمونہؓ مکہ مکرمہ میں مقیم تھیں' وہاں طبیعت کچھ خراب ہوئی تو فرمایا کہ مجھے مکہ سے لے چلو کیونکہ مجھے مکہ میں موت نہیں آئے گی۔ یہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے بتایا ہے۔ چنانچہ ان کو مقام سرف میں لایا گیا۔ وہیں ان کی وفات ہوئی۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ مقام سرف میں ان کا نکاح اور رخصتی ہوئی اور سرف ہی میں ان کی وفات ہوئی۔ سن وفات ۵۱ ہجری ہے۔

جب تدفین کے لئے ان کا جنازہ اٹھایا گیا تو حضرت ابن عباسؓ نے لوگوں سے کہا کہ جنازہ کو جھٹکے کے ساتھ نہ اٹھاؤ اور ہلا ہلا کر نہ چلو، باادب اور آہستہ آہستہ چلو، یہ رسول اللہ ﷺ کی محترم بیوی ہیں۔ حضرت ابنِ عباسؓ ہی نے نماز جنازہ پڑھائی اور قبر میں اتارا۔

جب یہ فوت ہوئیں تو حضرت عائشہؓ نے تعزیتی کلمات کہتے ہوئے ارشاد فرمایا ''ذَهَبَتْ وَ اللهِ مَيْمُوْنَةُ اَمَا اِنَّهَا كَانَتْ مِنْ أَتْقَانَا لِلّٰهِ وَ اَوْصَلِنَا لِلرَّحِم'' بخدا میمونہ اس دنیا سے چلی گئی۔ وہ ہم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والی اور ہم سب سے زیادہ صلہ رحمی کرنے والی تھی۔

رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْهَا.

اولاد امجاد

بنین، معصومین، مرحومین
[معصوم و مرحوم صاحبزادے]

جانِ دو عالم ﷺ کی اولاد امجاد کے بارے میں یہ بات پہلے سے جان لیں کہ سوائے حضرت ابراہیم کے آپ کے تمام بیٹے اور بیٹیاں حضرت خدیجۃ الکبرٰی کے بطن مبارک سے تھیں اور مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئیں۔ حضرت خدیجہ کے سوا کسی زوجۂ مطہرہ سے کوئی اولاد نہیں ہوئی؛ البتہ حضرت ماریہ سے مدینہ منورہ میں حضرت ابراہیم پیدا ہوئے۔ حضرت ماریہ ان دو کنیزوں میں سے ایک تھیں جو حاکمِ مصر و اسکندریہ، مقوقس نے آپ کے لئے تحفۃً بھیجی تھیں۔ (۱)

مؤرخین کا اس پر تو اتفاق ہے کہ صاحبزادیاں چار تھیں؛ البتہ صاحبزادوں کی تعداد میں خاصا اختلاف ہے؛ تاہم تین پر سب متفق ہیں کیونکہ ان تینوں کے ساتھ کوئی نہ کوئی تاریخی واقعہ متعلق ہے۔

۱--- حضرت قاسم رضی اللہ عنہ

اولاد نرینہ میں سب سے پہلے پیدا ہونے والے حضرت قاسم ہی تھے؛ بلکہ ایک روایت کے مطابق وہ جانِ دو عالم ﷺ کی سب سے بڑی صاحبزادی حضرت زینب سے بھی پہلے پیدا ہوئے اور بچپن ہی میں وفات پا گئے۔ ان کی وجہ شہرت یہ ہے کہ جانِ دو عالم ﷺ کی کنیت اَبُوالْقَاسِمْ یعنی قاسم کے باپ، انہی حضرت قاسم کے

(۱) تفصیل سیّد الورٰی، ج ۲، ص ۲۱۳ پر گزر چکی ہیں۔

حوالے سے ہے۔ جانِ دوعالم ﷺ نے رفعِ اشتباہ کے لئے دوسروں کو یہ کنیت اختیار کرنے سے منع فرما دیا تھا۔ اس طرح حضرت قاسم خود تو فوت ہو گئے مگر ''ابوالقاسم'' کی وجہ سے ہمیشہ کے لئے تاریخ کا حصہ بن گئے۔

۲--- حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ

یہ دوسرے صاحبزادے ہیں۔ یہ بھی بہت مختصر عرصہ زندہ رہے مگر ان کا تذکرہ اس لئے جاوداں ہو گیا کہ ان کی وفات پر بعض سنگ دل کفار نے بہت خوشی منائی تھی اور کہا تھا کہ محمد کے یکے بعد دیگرے دو بیٹے مر گئے ہیں اس لئے سمجھو کہ اب وہ ''ابتر'' ہو گیا ہے، یعنی اس کی جڑ کٹ گئی ہے اور کوئی اس کا نام لینے والا باقی نہیں رہا۔ معاذ اللہ۔

جانِ دوعالم ﷺ یہ دلآزار تبصرے سن کر بہت ملول ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی تسکین کی خاطر سورۃ کوثر نازل فرمائی اور آپ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ ہم نے آپ کو خیرِ کثیر عطا کر دی ہے، پھر آپ بھلا کیونکر ابتر ہو سکتے ہیں! آپ کا تو ایک عالم نام لیوا ہو گا۔ ہاں، آپ کے ساتھ بغض رکھنے والا یقیناً ابتر ہے--- اِنَّ شَانِئَکَ هُوَ الْاَبْتَرُ ○

۳--- حضرت ابراھیم رضی اللہ عنہ

یہ مدینہ میں پیدا ہوئے اور تقریباً ڈیڑھ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ ان کی وفات پر جانِ دوعالم ﷺ اشکبار تھے اور فرما رہے تھے

اِنَّ الْعَیْنَ تَدْمَعُ وَالْقَلْبَ یَحْزُنُ وَ لَا نَقُوْلُ اِلَّا مَا یَرْضیٰ رَبُّنَا وَ اِنَّا بِفِرَاقِکَ یَا اِبْرَاهِیْمُ لَمَحْزُوْنُوْنَ. (او کما قال علیه السلام)

(بے شک آنکھوں سے آنسو رواں ہیں اور دل غمگین ہے۔ اس کے باوجود ہم وہی کہیں گے جس سے ہمارا رب راضی ہو؛ تاہم اے ابراہیم! تیری جدائی سے ہم بہت غمگین ہیں۔)

آپ کو روتا دیکھ کر صحابہ کرامؓ کو حیرت ہوئی کہ آپ تو رونے پیٹنے سے منع فرماتے ہیں اور خود رو رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں منع تو نوحہ کرنے، منہ پیٹنے اور گریبان

پھاڑنے سے کرتا ہوں۔ رہا آنسوؤں کا بے اختیار جاری ہو جانا، تو یہ رحمت و شفقت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ یعنی اس کی ممانعت نہیں ہے۔

حضرت ابراہیم کی وفات کا یہ بھی یادگار واقعہ ہے کہ اس دن سورج کو گرہن لگ گیا۔ لوگ کہنے لگے کہ ابراہیم کے غم میں سورج نے بھی اپنا چہرہ چھپالیا ہے۔ غم کے موقع پر ایسی باتیں لوگ کرتے رہتے ہیں اور کوئی بھی ان کا خاص نوٹس نہیں لیتا لیکن جانِ دوعالم ﷺ کو خدشہ تھا کہ میری خاموشی سے لوگ کہیں اس بات کو حقیقت پر نہ محمول کرلیں اس لئے علی الاعلان یہ وضاحت فرمائی کہ شمس وقمر اللہ کی نشانیوں میں سے دونشانیاں ہیں۔ ان کو نہ کسی کے پیدا ہونے سے گرہن لگتا ہے، نہ کسی کے مرنے سے۔

یعنی یہ سب کچھ طبعی عوامل کی بنا پر ہوتا ہے، نہ کہ کسی موت وحیات سے۔

حضرت ابراہیم چونکہ شیرخوارگی کی عمر میں وفات پا گئے تھے اس لئے جانِ دوعالم ﷺ نے ان کا یہ خصوصی اعزاز ذکر فرمایا کہ جنت میں اس کی رضاعت کے لئے اللہ تعالیٰ نے دو، دودھ پلانے والیاں مقرر فرمائی ہیں۔

رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالیٰ عَنھُمْ اَجْمَعِیْنَ

خونِ خیرالرّسل سے ہے جن کا خمیر
ان کی بے لوث طینت پہ لاکھوں سلام

بناتِ طاہرات

(پاک صاحبزادیاں)

۱---سیّدہ زینب رضی اللہ عنہا

حضرت زینب جانِ دوعالم ﷺ کی سب سے بڑی صاحبزادی تھیں۔ ان کی شادی بعثتِ نبوی سے قبل ہی ان کے خالہ زاد بھائی ابوالعاص بن ربیع سے ہوگئی تھی۔

جب جانِ دوعالم ﷺ منصبِ رسالت پر فائز ہوئے تو حضرت زینب فوراً ایمان لے آئیں۔ ابوالعاص کو کفار نے بہت اُکسایا کہ وہ حضرت زینب کو طلاق دے دیں لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا اور حضرت زینب سے نہایت اچھا سلوک کرتے رہے۔ جانِ دوعالم ﷺ نے ابوالعاص کے اس طرزِ عمل کی ہمیشہ تعریف کی۔ باوجود اتنی شرافت اور نیک نفسی کے ابوالعاص نے اپنا آبائی مذہب ترک نہ کیا حتیٰ کہ جانِ دوعالم ﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے۔ حضرت زینب ان دنوں اپنے سسرال میں تھیں۔

رمضان المبارک ۲ھ میں حق اور باطل کے درمیان پہلا معرکہ بدر کے میدان میں ہوا۔ اس میں حق غالب رہا اور قریشِ مکّہ کے بہت سے آدمی مسلمانوں کے ہاتھ گرفتار ہو گئے۔ ان میں ابوالعاص بھی تھے۔ ان کی رہائی کے لئے حضرت زینب کے ہار بھیجنے کا واقعہ غزوۂ بدر میں گزر چکا ہے۔(۱) جانِ دوعالم ﷺ نے ہار واپس کر دیا اور فرمایا

''ابوالعاص کا فدیہ صرف یہ ہے کہ وہ مکّہ جا کر زینب کو فوراً مدینہ بھیج دے۔''

ابوالعاص نے یہ شرط قبول کر لی اور جب رہا ہو کر مکّہ پہنچے تو اپنے چھوٹے بھائی کنانہ کے ہمراہ حضرت زینب کو مکّہ سے مدینہ کی جانب روانہ کر دیا۔ کفارِ مکّہ کو جب یہ خبر پہنچی کہ رسول اللہ کی بیٹی مدینہ جا رہی ہے تو انہوں نے ابوسفیان کی معیت میں کنانہ اور حضرت

(۱) ملاحظہ فرمایئے سیّد الوریٰ، ج ۱، ص ۴۳۶

زینبؓ کا تعاقب کیا اور مقام ''ذی طویٰ'' میں انہیں جا گھیرا۔ حضرت زینب اونٹ پر سوار تھیں۔ کفار کی جماعت میں سے ہبار بن اسود نے ان کے اونٹ کا منہ پھیرنے کے لئے نیزہ گھمایا تو حضرت زینبؓ گر پڑیں۔ وہ حاملہ تھیں، سخت چوٹ آئی اور حمل ساقط ہو گیا۔ اس سے کنانہ غضبناک ہو گیا، ترکش سے تیر نکالے اور کمان پر چڑھا کر للکارا کہ خبردار اب تم میں سے کوئی آگے بڑھا تو اسے چھلنی کر دوں گا۔ کفار رُک گئے۔ ابوسفیان نے کہا

''بھتیجے! اپنے تیر روک لو، میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔''

کنانہ نے پوچھا --- ''کہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟''

ابوسفیان نے اس کے کان میں کہا --- ''محمد کے ہاتھوں ہمیں جس رسوائی اور ذلت کا سامنا کرنا پڑا ہے تم اس سے بخوبی واقف ہو۔ اگر تم اس کی بیٹی کو اس طرح کھلم کھلا لے جاؤ گے تو ہماری بڑی سبکی ہو گی۔ بہتر یہ ہے کہ تم اس وقت زینب کے ہمراہ مکّہ واپس لوٹ چلو اور پھر کسی دن خفیہ طور پر لے جانا۔''

کنانہ نے یہ بات مان لی اور حضرت زینب کو لے کر مکّہ واپس آ گیا۔

چند دن بعد وہ رات کے وقت چپکے سے حضرت زینبؓ کو ہمراہ لے کر نکلا اور انہیں حضرت زیدؓ کے سپرد کر کے مکّہ واپس چلا گیا۔ حضرت زیدؓ حضرت زینب کو لے کر مدینہ منورہ پہنچے۔

ابوالعاص بڑے شریف النفس اور دیانت دار آدمی تھے۔ لوگ ان کے پاس اپنی امانتیں رکھتے، وہ نہایت دیانت کے ساتھ ان کی حفاظت کرتے اور مالکوں کے طلب کرنے پر فوراً واپس کر دیتے تھے۔ مکّے میں ان کی اس قدر ساکھ تھی کہ لوگ اپنا مالِ تجارت انہیں دے کر فروخت کے لئے دوسرے ملکوں میں بھیجا کرتے تھے۔ ٦ھ میں ابوالعاص ایک تجارتی قافلہ کے ہمراہ شام جا رہے تھے کہ عیص کے مقام پر مجاہدینِ اسلام نے قریش کے قافلہ پر چھاپہ مارا اور تمام مال و اسباب پر قبضہ کر لیا۔ ابوالعاص بھاگ کر مدینہ چلے گئے اور حضرت زینب کی پناہ لے لی۔ انہوں نے جانِ دو عالم ﷺ سے سفارش کی کہ ابوالعاص کا مال انہیں واپس کر دیا جائے۔ چونکہ ابوالعاص نے مکہ میں حضرت زینب کے ساتھ اچھا سلوک کیا تھا۔

اس لئے جانِ دوعالم ﷺ ان کا لحاظ کرتے تھے۔ چنانچہ آپ نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا

''اگر تم ابو العاص کا مال واپس کر دو تو میں ممنون ہوں گا۔''

صحابہ کرامؓ کو تو خوشنودیٔ رسول مطلوب تھی اس لئے انہوں نے فوراً تمام مال و اسباب ابو العاص کو واپس کر دیا جسے لے کر وہ مکّہ پہنچے اور تمام لوگوں کی امانتیں واپس کر دیں۔ پھر اہلِ مکّہ سے مخاطب ہو کر کہا---''اے قریش! اب میرے ذمہ کسی کی کوئی امانت تو نہیں ہے؟''

تمام اہل مکّہ نے یک زبان ہو کر کہا---''بالکل نہیں، خدا تمہیں جزائے خیر دے تم ایک نیک نہاد اور باوفا شخص ہو۔''

ابو العاص نے کہا---''تو سن لو کہ میں مسلمان ہوتا ہوں۔ خدا کی قسم اسلام قبول کرنے میں مجھے صرف یہ امر مانع تھا کہ تم لوگ مجھے خائن نہ سمجھو۔''

یہ کہہ کر کلمہ شہادت پڑھا اور اس کے بعد ہجرت کر کے مدینہ منوّرہ تشریف لے آئے۔ یہ محرم ۷ھ کا واقعہ ہے۔

چونکہ حضرت زینبؓ اور حضرت ابو العاصؓ میں شرک کی وجہ سے تفریق ہو گئی تھی۔ اس لئے جب ابو العاصؓ مشرف باسلام ہو کر مدینہ پہنچے تو جانِ دوعالم ﷺ نے حضرت زینبؓ کو پہلے حقِ مہر کے ساتھ دوبارہ نکاح کر کے حضرت ابو العاصؓ کے گھر بھجوا دیا۔

حضرت زینب اس واقعہ کے بعد زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہیں اور ۸ھ میں خالقِ حقیقی کے حضور پہنچ گئیں۔ اس کا سبب اسقاط حمل کی وہ تکلیف تھی جو پہلی دفعہ مکّہ سے آتے ہوئے ذی طویٰ کے مقام پر انہیں پہنچی تھی۔

حضرت اُمِّ ایمن، حضرت سودہ اور حضرت اُمِّ سلمہ نے جانِ دوعالم ﷺ کی ہدایت کے مطابق میّت کو غسل دیا۔ نمازِ جنازہ آپ نے خود پڑھائی اور حضرت ابو العاص نے قبر میں اُتارا۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ خود بھی قبر میں اُترے۔

جس دن حضرت زینب نے وفات پائی جانِ دوعالم ﷺ بے حد مغموم تھے۔ آپ کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور فرما رہے تھے

''زینب میری سب سے اچھی لڑکی تھی جو میری محبت میں ستائی گئی۔''

حضرت زینب نے اپنے پیچھے ایک لڑکا علی اور ایک لڑکی امامہ چھوڑی۔ علی تو نوجوانی میں وفات پا گئے، امامہ البتہ جوان ہوئیں اور حضرت فاطمہ کے وصال کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے بیاہی گئیں۔

☪ ☪ ☪

۲--- سیّدہ رقیہ رضی اللہ عنہا
۳--- سیّدہ اُمِّ کلثوم رضی اللہ عنہا

دونوں شہزادیاں جانِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی علی الترتیب دوسری اور تیسری صاحبزادیاں تھیں۔ دونوں کا نکاح بعثتِ نبوی سے پہلے ابولہب کے بیٹوں سے ہو چکا تھا، اگرچہ رخصتی نہیں ہوئی تھی۔(۱) جب جانِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اور آپ نے لوگوں کو دعوتِ اسلام دینی شروع کی تو ابولہب اور اس کی بیوی آپ کے سخت دشمن ہو گئے اور انہوں نے آپ کو ستانے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ غیرت الٰہی جوش میں آئی اور سورۂ **تَبَّتْ یَدَا اَبِیْ لَهَبٍ وَّ تَبَّ ○** نازل ہوئی۔ ابولہب کو سخت غصہ آیا۔ اس کے ایک بیٹے عتبہ کے نکاح میں حضرت رقیہؓ تھیں اور دوسرے بیٹے عتیبہ سے حضرت اُمِّ کلثومؓ کا نکاح ہوا تھا، ابولہب نے اپنے دونوں بیٹوں کو بلایا

---

(۱) واضح رہے کہ اعلانِ نبوت سے پہلے ابولہب جانِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا نہایت شفیق و غمگسار چچا تھا۔ اسی نے تو آپ کی ولادت کی خوشی میں اپنی کنیز کو آزاد کیا تھا اور تخفیف عذاب کا صلہ پایا تھا۔ ہاں، اعلانِ نبوت کے بعد وہ دشمنی کی ہر حد کو پھلانگ گیا مگر اس سے پہلے تعلقات انتہائی خوشگوار تھے۔ انہی خاندانی مراسم کو مزید مستحکم کرنے کے لئے اس نے اپنے دونوں بیٹوں کے لئے جانِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی صاحبزادیوں کے رشتے مانگ لئے تھے اور آپ نے بخوشی دے دیئے تھے کیونکہ اس وقت تک نہ کوئی اختلاف تھا، نہ اسلامی احکام کے نزول کا آغاز ہوا تھا۔

اور اُن سے مخاطب ہو کر کہا کہ میرا اُٹھنا بیٹھنا تمہارے ساتھ حرام ہے اگر تم نے محمد کی لڑکیوں کو طلاق نہ دی۔ دونوں بیٹوں نے باپ کے حکم کی تعمیل کی۔ عتبہ نے حضرت رقیہ کو اور عتیبہ نے حضرت اُمِ کلثوم کو طلاق دے دی۔

واقعۂ طلاق کے چند دن بعد حضرت عثمان بن عفانؓ نے اسلام قبول کیا۔ وہ نہایت صالح، متموّل اور مخیّر نوجوان تھے۔ جانِ دو عالم ﷺ نے اپنی دامادی کے لئے انہیں منتخب فرمایا۔ حضرت عثمانؓ کی اپنی دلی خواہش بھی یہی تھی۔ چنانچہ آپ نے مکّہ ہی میں حضرت رُقیہ کی شادی حضرت عثمان سے کردی۔

مکّہ میں کفار نے جب مسلمانوں کو بے حد ستایا تو جانِ دو عالم ﷺ نے انہیں حبش کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت دے دی۔ حضرت عثمانؓ بھی حضرت رقیہ کے ہمراہ ہجرت کر کے حبش چلے گئے۔ اس موقع پر جانِ دو عالم ﷺ نے فرمایا۔۔۔ ''ابراہیم اور لوط کے بعد عثمان پہلا شخص ہے جس نے خدا کی راہ میں اپنی بیوی کے ہمراہ ہجرت کی ہے۔''

کافی عرصہ حبش میں قیام کرنے کے بعد حضرت عثمانؓ کو خبر ملی کہ رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کرنے والے ہیں۔ چنانچہ کچھ دوسرے مسلمانوں اور حضرت رقیہ کے ہمراہ انہوں نے مکہ کی طرف مراجعت کی اور پھر چند دن کے بعد جانِ دو عالم ﷺ کی اجازت سے حضرت رقیہؓ کے ہمراہ ہجرت کر کے مدینہ چلے گئے۔

۲ر ہجری میں حضرت رقیہؓ شدید بیمار ہوگئیں۔ اس وقت جانِ دو عالم ﷺ بدر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ روانگی سے پہلے آپ نے حضرت عثمانؓ کو حکم دیا کہ وہ رقیہ کی خبر گیری کے لئے مدینہ ہی میں ٹھہریں، اس کے عوض اللہ تعالیٰ انہیں جہاد میں شریک ہونے کا ثواب بھی دے گا اور مالِ غنیمت سے بھی انہیں حصہ ملے گا۔ چنانچہ حضرت عثمان حضرت رقیہ کے پاس ہی ٹھہرے۔ جانِ دو عالم ﷺ ابھی بدر ہی میں تھے کہ حضرت رقیہ کی تکلیف بڑھ گئی اور انہوں نے اکیس سال کی عمر میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ عین اس وقت جب قبر پر مٹی ڈالی جا رہی تھی، حضرت زید بن حارثہ بدر کی لڑائی میں مسلمانوں کی فتح کی خوشخبری لے کر مدینہ میں داخل ہو رہے تھے۔

جانِ دو عالم ﷺ اپنی لختِ جگر کی وفات کا سن کر بہت مغموم ہوئے اور مدینہ واپس آ کر حضرت رقیہ کی قبر پر تشریف لے گئے۔ حضرت فاطمہؓ بھی اپنی بہن کی قبر پر تشریف لائیں اور قبر کے کنارے بیٹھ کر رونے لگیں۔ جانِ دو عالم ﷺ نے ان کو تسلی دی اور اپنی چادر مبارک کے کناروں سے ان کے آنسو پونچھے۔

حضرت رقیہ کے قیام حبش کے دوران ان کا ایک لڑکا پیدا ہوا تھا جس کا نام عبداللہ رکھا گیا تھا۔ حضرت عبداللہ کی عمر ابھی چھ برس کی تھی کہ پیمانۂ عمر لبریز ہو گیا اور وہ دنیا سے چل بسے۔

حضرت رقیہ اور حضرت عثمان میں باہم بیحد محبت تھی۔ ان کے تعلقات اتنے خوشگوار اور مثالی تھے کہ لوگوں میں یہ مقولہ ان کی نسبت بطور ضرب المثل مشہور ہو گیا تھا۔

اَحْسَنُ زَوْجَیْنِ رَاٰهُمَا الْاِنْسَانُ ، رُقَیَّةُ وَزَوْجُهَا عُثْمَانُ.

یعنی رقیہ اور عثمان سے بہتر میاں بیوی کسی انسان نے نہیں دیکھے۔

رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالیٰ عَنْهُمَا

حضرت رُقیہ کی وفات کے کچھ عرصہ بعد حضرت ام کلثومؓ کا نکاح جانِ دو عالم ﷺ نے حضرت عثمان سے پڑھا دیا۔ نکاح کے وقت آپ نے حضرت عثمانؓ سے فرمایا کہ خداوند تعالیٰ نے جبریل امین کی معرفت مجھے حکم بھیجا ہے کہ اپنی بیٹی ام کلثوم کو اسی حق مہر پر جو رقیہ کا تھا، تمہارے عقد میں دے دوں۔

حضرت ام کلثوم اس شادی کے بعد چھ سال تک زندہ رہیں اور شعبان ۹ ہجری میں وفات پائی۔ حضرت صفیہ بنتِ عبدالمطلب، حضرت ام عطیہ اور حضرت اسماء بنتِ عمیس نے جانِ دو عالم ﷺ کی ہدایت کے مطابق غسل دیا۔ آپ نے کفن کے لئے اپنی چادر دی، خود ہی نمازِ جنازہ پڑھائی اور سیدہ کو جنت البقیع میں سپردِ خاک کر دیا۔

حضرت انس بن مالک سے روایت ہے کہ جس وقت سیدہ ام کلثوم کو قبر میں اتارا گیا تو رسول اللہ ﷺ قبر کے پاس تشریف فرما تھے اور آپ کی آنکھوں سے سیلِ اشک رواں تھا۔ سیدہ ام کلثوم کی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالیٰ عَنْهَا

مؤرخین نے لکھا ہے کہ یہ شرف پوری کائنات میں صرف حضرت عثمانؓ کو حاصل ہوا ہے کہ ان کے عقد میں یکے بعد دیگرے نبی کی دو بیٹیاں آئیں۔ اعلیٰ حضرتؒ نے اس بے مثال اعزاز پر حضرت عثمانؓ کو یوں مبارکباد پیش کی ہے

نور کی سرکار سے پایا دوشالہ نور کا
ہو مبارک تم کو ذوالنورین جوڑا نور کا

اور اپنے مشہورِ عالم سلام میں فرماتے ہیں

زوجِ دو نورِ عفت پہ لاکھوں سلام

☪ ☪ ☪

۴---سیدہ فاطمة الزھرا رضی اللہ عنہا

سیدہ فاطمہؓ جانِ دو عالم ﷺ کی چوتھی، سب سے چھوٹی اور لاڈلی صاحبزادی تھیں۔ سیدة نساء اہل الجنة، زہرا، بتول، طاہرہ، اور خاتونِ جنت ان کے مشہور القاب ہیں۔ ان کی ولادت بعثتِ نبوی سے پانچ سال قبل ہوئی جبکہ جانِ دو عالم ﷺ کی عمر مبارک پینتیس برس کی تھی۔ بچپن ہی سے نہایت متین اور تنہائی پسند تھیں۔ نہ کبھی کسی کھیل کود میں حصہ لیا اور نہ گھر سے قدم باہر نکالا۔ ابتدا ہی سے ان کی حرکات وسکنات سے خدا دوستی اور استغنا کا اظہار ہوتا تھا۔

حضرت فاطمہؓ مکہ مکرمہ میں ہی سنِ بلوغت کو پہنچ چکی تھیں۔ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئیں تو رشتے آنے شروع ہو گئے۔ سب سے پہلے صدیق اکبرؓ ان کے خواستگار ہوئے، پھر حضرت عمرؓ۔ مگر جانِ دو عالم ﷺ نے فرمایا کہ میں فی الحال حکم الٰہی کا منتظر ہوں۔

پھر ابوبکرؓ وعمرؓ نے حضرت علیؓ کو مشورہ دیا کہ آپ اپنے لئے فاطمہ کا رشتہ مانگئے!

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ ان کے توجہ دلانے سے پہلے مجھے اس بات کا کبھی خیال بھی نہیں آیا تھا۔ ان کے کہنے پر میں اسی وقت بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا اور عرض کی

''یَارَسُوْلَ اللہ! اَتُزَوِّجُنِیْ فَاطِمَۃ؟'' (یارسول اللہ! کیا آپ فاطمہ کو میرے عقد میں دینا پسند کریں گے؟)

رسول اللہ نے پوچھا---''تمہارے پاس مہر میں دینے کے لئے کچھ ہے؟''

''نہیں یارسول اللہ! میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔''

''بدر کے مالِ غنیمت سے میں نے تمہیں جو زرہ دی تھی، وہ کیا ہوئی؟''

''وہ تو موجود ہے، یارسول اللہ!''

''بس، اسی کو بیچ ڈالو!''

حضرت علیؓ فرحاں و شاداں اٹھے اور زرہ بیچنے کے لئے چل پڑے۔ صحابہ کرامؓ میں ایسے متمول تاجر حضرت عثمانؓ ہی تھے جن کے پاس ہر وقت پیسے موجود رہتے تھے۔ چنانچہ حضرت علی بھی اپنی زرہ انہی کے پاس فروخت کرنے گئے۔

حضرت عثمانؓ سید الاسخیاء تھے۔ ان کو جب پتہ چلا کہ حضرت علیؓ کو مہر کے لئے رقم درکار ہے تو انہوں نے پہلے تو چار سو اسی روپے ادا کر کے زرہ خرید لی۔ پھر وہی زرہ حضرت علیؓ کو تحفۃً دے دی۔

حضرت علیؓ رقم لے کر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور سارے پیسے آپ کی جھولی میں ڈال دیئے۔ ساتھ ہی حضرت عثمانؓ کی نوازش کا ذکر بھی کیا۔ جانِ دو عالم ﷺ حضرت عثمانؓ کی اس فیاضی سے بے حد خوش ہوئے اور ان کو غائبانہ بہت سی دعائیں دے ڈالیں۔ پھر آپ نے حضرت بلالؓ کو انہی پیسوں میں سے کچھ رقم خوشبو وغیرہ کی خریداری کے لئے عطا فرمائی اور سیدہ فاطمہؓ کے لئے جہیز تیار کرنے کا حکم بھی دیا۔

جہیز تیار ہوا---کس کا جہیز---؟ سرورِ کونین کی لاڈلی بیٹی کا جہیز---شہنشاہِ دو عالم کی دختر بلند اختر کا جہیز۔

آئیں، ذرا دیکھیں تو سہی کہ جانِ دو عالم ﷺ نے اپنی لختِ جگر کو رخصت کرتے وقت کیا کیا سامان دیا تھا۔

ایک موٹی چادر، ایک پانی کا مشکیزہ، ایک چمڑے کا بچھونا، جس میں کھجور کے پتے

بھرے تھے ---اور بعض روایات کے مطابق ایک چارپائی بھی۔

یہی تین یا چار چیزیں کل کائنات تھی سیدۃ نساء العالمین کے جہیز کی۔ اَللّٰہُ غَنِیٌ.

سلام اس پر کہ جس نے بادشاہی میں فقیری کی

رخصتی کے وقت جانِ دو عالم ﷺ نے حضرت علیؓ سے کہا ---"میں رات کو تمہارے گھر آؤں گا، انتظار کرنا۔"

چنانچہ آپ نماز عشاء کے بعد ان کے گھر تشریف لے گئے اور سیدہ فاطمہؓ سے کہا

"بیٹی! تھوڑا سا پانی لادو!"

سیدہ فاطمہؓ فرطِ حیاء سے لڑکھڑاتی ہوئی اٹھیں اور ایک پیالے میں پانی بھر لائیں۔ جانِ دو عالم ﷺ نے تھوڑا سا پانی منہ میں لے کر کلی کی اور منہ والا پانی پھر اس پیالے میں ڈال دیا، پھر سیدہ فاطمہؓ سے کہا---"بیٹی! ذرا نزدیک ہو جاؤ!"

سیدہ فاطمہؓ قریب گئیں تو آپ نے وہ پانی ان کے سینے پر چھڑکا۔ پھر فرمایا

"اب میری طرف پیٹھ کر کے کھڑی ہو جاؤ!"

سیدہ فاطمہؓ نے تعمیل کی تو آپ نے ان کے کندھوں پر وہی پانی چھڑکا۔ پھر حضرت علیؓ کے ساتھ بھی آپ نے یہی عمل دہرایا۔ اس کے بعد دعا فرمائی۔

"اَللّٰھُمَّ! بَارِکْ فِیْھِمَا وَفِیْ شَمْلِھِمَا." (الٰہی! ان دونوں کو بابرکت بنا اور ان کے اجتماع کو بھی مبارک بنا۔)

ایسی ہی متعدد جانفزا دعائیں دینے کے بعد آپ وہاں سے واپس چلے آئے۔

شادی کے بعد آپ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ دعوتِ ولیمہ بھی ہونی چاہئے چنانچہ مہر ادا کرنے کے بعد جو رقم بچ گئی تھی حضرت علیؓ نے اسی سے ولیمہ کا انتظام کیا۔ دستر خوان پر پنیر، کھجور، نانِ جو اور گوشت تھا۔ حضرت اسماءؓ سے روایت ہے کہ یہ اس زمانے کا بہترین ولیمہ تھا۔

حضرت فاطمۃ الزہراؓ کا گھر مسکنِ نبوی سے کسی قدر فاصلے پر تھا اس لئے آنے جانے میں تکلیف ہوتی تھی۔ ایک دن جانِ دو عالم ﷺ نے حضرت فاطمہؓ سے فرمایا

"بیٹی! مجھے اکثر تمہیں دیکھنے کے لئے آنا پڑتا ہے۔ میں چاہتا ہوں تمہیں اپنے

قریب بلالوں۔"

حضرت فاطمہؓ نے عرض کی---"آپ کے قرب وجوار میں حارثہ بن نعمان کے بہت سے مکانات ہیں۔آپ ان سے فرمایئے، وہ کوئی نہ کوئی مکان خالی کر دیں گے۔"(۱)

آپ نے فرمایا---"بیٹی! حارثہ سے اب کوئی مکان مانگتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے کیونکہ وہ پہلے ہی اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی خوشنودی کے لئے کئی مکان دے چکے ہیں۔"

حضرت فاطمہ خاموش ہوگئیں۔

ہوتے ہوتے یہ خبر حضرت حارثہؓ تک جا پہنچی۔وہ فوراً جانِ دو عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی---"یارسول اللہ! آپ فاطمہ کو کسی قریبی مکان میں لانا چاہتے ہیں تو یہ مکان جو آپ کے متصل ہے میں خالی کئے دیتا ہوں، آپ فاطمہ کو بلا لیجئے! خدا کی قسم جو چیز آپ مجھ سے لے لیں وہ مجھے زیادہ محبوب ہے، بہ نسبت اس کے جو میرے پاس رہ جائے۔"

فرمایا---"تم سچ کہتے ہو، اللہ تعالیٰ تمہیں خیر و برکت دے۔"

اس کے بعد آپ نے حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کو حضرت حارثہؓ کے مکان میں منتقل کرالیا۔

جب فتوحاتِ اسلام روز بروز وسعت پذیر ہونے لگیں اور مدینہ منورہ میں بکثرت مالِ غنیمت آنا شروع ہوگیا تو ایک دن حضرت علیؓ کو معلوم ہوا کہ مال غنیمت میں کچھ لونڈیاں آئی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے سیدہ فاطمہؓ سے کہا---"فاطمہ! چکی پیستے پیستے تمہارے ہاتھ میں آبلے پڑ گئے ہیں اور چولھا پھونکتے پھونکتے تمہارے چہرے کا رنگ متغیر ہوگیا ہے۔آج رسول اللہ ﷺ کے پاس مال غنیمت میں بہت سی لونڈیاں آئی ہیں، جاؤ، آپ سے ایک لونڈی مانگ لاؤ۔"

(۱) حضرت حارثہؓ ایک متمول انصاری تھے اور کئی مکانات کے مالک تھے۔جب سے جانِ دو عالم ﷺ مدینہ تشریف لائے تھے، وہ اپنے کئی مکانات یکے بعد دیگرے آپ کی نذر کر چکے تھے۔

حضرت فاطمہؓ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئیں لیکن اس وقت محفل میں بہت سے لوگ بیٹھے تھے اس لئے شرم وحیا سے حرفِ مدعا زبان پر نہ لاسکیں اور واپس آ کر حضرت علیؓ سے کہا کہ مجھے آپ سے کنیز مانگنے کا حوصلہ نہیں پڑتا۔ پھر دونوں میاں بیوی حاضر ہوئے، اپنی تکالیف بیان کیں اور ایک لونڈی کے لئے درخواست کی۔ آپ نے فرمایا

''میں تم کو کوئی قیدی خدمت کے لئے نہیں دے سکتا۔ ابھی اصحاب صُفّہ کی خورد و نوش کا تسلی بخش انتظام مجھے کرنا ہے، میں ان لوگوں کو کیسے نظر انداز کرسکتا ہوں جنہوں نے اپنا گھر بار چھوڑ کر خدا اور خدا کے رسول کی خوشنودی کی خاطر فقر وفاقہ اختیار کیا ہے۔''

یہ سن کر دونوں میاں بیوی خاموشی سے گھر تشریف لے گئے۔ ابن سعدؒ اور حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ رات کو آپ ان کے ہاں تشریف لے گئے اور فرمایا کہ تم جس چیز کے خواہش مند تھے، اس سے بہتر ایک چیز میں تم کو بتاتا ہوں۔ ہر نماز کے بعد دس دس بار سبحان اللہ، الحمدللہ، اور اللہ اکبر پڑھا کرو اور سوتے وقت سبحان اللہ الحمدللہ ۳۳، ۳۳، بار اور اللہ اکبر ۳۴ بار پڑھ لیا کرو۔ یہ عمل تمہارے لیے خادم سے بہتر ثابت ہوگا۔

علامہ شبلیؒ نے اس واقعہ کا کیا خوب نقشہ کھینچا ہے---!

افلاس سے تھا سیدۂ پاک کا یہ حال — گھر میں کوئی کنیز، نہ کوئی غلام تھا
گھس گھس گئی تھیں ہاتھ کی دونوں ہتھیلیاں — چکی کے پیسنے کا جو دن رات کام تھا
اٹ جاتا تھا لباسِ مبارک غبار سے — جھاڑو کا مشغلہ بھی ہر صبح و شام تھا
آخر گئیں جنابِ رسولِ خدا کے پاس — یہ بھی کچھ اتفاق، وہاں اذنِ عام تھا
محرم نہ تھے جو لوگ تو کچھ کرسکیں نہ عرض — واپس گئیں کہ پاسِ حیا کا مقام تھا
پھر جب آئیں دوبارہ تو پوچھا حضور نے — کل کس لیے تم آئی تھیں؟ کیا خاص کام تھا؟
غیرت یہ تھی کہ اب بھی نہ کچھ منہ سے کہہ سکیں — حیدر نے ان کے منہ سے کہا جو پیام تھا
ارشاد یہ ہوا کہ غریبانِ بے وطن — جن کا کہ صفۂ نبوی میں قیام تھا
میں ان کے بندوبست سے فارغ نہیں ہنوز — ہر چند اس میں خاص مجھے اہتمام تھا

کچھ تم سے بھی زیادہ مقدم تھا ان کا حق جن کو کہ بھوک پیاس سے سونا حرام تھا
خاموش ہوکے بسیدۂ پاک رہ گئیں جرأت نہ کرسکیں کہ ادب کا مقام تھا
یوں کی بسر ہر اہل بیتِ مطہر نے زندگی
یہ ماجرائے دخترِ خیر الانام تھا

اس قدر فقیرانہ زندگی گزارنے کے باوجود سخاوت کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ قبیلہ بنو سلیم کا ایک بوڑھا اعرابی مسلمان ہوا۔ جانِ دو عالم ﷺ نے اسے دین کے ضروری احکام و مسائل بتائے اور پھر اس سے پوچھا کہ تیرے پاس کچھ مال بھی ہے؟ اس نے کہا---"خدا کی قسم! بنی سلیم کے تین ہزار آدمیوں میں سب سے زیادہ غریب اور فقیر میں ہی ہوں۔"

آپ نے صحابہ کی طرف دیکھا اور فرمایا---"تم میں سے کون اس مسکین کی مدد کریگا۔"

حضرت سعدؓ بن عبادہ اٹھے اور کہا---"یا رسول اللہ! میرے پاس ایک اونٹنی ہے جو میں اس کو دیتا ہوں۔"

فرمایا---"تم میں سے کون ہے جو اس کا سر ڈھانک دے۔"

حضرت علی مرتضیٰؓ اٹھے اور اپنا عمامہ اتار کر اس کے سر پر رکھ دیا۔

آپ نے پھر فرمایا---"کون ہے جو اس کی خوراک کا بندوبست کرے؟"

حضرت سلمان فارسیؓ نے اعرابی کو ساتھ لیا اور اس کی خوراک کا انتظام کرنے نکلے۔ چند گھروں سے دریافت کیا لیکن وہاں سے کچھ نہ ملا۔ پھر حضرت فاطمہؓ کے مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا حضرت فاطمہؓ نے پوچھا---"کون ہے؟" انہوں نے اپنا نام بتا کر سارا واقعہ بیان کیا اور التجا کی کہ اس مسکین کی خوراک کا کچھ بندوبست کیجئے!

حضرت فاطمہؓ نے فرمایا---"اے سلمان! خدا کی قسم، آج ہم سب کو تیسرا فاقہ ہے۔ دونوں بچے بھوکے سوئے ہیں لیکن سائل کو خالی ہاتھ جانے نہ دوں گی۔ یہ میری چادر شمعون یہودی کے پاس لے جاؤ اور کہو فاطمہ بنتِ محمد ﷺ کی یہ چادر رکھ لو اور اس غریب انسان کو تھوڑی سی جنس دے دو۔"

حضرت سلمانؓ اعرابی کو ساتھ لے کر یہودی کے پاس پہنچے اور اس سے تمام کیفیت

بیان کی۔ وہ حیران رہ گیا اور پکار اٹھا۔۔۔ ''خدا کی قسم یہ وہی لوگ ہیں جن کی خبر توریت میں دی گئی ہے۔ اے سلمان! گواہ رہنا کہ میں فاطمہ کے باپ پر ایمان لایا۔''

اس کے بعد کچھ غلہ حضرت سلمانؓ کو دیا اور چادر بھی حضرت فاطمہ کو واپس بھیجدی۔ سیدہ نے اپنے ہاتھ سے اناج پیسا اور جلدی سے اعرابی کے لئے روٹی پکا کر حضرت سلمانؓ کو دی۔ انہوں نے کہا۔۔۔ ''اس میں سے کچھ بچوں کے لئے رکھ لیجئے!''

فرمایا۔۔۔ ''سلمان! جو چیز خدا کی راہ میں دے چکی، وہ میرے بچوں کے لئے جائز نہیں۔''

حضرت سلمان روٹی لے کر حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضور نے وہ روٹی اعرابی کو دی، پھر فاطمۃ الزہرا کے گھر تشریف لے گئے، ان کے سر پر اپنا دستِ شفقت پھیرا اور آسمان کی طرف دیکھ کر دعا کی

''الٰہی! فاطمہ تیری کنیز ہے، اس سے راضی رہنا۔''

جانِ دوعالم ﷺ حضرت فاطمۃ الزہرا سے بے پناہ محبت فرماتے تھے۔ صحیح بخاری میں روایت ہے کہ ایک موقع پر جانِ دوعالم ﷺ نے مسجد میں منبر پر چڑھ کر ارشاد فرمایا۔۔۔ ''فاطمہ میرے جسم کا ایک ٹکڑا ہے۔ جس نے اس کو اذیت دی، اس نے مجھے اذیت دی۔ جس نے اس کو دکھ پہنچایا، اس نے مجھے دکھ پہنچایا۔''

وصال نبوی سے کچھ دن پہلے حضرت فاطمہؓ آپ کی خبر گیری کے لئے تشریف لائیں۔ آپ نے نہایت شفقت سے انہیں اپنے پاس بٹھایا اور ان کے کان میں آہستہ سے کوئی بات کہی جسے سُن کر وہ رونے لگیں، پھر آپ نے کوئی اور بات ان کے کان میں کہی جسے سن کر وہ ہنسنے لگیں۔ جب چلنے لگیں تو حضرت عائشہ نے ان سے پوچھا۔۔۔ ''فاطمہ! تیرے رونے اور ہنسنے کا کیا بھید تھا؟''

سیّدہ نے فرمایا۔۔۔ ''جو بات ابا جان نے اخفا میں رکھی ہے، میں اسے ظاہر نہ کروں گی۔''

جانِ دوعالم ﷺ کی رحلت کے بعد ایک دن حضرت عائشہ صدیقہؓ نے دوبارہ حضرت فاطمہؓ سے اس روز کے واقعہ کی تفصیل پوچھی۔ انہوں نے فرمایا۔۔۔ ''پہلی دفعہ

ابا جان نے فرمایا تھا کہ اس سے پہلے جبریل امین سال میں ہمیشہ ایک بار قرآن مجید کا دور کیا کرتے تھے، اس سال خلافِ معمول دو بار کیا ہے۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ میری وفات کا وقت قریب آ گیا ہے۔ اس پر میں رونے لگی۔

پھر آپ نے فرمایا تھا کہ تم اہل بیت میں سے سب سے پہلے مجھے ملو گی اور تم جنت کی عورتوں کی سردار ہو گی۔ اس سے مجھے خوشی ہوئی اور میں ہنسنے لگی۔''

رحلت سے قبل جب جانِ دو عالم ﷺ پر بار بار غشی طاری ہونے لگی تو حضرت فاطمہؓ کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ فرمایا--- وَاکَرْبَ اَبَاہ. ہائے میرے باپ کی بے چینی۔

جانِ دو عالم ﷺ نے فرمایا---''تمہارا باپ آج کے بعد کبھی بے چین نہیں ہو گا۔''

جانِ دو عالم ﷺ کی تجہیز و تکفین کے بعد صحابیاتؓ اور صحابہ کرامؓ تعزیت کے لئے ان کے پاس آتے تھے لیکن ان کو کسی پہلو قرار نہ آتا تھا۔ تمام کتبِ سیرت متفق ہیں کہ جانِ دو عالم ﷺ کے وصال کے بعد کسی نے سیدہ فاطمۃ الزہراؓ کو ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔

جانِ دو عالم ﷺ کی جدائی کا سب سے زیادہ صدمہ حضرت فاطمہؓ کو ہوا۔ وہ ہر وقت غمگین و دل گرفتہ رہنے لگیں اور آپ کی رحلت کے چھ ماہ بعد ہی ۳ رمضان المبارک ۱۱ ہجری کو ۲۹ سال کی عمر میں عازمِ فردوسِ بریں ہو گئیں۔ وفات سے پہلے حضرت اسماءؓ بنت عمیس کو بلا کر فرمایا---''میرا جنازہ لے جاتے ہوئے اور تدفین کے وقت پردہ کا پورا لحاظ رکھنا مجھے خود ہی غسل دینا اور سوائے میرے شوہر کے میرے غسل میں کسی سے مدد نہ لینا۔ تدفین کے وقت بھی زیادہ ہجوم نہ ہونے دینا۔''

حضرت اسماءؓ نے کہا---''میں نے حبش میں دیکھا ہے کہ جنازے پر درخت کی شاخیں باندھ کر ایک ڈولے کی صورت بنا لیتے ہیں اور اس پر پردہ ڈال دیتے ہیں۔''

پھر انہوں نے کھجور کی چند شاخیں منگوائیں اور انہیں جوڑ کے اور پھر ان پر کپڑا تان کر سیدہ فاطمہؓ کو دکھایا۔ انہوں نے اسے پسند فرمایا۔ چنانچہ وفات کے بعد ان کا جنازہ اسی طریقہ سے اٹھایا گیا۔ جنازہ میں بہت کم لوگوں کو شرکت کا موقع ملا کیونکہ سیدہ کی وفات رات کے وقت ہوئی تھی اور حضرت علیؓ نے وصیت کے مطابق رات ہی کو دفن کر دیا تھا۔

نمازِ جنازہ حضرت عباسؓ نے پڑھائی اور حضرت علیؓ، حضرت عباسؓ، حضرت فضلؓ بن عباس نے قبر میں اتارا اور جنت البقیع میں مدفون ہوئیں۔

حضرت فاطمہؓ کی چھ اولادیں ہوئیں۔ حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ، حضرت محسنؓ، حضرت اُمِ کلثومؓ، حضرت رقیہؓ اور حضرت زینبؓ محسن اور رقیہؓ نے بچپن ہی میں انتقال کیا۔ حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ، حضرت زینبؓ اور حضرت ام کلثومؓ تاریخ اسلام کی معروف شخصیتیں ہیں۔ جانِ دوعالم ﷺ کی نسل فاطمۃ الزہراؓ ہی سے باقی رہی۔

حضرت فاطمۃ الزہراؓ سے کتب احادیث میں اٹھارہ حدیثیں مروی ہیں۔ ان کے رواۃ میں حضرت علیؓ، حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ، حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت ام سلمہؓ جیسی جلیل القدر ہستیاں شامل ہیں۔

علامہ اقبالؒ نے سیدہ فاطمۃ الزہراؓ کو ان الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے

مزرعِ تسلیم راحاصل بتولؓ مادراں را اسوۂ کامل بتولؓ

بہرِ محتاجے دلش آں گونہ سوخت بایہودے چادرِ خودرا فروخت

آں ادب پروردۂ صبر و رضا آسیا گردان ولب قرآں سرا

گریہ ہائے او زبالیں بے نیاز گوہر افشاندے بدامانِ نماز

تسلیم ورضا کی کھیتی کا حاصل بتولؓ ہیں اور ماؤں کے لئے کامل نمونہ بتولؓ ہیں۔

ایک محتاج کے لئے ایسی دلسوزی فرمائی کہ اپنی چادر ایک یہودی پر بیچ دی۔

وہ صبر ورضا کی ادب پروردہ جو ہاتھوں سے چکی چلاتی تھیں اور لبوں پر قرآن ہوتا تھا۔

راتوں کو سرہانے سے بے نیاز ہوجاتی تھیں۔ روتی تھیں اور نماز کے دامن پر اشکوں کے موتی بکھیرتی تھیں۔

علامہ اقبال نے مسلمان عورت کو بھی سیدہ بتولؓ کی تقلید کا مشورہ دیتے ہوئے کہا ہے۔

بتولے باش و پنہاں شوازیں عصر کہ در آغوش شبیرے بگیری

(تو بھی بتولؓ کی طرح بن اور زمانے کی نگاہوں سے چھپ کر رہ، تا کہ تیری آغوش میں بھی کوئی شبیرؓ جیسی ہستی آئے)

اعلحضرتؒ نے ان کی بارگاہ میں یوں گلہائے عقیدت نچھاور کئے ہیں

اس بتولِ جگر پارۂ مصطفیٰ حجلہ آرائے عفت پہ لاکھوں سلام
جس کا آنچل نہ دیکھا مہ و مہر نے اس ردائے نزاہت پہ لاکھوں سلام
سیدہ ، زاہرہ ، طیبہ ، طاہرہ جانِ احمد کی راحت پہ لاکھوں سلام

رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالیٰ عَنْہَا

اللھم صل علی سیدنا محمد وعلی ازواجه المطهرات وبنیه المعصومین وبناته الطاهرات.

بحمد اللہ
سیدالوریٰ
مکمل ہوئی

دعا ہے کہ جس آقا و مولیٰ ﷺ کی سیرت بیان کرنے کے لئے یہ کتاب لکھی گئی ہے، اس کے طفیل اللہ تعالیٰ کتاب کے مصنف، قارئین، ناشرین، کمپوزرز، پروف ریڈرز اور جملہ معاونین پر خصوصی کرم فرمائے اور سب کو سیدالوریٰ ﷺ کی حقیقی محبت و اتباع نصیب فرمائے۔

آمین وصلی اللہ علی النبی الامین وعلی آله واصحابه اجمعین.

منظوم کلام

(قطعہ تاریخ طباعت)

زمیں آراستہ کی سیرت سرور کی داتم نے
مثیل جس کے مقابل خوبی چرخ زبرجد ہے
وقار ، احتشام ، ارباب علم و فن کی محفل کا
بزرگان طریقت کا وہ فخر ، ناز مسند ہے
زباں کا اس کی ہر لفظ انتہائی آگہی آور
قلم کی اس کے ہر تحریر پہ تاثیر بے حد ہے
رضائے مصطفیٰ ، خوشنودی حق کے لئے کوشاں
یہی ہے دائمی راحت ، یہی عیش مخلد ہے
نہیں آساں احاطہ اس کے افضال و محاسن کا
وہ افصح ہے، وہ افضل ہے، وہ اسعد ہے، وہ ارشد ہے
لکھی ہے سیرت محبوب حق پہ وہ کتاب اس نے
جہان لفظ میں ، دنیائے معنی میں جو مفرد ہے
گل رعنائے باغ سیرت عنبر رحمت
یہ دل آویز نقش حسن کردار محمد ہے
چھپی کب اس سے پہلے نادر و جامع کتاب ایسی
بجا ہے جس قدر بھی فرحت عشاق احمد ہے
برائے عاشقان سرور عالم یہ مجموعہ
ہے ہر دور ، انتہائی فیض بخش و کار آمد ہے
"ادب" سے اس کی تاریخ طباعت یوں کہی طارق
نے
عجب ایمان پرور "خوبی و تفضیل احمد" ہے

۱۹۹۷ء

(۷+۱۹۹۷ = ۲۰۰۴ء)

(واضح رہے کہ پہلی جلد ۱۹۹۷ء میں جبکہ
تیسری جلد ۲۰۰۴ء میں شائع ہوئی)

طارق سلطان پوری (حسن ابدال)